



خواب سراپ

(ناول)

انیس اشفاق

خوابِ مراب

ناول



سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4393 Ashfaq, Anis
Khwab Sarhad' Anis Ashfaq -
Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2018.
48pp.
1. Urdu Literature - Novel.
I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز سے باقاعدہ
تجزیہ کی اجازت کے بغیر نہیں بھی شائع نہیں کیا جاسکتا اگر اس قسم کی
کوئی بھی صورت حال نمودار پڑے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔

2018ء

افضل احمد نے

سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

سے شائع کی۔

0305 6406067

ISBN-10: 969-35-3171-X

ISBN-13: 978-969-35-3171-7

Sang-e-Meel Publications

35 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN

Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101

<http://www.sangemeel.com> e-mail: smp@sangemeel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

صدا میں

✓ کر بلائیں، درگا ہیں، مسجدیں، امام باڑے، باغ، روئے، عقصر زینب

سیرگا ہیں اور محسراتیں

میں انہیں میں زندہ ہوں

اور

میرا نام لکھنؤ ہے

”میں یعنی مرزا ہادی رسوا اس ناول کے پڑھنے والوں کے سامنے لکھنؤ کی ایک سچی اور اصلی کہانی پیش کر رہا ہوں۔ یہ کہانی ایک بڑے رئیس کی حویلی سے ایک کمسن بچی کے غائب ہو جانے اور کوشے پر پہنچ کر ایک مشہور طوائف بن جانے کی ہے۔ صاحبو! میں اس کہانی کو ہرگز نہ لکھتا اگر اس میں حزن و الم کے مرقعے موجود نہ ہوتے۔ اس کے لکھنے کا مقصود یہ بتانا ہے کہ حویلیوں اور محلوں کی تہذیب جگہیں بدل جانے کے باوجود اپنی شکل نہیں بدلتی اور اس کا مقصود یہ دکھانا ہے کہ اصالت کے قامت پر شرافت کا جامہ ہمیشہ قائم رہتا ہے۔

غدر کے بعد لکھنؤ میں جو کچھ ہوا اور جس طرح ہوا، قارئین اس قصے میں پڑھیں اور عبرت حاصل کریں۔“

قصہ نویس

مرزا محمد ہادی المتخلص بہ رسوا

(ناول سے اقتباس)

خلوت

"Solitude is the profoundest fact of the human condition... Man is nostalgia and a search for communion. Therefore when he is aware of himself he is aware of his lack of another, that is of his solitude."

Octavio Paz
The Labyrinth of solitude
1950

دکھیارے پراظہار خیال کے دوران

”انیس اشفاق! اچھا ہے تم لکھنؤ کے بارے میں لکھو،
بہت کچھ ہے ابھی لکھنؤ پر لکھنے کو۔“

انتظار حسین

تاریخ : ۱۶ اکتوبر ۲۰۱۴ء

زمان : ۹ بجے صبح

مکان : ہوٹل نیچ لکھنؤ، کراچی، پاکستان

تشکر

ہندوپاک کے ان بے شمار قارئین کا خصوصی شکریہ جنہوں نے
’دکھیارے‘ پڑھتے ہی دل کھول کر اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

اس ناول کے تمام واقعات و کردار فرضی ہیں۔
کسی سے انکی مطابقت محض اتفاق ہوگی۔

انتساب
رسوا کے لکھنؤ کے نام

استفادہ
رجب علی بیک سرور، مہذب لکھنوی، نیر مسعود، انو بھوتیواری
تاج آرا بیگم، ہادی رضا، بادشاہ خاتون
مشورت
اظہر مسعود
روشن تقی، جعفر میر عبد اللہ

وحشت سرائے دہر میں آیا نہ پھر کوئی
ایسے گئے یہاں سے مسافر ڈرے ہوئے
تعلیق لکھنوی

اجل گرفتہ گئے کس طرف کو کیا معلوم
خزاں گلوں کو کدھر لے گئی خدا معلوم
آغا شرف

بہت پہلے جب میں بہت چھوٹا تھا اور ماں انگلی پکڑ کر مجھے اپنے ملنے والوں کے یہاں لے جایا کرتی تھی اور ان کے ساتھ بیٹھ کر دیر تک باتیں کیا کرتی تھی، تب کچھ بڑی بوڑھیوں کی زبانی امراؤ جان کا نام میں نے پہلی بار سنا تھا اور یہ بھی سنا تھا کہ امراؤ جان کا واقعہ لکھنے کے بعد رسوا نے بہت سے لوگوں کو بتایا تھا کہ انہوں نے وہی لکھا ہے جو دیکھا ہے اور قصے میں جو کچھ بڑھایا ہے وہ قصے کو بڑھانے کے لئے ضروری تھا۔ اُس وقت میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا لیکن جب میں بڑا ہوا تو میرے بزرگوں نے جنہوں نے اپنے بزرگوں سے سن رکھا تھا، بتایا کہ رسوا نے اس کہانی کو الگ الگ طرح سے لکھا تھا اور انہیں الگ الگ طرح سے لکھی ہوئی کہانیوں میں سے ایک میں جس کا مسودہ رسوا کی موت کے بہت دن بعد لوگوں کے ہاتھ لگا، امراؤ جان کے یہاں ایک اولاد کا ہونا بتایا گیا تھا۔ جن لوگوں کے ہاتھ یہ مسودہ لگا انہیں اس سے آگے کا قصہ اس لئے نہیں معلوم کد آگے کی عبارتیں مٹ چکی تھیں لیکن کتاب کے ختم پر یہ عبارت محفوظ رہ گئی تھی: ”راقم نے اس نسخے کی ایک نقل اور تیار کی ہے۔“ اس کے بعد یہ ہدایت بھی تھی کہ جو کچھ میں نے اس میں لکھا ہے اسے عام نہ کیا جائے۔

رسوا کے لکھنؤ کا وہ علاقہ جہاں چھپی ہوئی کہانی کے مطابق خانم نے اپنے کوٹھے پر دوسرے شہر سے لائی جانے والی امراؤ جان کو معمولی داموں خریدا تھا، میرے گھر سے بہت دور نہیں ہے۔ اب یہاں کا نقشہ بہت بدل گیا ہے، پھر بھی اُن عمارتوں کے آثار اب بھی یہاں موجود ہیں جن کا ذکر امراؤ جان کے قصے میں کیا گیا ہے۔ کسی زمانے میں سب سے زیادہ بارونق رہنے والا یہ علاقہ لکھنؤ کے بیان میں طرح طرح سے بیان کیا جاتا رہا ہے۔ ان سب میں، سب جانتے ہیں سب سے زیادہ جیتا جاگتا نقشہ سرور نے اپنے فسانے میں کھینچا ہے۔ لیکن اس علاقے کی تصویر کھینچتے وقت وہ کوٹھے والیوں کے بیان سے خود کو بچالے گئے۔ ایسا اس لئے بھی ہو سکتا ہے کہ اُس وقت یہ کوٹھے نہ رہے ہوں اور رہے ہوں تو رسوا کے زمانے کی

طرح آباد نہ رہے ہوں۔ میں نے اپنے گھر کے بڑے بوڑھوں سے چوک کی جن ناپنے والیوں کا ذکر سنا تھا وہ رسوا ہی کے زمانے کی تھیں۔ اس زمانے میں کوٹھے پر جانا اور مشہور ناپنے والیوں کو اپنے گھر بلا کر اُن سے مجرا کرانا دولت مندوں کے مزاج میں شامل تھا۔ بعد میں اسی آنے جانے میں یہ بھی ہوا کہ ان صاحبانِ دولت کے گھروں پر خاک اڑنے لگی۔ جن ناپنے والیوں کے نام میں اپنے گھر میں آئے دن سنا کرتا تھا، ان میں کچھ نام بار بار لیے جاتے اور امراؤ جان کا نام ان سب میں سب سے پہلے لیا جاتا۔ پھر کچھ نام یوں آتے: الہی جان، بسم اللہ جان، گوہر جان، امیر جان، نسیم جان اور امانی جان وغیرہ۔..... گھر کے بزرگ جب ان ناموں کو لے رہے ہوتے تو میں ان کے پاس جا کر پوچھتا:

”یہ ہر ناپنے والی کے آگے جان کیوں لگا رہتا ہے۔“

جواب دینے کے بجائے وہ ہنس کر خاموش ہو جاتے۔ ہمارے گھر میں امراؤ جان کا نام یوں لیا جاتا جیسے وہ آج بھی چوک میں کہیں موجود ہوں۔ اُن کا ذکر کرتے وقت یہ ضرور بتایا جاتا کہ اُن کے جنازے میں بہت لوگ تھے اور وہ لکھنؤ کی فلاں کر بلا میں دفن ہیں اور اُن کی قبر کا پتھر فلاں کتبہ نویس نے لکھا تھا۔ امراؤ جان پر بات کرتے کرتے ان بزرگوں میں یہ بحث بھی چھڑ جاتی کہ لکھنؤ میں ایک نہیں دو امراؤ جان تھیں۔ ایک وہ جنہیں بہت کم لوگ جانتے تھے اور جو شہر سے باہر مجرے کرتی تھیں اور ایک وہ جو کوٹھے پر بھی ناچتی تھیں اور شہر سے باہر کی محفلوں میں بھی۔ لیکن ان میں سے زیادہ تر یہی کہتے کہ امراؤ جان ایک ہی تھیں اور یہ وہی تھیں جن کا فسانہ رسوا نے لکھا ہے۔

امراؤ جان کی رہائش والے جس علاقے کی بات میں آپ کو بتا رہا ہوں، انگریزوں کے جاتے جاتے وہ بہت بدل گیا تھا۔ اس چوک میں اب رسوا کے دنوں والے شاندار کوٹھے نہیں تھے اور نہ ان کوٹھوں پر وہ خوب روٹوائیں تھیں جو یہاں آنے والے رئیس زادوں سے پورے مجلسی آداب کے ساتھ پیش آتی تھیں۔ طلبوں کی تھاپ اور گھنگھروں کی جھنکار اب ان کوٹھوں پر کم کم سنائی دیتی تھی۔ یہاں کی رہنے والیاں مجروں کے لئے اب شہر سے باہر جانے لگی تھیں اور ان کے کوٹھوں پر وہ نو دولتے آنے لگے تھے جنہوں نے لکھنؤ کے بگڑے ہوئے رئیسوں کے اثاثے کوڑیوں کے مول ہتھیا لئے تھے۔

بتانے والے بتاتے ہیں کہ رسوانے وہ مسودہ جس میں انہوں نے امراؤ جان کے یہاں اولاد کا ہونا دکھایا تھا، اپنے صندوق میں اس لئے رکھ دیا تھا کہ انہیں معلوم تھا کہ پڑھنے والے امراؤ جان کو ماں کی شکل میں قبول نہیں کریں گے۔ اپنے بڑوں کے بڑوں سے منتقل ہوتی ہوئی یہ بات جب میرے کانوں تک پہنچی اور جب میں اسے سنتے سنتے بڑا ہوا تو میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ معلوم کروں کہ امراؤ جان کی اصل کہانی کیا وہی ہے جس کا مسودہ رسوانے الگ رکھ دیا تھا۔

○

چوک اور میرے محلے کے بیچ ایک چوڑی سڑک ہے جو آصف الدولہ کے امامباڑے کی پشت سے تال کٹورے تک کوئی پانچ میل کے فاصلے میں بالکل سیدھی چلی گئی ہے اور اس کے نصف سے زائد حصے میں وہی لکھنؤ آباد ہے جسے ہم اصل اور پرانا لکھنؤ کہتے ہیں۔ غدر کی تباہی کے بعد بننے والی پرانے طرز کی ساری عمارتیں، جن میں سے بیشتر اپنی پرانی شکلیں بدل چکی ہیں اسی سڑک کے دونوں طرف موجود ہیں۔ پرانی اور کمزور ہو جانے کے باوجود ان بلند وبالا عمارتوں کی شان میں اب بھی کوئی کمی نظر نہیں آتی۔

میں جس محلے میں رہتا ہوں اس کے بالکل سامنے سڑک پار کر کے وہ گلی شروع ہو جاتی ہے جسے چوک والی گلی کہا جاتا ہے۔ اس گلی میں داخل ہوتے ہی وہ مکان ملنے لگتے ہیں جن کا ذکر ہم بچپن سے سنتے آئے ہیں۔ گلی کے بائیں طرف ناچنے گانے والیاں رہتی ہیں اور داہنی طرف ایک وسیع اور کشادہ عمارت ہے جس کے اندر وہ کارخانہ ہے جس میں تیار کیا جانے والا عطر پورے ملک میں مشہور ہے اور بائیں طرف کے حصے کے بالکل بیچوں بیچ ایک دینی درسگاہ ہے۔ اسی گلی کے آخر میں ایک پرانی اور مخدوش عمارت میں انگریزوں کے زمانے کا ڈاک خانہ ہے جو عرف عام میں حنا پوسٹ آفس کے نام سے مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے اس کا یہ نام اس لیے پڑا کہ یہ ڈاکخانہ اسی عطر کے کارخانے کی تاجرانہ ضرورتوں کے لیے کھلوایا گیا تھا۔ اس گلی کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر دوسرے یا تیسرے مکان کے بعد والے مکان پر ایک تختی لگی رہتی ہے جس پر نمایاں حروف میں لکھا ہوتا ہے: ”بغیر اجازت اندر آنا منع ہے۔“ گلی

ختم ہوتے ہی ایک چھتہ ہے اور چھتے سے نکلتے ہی وہ پتلی سڑک آ جاتی ہے جو گول دروازے سے شروع ہو کر اکبری دروازے پر ختم ہوتی ہے۔ اس سڑک کے نصف حصے میں وہی کوٹھے آباد ہیں جن میں کسی زمانے میں مشہور ناچنے والیوں کے ٹھکانے تھے لیکن مجھے نہیں معلوم کہ ان ٹھکانوں کے بیچ منشی احمد حسین کا وہ ٹھکانہ کہاں تھا جہاں بیٹھ کر رسوا کے دوست شعر خوانی کیا کرتے تھے اور جہاں رسوا کو اپنے شعر پر امراؤ جان سے داد ملی تھی اور یہی داد ان کے لئے امراؤ جان سے دوبارہ ملنے کا وسیلہ بنی تھی۔ اسی تنگ سڑک پر تحسین علی خاں کی شان و شکوہ والی وہ مسجد بھی ہے جس کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے خدائے سخن میر، سعادت علی خاں کی سواری گزرتے وقت اپنی جگہ سے ہلے تک نہیں تھے اور ان کے اس عمل پر خشمگیں بادشاہ نے پوچھا تھا: ”یہ بے دماغ کون ہے۔“ کھانے پینے اور روزمرہ کے استعمال میں آنے والی چیزیں اپنی بدلی ہوئی طرزوں اور قسموں کے ساتھ اب بھی چوک کے اس بازار میں اسی طرح نظر آتی ہیں جیسی سرور کے بیان میں موجود ہیں۔ اس بازار میں چیزوں کی بہتات اور ان کی رنگارنگی کے بارے میں بہت پہلے آتش نے کہا تھا:

دل کو بغل میں مار کے لے تو چلے ہیں چوک
کہتی ہے کیا نگاہ خریدار دیکھئے



میرا آنا جانا چوک والی گلی میں بچپن ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ ماں ہر دوسرے تیسرے دن صبح ہوتے ہی رحیم کی دوکان سے نہاری اور کلچے لانے کے لئے مجھی کو بھیجتی اور گھر میں اسی کا ناشتہ کیا جاتا۔ گھر کے ناشتے کا یہ سامان لانے کے لئے میں جب بھی اس گلی سے گزرتا تو دینی مدرسے کے بعد والے مکانوں میں سے ایک بہت بوسیدہ مکان کی تاریک ڈیوڑھی میں بہت پرانے اور ہلتے ہوئے پایوں کے تخت پر بچھی اُجلی سی دبیز چادر پر گوری رنگت اور سبک ناک نقشے والی ایک ادھیڑ عمر عورت اپنے سامنے ایک کھلے پاندان کے ساتھ بیٹھی نظر آتی۔ اُسے دیکھ کر ایسا لگتا جیسے اس کا تعلق کسی رجواڑے سے ہو۔ میں جب بھی اس مکان کے سامنے سے گزرتا، اُس عورت کی طرف ضرور دیکھتا۔ اُس کے چہرے کی چمک، سلیقے سے پہنی ہوئی ساری اور کھلے ہوئے پاندان کے سامنے بیٹھنے کا شاہانہ انداز مجھے بہت اچھا معلوم ہوتا۔ ایک

دن جب میں اسے دیکھتا ہوں اس کے مکان کے سامنے سے گزر رہا تھا، اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا:

”صاحبزادے! کس طرف جا رہے ہیں؟“

اُس کے اس طرح اچانک پوچھنے پر میں ٹپٹا گیا پھر خود کو سنبھالتے ہوئے بولا:

”رحیم کی طرف، کلچے نہاری لینے۔“

”ایک کام میرا کر دیجئے گا۔“

”بتائیں۔“

”دو کلچے اور ایک آنے کی نہاری میرے لئے بھی لے لیجئے گا۔“ یہ کہہ کر اس نے مجھے

ایک پرانی ڈوپٹی دیتے ہوئے کہا: ”نہاری اس میں لے لیجئے گا۔“ پھر پوچھا:

”آپ کو برا تو نہیں لگا؟“

”جی بالکل نہیں، لے لوں گا۔“

پھر اس نے پاندان میں رکھی ہوئی ایک ڈبیا میں سے تین آنے نکال کر مجھے دیے۔ میں

ڈوپٹی اور پیسے لے کر آگے بڑھ گیا اور جب میں نے اس خاتون کی منگائی ہوئی چیزیں اسے

لا کر دیں تو اس نے بڑے پیار سے کہا: ”جیتے رہیے۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔“ پھر پوچھا:

”کہاں رہتے ہیں میاں؟“

”بنجاری ٹولے میں“ میں نے کہا۔ بزازے کے اندر امام باڑے کے پہلو والی گلی

میں۔“ یہ سن کر وہ کھسکی۔ پھر اس نے زیر لب دہرایا: ”بزازے کے اندر.....“ پھر پوچھا:

”جہاں استاد رحمت خلیفہ ستار نواز رہتے ہیں؟“

”جی نہیں وہ تو آگے کبوتر کے پھاٹک میں ہیں۔“

”اچھا تو جہاں سکندر رہتی ہیں، مشہور سوز خوان؟“

”جی نہیں وہاں بھی نہیں،“ میں نے کہا۔ پھر پوچھا: ”ریحانہ کو جانتی ہیں؟“

”وہ فلم والی؟“

”جی، انہیں کے مکان کے برابر۔“

یہ سن کر وہ کچھ دیر خاموش رہیں، پھر بولیں:

”ریحانہ تو پاکستان چلی گئی تھیں۔“
”جی مگر ان کی ماں شاہجہاں ابھی اسی مکان میں ہیں اور باہر والے حصے میں ان کی بڑی بہن رہتی ہیں، بیگم بائی۔“

”دونوں کو جانتی ہوں، میری ہی عمر کی ہیں۔“
”لیکن میں نے آپ کو ادھر کبھی دیکھا نہیں۔“ میں نے کہا۔
”صاحبزادے! صرف ایک سڑک پار کر کے اُس طرف جانا ہے، لیکن برسوں ہو گئے اسی ڈیوڑھی میں بیٹھے ہوئے۔“ یہ کہہ کر یوں بولیں جیسے مجھ سے نہیں خود سے کہہ رہی ہوں:
”ہم لوگ ایک ہی پیشے میں ہیں لیکن سالوں ایک دوسرے سے ملنا نہیں ہوتا۔“ پھر پوچھا:
”کیسی ہیں شاہجہاں؟“

”اچھی ہیں، لیکن اتنے بڑے مکان میں اکیلی رہتی ہیں۔“
یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اندر سے ایک بوڑھی عورت نکلی اور پانوں کی ایک دھلی ہوئی ڈولی ان خاتون کے پاندان کی تھالی پر رکھتے ہوئے بولی:
”یہ صاحبزادے کون ہیں؟“

”ادھر بزازے کے ہیں، بنجاری ٹولے کے۔ ادھر سے گزر رہے تھے میں نے آواز دے کر بلا لیا اور یہ کلچے نہاری انہیں سے منگوا لیے۔“

”بنجاری ٹولے کے؟“ وہ عورت بولی۔ پھر بولی: ”وہی جہاں شاہجہاں رہتی ہیں۔“
”ہاں ہاں وہیں کے۔ بتا رہے ہیں ریحانہ پاکستان چلی گئیں، شاہجہاں اکیلے اس مکان میں رہتی ہیں۔“

”سنا ہے ڈی نواب سے نکاح کر لیا ہے؟“
”یہ مجھے نہیں معلوم۔“ پہلے والی خاتون نے کہا۔ پھر اس عورت کی طرف دیکھتے ہوئے دبی زبان سے بولیں: ”پتہ نہیں بندی نے شراب چھوڑی یا نہیں۔ ایک زمانے میں بہت پینے لگی تھی۔“
”چھوڑی نہیں ہوگی۔ ایک بار مونہہ کو لگ جائے تو آسانی سے نہیں چھٹتی۔“ دوسری عورت بولی۔ پھر بولی: ”وہیں کہیں سکندر سوز خوان بھی رہتی ہیں۔“
”نہیں وہاں نہیں، کہیں اور رہتی ہیں۔ میں پوچھ چکی ہوں۔“ پہلی والی نے کہا۔

”غازی منڈی میں۔ وہ جو راستہ راجہ بازار کی طرف جاتا ہے اسی کے پہلو والی گلی میں۔“ میں نے سکندر سوز خوان کا پورا پتہ بتایا۔

”بڑا تیار گلا تھا۔ میں نے بہت سنی ہے ان کی سوز خوانی۔“ دوسری خاتون بولیں۔

”ہاں کیا مجال کوئی سر غلط لگ جائے۔“ پہلی والی نے کہا۔

یہ سن کر دوسری بولیں: ”اور تان، پلٹے اور گنگریوں کا تو کبھی استعمال ہی نہیں کیا۔“

”اسی لئے شرع شرع کی پابندی بیاں ان کا سوز ضرور سنتی تھیں۔“ پہلی والی نے کہا۔ پھر

بولیں: ”مذہباً جو چیزیں جائز نہیں تھیں، اپنی لجن میں کبھی نہیں لائیں۔“

ان دونوں کی گفتگو میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ کچھ دیر ٹھہر کر میں نے کہا:

”تو میں چلوں۔“

”جائیے صاحبزادے۔ خوش رہیے۔“ اس خاتون نے پانوں کی دھلی ہوئی ڈولی میں

سے دوپان نکال کر ان کی نمی کو ہتھیلی سے پونچھتے ہوئے کہا۔



اُس وقت میری عمر ایسی نہیں تھی کہ میں یہ باتیں آسانی سے سمجھ سکتا لیکن اتنا ضرور تھا کہ اس بوسیدہ مکان کی تاریک ڈیوڑھی میں بیٹھی ہوئی اچھے ناک نقشے والی وہ سن رسیدہ خاتون مجھے اچھی لگنے لگی تھیں۔ اب میں اس گلی سے آتے جاتے ان سے خود ہی پوچھ لیتا:

”کچھ منگنا تو نہیں؟“

کبھی کبھی اُن سے یہ پوچھتے ہوئے مجھے ڈر بھی لگتا کیونکہ بہت شروع سے میرے کانوں میں یہ بات پڑنے لگی تھی کہ اس گلی میں اچھی عورتیں نہیں رہتی ہیں۔ میرا یہ ڈر اس لئے اور بڑھ گیا تھا کہ اُن بوڑھی خاتون کے دروازے پر ”اجازت کے بغیر.....“ والی تختی نہیں لگی تھی۔ مجھے ڈر لگا رہتا کہ کسی شخص نے اُدھر سے گزرتے ہوئے مجھے اُن سے بات کرتے دیکھ لیا تو وہ مجھے بھی اچھا آدمی نہیں سمجھے گا۔ ایسی عورتوں کے بارے میں میرے گھر میں روز ہی باتیں ہوا کرتی تھیں اور میرے پڑوس میں ریحانہ کے آکر بس جانے پر ان لوگوں کو خوب برا بھلا کہا جاتا جنہوں نے ایک بڑی رقم لے کر ریحانہ کے ہاتھ اپنا حویلی نما مکان فروخت کر دیا تھا۔ اماں اکثر کہا کرتیں: ”ہمارے ہی پہلو میں آکر رہنا تھا! نہیں۔“

ہم سب کو اس مکان میں جانے سے روکا جاتا اور جب ہم یہ جاننا چاہتے کہ ایسا کیوں ہے تو بتایا جاتا وہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔ لیکن ریحانہ ہم سب کو اچھی لگتیں۔ ہم میں سے جب بھی وہ کسی کو باہر کھیلتا ہوا دیکھتیں مسکرا کر اپنی طرف بلا لیتیں۔ ہم دیکھتے کہ اماں دیکھ تو نہیں رہی ہیں اور جب یقین ہو جاتا کہ وہ آس پاس نہیں ہیں تو ہم ان کے پاس چلے جاتے۔ وہ ہمیں اچھی اچھی چیزیں کھلاتیں، پیاری پیاری باتیں کرتیں اور ان فلموں کی تصویریں اور پوسٹر دکھاتیں جن میں انہوں نے کام کیا تھا اور جب ہم پوچھتے یہ کیا ہے تو وہ بتاتیں:

”جب تم اور بڑے ہو گے اور بائیسکوپ دیکھنے جاؤ گے تو میں تمہیں وہاں چلتی پھرتی نظر آؤں گی۔“

میں پوچھتا یہ بائیسکوپ کیا ہوتا ہے؟

وہ کہتیں: ”بڑے ہو جاؤ گے تو سب معلوم ہو جائے گا۔“

ریحانہ یوں تو سال بھر غائب رہیں لیکن محرم کے دس دنوں میں اپنے گھر ضرور آتیں۔ نو محرم کو زنانی اور مردانی دو بڑی مجلسیں کرتیں۔ زنانی مجلس میں سکندر بڑی پرسوز آواز میں سوز پڑھتیں اور خود ریحانہ بڑی خوش الحنی کے ساتھ نوحے۔ دونوں مجلسوں میں شاندار تبرک تقسیم ہوتا جس کا شہرہ دور دور تک تھا۔

جب میں اور بڑا ہوا تو ریحانہ کے مکان کے وسیع اور کشادہ صحن میں ”کھیلوں“ کی ریہرسل ہوتے ہوئے بھی دیکھی۔ اس وقت سمجھ میں کچھ نہ آتا بس یہ دیکھتے کہ ادھر ریہرسل ہو رہی ہے اور ادھر گلی کے نلکے پر دفعتی کے بڑے بڑے بورڈ لگے ہیں جن پر لکھا ہوتا: ”فلاں دن فلاں جگہ کھیل“ ”اندر سبھا“ اور فلاں دن فلاں جگہ کھیل ”نیک پروین“ دکھایا جائے گا۔ یہ تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کھیل امانت اور آغا حشر کاشمیری کے تھے۔



چوک والی گلی میں رہنے والی خاتون کو پہلی بار میں نے اس وقت دیکھا تھا جب ان کی عمر پچاس یا پچپن کی رہی ہوگی۔ اس وقت میں دس یا بارہ سال کا تھا۔ اس زمانے میں ہر دوسرے تیسرے اس گلی سے میرا گزر ہوتا اور اگر وہ خاتون ڈیوڑھی میں بیٹھی ہوتی تو ان سے کچھ نہ کچھ بات چیت ضرور ہو جاتی۔ کچھ نہاری انہوں نے مجھ سے ایک۔ دو بار ہی منگوائے تھے اور یہ

شاید وہ موقع تھے جب ان کے گھر میں یہ چیزیں لانے والا کوئی اور نہیں تھا۔

اپنے آبائی محلے میں بہت دن رہنے کے بعد میری ماں نے وہ محلہ چھوڑ دیا اور ہم دور کے علاقے میں رہنے لگے۔ اب ہمارا چوک کی طرف آنا کم کم ہوتا اور اگر ہوتا بھی تو چوک والی گلی سے گزر نہ ہوتا۔ میری ماں کتابیں پڑھنے کی بہت شوقین تھیں اور بڑے ہوتے ہوتے میں نے بھی بہت کچھ پڑھ ڈالا تھا۔ لکھنؤ کی مشہور داستانیں جاڑے کی سردراتوں میں دہکتے ہوئے کونکوں سے بھری ہشت پہل انگلیٹھی کے گرد بیٹھ کر پہلے اماں کی زبانی سنیں پھر خود پڑھنا شروع کیں، پھر سرور اور آزاد کے فسانے پڑھے اور پھر ہاتھ آئی امراؤ جان۔ لیکن یہ ناول میں نے رک رک کر اور ٹھہر ٹھہر کر اس لئے پڑھی کہ اس کے بارے میں بچپن سے بہت کچھ سنتا آیا تھا اور اس بہت کچھ سنے ہوئے میں یہ بات سب سے زیادہ سنی تھی کہ رسوا نے امراؤ جان کے بہت سے مسودے تیار کئے تھے اور ان سب میں کہانی کو الگ الگ طرح سے ختم کیا تھا۔ چھپی ہوئی امراؤ جان پڑھنے کے بعد مجھے اس ناول کے اُس مسودے کی تلاش ہوئی جو رسوا کی موت کے بہت دن بعد لوگوں کے ہاتھ لگا اور جسے رسوا نے اس ڈر سے نہیں چھپوایا کہ امراؤ جان کے ماں بن جانے کی شکل میں یہ ناول مقبول نہیں ہوگی۔ میں اس مسودے کی تلاش میں کئی دن تک ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا، بہت سے عوامی اور ذاتی کتب خانوں میں گیا جہاں موجود پرانی کتابوں کے نسخوں اور مخطوطوں کو دیکھا لیکن وہ مسودہ ہاتھ نہیں آیا۔ جہاں جہاں جاتا یہی بتایا جاتا کہ ایسے مسودے کا ہونا ثابت ہے لیکن وہ کس کی تحویل میں ہے یہ نہیں معلوم۔ ایسے ہی کتاب خانوں کے مالکوں میں سے ایک نے بتایا:

”نادر آغا سے ملیے۔ وہ شاید کچھ بتا سکیں۔“

”یہ کون ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”نوادرات کا کام کرتے ہیں۔“ اُس نے کہا۔ پھر کہا: ”رجواڑوں اور رئیسوں کے پرانے سامان کی خبر رکھتے ہیں۔ جب وہاں چیزیں نکالی جاتی ہیں، خرید لاتے ہیں۔ آغا بڑے پارکھ ہیں سستے داموں خرید لیتے ہیں اور انہیں اور پرانا کر کے اونچے داموں نکالتے ہیں۔“

”رہتے کہاں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”کشمیری محلے سے جو سڑک درگاہ کی طرف جاتی ہے، اسی پر درگاہ سے کچھ پہلے داہنی

طرف ہے ان کا مکان۔“ یہ بتانے کے بعد بولا: ”وہاں پہنچ کر کسی سے بھی پوچھ لیجئے گا۔ اپنے کاروبار کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔“

دوسرے دن جب اس کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ کر میں نے ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا تو ایک شخص نے آگے بڑھ کر پوچھا:

”کسے ڈھونڈ رہے ہیں؟“

”نادر آغا صاحب کو، یہیں کہیں رہتے ہیں۔“

”وہ سامنے والا مکان انہیں کا ہے۔“ اس شخص نے ایک بوسیدہ مکان کی طرف جس کی دیواریں جگہ جگہ سے چٹخنی ہوئی تھیں، اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر پوچھا: ”کیوں آئے ہیں؟“

”کچھ کام ہے۔“

”کچھ خریدنا ہے؟“

”نہیں، خریدنا تو کچھ نہیں ہے کچھ پوچھنا ہے۔“

”کیا پوچھنا ہے؟“

اس کے یہ پوچھنے پر میں نے اسے اس طرح دیکھا جیسے کہنا چاہ رہا ہوں آپ کیا سمجھیں گے۔

”کیا پوچھنا ہے؟“ اس نے پھر پوچھا۔

”پرانی کتابوں کے بارے میں۔“

”وہ تو ان کے پاس بہت ہیں۔ اور بہت سی ایسی ہیں جو ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔“

یہ سن کر میں چونکا۔

”ہاتھ کی لکھی ہوئی؟“

”جی ہاتھ کی لکھی ہوئی۔“

”آپ نے دیکھی ہیں؟“

”بھانجا ہوں ان کا، سارا کام میں ہی دیکھتا ہوں۔“ اس نے کہا، پھر مجھے اپنے پیچھے

آنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا: ”آئیے میرے ساتھ۔“

پھر سامنے والے مکان پر پہنچ کر کنڈی کھٹکھٹاتے ہوئے آواز لگائی:

”ماموں جان! کوئی صاحب آئے ہیں، آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

تھوڑی دیر بعد اس دروازے سے ملا ہوا ایک دوسرا دروازہ کھلا اور اسی پچاسی برس کی عمر کے ایک سرخ و سپید شخص نے مجھے سر سے پیر تک سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا:
”فرمائیں۔“

میں نے انہیں مودبانہ سلام کرتے ہوئے کہا: ”کچھ پرانی کتابوں کے بارے میں.....“
میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے انہوں نے ایک طرف ہٹ کر سر کو ہلکا سا خم دیتے ہوئے کہا:
”تشریف لائیں۔“

— میں اندر داخل ہوا تو دیکھا ایک بڑے کمرے میں جو کبھی پیٹھکے کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہوگا، چاروں طرف تخت بچھے ہیں جن پر طرح طرح کے پرانے سامان قرینے سے رکھے ہیں۔ ان سامانوں میں نقشی پاندان، حقے، جریبیں، خاصدان اور سرمہ دانیاں۔ قد آدم آئینے، اگالداں، چکنیں، اچکنیں اور زرکار دوشالے، سلفجیاں، آفتابے، سماور اور میر فرش، بہت عمدہ نقاشی والے چینی کے برتن اور نایاب نگوں والی انگوٹھیاں تھیں۔ تختوں کے پیچھے لکڑی کی دو بڑی میزیں تھیں جن میں سے ایک پر موٹی موٹی جلدوں والی بہت سی جہازی ساز کی کتابیں اور دوسری پر چھوٹے بڑے ساز کی جلد اور بغیر جلد والی کتابیں رکھی تھیں۔ انہیں میزوں سے کچھ دور پر کرم خوردہ کتابوں کے کئی بنڈل رکھے ہوئے تھے۔ میں ان چیزوں کو دیکھ ہی رہا تھا کہ نادرا آغانے ایک پرانی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”تشریف رکھیں۔“

میں کرسی پر بیٹھا تو وہ بولے: ”بتائیں کن کتابوں کی تلاش ہے۔“
”جی مرزا رسوا کی امراؤ جان.....“ میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی وہ بول پڑے:
”وہ تو ہر جگہ مل جاتی ہے۔“

”جی نہیں۔ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے.....“ یہ کہہ کر میں کچھ دیر کے لئے رکا پھر
کہا: ”مرزا رسوا نے اس ناول کے کئی مسودے تیار کئے تھے۔“
”سنا تو میں نے بھی ہے۔“

”انہیں میں سے ایک میں انہوں نے امراؤ جان کو.....“ میں کہتے کہتے رکا۔

”امراؤ جان کو..... آگے کہیے۔“

”اولاد والا دکھایا ہے۔“

”تو.....“

”وہ مسودہ انہوں نے نہیں چھپوایا، اُسی کی مجھے تلاش ہے۔“

یہ سن کر نادرا آغا کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر بولے:

”آپ علی رضا صاحب سے ملیے۔ علن کی عرفیت سے مشہور ہیں۔ پرانی کتابوں کا کاروبار کرتے ہیں۔“ اتنا بتا کر آگے بتایا: ”نخاس میں ’ناظمیہ‘ کے پیچھے کمبوہ کے پھاٹک میں جہاں رحمت خلیفہ ستار نواز رہتے ہیں، وہیں رہتے ہیں، انہیں کے گھر سے ملا ہوا ہے ان کا گھر۔“ پھر بولے: ”مشہور شاعر ضامن علی جلال کے بھتیجے ہیں۔ چھپی اور بغیر چھپی کتابوں کا بڑا ذخیرہ انہیں اپنے اجداد سے ملا ہے۔“ پھر کچھ ٹھہر کر بولے: ”یہ جو سامنے میزوں پر کتابیں رکھی ہیں ان میں سے بہت سی میں انہیں سے لے کر آیا ہوں۔ وہاں جا کر دیکھیے شاید مل جائے۔“ پھر کہا: ”ویسے مجھے پرانی کتابوں کی خرید میں کوئی سراغ ملا تو آپ کو ضرور بتاؤں گا۔“ میں آغا کا شکریہ ادا کر کے اٹھنے لگا تو وہ بولے: ”بیٹھے ایک پیالی چائے پی کر جائیے۔“ یہ کہہ کر انہوں نے اپنے بھانجے کو چائے لانے کا اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا:

”لیکن آپ اُس مسودے کو کیوں ڈھونڈ رہے ہیں؟“

”میں جاننا چاہتا ہوں رسوا نے اس میں کہانی کس طرح ختم کی ہے۔“ میں نے کہا۔ پھر کہا: ”ابھی آپ ہی بتا رہے تھے، مرزا رسوا کے سارے کردار اصلی ہیں، اگر انہوں نے امراؤ جان کو اولاد والا دکھایا ہے تو ممکن ہے وہ اولاد ابھی زندہ ہو۔“

”یہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ بولے۔ پھر بولے: ”آپ کی عمر کے لوگوں میں کتابوں سے اتنی دلچسپی میں نے بہت کم دیکھی ہے۔“ پھر کہا: ”میرے پاس پچاس کے اوپر کی عمر کے لوگ آتے ہیں اور اب وہ بھی کبھی کبھی ہی آتے ہیں۔“ یہ کہنے کے بعد کہا: ”اسی لیے اب ڈھونڈ ڈھونڈ کر کتابیں لانا میں نے بند کر دیا ہے، ایسا لگتا ہے پڑھنے کا شوق لوگوں میں ختم ہو چکا ہے۔“ ”صحیح فرمایا۔ مگر مجھے تو پڑھنے کی لت بہت بچپن سے ہے۔ آپ شاید یقین نہ کریں پانچویں چھٹی جماعت تک آتے آتے بڑی کتابوں کے بارے میں میں نے بہت کچھ سن لیا تھا اور انہیں پڑھ بھی لیا تھا۔“

”یعنی۔“

”سارے مشہور قصے، داستانیں، آزاد کا فسانہ اور.....“

”اور.....؟“

”شرر کے ناول اور آبِ حیات وغیرہ۔“

جناب نواز

”جناب کا تعلق کس خانوادے سے ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”نائیہال حکیم میرن کی ہے اور دادیہال نیوتنی کے رئیس میر شوکت علی کی۔ لیکن پلا بڑھا اپنی

نائیہال میں ہوں۔“ میں نے کہا۔ پھر کہا: ”آپ نے مشہور حدیث خوان ذاکینہ بیگم کا نام سنا ہوگا۔“

”بالکل سنا ہے۔“

”وہ میری ماں تھیں۔“

آغا یہ سنتے ہی اُچھل پڑے، کھڑے ہو کر مجھے گلے سے لگالیا۔ پھر بولے:

”بہت عمدہ حدیث پڑھتی تھیں، بڑی پاٹ دار آواز تھی ان کی۔“

”جی۔“

”اور بیچ بیچ میں انیس کے بند بھی خوب چسپاں کرتی تھیں، برابر والے مکان میں کئی بار

پڑھنے آئیں۔“ انہوں نے بتایا۔ پھر بولے: ”مرثیہ کی پڑھت سے بھی خوب واقف تھیں۔“

”جی۔ سوز خوانی بھی بہت عمدہ کرتی تھیں۔“

”ضرور کرتی ہوں گی۔“ انہوں نے کہا۔ اب نہ مرثیہ پڑھنے والے رہ گئے ہیں نہ سوز

پڑھنے والے۔ اور سوز تو راگوں کو پوری طرح جانے بغیر پڑھا ہی نہیں جاسکتا۔“

”میری والدہ بھی یہی کہتی تھیں۔ بتاتی تھیں بعض سوز خوان سوز پڑھنے سے پہلے سننے

والوں کو یہ بھی بتاتے تھے اس کی بندش کس راگ میں ہے۔“

”آپ تو بچے ہیں ابھی۔ بہت سی باتیں ابھی تک نہ سنی ہوں گی آپ نے اور بہت سی

باتیں شاید آپ کی والدہ کے علم میں بھی نہ رہی ہوں۔“

”کون سی باتیں۔“

”واجد علی شاہ کے عہد میں ایک سوز خوان تھے مہدی خاں۔ نام سنا ہے آپ نے؟“

”جی نہیں۔“

”وہ جب سوز پڑھتے تھے تو پنجم اور نکھاد کے تینوں سُر اس خوبی سے لگتے تھے کہ

بادشاہ بے چین ہو کر بے ساختہ پکار اٹھتے: ”کیا رکھب لگی ہے۔ سننے والوں میں سے کوئی کہہ اٹھتا: واہ ری پنجم۔ کوئی حضرت بار بار نکھاد کے سر پر پھڑک جاتے۔“ آغا گردن جھکائے آنکھیں بند کیے بتاتے جا رہے تھے اور میں بغیر کچھ سمجھے ایسے سن رہا تھا جیسے سب کچھ سمجھ رہا ہوں۔ وہ جھوم جھوم کر کہتے جا رہے تھے: ”بہاگ کا سوز، بہاگ کے بعد جنگلا، پھر کافی، پھر ایمن کلیان..... معلوم ہوتا تھا ہر سوز میں آ کر راگنی نے جنم لیا ہے۔“ پھر ذرا ٹھہر کر بولے: ”یہ چیزیں آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔“ وہ خاموش ہوئے تو میں نے کہا:

”اب تو بس ایک رہ گئے ہیں جو فن سے واقف ہیں۔“
 ”کون؟“

”ہادی رضا صاحب، نواب اصغر علی خاں سوز خوان کے شاگرد۔“
 ”صحیح کہا آپ نے۔ نواسے ہیں ان کے، بہت اچھا گلا ہے لیکن اب آواز پھٹنے لگی ہے۔ ان کے نانا نے بڑی محنت سے سکھایا تھا انہیں۔“ انہوں نے کہا: ”بڑھ چھ سید رضی بھی اصغر علی خاں ہی کے شاگرد تھے۔ آٹھویں میں چپ تعزیے میں فجر کے وقت برسوں اپنی سوز خوانی سے لوگوں کو رالایا، لیکن اب بستر سے لگے ہیں۔ یہ کہہ کر بڑے افسوس کے ساتھ کہا: ”میر علی سوز خوان کا لکھنؤ سوز خوانوں سے خالی ہو رہا ہے۔“
 ”کون میر علی سوز خوان؟“

”سعادت علی خاں کے زمانے میں تھے۔ پوری عمر موسیقی میں صرف کی۔ اُس وقت نہ ان کا سا گلا تھا نہ ان کی سی لحن۔ یگانہ فن تھے اس لیے ذرا سی بات پر براہم ہو جاتے۔ سعادت علی خاں سے ملال ہوا تو لکھنؤ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔“ یہ بتانے کے بعد کچھ یاد کرتے ہوئے بولے: ”ایک خاتون بھی تھیں، سکندر وہ بھی راگوں سے خوب واقف تھیں۔ بڑا نام کمایا۔ نہیں معلوم زندہ ہیں یا.....“

”جی میرے پڑوس کی تھیں۔“
 ”تو کیا.....“

”دو برس پہلے انتقال کر گئیں۔“

یہ سن کر آغا نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا:

ع ”برہم ہے مرقع چمنستان جہاں کا“

پھر بولے: ”بہت کمال کی خاتون تھیں۔ مشہور طبلہ نواز آفاق حسین خاں انہیں کے

خاندان کے ہیں۔“

”جی اور کچھ راگ احمد جان تھر کو اسے بھی سیکھے تھے۔“

”اچھا یہ مجھے نہیں معلوم۔ اُن کا سا طبلہ نواز لکھنؤ میں کوئی اور نہیں ہوا۔“ آغا نے کہا۔ پھر

تعریفی نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے: ”یہی میں کہوں کہ ایسے مشکل راگوں

سے کیونکر واقف تھیں۔ اس کے پیچھے بڑے استادوں کا ہاتھ ہے۔“ پھر سراپا حیرت بن کر بتایا:

”اور جناب کمال تو یہ ہے کہ راگ ساگر کا بڑی خوبی سے استعمال کرتی تھیں۔“

میں نے ان کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو وہ بولے:

”بہت مشکل راگ ہے۔ سیکھنے میں ایک عمر گزر جاتی ہے۔“ وہ بولتے رہے، میں سنتا رہا:

”اس راگ میں بند کے ہر مصرعے کی بندش ایک الگ راگ میں ہوتی ہے۔“

یہ کہہ کر بولے: ”لیکن سکندر مشکل راگوں میں وہیں پڑھتی تھیں جہاں ان راگوں کو

سمجھنے والے ہوں۔“

”آپ کو یہ سب کیسے معلوم۔“ میں نے پوچھا۔

”اُن کے گھر والوں سے اچھی صاحب سلامت تھی میری۔ یہ ساری باتیں انہیں کی

زبانی سنیں ہیں..... اور کچھ میرے گھر کی بی بیوں نے بتائی ہیں۔“

نادر آغا نے اپنی بات ختم کی تو میں نے کہا:

”اب اجازت دیجیے۔ کل کمبوہ کے پھاٹک جا کر علن صاحب سے ملوں گا۔“

”ضرور ملیے۔ کچھ نہ کچھ ضرور معلوم ہوگا۔“

اور جب میں ان کے پیٹھکے سے نکلنے لگا تو ایک بار انہوں نے پھر کہا:

”کہیں کچھ معلوم ہوا تو ضرور بتاؤں گا۔“

○

اگلے دن میں علی رضا علن سے ملنے کمبوہ کے پھاٹک پہنچ گیا۔ پکی اینٹوں سے بنی نیم

بیضاوی شکل کی سیڑھیوں پر چڑھنے سے پہلے میں نے اس پھانک کو غور سے دیکھا۔ اس کے دونوں دروازے کئی ہاتھ اونچے تھے جن پر چھوٹے بڑے ستاروں کی شکل میں بہت عمدہ نقاشی کی گئی تھی۔ دونوں دروازوں کے دونوں کناروں پر لوہے کی موٹی کیلوں کو چھوٹے چھوٹے دائروں کی شکل میں بڑی خوبصورتی سے جڑا گیا تھا۔ ان دروازوں کے قلب میں لوہے کے بہت موٹے اور بہت بڑے کڑے پڑے ہوئے تھے۔ دروازوں کے تھوڑے تھوڑے حصے زمین میں دھنس گئے تھے جس کی وجہ سے وہ اپنی جگہ پر جم سے گئے تھے۔ ان تھوڑے تھوڑے دھنسے ہوئے دروازوں کو دیکھ کر میں نے سوچا جب یہ اپنی ٹھیک حالت میں رہے ہوں گے، اس وقت کئی لوگ مل کر انہیں کھولتے بند کرتے ہوں گے۔

یہاں آنے سے پہلے کسی نے مجھے بتایا تھا کہ اس علاقے میں کسی زمانے میں بخارے رہا کرتے تھے اور کمبوہ کے پھانک کا اندرونی حصہ ان بخاروں کے سردار کی ملکیت تھا۔ پھانک کا اندرونی حصہ ایک بڑی ڈیوڑھی سے شروع ہوتا تھا جس کے اوپر کے حصے میں بھی لوگ رہنے لگے تھے۔ اس ڈیوڑھی کے بعد کھلے ہوئے حصے میں دور تک ایک گلیارا تھا جس کے دونوں طرف مکان بنے تھے۔ میں جیسے ہی ڈیوڑھی میں داخل ہوا مجھے ستار کے بجنے کی آواز سنائی دی۔ پھر میں نے دیکھا میرے داہنی طرف ایک چھوٹے سے کمرے میں جس کے دروازے کھلے ہوئے تھے ایک شخص سنہری بٹنوں والا بہت اُجلا کرتا اور دھوتی پہنے پلتھی مارے بیٹھا ہے اور اس کے گلے سے کوئی راگ نکل رہا ہے اور اسی راگ کے سروں پر اس کی انگلیاں ستار کے تنے ہوئے تاروں پر تھکر رہی ہیں۔ اُسی شخص کے مقابل اجلی ساری پہنے ماتھے پر بندیا لگائے ایک جوان عورت ستار ہاتھوں میں لئے اسی شخص کی طرح وہی راگ اپنے گلے سے نکال رہی ہے اور اسی طرح راگ کے سروں پر ستار کے تاروں کو چھیڑ رہی ہے۔ میں اس شخص کو دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ یہ استادِ رحمت خلیفہ ہیں جو سامنے بیٹھی ہوئی اپنی چیلی کو کوئی راگ سکھا رہے ہیں۔

ستار نواز رحمت خلیفہ کی طرف سے نظر ہٹا کر میں نے بائیں طرف دیکھا تو ڈیوڑھی کے کنارے پر بنے ایک کمرے میں ساٹھ ستر برس کی عمر کا ایک شخص جس کے رخساروں سے خون ابلا پڑتا تھا، ایک میز کرسی لگائے بیٹھا ہے اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے مریضوں کی نبضیں دیکھ کر

اور ان کے حال پوچھ پوچھ کر نسخہ لکھ رہا ہے۔ پھر میری نگاہ کمرے کی باہری دیوار پر ٹنگے ہوئے ایک بڑے سے بورڈ پر پڑی جس پر جلی حروف میں لکھا تھا: ”ڈاکٹر متین قزلباش“ اور اس کے بعد کئی ڈگریوں کی تفصیل تھی پھر لکھا تھا: ”یہاں حکیمی اور ہومیو پیتھی دونوں طرح کے علاج ہوتے ہیں۔“ میں ابھی یہ بورڈ دیکھ ہی رہا تھا کہ داہنی طرف کے مکان سے جو شاید رحمت خلیفہ ستار نواز کا مکان تھا، ایک شخص نے نکل کر پوچھا:

”کسے ڈھونڈ رہے ہیں؟“

”علی رضا صاحب کا مکان اسی پھاٹک میں ہے؟“

”علیٰ صاحب؟“

”جی“

”آگے داہنی طرف انہیں کی ڈیوڑھی ہے۔“

میں نے دو قدم چل کر داہنی طرف کے ایک بڑے دروازے پر جس کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے، دستک دی لیکن اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔ میں نے پھر دستک دی لیکن پھر کوئی آواز نہیں آئی۔ اب میں دیوڑھی میں داخل ہوا اور اس دروازے کے قریب کھڑے ہو کر جس سے گزر کر گھر کے اندر جایا جاتا تھا بڑے شائستہ لہجے میں صاحب کے لفظ کو کہتے ہوئے آواز لگائی:

”جناب علی رضا صاحب۔“

جواباً اندر سے ایک نسوانی آواز آئی: ”کون صاحب ہیں؟“

”علی رضا صاحب تشریف رکھتے ہیں۔“ میں نے اُس آواز کے جواب میں پوچھا۔

وہی آواز پھر آئی: ”علیٰ چچا، آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔“

کچھ دیر بعد ایک سن رسیدہ شخص جس کی آنکھوں پر چڑھی ہوئی عینک میں کمانیوں کے بجائے ڈوریاں بندھی ہوئی تھیں، برآمد ہوا اور میرے قریب آ کر اپنی عینک پر اپنے داہنے ہاتھ کی ہتھیلی کی چھت بناتے ہوئے پوچھا: ”فرمائیں! کہاں سے تشریف لائے ہیں۔“

”یہیں قریب کے محلے سے حاضر ہوا ہوں۔“ میں نے انہیں سلام کرتے ہوئے کہا۔

”کیسے آنا ہوا؟“ انہوں نے پوچھا۔

”نادرا آغا صاحب جو نوادرات کا کام کرتے ہیں، انہوں نے آپ سے ملنے کے لئے کہا ہے۔“

”کیوں؟“

”آپ کے پاس بڑی نایاب کتابیں ہیں۔“

”ناایاب کیا، بس کتابیں ہیں۔ کچھ میرے پاس ہیں، کچھ ادھر ادھر سے جمع کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر ر کے پھر بولے: ”کتابوں کے شوقینوں کے ہاتھ انہیں بیچ لیتا ہوں، اُسی سے دال روٹی چلتی ہے۔“ پھر ذرا ٹھہر کر بولے: ”ذرا ر کیے پردہ کرا لوں، اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے وہیں سے کھڑے کھڑے آواز لگائی: ”ناجو بہن! ذرا پردہ کر لو۔ دالان کی طرف جانا ہے۔“

کچھ دیر بعد آواز آئی: ”پردہ ہو گیا ہے نکل جائیے۔“

یہ آواز سن کر علین صاحب نے مجھ سے کہا: ”آئیے۔“

میں ان کے پیچھے پیچھے اپنی نظریں جھکائے ایک کشادہ صحن سے گزرتا ہوا اس دالان میں پہنچا جو کئی مکینوں والے اس گھر میں علین صاحب کا ٹھکانہ تھا۔ دالان میں ہر طرف کتابیں بکھری ہوئی تھیں اور ایک بڑے تخت کے چاروں کناروں پر موٹی موٹی کتابیں لگی ہوئی تھیں۔ بیچ کی جگہ خالی تھی جس میں ایک دو کتابیں ایسے کھلی ہوئی تھیں جیسے ان کی ورق گردانی ابھی جاری ہو۔ علین صاحب نے تخت کے قریب رکھے ہوئے باندھوں سے بنے ایک مونڈھے کو میرے آگے بڑھاتے ہوئے کہا: ”بیٹھیے۔“ اور خود تخت کے بیچ کی اس خالی جگہ میں جا کر بیٹھ گئے اور کھلی ہوئی کتابوں میں نشانیاں لگا کر انہیں بند کرتے ہوئے بولے: ”بتائیے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

”بات یہ ہے کہ.....“ میں رکا پھر بولا: ”لکھنؤ میں ایک بات مرزا رسوا کی ناول امراؤ جان کے بارے میں.....“ میں پھر رکا..... ”بہت زمانے سے کہی جا رہی ہے۔“

”وہ کیا؟“

”یہ ناول انہوں نے کئی مرتبہ لکھی تھی اور الگ الگ طرح سے لکھی تھی۔“

”صحیح کہا آپ نے۔ میرے چچا ضامن علی جلال بھی یہی کہا کرتے تھے۔“

”انہیں الگ الگ لکھے ہوئے مسودوں میں سے ایک میں انہوں نے.....“

”امراؤ جان کو ماں بنا دیا ہے۔“ علین میاں نے میرا جملہ پورا کرتے ہوئے کہا۔ پھر بولے:

”لیکن وہ مسودہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ کسی زمانے میں کسی کے ہاتھ لگا تھا، اب کس کی

ملکیت ہے، مجھے نہیں معلوم۔“ پھر پوچھا:

”آپ نے کہاں کہاں تلاش کیا؟“

”لکھنؤ میں جتنے کتاب خانے ہیں، سب کو دیکھ چکا ہوں اور جن لوگوں کے پاس پرانی کتابیں ہیں، ان سے بھی معلوم کر چکا ہوں۔ کہیں کامیابی نہیں ملی۔“

”میں نے اب تک آپ کا نام نہیں پوچھا، جناب کا اسم گرامی۔“

”علی حیدر۔“

”اور جناب کی رہائش؟“

”یہیں قریب میں رہتا ہوں۔ حدیث خوان ذاکیہ بیگم میری والدہ ہیں۔“

”اچھا تو جناب بزازے کے ہیں۔“ علن میاں کا جملہ جیسے ہی ختم ہوا پردے کے پیچھے

سے نحیف سی آواز میں کسی نے پوچھا:

”یہ ذاکیہ بیگم کے لڑکے ہیں؟“

”ہاں علی حیدر نام ہے ان کا۔“

”تو ان سے کیا پردہ؟“ یہ کہتے ہوئے اسی کی عمر کی ایک خاتون جن کی کمرپوری

طرح جھکی ہوئی تھی چادر سر پر ڈالے پردے کے پیچھے سے برآمد ہوئیں اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولیں:

”ذاکیہ بیگم کے لڑکے ہو۔“

”جی۔“ میں نے مونڈھے سے اٹھ کر انہیں سلام کرتے ہوئے کہا۔

”ہمارے عزیزوں میں ہو، قریبی عزیزوں میں۔ ایک دوسرے سے ملتے رہو تو رشتے داریاں

معلوم رہیں۔“ انہوں نے کہا۔ پھر بولیں: ”نئی عمر کے بچے اپنے عزیزوں کو جانتے ہی نہیں۔“

پھر کسی کو آواز دے کر کہا: ”بیٹیا! شربت بنالونیو کا۔ بازار سے تھوڑی سی برف بھی منگوا لو۔“ یہ

کہہ کر علن میاں سے بولیں:

”نہ خود پنکھا جھل رہے ہو، نہ انہیں جھلنے کے لئے دے رہے ہو۔“ پھر میری طرف مونہہ

کر کے بولیں: ”کتابوں میں پاگل رہتے ہیں۔ لیٹے ہیں تو پڑھ رہے ہیں، بیٹھے ہیں تو پڑھ

رہے ہیں۔ خدا معلوم کیا ڈھونڈتے رہتے ہیں ان چھپی اور بے چھپی کتابوں میں۔“

خدا معلوم خدا معلوم ✓ ۲۷

ان کی یہ باتیں سن کر علن میاں میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔ کچھ دیر چپ رہے پھر کہا:
 ”میں پرانے رئیسوں کے گھروں سے بہت کتابیں لایا ہوں۔ مرزا کی پہلی
 اشاعت والی ساری کتابیں تھیں میرے پاس بلکہ ان میں سے ایک دو شاید اب بھی ان
 میں کہیں پڑی ہوں۔“ انہوں نے اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی کتابوں کی طرف اشارہ کرتے
 ہوئے کہا۔ پھر کہا: ”اب رؤسا کے ذخیرے بھی ختم ہو چکے ہیں۔ بہت سوں نے جنہیں
 کتابوں کی پہچان نہیں تھی کباڑ میں ردی کے بھاؤ نکال دیں۔ کیسی کیسی عمدہ کتابیں
 تھیں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

”آپ نے ان کتابوں کو دیکھا تھا؟“

”نہیں، دیکھا نہیں تھا۔“

پھر آپ کو کیسے معلوم وہ عمدہ کتابیں تھیں۔

”میاں! اودھ کے شاہی کتب خانے میں دور دور سے کتابیں منگوا کر جمع کی جاتی تھیں۔
 غدر میں یہ کتابیں بری طرح برباد ہوئیں۔ جو برباد ہونے سے بچ گئیں وہ ڈھیر لگا کر نافہموں نے
 اونے پونے بیچ دیں۔“ ابھی وہ یہ بتا ہی رہے تھے کہ اندر سے آواز آئی: ”ماموں جان شربت۔“
 علن میاں اپنی جگہ سے اٹھے۔ تخت کے نیچے رکھی ہوئی اپنی جوتیوں کو سیدھا
 کر کے پہنا اور شربت لا کر ایک گلاس مجھے دیا، ایک دالان میں بیٹھی ہوئی اُن بوڑھی
 خاتون کو، اور ایک گلاس لے کر تخت کے بیچ والی اسی جگہ پر جا کر بیٹھ گئے جہاں بیٹھے
 تھے، بیٹھتے ہی بولے:

”جی تو کیا کہہ رہا تھا میں۔“

”ردی کے بھاؤ.....“

جی، آپ تو بہت چھوٹے ہیں، آپ نے شاید نہ دیکھا ہو، میرے بڑے بھائی
 حیدر رضا نے ایک گشتی کتب خانہ قائم کیا تھا۔ یہ کہہ کر وہ رُکے، شربت کا ایک گھونٹ لیا
 پھر بولے: ”بڑی نایاب کتابیں ہوا کرتی تھیں اس میں..... قصے، ناول، داستانیں،
 شعراء کے دیوان، انیس و دہیر کے مراٹھی اور اودھ اور مغلیہ سلطنتوں کی تاریخیں۔ سب
 تھیں اس میں۔ جو کتابیں ان کے پاس نہ ہوتیں وہ منشی نولکشور کے چھاپے خانے سے

لے آتے۔“ اتنا کہہ کر اچانک مجھ سے پوچھا:
”آپ نو لکشور کی طرف گئے تھے؟“

”گیا تھا۔“ میں نے کہا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہتا، وہ بولے:
”اب ان لوگوں نے فروخت بند کر دی ہے، ایک جگہ پر کتابوں کا ڈھیر لگا دیا ہے، اسی
میں سے اپنے مطلب کی کتاب نکال لیجئے اور پیسے دے کر لے آئیے۔“ وہ ر کے تو میں نے کہا:
”میں گیا تھا۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں وہاں کتابیں اب نہیں بکتیں۔“ پھر بتایا: ”مسودہ بھی کسی
کتاب کا نہیں ہے ان کے پاس۔ اور مرزا صاحب کے مسودے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا جب
انہوں نے اسے باہر نکالا ہی نہیں تو چھاپے خانے پہنچے گا کیسے۔“

”صحیح کہا آپ نے۔“ علقن میاں نے کہا۔ پھر اپنے کانوں کے گرد لپٹی ہوئی ڈوریاں کھول
کر عینک کو اپنے سامنے رکھی ہوئی ایک بند کتاب پر رکھا اور اپنی پیشانی کو اپنی انگلیوں اور اپنے
انگوٹھے سے بار بار دباتے ہوئے کچھ سوچنا شروع کیا پھر اچھل پڑنے والے انداز میں بولے:
”ارے ہاں۔ آپ کھجورے گئے تھے، ناصر یہ ناصر الملت کا جمع کیا ہوا بہت عمدہ ذخیرہ
ہے اس کتاب خانے میں۔ ایک سے ایک نایاب کتابیں ہیں۔“ پھر یوں بولے جیسے اپنے
آپ سے مخاطب ہوں: ”مگر نہیں وہاں تو مرزا صاحب کی مذہب اور فلسفے والی کتابیں ہیں۔“
پھر کہا: ”میرادل کہتا ہے وہ مسودہ کہیں نہ کہیں موجود ہے اور کسی نہ کسی دن ملے گا ضرور۔“ پھر
کچھ دیر تک سوچنے والے انداز میں میری طرف دیکھتے رہے پھر اپنی انگلیاں کھولنا اور بند کرنا
شروع کر دیں اور اسی کے ساتھ ہوں..... نہیں وہاں نہیں..... ہوں..... وہاں بھی نہیں کے
فقرے زیر لب کہتے ہوئے مجھ سے بولے:

”ہاں آپ پرنس سرتاج مرزا سے ملیے۔“
”یہ کون ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”کنگھی والی گلی میں جہاں جلی خورشید رہتی ہیں، وہیں رہتے ہیں۔“
”کون جلی خورشید۔ وہ پتنگ باز؟“

”جی جی۔ پتنگ لڑانے والی اکیلی وہی تو عورت ہیں لکھنؤ میں۔ اچھے اچھے پتنگ باز
ان کے آگے بیچ ہیں۔“ انہوں نے کہا۔ پھر پوچھا: ”آپ نے مرزا صاحب کی تصنیف

’اختری بیگم پڑھی ہے؟‘

’جی پڑھی ہے۔‘

’اس میں جو خورشید مرزا صاحب ہیں، پرنس سرتاج مرزا انہیں کے خاندان کے ہیں۔‘

پھر بولے: ’’خورشید مرزا، ہادی صاحب رسوا کے بہت قریبی عزیز تھے۔ میرے والد کہا کرتے تھے مرزا صاحب نے جتنی بھی ناویں لکھی ہیں، ان سب کے کردار اصلی ہیں، بس انہوں نے کچھ کچھ بدل دیا ہے اس میں۔‘‘ یہ بتانے کے بعد کہا: ’’آپ پرنس سرتاج مرزا کے پاس جائیں، وہی اس بابت کچھ بتا سکتے ہیں۔‘‘ پھر مجھ سے کہا:

’اس ناچیز سے بھی ملتے رہیں۔ ہو سکتا ہے کہیں سے مجھے بھی کچھ معلوم ہو جائے۔‘
’جی بالکل ملتا رہوں گا۔ کل انشاء اللہ کنگھی والی گلی جاؤں گا اور کچھ معلوم ہوا تو آپ کو ضرور بتاؤں گا۔‘ یہ کہہ کر میں عین میاں کو سلام کر کے اُن کے مکان سے باہر نکل آیا۔

○

دوسرے دن کنگھی والی گلی پہنچ کر میں نے پرنس سرتاج مرزا کے دروازے پر دستک دی تو بہت گورے رنگ کے اچھی صورت شکل والے ایک شخص نے دروازہ کھول کر مجھے سر سے پیر

تک دیکھتے ہوئے پوچھا: ’’فرمائیے، کس سے ملنا ہے؟‘‘ جتنی دیر افسس سرتاج صاحب

’سرتاج مرزا صاحب سے، آپ ہی ہیں۔‘ ان میں سے سلام و آداب میں

’جی میں ہی ہوں، فرمائیں۔‘

’آپ سے کچھ معلوم کرنا ہے۔‘

’کس بارے میں؟‘

’مرزا ہادی رسوا کے.....‘

میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے وہ بولے: ’’آپ ذرا رکیں میں ابھی حاضر ہوا۔‘‘ یہ کہہ کر

وہ اندر گئے اور کچھ دیر بعد اپنی بیٹھک کا دروازہ کھول کر مجھے اندر بلاتے ہوئے کہا:

’تشریف لائیں۔‘

اُن کی بیٹھک میں شیشم کی لکڑی کا ایک بہت پرانا صوفہ پڑا تھا جس پر رکھے ہوئے

ٹیرے ترچھے گدوں کو پرنس سرتاج مرزا نے میرے بیٹھنے سے پہلے ٹھیک کیا۔ صوفے پر گرد کی

جہیں جی ہوئی تھیں۔ بیچ کی جگہ میں شیشم ہی کی لکڑی کی ایک گول میز تھی جس پر بہت اچھی سی کڑھائی والا ایک میلا سا میز پوش پڑا تھا۔ بیٹھک کی دیواروں میں بڑے بڑے محراب دار طاق تھے جن کے باہری کناروں پر عمدہ قسم کی نقاشی کی گئی تھی۔ ان بہت سے طاقوں میں سے ایک دو میں باریک شیشے کے خاک آلودہ گلدان رکھے تھے جن میں رنگ برنگے کاندوزوں کے پھول سجے ہوئے تھے اور فرش پر جگہ جگہ سے پھٹا ہوا خوشنما بوٹوں والا ایک بہت پرانا قالین پڑا تھا۔ پرنس سرتاج مرزا نے مجھے صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا:

”جی اب بتائیں کیا معلوم کرنا ہے؟“

”آپ کا تعلق خورشید مرزا کے خاندان سے ہے؟“

”جی ہے تو۔“

”وہ مرزار سوا کے قریبی عزیز تھے۔“

”جی، تھے تو۔“

”تو آپ مرزار سوا کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہوں گے۔“

”بہت کچھ تو نہیں بس اتنا جانتا ہوں بہت پڑھے لکھے شخص تھے اور بہت سی کتابیں لکھی تھیں۔ یہ کہہ کر بولے: ”خاندان میں برابر ان کا ذکر ہوتا تھا اور ان کی ناول امراؤ جان کا ذکر تو روز ہی ہوتا تھا۔“

”اُسی کے بارے میں معلوم کرنا ہے۔“

”کیا معلوم کرنا ہے؟“

”انہوں نے اس ناول کو کئی بار لکھا تھا۔ مطلب یہ کہ اس کے کئی مسودے تیار کیے تھے۔“

”یہ بات اڑتے پڑتے سنی تو میں نے بھی ہے۔“

”انہیں میں سے ایک میں انہوں نے امراؤ جان کے یہاں ایک اولاد کا ہونا دکھایا ہے۔“

”جی تو؟“

”مجھے اسی مسودے کی تلاش ہے۔“

”وہ کیوں؟“

”آپ علی رضا صاحب، علن میاں کو جانتے ہیں۔ کبوتر کے پھانک میں رہتے ہیں۔“

”جانتا ہوں۔“

”میں کل ان سے ملا تھا، انہوں نے ہی آپ کے پاس بھیجا ہے۔“ یہ بتا کر میں نے انہیں بتایا:

”وہ بتا رہے تھے مرزا صاحب کی ناولوں کے زیادہ تر لوگ ان کے ارد گرد کے ہیں یا ان کے خاندان کے۔ انہیں میں آپ کے بزرگ خورشید مرزا بھی تھے۔“

”جی مرزا صاحب کے ایک ناول میں وہ موجود ہیں۔“

آپ نے ابھی پوچھا تھا مجھے اس مسودے کی تلاش کیوں ہے؟“

”جی۔“

”بات یہ ہے کہ جس مسودے میں انہوں نے امراؤ جان کو اولاد والا بتایا ہے۔“ میں نے کہا۔ پھر انہیں بتایا: ”اگر وہ مل جائے تو پتہ چل جائے کہ ان کی اولاد کون تھی اور اگر وہ اولاد ابھی زندہ ہے تو لکھنؤ میں کہیں نہ کہیں موجود ہوگی۔“

”ایسا کوئی مسودہ میری نظر سے نہیں گزرا، نہ مجھے اس کا علم ہے۔“ انہوں نے کہا۔ پھر کہا:

”میں نے تو ان کی چھپی ہوئی کتاب پڑھی ہے اور وہی سب نے پڑھی ہے۔“

پرنس یہ کہہ ہی رہے تھے کہ اندر سے کھنکھارنے کی آواز آئی۔ پرنس سرتاج مرزا یہ آواز سن کر اندر گئے اور تھوڑی دیر بعد لہر دار کناروں والی تانبے کی ایک گول کشتی میں رکھے ہوئے فالے کے شربت کے دو گلاس لے کر برآمد ہوئے اور ایک گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے:

”نوش فرمائیں۔“

پھر انہوں نے کشتی میں سے اپنا گلاس اٹھایا اور شربت کا ایک گھونٹ لے کر کہنا شروع کیا:

”سرائے معالیٰ خاں میں خورشید مرزا کی بہت بڑی حویلی تھی اور یہ حویلی ویسی ہی تھی

جیسی مرزا رسوا نے ”اختری بیگم“ میں دکھائی ہے۔ برسوں پہلے اس کے حصے کرنا شروع ہو گئے

تھے۔“ پرنس سرتاج مرزا شربت کے گھونٹ لے لے کر بتاتے رہے: ”خورشید مرزا کی زرینہ

اولاد کوئی نہیں تھی۔ میری والدہ بتاتی تھیں ان کے دامادوں نے پوری حویلی بیچ کھائی اور

خریدنے والوں نے اس کو بالکل بدل دیا۔ خورشید مرزا ہمارے دادا کے بھائی تھے۔“ پرنس

بولتے رہے: ”ان کے خاندان کے لوگ رفتہ رفتہ ادھر ادھر ہو گئے۔ اور اب سالوں میں کہیں

کسی کے بارے میں کچھ معلوم ہوتا ہے تو اس سے ملاقات ہو جاتی ہے۔“
”ایسے کسی شخص سے آپ کی آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟“
”دو سال پہلے۔“

”کہاں؟“

”مشک گنج میں۔ وہ جو راستہ سٹی اسٹیشن کی طرف سے اقبال منزل ہوتا ہوا آیا ہے، اسی پر
بائیں جانب گلی میں داخل ہوں۔ آگے ایک چوڑا راستہ ہے، وہیں ایک بہت بڑی حویلی ہے.....“
”خاقان منزل کی پشت پر؟“

”اُدھر سے بھی ایک راستہ ہے، اسی میں اکیلی رہتی ہیں وہ۔ جہاں دارنیگم نام ہے ان کا۔
اسی پچاسی کی ہوں گی۔“ یہ بتا کر بولے: ”پتہ نہیں زندہ بھی ہیں یا..... وہی کچھ بتا سکتی ہیں۔“
”جہاں دارنیگم! یہ نام تو سنا ہوا ہے۔“

”ضرور سنا ہوا ہوگا۔ ان کا شمار لکھنؤ کے بڑے رئیسوں میں ہوتا ہے۔“

”اُن کا تعلق تو میرے خاندان سے بھی ہے۔“

”تو انہیں سے معلوم کیجئے۔ بشرطیکہ وہ زندہ ہوں۔“ پھر بولے: ”بات میرے علم میں
آئی ہے تو میں بھی معلوم کروں گا۔“

”بہت بہت شکریہ۔“ میں نے شربت کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

”نہیں شکریے کی کوئی بات نہیں۔“ پرنس بولے۔ ”بات تو جب تھی جب آپ کو پوری
بات معلوم ہو جاتی۔“ پھر بولے: ”آپ کو میں نے کہیں دیکھا ہے۔“
”میں یہاں سے کچھ ہی دور پر رہتا ہوں۔“

”کہاں؟“

”پھانک مرزا منعم بخت، جہاں ریحانہ رہتی تھیں۔ مشہور اداکارہ۔“

”وہ جو مدرسہ ہے ناظمیہ اسی کے برابر والی گلی؟“

”جی وہیں۔“

”آپ اتوار کو یا کسی چھٹی کے دن آئیں تو ذرا تفصیل سے بات ہو۔“ پرنس نے کہا۔
”اُس وقت تو میں دفتر کے لئے نکل رہا ہوں۔“

”معاف کیجئے گا میں غلط وقت پر آ گیا۔“
 ”نہیں ایسی کوئی بات نہیں، آپ مشک گنج جا کر جہاں دار بیگم سے ملیے۔ شاید کچھ پتہ چلے۔“
 ”بالکل ملوں گا۔“ میں نے کہا اور سرتاج مرزا سے رخصت ہو کر اپنے ٹھکانے پر چلا آیا۔

○

”جہاں دار بیگم! یہ نام اکثر لیا جاتا تھا میرے گھر میں۔“ میں نے گلی سے نکلتے نکلتے سوچا۔ ماں ان کے گھر حدیث پڑھنے جایا کرتی تھیں اور بتاتی تھیں وہ ان کی عزیز ہیں۔ گھر کی طرف آتے آتے میں نے طے کیا کہ دو ایک دن بعد ان کی طرف جاؤں گا۔

○

جہاں دار بیگم کی طرف جانے سے قبل میں نے اس مسودے کے بارے میں کچھ اور لوگوں سے معلوم کیا، ان لوگوں نے کچھ اور کتاب خانوں کے نام بتائے۔ انہیں میں سے ایک صاحب نے بڑے یقین سے کہا:

”آپ راجہ صاحب کے یہاں جائیں، وہاں مل سکتا ہے۔“

”کون راجہ صاحب؟“

”محمود آباد، راجہ صاحب محمود آباد، بہت بڑا کتاب خانہ ہے ان کا۔“

اور اس سے پہلے کہ میں ان صاحب سے کچھ کہتا انہیں کے ساتھ کے ایک شخص نے کہا:

”وہاں نہیں ہے۔“

”یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔“ پہلے والے صاحب بولے۔

”ان کے یہاں جو کتاب دار ہیں، اُن سے میری اچھی پہچان ہے، میں نے اس کتاب خانے کی ساری فہرستیں دیکھی ہیں، ایسا کوئی مسودہ ان میں سے کسی فہرست میں نہیں ہے۔“ اس شخص نے کہا۔ پھر کہا: ”اپنے اطمینان کے لئے آپ دونوں جگہ دیکھ لیں، لکھنؤ میں بھی اور محمود آباد میں بھی۔“

”نہیں اگر کتاب خانے کی فہرست میں نہیں ہے تو جانا فضول ہے۔“

”ان کے یہاں، جب بھی انہیں کوئی پرانی کتاب یا مسودہ ملتا ہے، فہرست میں درج ہو جاتا ہے۔ میں وہ فہرست برابر دیکھتا رہتا ہوں۔“ وہ شخص بولا۔ پھر پہلے والے صاحب کی طرف دیکھتے

ہوئے کہا: ”اسی لئے اتنے یقین سے کہہ رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر میری طرف دیکھ کر بولا:
 ”ایسی قلمی کتاب مرزا صاحب کے خاندان ہی میں کسی کے پاس ہو سکتی ہے۔ آپ پہلے
 یہ پتہ لگائیں لکھنؤ میں ان کے خاندان کے لوگ کہاں ہیں، اگر وہ لوگ مل جائیں تو انہیں سے
 معلوم کریں۔“

”آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ اب یہی کروں گا۔“

جسکے
 سر پر
 تھکا

○

اگلی صبح جب دن کی روشنی پوری طرح پھیل چکی، میں جہاں دار بیگم کی حویلی کی طرف چل
 پڑا۔ پرنس سرتاج مرزا کے بتائے ہوئے راستے سے ہوتا ہوا جب میں وہاں پہنچا تو کسی سے
 پوچھے بغیر وہ حویلی مجھے نظر آ گئی۔ حویلی کیا ایک چھوٹا موٹا محل تھا جس کی بہت بڑی ڈیوڑھی کا
 بڑا حصہ ڈھے چکا تھا لیکن ڈیوڑھی کے پوری طرح کھلے ہوئے دروازے بجی رہ گئی دیواروں
 میں پیوست اپنے مضبوط قبضوں کی وجہ سے کسی نہ کسی طرح اپنی جگہ ٹکے ہوئے تھے۔ میں
 ڈیوڑھی کے اس حصے میں جس پر چھت ابھی سلامت تھی اور جس کے تین طرف پردے پڑے
 ہوئے تھے، کھڑا یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اپنے آنے کی خبر اندر کس طرح بھجواؤں کہ پردے کے
 پیچھے سے کسی خاتون نے پوچھا:

”کس سے ملنا ہے؟“

”بیگم صاحبہ سے۔“

”کہاں سے آئے ہیں؟“

”بزازے سے۔“

”کیا بتادیں۔“

”کہہ دیجئے حدیث خوان ذاکیہ بیگم کے لڑکے آئے ہیں، آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”آپ ذرا ادھر ہٹ کر کھڑے ہو جائیں، میں اندر جا کر بتاتی ہوں۔“

کافی دیر بعد ایک میلی چادر سے اپنے جسم اور چہرے کو چھپائے وہ عورت ایک نو عمر لڑکی
 کے ساتھ واپس آئی اور اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی:

”اس کے ساتھ چلے جائیے۔“

میں اس لڑکی کے پیچھے پیچھے حویلی کی چہار دیواری میں داخل ہوا۔ اندر بہت دور تک کھلا ہوا حصہ تھا جس کے ایک طرف کچھ جنگلی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور انہیں کے بیچ کچھ پرانے درخت کھڑے تھے، کہیں کہیں گلاب کے پودے لگے تھے اور بیچ میں ایک فوارہ تھا۔ میں نے اس لڑکی کو جو میرے آگے آگے چل رہی تھی رکنے کا اشارہ کیا اور لپک کر اس حصے کی طرف پہنچ گیا۔ فوارے کے چاروں طرف بہت خوبصورت کیاریاں بنی ہوئی تھیں جن میں درختوں کی شاخوں سے گرے ہوئے پتے بھرے تھے۔ فوارے تک پہنچنے کے لئے ان کیاریوں کے بیچ سے چار راستے نکالے گئے تھے۔ میں اپنے سامنے والے راستے سے ہو کر فوارے تک پہنچا تو دیکھا اس کے اندر بھرے ہوئے پانی میں کائی کی تہیں جمی ہیں۔ میں نے اس حصے سے نکل کر کیاریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُس لڑکی سے پوچھا:

”ان میں پانی نہیں دیتا کوئی۔“

”ہمیں لوگ دے دیتے ہیں کبھی کبھی، جب بیگم صاحب کہتی ہیں۔“

”تم لوگ یہیں رہتے ہو؟“

”ہاں، بہت دن سے۔ نانی بھی یہیں رہتی تھیں۔“ اس نے کہا۔ پھر بولی:

”ہم لوگ باہر رہتے ہیں، خالہ اور چچی اندر رہتی ہیں، اُس طرف۔“

میں نے اُس طرف جدھر اُس نے اشارہ کیا تھا، دیکھا تو ایک برآمدے میں کئی پردے پڑے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ یہ جہاں دار بیگم کے خاندانی ملازم ہیں جو کئی نسلوں سے یہاں رہتے چلے آ رہے ہیں۔ میں اس طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ لڑکی نے ایک بڑے سے چبوترے پر پہنچ کر بہت سے بند دروازوں میں سے ایک کو کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے کہا:

”آپ یہیں رکیے، ہم اندر بتا کر آتے ہیں۔“

کچھ دیر بعد وہ باہر آ کر بولی: ”اندر آ جائیے۔“

اندر ایک بہت اونچی چھت والے بہت بڑے دالان کے دونوں طرف اوپر نیچے تین تین دروں کی صفیں بنی ہوئی تھیں۔ انہیں میں سے ایک صف میں پڑے ہوئے ریشمی پردے کے پیچھے سے آواز آئی: ”ذگن کے لڑکے ہو۔“ بیگم صاحبہ نے میری ماں کو ان کے پکارے جانے والے نام سے یاد کرتے ہوئے پوچھا۔

”جی۔ آداب۔“

”جیتے رہو، بیٹھو۔“ میں اس کرسی پر جو میرے آنے سے پہلے میرے بیٹھنے کے لئے دالان میں پچی کے قریب رکھ دی گئی تھی، بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھنے کے کچھ دیر بعد پچی میں پڑا ہوا ریشمی پردہ ہٹا تو ایک بڑے سے تخت پر بچھے ہوئے عمدہ نقش و نگار والے ایرانی قالین پر بہت سبک ناک نقشے والی ایک بہت خوب رو خاتون زری کے نفیس کام والی ہلکے سبز رنگ کی ساری پہنے بیٹھی نظر آئیں جو اپنے سامنے رکھے ہوئے خالصدان میں سے پان نکال کر منہ میں رکھ رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے پوچھا:

”یہاں پہلے کبھی آئے ہو؟“

”جی نہیں۔“

”یہ معلوم ہے تمہاری ماں یہاں آتی تھیں؟“

”جی معلوم ہے۔“

”کیوں آتی تھیں، یہ بھی معلوم ہے؟“

”جی یہ بھی معلوم ہے، حدیث پڑھنے اور وہ یہ بھی بتاتی تھیں کسی طرف سے آپ

ہماری عزیز ہیں۔“

”صحیح بتاتی تھیں۔ میں ان کے مرنے پر تمہارے یہاں گئی تھی۔ اس وقت تم ہوش میں

نہیں تھے۔“ یہ کہہ کر پوچھا: ”یاد ہے تمہیں؟“

”کچھ کچھ یاد ہے۔ ڈاکٹر آیا تھا ہمیں دیکھنے۔“

”ہاں تم پر بہت اثر تھا اپنی ماں کے مرنے کا۔“ انہوں نے کہا۔ پھر پوچھا:

”فاتحہ کراتے ہو ان کا؟“

”جی کراتا ہوں۔“

”اور ان کے نام کی مجلس؟“

”وہ بھی۔“

”کبھی بلایا نہیں ہمیں۔“

”جی.....“ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں ان سے کیا کہوں۔

جبکہ سب سے پہلے
میں نے اس
کو دیکھا

فاتحہ کراتے
مجلس کرواتے
لفظ سزا اور سزا

”اصل میں تمہاری ماں نے.....“ یہ کہہ کر وہ رکیں، پھر کچھ سوچ کر بولیں: ”جب یہاں مجلسیں پڑھنا شروع کیں، اس وقت تم بڑے ہو چکے تھے اس لئے وہ تمہیں اپنے ساتھ نہیں لاتی تھیں۔ لیکن ایک جگہ تم ان کے ساتھ جاتے تھے۔“ انہوں نے کہا۔ پھر پوچھا:

”یاد آیا کہاں؟“

میں خاموش رہا۔

”اس وقت تم بہت چھوٹے تھے یاد نہیں رہا ہوگا۔“ یہ کہہ کر انہوں نے مجھے یاد

دلاتے ہوئے کہا:

”راجہ صاحب پیرپور کے یہاں، ڈالی باغ، محرم کا پہلا عشرہ وہیں پڑھتی تھیں وہ۔“

جہاں دار بیگم کے یاد دلانے پر مجھے یاد آنے لگا: راجہ صاحب پیرپور کی کوٹھی پرانے لکھنؤ سے بہت دور تھی۔ رانی صاحبہ دس دنوں کے لئے رکشہ لگوا دیتی تھیں۔ مجھے یاد ہے عباس رکشے والا اماں کو لاتے اور لے جاتے وقت راستے بھر بہت باتیں کرتا تھا اور راستے میں آنے والی عمارتوں اور کوٹھیوں کے بارے میں ایسے بتاتا جیسے یہ ساری عمارتیں اسی نے بنوائی ہوں یا اسی کے زمانے میں بنی ہوں۔ ایک بار کوٹھی پیرپور جاتے وقت شاہ نجف کے آگے سکندر باغ کے چوراہے پر اس کے رکشے کی چین اتر گئی۔ اس نے چین چڑھاتے چڑھاتے اور چین کو رواں کرنے کے لئے پیڈل گھماتے گھماتے سکندر باغ کی پوری تاریخ بتا ڈالی۔ ”بیگم صاحب!“ اس نے میری ماں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا: ”غدر میں بیگم حضرت محل اسی طرف سے نکلی تھیں بوٹڈی کے لئے۔“

اُس وقت میں نے ماں سے پوچھا تھا: ”اماں یہ بیگم حضرت محل کون تھیں۔“

”لکھنؤ کی رانی۔“

”کیا سوچنے لگے؟“ جہاں دار بیگم نے مجھے کھوئی ہوئی یادوں سے باہر نکالتے ہوئے پوچھا۔

”آپ نے یاد دلایا تو سب یاد آنے لگا۔“

”تمہاری ماں بہت نیک بی بی تھیں۔ سب کے مرنے جینے میں شریک رہتیں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے ماں کے لئے دعا کی: ”خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔“ پھر بولیں:

”عمر میں مجھ سے بہت چھوٹی تھیں۔ بہت جلد چل بسیں۔ ماں کی طرح مانتی تھیں مجھے۔“ پھر کہا:
”اسی تعلق سے میں نے تمہیں اندر بلا لیا اور تمہارے سامنے آ گئی۔“ یہ کہنے کے بعد
پوچھا: ”اچھا بتاؤ کیسے نکل آئے اس طرف۔“

”مجھے کسی چیز کی تلاش ہے۔ کسی نے آپ کا نام لیا کہ آپ میری مدد کر سکتی ہیں۔“
”کس نے؟“

”پرنس سرتاج مرزا نے جو کنگھی والی گلی میں رہتے ہیں۔“

”سرتاج مرزا.....!!“ انہوں نے اس نام کو یاد کرنے کی کوشش کی پھر بولیں:

”یاد پڑتا ہے کوئی دو برس پہلے آئے تھے ملنے۔ دور کے عزیزوں میں ہیں۔“

”بتا رہے تھے آپ سر اے معالی خاں والے خورشید مرزا کی عزیز ہیں۔“

”ہاں۔ ایک جدی ہیں ہم لوگ۔ بزرگ ہمارے مازندران سے پہلے وہلی آئے پھر

آصف الدولہ کے زمانے میں اودھ چلے آئے۔“ پھر خورشید مرزا کے بارے میں بتایا:

”حویلی تو ان کی تھوڑی تھوڑی کر کے زمانہ ہوا بک چکی، پتہ نہیں اب وہاں کیا کیا بن گیا ہے۔“

”بہت سے نئے مکان۔“

یہ سن کر وہ چپ ہو گئیں۔ پھر کچھ دیر بعد بولیں:

”مرزا رسوا کا نام سنا ہے۔ مرزا ہادی رسوا۔“

یہ سن کر میں ٹھٹھکا، اسی کے ساتھ خوش بھی ہوا کہ جو کچھ میں پوچھنے والا ہوں، اس کا راستہ
خود بخود کھل رہا ہے۔

”جی سنا ہے اور ان کی کتابیں بھی پڑھی ہیں۔“

”انہوں نے اپنی ایک کتاب ’اختری بیگم‘ میں ہمارے چچا ہی کا قصہ بیان کیا ہے۔“

”تو آپ مرزا رسوا کی بھی.....“

”عزیز ہوں۔“ میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے وہ بول پڑیں۔ وہ میرے والد کے چچا زاد

بھائی تھے۔ عمو جان کہتے تھے ہم انہیں۔ پڑھے لکھے تو بہت تھے لیکن دماغ میں خلل تھا۔ عجیب

عجیب حرکتیں کرتے رہتے تھے۔“ جہاں دار بیگم نے اپنے سامنے رکھے ہوئے خاصدان میں

سے ایک پان نکال کر منہ میں رکھا اور اسے چباتے ہوئے آگے بتانا شروع کیا: ”کبھی دوائیاں

بنار ہے ہیں، کبھی طرح طرح کے اوزاروں سے کوئی پرزہ بنار ہے ہیں، کبھی بڑی بڑی عمارتوں کے نقشے تیار کر رہے ہیں۔“ یہ بتانے کے بعد بولیں:

”حیدر آباد جانے سے پہلے اسی حویلی میں آ کر رہے تھے۔ تم نے ادھر آتے وقت چمن دیکھا ہوگا، چمن تو اب نام کا ہے کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں، اسی کے برابر تین دروں والا ایک کمرہ ہے، اسی میں رہتے تھے۔ کچھ اور تو ان کے پاس تھا نہیں، بہت سی کتابیں بوروں میں بھر کر لائے تھے اپنے ساتھ۔“

یہ بتانے کے بعد انہیں کچھ یاد آیا۔ بولیں:

”لو۔ ابھی تک میں نے تمہارے لئے پانی منگوایا نہ شربت۔ باتوں میں بھول گئی۔“

”کیا پیو گے؟“

”کچھ نہیں۔“

”نہیں کچھ تو۔“

”پانی پلوادیتے۔“

جہاں دار بیگم نے اس لڑکی کو جو مجھے اپنے ساتھ یہاں تک لائی تھی بلا کر کہا:

”منی۔ جا سلیمن سے کہہ نیل کا شربت بنا کر لے آئے۔“

”کوئی تکلف نہ کیجئے۔ بس ایک گلاس پانی.....“

”ارے گھر کے نیل ہیں، کاغذی۔ پیچھے کئی پیڑ لگے ہیں، پھلوں سے لدے رہتے ہیں۔“ یہ کہنے کے بعد پوچھا: ”ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی؟“

”کتابیں بوروں میں بھر کر.....“

”بہت کتابیں لائے تھے اپنے ساتھ، ہر وقت لکھتے پڑھتے رہتے تھے۔ بس کبھی کبھی باہر نکل کر ایک آدھ چکر چمن کا لگاتے، پھر کمرے میں چلے جاتے، دروازے اندر سے بند کر لیتے۔ ناشتہ کھانا سب اسی کمرے میں پہنچا دیا جاتا۔“

”کتابیں ابھی ہیں اس کمرے میں؟“ بولتے بولتے وہ رکیں تو میں نے ان سے پوچھا۔

”ہیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے لکڑی کی الماریاں بنائی تھیں اور بوروں سے نکال نکال کر کتابیں اس میں لگائی تھیں۔“ انہوں نے کہا۔ پھر کہا: ”جو ہمارے یہاں کی تھوڑی بہت

کتابیں تھیں وہ بھی اسی میں ہیں۔ وہاں سلین بہت ہے۔ بہت سی کتابیں دیمک کھا گئی۔ الماریوں کی لکڑی سڑ چکی ہے اس لئے کتابیں ایک جگہ ڈھیر ہو گئی ہیں۔“ یہ کہہ کر بولیں: ”ان میں بھی دیمک لگ چکی ہوگی۔ میں تو اس طرف برسوں ہوئے گئی نہیں۔“ یہ بتا کر بولیں: ”ابا باتوں باتوں میں اماں سے بتاتے تھے اور یہ اس وقت کی بات ہے جب عمو جان یہ کتابیں یہاں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔“

”کیا بتاتے تھے؟“

”شاہی کتب خانے کے بارے میں۔ بتاتے تھے شاہی کتب خانہ کیسے برباد ہوا؟“

”جی۔ دولاکھ کتابیں تھیں اس میں۔“

”تمہیں کس نے بتایا؟“

”بھئی نک نر سدا۔ کھا کر سی نس۔ آریا چھا؟“

”جن لوگوں سے اس کتاب کے سلسلے میں ملا ہوں انہیں میں سے کسی نے۔“

”ہاں۔ دولاکھ کتابیں تھیں طرح طرح کی اور سلطان عالم نے بڑے جتن سے انہیں جمع کیا تھا۔“ جہاں دار بیگم نے بتایا۔ پھر کہا: ”اور ابا بتاتے تھے کوٹھی فرح بخش، اب یہ نام بھی لوگ بھول گئے ہیں سب اسے چھتر منزل کہنے لگے ہیں۔ لکھنؤ سے واجد علی شاہ کے چلے جانے کے بعد اس کوٹھی میں یہ کتابیں بڑی بے دردی سے ایک بوسیدہ کمرے میں بھر دی گئی تھیں۔ سلین انہیں خراب کر رہی تھی اور کیڑے انہیں کھا رہے تھے۔“ جہاں دار بیگم بتاتی رہیں۔ ”اور ابا یہ بھی بتاتے تھے کسی بڑے انگریز افسر نے ان کی یہ حالت دیکھ کر اپنے اوپر والے افسر سے کتابوں کی اس بربادی پر بڑا افسوس کیا تھا۔“ یہ کہہ کر کہا: ”یہی حال اُس کمرے میں عمو جان کی کتابوں کا ہے۔“

جہاں دار بیگم آگے کچھ بتانے والی تھیں کہ ملازمہ ایک کشتی میں بیل کا شربت اور ایک طشتری میں چھلی ہوئی لیچیاں لے کر آ گئی اور جب اس نے شربت کا گلاس اور لیچیوں سے بھری طشتری میرے سامنے رکھی تو وہ بولیں:

”لو۔ بیل گھر کے لیچیاں بازار کی۔ پیو۔ سلیمن بہت مزے کا شربت بناتی ہے۔“

میں نے کشتی میں سے شربت کا گلاس اٹھا کر جہاں دار بیگم سے کہا: ”کتابیں آپ نے نکال کیوں نہیں دیں۔“

”نہیں، نہ انہیں نکالنے کو جی چاہتا ہے نہ جیسے انہیں رکھنا چاہئے رکھ پاتی ہوں۔“

”کسی کتاب خانے کو دے دیجئے، تحفہ۔“

”جب تک زندہ ہوں ہر چیز، مٹے یا رہے، اپنے کلبے سے لگا کر رکھوں گی۔“ انہوں نے کہا۔ پھر بڑے افسردہ لہجے میں بولیں: ”سب حویلی بیچ دینے کو کہتے ہیں، کہتے ہیں۔ اکیلی ہیں آپ، کتنی جگہ چاہئے رہنے کے لئے۔ مگر مجھ سے اس کا سودا نہیں ہوتا۔“

”خدا کرے آپ بہت دن تک جنیں لیکن آپ کے بعد۔“

”بیٹوں کی ہرگز نہیں، وقف کردوں گی۔ علی الخیر۔ وکیل کو بلا کر وصیت لکھنے کا ارادہ کر لیا ہے۔“

”میں ان کتابوں کو دیکھ سکتا ہوں۔“ میں نے پوچھا۔

”کیوں۔ تمہیں کیا ضرورت آن پڑی۔“

”بات یہ ہے.....“ میں کہتے کہتے رکا۔ پھر بولا: ”پرنس سرتاج مرزا سے بھی میں اسی لئے ملا تھا۔“

”کس لئے؟“

”آپ کے عمو جان کی جو ناول ہے..... امراؤ جان.....“

”ہاں، وہی سب سے زیادہ مشہور ہوئی۔“

”جی اس میں جو کہانی ہے.....“

”بالکل سچی ہے، لیکن کہیں کہیں انہوں نے اسے بدل دیا ہے۔“

”یہ بات نہیں ہے۔“

”پھر؟“

”مرزا رسوانے اسے کئی بار لکھا تھا۔“

”کئی بار تو لکھا ہوگا، اچھے سے اچھا بنانے کے لئے۔“

”نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اسے الگ الگ طرح سے لکھا تھا۔“

”بھئی اس بارے میں میں زیادہ نہیں جانتی، البتہ اتنا جانتی ہوں جیسا وہاں اس کمرے

میں دیکھا ہے وہ کتاب لکھنے کے بعد خود اس کی جلد بناتے تھے پھر اس پر عمدہ قسم کا کپڑا چڑھا کر

بہت خوشنما حروف میں کتاب کا نام لکھتے تھے۔“ یہ بتانے کے بعد بولیں: ”میں نے ان کو بہت

بار اس طرح کی جلدیں بناتے دیکھا، پرانی کتابوں کی بھی جلدیں ٹھیک کرتے رہتے تھے۔“ یہ

کہہ کر انہوں نے ایک بار پھر خالصدان سے پان نکالا اور منہ میں دبے ہوئے پہلے والے پان کا چبایا ہوا حصہ اگالدان میں ڈالتے ہوئے بولیں:

”الگ الگ طرح سے لکھنے کا مطلب کیا ہے تمہارا۔“

”مطلب یہ کہ..... جیسا کہا جاتا ہے..... امراؤ جان کے قصے کو ایک کتاب میں، اور وہی اس قصے کی پہلی کتاب تھی، مرزا صاحب نے بیان کرتے وقت امراؤ جان کو اولاد والا بتایا تھا۔“ میں نے کہا: ”لیکن انہوں نے اسے نہیں چھپوایا، انہیں ڈرتھا کہ اس شکل میں کتاب مقبول نہ ہوگی۔“ یہ سن کر وہ بولیں: ”تمہارا کیا مطلب ہے۔ ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی وہ کتاب کمرے والی کتابوں میں ہو سکتی ہے۔“

”شاید ہو، کسی زمانے میں کسی کے ہاتھ لگی تھی، پھر نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔“ میں نے کہا۔

”یہاں آنے سے پہلے عمو جان کی بہت سی کتابیں جہاں وہ رہتے تھے وہیں رہ گئی تھیں، ان کے مرنے کے بہت دن بعد اسی گھر سے کوئی آیا تھا اور بہت سی کتابیں یہ کہہ کر دے گیا تھا کہ مرزا صاحب کی ہیں۔“ اتنا بتا کر کچھ یاد کرتے ہوئے بولیں: ”اور ہاں کتابیں دیتے وقت یہ بھی بتایا تھا کہ انہوں نے حیدر آباد میں کسی سے کہا تھا میری کتابیں جو کشمیری محلے والے مکان میں چھوٹ گئی ہیں، مشک گنج جہاں دار بیگم کی حویلی میں پہنچادی جائیں۔“ یہ بتا کر بولیں: ”ہو سکتا ہے انہیں میں آگئی ہو وہ کتاب اور وہیں پڑی ہو کتابوں کے اُس اٹم میں۔“

”آپ کہیں تو میں کل سے آ کر دیکھنا شروع کر دوں، شاید مل جائے۔“

”ضرور آؤ، گھر ہے تمہارا۔ لیکن تمہیں اس کتاب کی ضرورت کیوں آ پڑی۔“

”اگر امراؤ جان کی کہانی اصلی ہے، آپ نے بھی یہی کہا ہے، تو مرزا صاحب نے پہلی والی کتاب میں سب کچھ صحیح صحیح لکھا ہے۔“ میں نے کہا۔ پھر کہا: ”اور اگر ان کے لکھے ہوئے کے مطابق امراؤ جان کی کوئی اولاد ہے تو وہ اسی شہر میں کہیں ہوگی۔“ یہ کہہ کر میں رکا اور طشتری میں سے ایک تیلچی اٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے کہا:

”کتاب کے مل جانے سے ممکن ہے ان کی اولاد کا کچھ پتہ چل جائے۔“

”تو کل سے آ جاؤ۔ میں کمرہ کھلوادوں گی، جب تک جی چاہے دیکھنا۔“ جہاں دار بیگم

نے کہا۔ پھر اپنی ملازمہ سلیمین کو بلا کر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں:

”کل سے یہ صاحب یہاں روز آئیں گے۔ عزیز ہیں ہمارے۔ وہ جو چمن کے برابر والا کمرہ ہے اسے کھلوادو، وہاں جو کتابیں ڈھیر ہیں یہ اُن میں کچھ ڈھونڈنا چاہتے ہیں۔“ اس ہدایت کے بعد اسے تاکید کرتے ہوئے کہا:

”اور ہاں۔ ان کے کھانے پینے کا خیال رکھنا۔“

”تو میں کل حاضر ہوتا ہوں۔ آپ ملیں، اتنا وقت دیا، اس کا بہت بہت شکریہ۔“

یہ سن کر وہ مسکراتے ہوئے بولیں: ”تکلفات کی ضرورت نہیں۔ تم گھر والوں کی طرح ہو۔ جب تک کتاب مل نہ جائے آتے رہو، اور کتاب مل جانے کے بعد بھی آتے رہنا۔“

جہاں دار بیگم کی اس بہت بڑی حویلی کے دالان سے نکلتے ہوئے جب میں نے انہیں سلام کیا تو مازندرانہ خون کی تاب ان کے مسکراتے ہوئے چہرے کی جھریوں میں رہ رہ کر اپنی جھلک دکھا رہی تھی۔



دوسرے دن دوپہر سے کچھ پہلے میں جہاں دار بیگم کی حویلی پہنچا تو ان کی ملازمہ سلیمین نے مجھے دیکھتے ہی اسن کمرے تک پہنچا دیا جہاں بہت بڑی تعداد میں کتابیں ایک ڈھیر کی شکل میں جمع تھیں۔ میرے پہنچنے سے پہلے کمرہ کھول دیا گیا تھا اور اس کے آس پاس صفائی بھی کرادی گئی تھی۔ کمرے کی ساری کھڑکیاں کھلی تھیں اور چمن کی طرف سے تازہ اور خوشگوار ہوا آرہی تھی۔ کمرے میں ایک کرسی رکھ دی گئی تھی اور اسی کے برابر ایک بڑے سے اسٹول پر پانی سے بھرا ہوا شیشے کا ایک جگ اور ایک گلاس۔ مجھے کمرے کے اندر پہنچا کر سلیمین نے کہا:

”کسی چیز کی ضرورت ہو تو باہر نکل کر آواز دے لیجئے گا۔ ہم سامنے برآمدے میں ہیں۔ ویسے ہم خود آ کر پوچھ لیں گے۔“

”ضرور ضرور۔ بیگم صاحبہ کو میرا سلام کہہ دیجئے گا، بتا دیجئے گا میں آگیا ہوں۔“

سلیمین کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک کرسی پر بیٹھا کتابوں کے اس ڈھیر کو دیکھتا رہا۔ میں دراصل یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اس ڈھیر میں کس طرح داخل ہوا جائے۔ بہت سوچنے کے بعد میں نے طے کیا اچھا طریقہ یہ ہے پہلے کتابوں کو اُن کے موضوع کے حساب

سے الگ کر لیا جائے اور جب یہ چھٹائی پوری ہو جائے تو ان الگ الگ کتابوں کو از سر نو ٹھہر
 ٹھہر کر دیکھا جائے۔ کتاب اٹھانے اور الگ رکھنے کے اس عمل میں ہو سکتا ہے وہ مسودہ زیادہ
 محنت کے بغیر ہاتھ آ جائے۔ پھر میں نے سوچا اب کام شروع کیا ہے تو ساری کتابوں کی تقسیم
 اسی طرح کر دی جائے جیسے کتاب خانوں میں ہوتی ہے۔ اس طرح بہت سی دوسری کارآمد
 کتابیں بھی نکل آئیں گی۔ یہ سوچ کر میں کرسی سے اٹھا اور کتابوں کے ڈھیر سے پہلی کتاب
 اٹھائی۔ یہ عربی کی ایک لغت تھی جس کا پہلا اور آخری حصہ غائب تھا۔ پھر دوسری کتاب کو دیکھا
 یہ فردوسی کا شاہنامہ نکلا، اسی کے برابر دیوان حافظ۔ پھر چار پانچ موٹی موٹی کتابیں علم کیمیا
 سے متعلق تھیں۔ پھر ایک کتاب نقشہ نویسی کے طریقوں اور عمارتوں کی تعمیر سے متعلق نکلی۔ پھر
 میں ڈھیر کے دوسری طرف گیا اور وہاں جو پہلی کتاب اٹھائی وہ ہیئت اور نجوم پر تھی۔ اسی کے
 نیچے دو تین کتابیں یونانی فلسفے کی تھیں۔ میں جتنی بار اس ڈھیر میں ہاتھ لگا تا کوئی نہ کوئی نایاب
 اور قیمتی کتاب ہاتھ آتی۔ کتابوں کے اتنے بڑے ڈھیر اور اس ڈھیر میں طرح طرح کی کتابیں
 دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ واقعی مرزا رسوا کتابوں کے رسیا تھے۔ میں نے سوچا کس کس جتن سے
 انہوں نے یہ کتابیں جمع کی ہوں گی۔ میں ان کے اس شوق پر حیران ہو ہو کر کتابیں چھانٹتا رہا۔
 سہ پہر سے پہلے پہلے میں نے بہت سی کتابیں چھانٹ ڈالیں اور جب یہ کام کرتے کرتے
 تھک گیا تو میں نے کام روک دیا اور آرام کرنے کے لئے کرسی پر بیٹھ گیا۔ کرسی پر کچھ دیر بیٹھے
 رہنے کے بعد میں اٹھا اور اس سے پہلے کہ سلیمان کو آواز دوں وہ چبوترے سے اتر کر مجھے اپنی
 طرف آتی ہوئی نظر آئی۔ قریب آ کر اس نے کہا:

”چلیے کھانا کھا لیجئے۔ دسترخوان لگ گیا ہے۔“

”میں تو اب جانے کی تیاری کر رہا ہوں۔“

”نہیں، کھانا کھائے بغیر بیگم صاحب آپ کو نہیں جانے دیں گی۔ چلیے کھانے پر
 انتظار کر رہی ہیں۔“

میں نے کمرے کے دروازے بند کیے اور سلیمان کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا اسی دالان میں
 جس میں کل بیٹھ کر جہاں دار بیگم سے باتیں کی تھیں، داخل ہو گیا۔ دالان میں ایک بڑے سے
 قالین پر ایک بہت خوبصورت دسترخوان بچھا تھا جس پر چینی کی قابوں میں تین چار طرح کے

کھانے رکھے تھے۔ جہاں دار بیگم دسترخوان کے دوسری طرف بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھیں۔
مجھے دیکھتے ہی بولیں: ”آؤ آؤ بیٹھو، کھو کچھ ہاتھ لگا۔“

”ابھی تو نہیں۔“ میں نے انہیں سلام کرتے ہوئے کہا۔ ”ابھی تو چھٹائی شروع کی ہے۔ الگ الگ موضوع والی کتابیں الگ الگ رکھتا چل رہا ہوں۔“ پھر انہیں بتایا: ”اس بہانے وہ سب کتابیں ترتیب سے لگ جائیں گی۔“

”اب جو کچھ کرنا ہے تمہیں کرو۔ یہاں انہیں دیکھنے والا کوئی نہیں۔“
”جی۔ اب یہ کتابیں اسی طرح ہو جائیں گی جیسی کتاب خانوں میں ہوتی ہیں۔“
”لو، شروع کرو۔“ جہاں دار بیگم نے دسترخوان پر سے ایک قاب اٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ پھر بولیں: ”میں تو پرہیزی کھاتی ہوں۔ یہ سب تمہارے لئے پکوا یا ہے۔“
”کیوں تکلف کیا آپ نے۔“

یہ سن کر جہاں دار بیگم کچھ دیر تک میری طرف شفقت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہیں پھر ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں: ”خدا نے سب کچھ دیا.....“ یہ کہہ کر رکیں پھر آنکھوں میں آئی ہوئی نمی کو ساری کے پلو سے پونچھتے ہوئے کہا: ”لیکن اولاد نہیں دی۔ کبھی کبھی بڑی وحشت ہونے لگتی ہے اس حویلی میں۔ دیواریں کاٹنے کو دوڑتی ہیں۔“ پھر بولیں:

”تمہاری ماں بہت عزیز تھیں مجھے اور اتنے ہی عزیز تم بھی ہو۔“

میں اُن کی یہ بات سن کر خاموش رہا۔

”چلو شروع کرو۔ نوالہ توڑنے سے پہلے میں نے یہ باتیں شروع کر دیں۔“ مجھے خاموش دیکھ کر انہوں نے کہا۔ پھر اپنے پرہیزی کھانے کا لقمہ بنا کر منہ میں رکھتے ہوئے بولیں۔
”عمو جان بھی عجیب آدمی تھے۔“

”مرزا رسوا؟“

”ہاں۔ ایسے آدمی بہت کم دیکھے ہیں میں نے۔ نمازیں پڑھنے پر آئے تو پوری پوری رات نمازیں پڑھ رہے ہیں، مجروں کا شوق ہوا تو رات رات بھر رئیسوں کی محفلوں میں بیٹھے ہیں، کوٹھوں پر جارہے ہیں اور طوائفوں کو راگ راگیاں سکھا رہے ہیں اور ساتھ ساتھ بھاؤ بھی بتاتے جارہے ہیں۔“
”کوٹھوں پر جاتے تھے؟“

”خوب، اماں بتاتی تھیں وہیں امراؤ جان سے عشق کر بیٹھے۔“

”بہت سے لوگ کہتے ہیں امراؤ جان تھیں ہی نہیں۔“

”غلط کہتے ہیں، میری والدہ بتاتی تھیں خاندان کی کئی شادیوں میں وہ آئیں اور مجرا کیا۔“ انہوں نے کہا۔ پھر بولیں: ”بڑی رکھ رکھاؤ والی عورت تھیں۔ کیا مجال مونہہ سے کوئی عامیانہ بات نکل جائے۔ اماں کہتی تھیں وہ کوٹھے کی عورت لگتی ہی نہیں تھیں۔ محرم کے دنوں میں سیاہ لباس پہن کر درد بھری آواز میں سوز پڑھتیں تو پٹس پڑ جاتی۔“

”سوز پڑھتی تھیں؟“

”خوب پڑھتی تھیں، لیکن ہر کسی کے یہاں نہیں۔ بس اپنے ہی لوگوں میں۔“ جہاں دار بیگم نے کہا۔ پھر میری طرف ایک اور قاب بڑھاتے ہوئے کہا: ”کھاتے رہو، ہاتھ مت روکو۔“ یہ کہہ کر بولیں: ”اور امراؤ جان سے اچھا سوز کوئی اور پڑھ بھی نہیں سکتا تھا، سارے راگ راگنیوں سے واقف اور گلا..... ایسا لگتا تھا جیسے ہر سُر انہیں کے لئے بنا ہو۔“

”تو مرزا صاحب ان کے عشق میں.....“

”دیوانے تھے۔ اب تم تو میرے سامنے بچے ہو ابھی..... تم سے کیا بتاؤں..... عمو جان کا عورتوں میں بہت جی لگتا تھا..... میرا مطلب سمجھ لیا ہو گا تم نے۔“

”جی جی..... کچھ قصے میں نے بھی سنے ہیں ان کے.....“

”کچھ نہیں بہت..... شادیاں بھی کئی کیں۔ لیکن نباہ، جیسا ہونا چاہئے کسی سے نہیں ہوسکا۔“

”تو کیا امراؤ جان کو بھی اُن سے.....“

”عشق تھا، بہت تھا۔ اصل میں عمو جان کو اللہ نے بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ کون سا فن تھا جس میں وہ طاق نہ ہوں۔ خود کہا کرتے تھے:

ع سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

جہاں دار بیگم نے کہا۔ ”اسی لئے کوٹھے والیاں اُن پر جان چھڑکتی تھیں۔ لیکن.....“ وہ کہتے کہتے رکیں۔

”لیکن.....؟“

”وہ امراؤ کو گھر نہیں لاسکتے تھے۔“

”کیوں؟“

”بڑی بدنامی ہوتی۔ خاندان کی ناک کٹ جاتی۔ وہ جوان کی کتاب میں نواب سلطان ہیں، وہ دراصل عمو جان ہی ہیں۔“ یہ بتا کر جہاں دار بیگم نے بتایا:

”امراؤ واقعی انہیں بہت چاہتی تھیں۔ ہر تہج تہوار پر کچھ نہ کچھ ان کے لئے بھیجتیں۔ عمو جان بھی ہفتے میں دو تین بار کوٹھے پر جائے بغیر نہ رہ پاتے۔“

جہاں دار بیگم کھانا کم کھا رہی تھیں، بتا زیادہ رہی تھیں: ”اب اتنی باتیں کھل کر تمہیں بتادیں تو یہ بھی سن لو کہ اس زمانے میں..... اور شاید تم نے اپنے گھر میں بھی یہ باتیں سنی ہوں..... کوٹھے والیاں اکثر نوابوں اور رئیسوں پر مٹتیں اور سب کچھ اُن پر نچھاور کر دیتیں۔ اُن رئیسوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو اپنا سب کچھ لٹا کر انہیں کے دروازے پڑ رہے۔“

”آپ امراؤ جان کے بارے میں کتنا جانتی ہیں؟“ بتاتے بتاتے وہ رکیں تو میں نے پوچھا۔ ”بس اتنا جتنا گھر میں ان کے بارے میں سنا ہے۔ اماں بتاتی تھیں اور وہ بھی انہوں نے دوسروں سے سنا تھا، جب تک چوک میں رہیں، کوٹھے کی شان بن کر رہیں۔ آداب تمیز میں کوئی کمی نہیں تھی لیکن ایک دن..... یہ بھی اماں ہی بتاتی تھیں.....“ اتنا کہہ کر جہاں دار بیگم چپ ہو گئیں اور کھانے سے ہاتھ روک لیا۔

”کیا بتاتی تھیں؟“

”پیشے سے طبیعت بھر گئی تو کوٹھا چھوڑ دیا۔“

”مرزا صاحب نے لکھا ہے فیض علی کے ساتھ بھاگ گئیں۔“

”نہیں یہ غلط ہے۔ بات یہ ہے جب امراؤ کو لگا عمو جان سے ان کا عشق عشق

ہی رہے گا تو وہ.....“

”تو وہ.....؟“

”ٹوٹ گئیں اور لکھنؤ چھوڑ دیا۔“

”فیض علی کے ساتھ؟“

”کہا یہی جاتا ہے۔“ یہ کہہ کر جہاں دار بیگم نے پوچھا۔

”فیض علی کون تھا۔ معلوم ہے؟“

”ڈاکو۔“

”ڈاکو تو تھا۔ لیکن اس کی اصلیت کیا تھی۔ کبھی اپنی ماں کے منہ سے نام سنا اس کا۔“
”نہیں۔“

”تو سنو۔ اب یہ باتیں بتانے والا کوئی نہیں ہے۔ میری ہی عمر کے لوگ بتا سکتے ہیں۔“
انہوں نے کہا: ”فیض علی اصل میں حامد ڈاکو کا بھائی تھا۔ حامد ڈاکو کا نام سنا ہے؟“
”وہ تو سنا ہے۔ امیروں کے یہاں ڈاکہ ڈالتے، جو کچھ لوٹے غریبوں میں بانٹ دیتے۔“
”ہاں۔ انگریزوں کے دشمن تھے۔ پتے پر رہتے تھے۔ سپہ کہاں ہے معلوم ہے؟“
”تال کٹورے والے راستے میں۔“

”ہاں۔ منشی فضل حسین خاں کی کربلا جہاں امراؤ جان دفن ہیں، لوگ بتاتے ہیں پتھر مٹ چکا ہے ان کی قبر کا، اسی کے آگے بہت آگے داہنی طرف ایک ویران مقام ہے۔ سپہ وہیں ہے۔ وہیں چھپتے تھے جا کر حامد ڈاکو۔“

جہاں دار بیگم کی طشتری خالی ہو چکی تھی۔ انہوں نے آخری نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا:
”اور یہ فیض علی انہیں کے ساتھ رہتا تھا۔ انگریز پولیس دونوں کے پیچھے لگی رہتی۔ اماں بتاتی تھیں ایک دوش میں حامد پکڑا گیا، فیض علی بھاگ نکلا۔“ بتاتے بتاتے جہاں دار بیگم نے قابو کو میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ”تم ٹھیک سے نہیں کھا رہے ہو، طشتری خالی ہے۔“
”نہیں، میں نے کچھ زیادہ کھا لیا، سب چیزیں بہت مزے کی ہیں۔“

”جیسے بعض حکیموں کے ہاتھ میں شفا ہوتی ہے ویسے ہی سلیمان کے ہاتھ میں مزہ ہے۔ بہت اچھا پکاتی ہے۔“ پھر انہوں نے سلیمان کو بلا کر اس سے کہا: ”دستر خوان بڑھا دو۔“ کھانا کھانے کے بعد جہاں دار بیگم صحنچی میں جا کر اپنے تخت پر بیٹھ گئیں اور میں صحنچی کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر۔ تخت پر بیٹھتے ہی اپنے خاصدان سے پان نکال کر منہ میں رکھتے ہوئے انہوں نے کہا:
”اور تمہیں بتاؤں۔ حامد اور فیض علی خاندانی لوگ تھے۔ پتہ نہیں کیسے ڈاکو بن گئے۔“

حامد ڈاکو نے تو ایک مسجد بھی بنوائی تھی پتے کے پاس۔“

”تو لکھنؤ چھوڑنے کے بعد کچھ پتہ نہیں چلا امراؤ جان کا۔“

”اب ہم تو جیسا اماں نے بتایا، یہی جانتے ہیں۔ کتاب میں عمو جان نے کچھ کا کچھ کر دیا۔“

”دیکھیے، اُس کتاب میں جو اس کمرے کے ڈھیر میں کہیں ہو سکتی ہے، کیا نکلتا ہے۔“
میں نے کہا۔

”جو بندہ یا بندہ۔“ انہوں نے کہا۔ پھر پوچھا: ”مطلب سمجھے۔“

”جی۔ جسے تلاش ہوتی ہے، اسے ملتا ضرور ہے۔“

”ہاں۔ یہ روز کے فقرے ہیں۔ ذکن، تمہاری ماں اٹھتے بیٹھتے ایسے فقرے بولتی تھیں۔“ جہاں دار بیگم نے کہا۔ پھر ناصحانہ انداز میں بولیں: ”فارسی بھی خوب پڑھو۔ صرف اردو سے کام نہیں چلے گا۔“ پھر کہا: ”عمو جان کو دیکھو۔ کتنی زبانیں آتی تھیں اور سب بڑی روانی سے بولتے تھے۔“

”ان کا کیا کہنا۔ ایسے لوگ تو کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ پھر کہا: ”یہ بھی نہیں معلوم کہ امراؤ جان پلٹ کر لکھنؤ آئیں یا نہیں۔ چھپی ہوئی کتاب میں تو لکھا ہے کہ آئیں۔“

”اس کا ہمیں علم نہیں۔ ہم تو بس گھر میں جو باتیں ہوتیں، انہیں سن لیتے۔“ جہاں دار بیگم نے کہا: ”اماں آخری عمر میں جب بہت بیمار تھیں، دے کا مرض تھا انہیں، پرانی باتیں بہت یاد کرتی تھیں، بتاتی تھیں، امراؤ نے جب لکھنؤ چھوڑا تو بھائی جان وہ انہیں بھائی جان کہتی تھیں، بہت پریشان رہنے لگے تھے۔ سارے مشغلے چھوڑ کر ٹکلی باندھے بیٹھے رہتے۔“ یہ کہہ کر جہاں دار بیگم نے آگے بتایا: ”کبھی کبھی بے چین ہو کر کوٹھے کی طرف جاتے تو بسم اللہ کی ماں جو سب طوائفوں کے اوپر تھیں منہ دے کر بات نہ کرتیں۔ ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ امراؤ نے کوٹھا عمو جان کی وجہ سے چھوڑا۔“ یہ کہہ کر مجھ سے پوچھا:

”اب اس طرف کے کیا حال ہیں؟ چوک تو کسی نہ کسی ضرورت سے جانا ہوتا ہوگا۔“

”دو چار کوٹھے ہیں جہاں ناچ گانا ہوتا ہے۔ باقی تو.....“

”باقی.....؟“

”بازار و عورتیں آ کر بس گئی ہیں۔ اور یہ وبا چوک والی گلی کے منہ تک پھیل گئی ہے۔“ میں

نے کہا۔ پھر انہیں بتایا: ”روز جھگڑا ہوتا ہے انہیں وہاں سے ہٹانے پر۔“

”یہ باتیں، تم میرے سامنے کے بچے ہو، تم سے کرنے کی نہیں ہیں لیکن اب تمہیں اس

معاملے میں دلچسپی ہے تو جو کچھ میں نے سنا ہے وہ مجھ سے سنو۔“ جہاں دار بیگم ایک دوسرا پان منہ میں رکھتے ہوئے بولیں: ”پہلے ہر گھر میں چوسر پچسپی کھیلتے وقت یا اس وقت جب گرمیوں کے دنوں میں شام کو گھر کے صحنوں اور چبوتروں پر چھڑکاؤ کے بعد سب جمع ہوتے، شہر بھر کی باتیں ہوتیں۔ انہیں میں یہ چوک والی باتیں بھی نکل آتیں۔“ پھر آگے بتایا: ”جس کو ٹھے پر امراؤ جان تھیں وہ اُن کی وجہ سے بہت مشہور ہو گیا اور عمو جان نے کتاب لکھ کر اسے اور مشہور کر دیا۔ لیکن چوک میں کچھ اور ناچنے والیاں بھی تھیں جن کے فن کی بڑی دھوم تھی۔“

”وہ کون؟“

”امیر جان، دلربا اور اللہ رکھی۔“

”ان کے نام تو میں نے بھی سنے ہیں۔“

”ضرور سنے ہوں گے۔ اماں بتاتی تھیں اور انہیں عمو جان نے بتایا تھا یہ تینوں مشکل سے مشکل راگوں میں گاتی اور ناچتی تھیں اور غلط بجانے پر سازندوں کو ٹوک دیتی تھیں۔ تینوں کے حسن کا بھی بہت شہرہ تھا۔“ یہ بتاتے بتاتے جہاں دار بیگم کو جھپکی آ گئی۔ وہ جماہیاں لینے لگی تھیں۔ اسی میں انہوں نے بتایا:

”لیکن تینوں کا آخر اچھا نہیں رہا۔“

”بیماریوں نے آ گھیرا؟“

”نہیں۔ کوٹھے اجڑنے کے بعد، جیسا میں نے سنا، کوئی ذریعہ آمدنی کا نہیں رہا اور جوانی بھی ڈھل گئی۔ امیر جان نے لکڑی کی ٹھیکری کر لی اور اسی میں ایک طرف کچھریل ڈال کر کوٹھے ہی پر کے ایک آدمی کے ساتھ رہنے لگیں۔“

”اور دلربا اور اللہ رکھی۔“

”دونوں نے اپنے اچھے دنوں میں آگے کی زندگی کا سامان کر لیا تھا۔“ جہاں دار بیگم نے بتایا: ”دلربا وہ جو تمہارے نخاس والی چوڑی سڑک ہے اسی پر ایک بڑی عمارت میں اچھے کرائے پر رہنے لگیں۔ لیکن.....“

”لیکن.....؟“

اگرچہ بود زاده شہریار

پرستار زاده نیاید بکار

جہاندار بیگم نے یہ شعر پڑھا پھر پوچھا: ”مطلب سمجھے۔“
”نہیں۔“

”لوٹدی بچہ کام نہیں آتا چاہے وہ بادشاہ سے پیدا ہوا ہو۔“

مطلب سمجھا کر جہاندار بیگم بولیں:

”تو جو اولادیں ہوئیں وہ کوٹھے پر آنے والے بگڑے رئیسوں کی۔ سب آرام طلب۔
کھانے پینے کے لالے پڑ گئے۔ کرایہ بھی مشکل ہی سے دے پاتیں۔“
”اور اللہ رکھتی؟“

”انہوں نے اسی کے آگے جہاں پتھر والا کنواں ہے وہاں ایک عمارت بنوالی۔ لیکن ان
کا حال بھی وہی تھا۔ کوئی اور کھانے کمانے والا نہیں تھا۔ ایک نواسی تھی مہ ناز گلا اچھا تھا لیکن
کب تک گاتی، ناچ سیکھا نہیں۔“

”تو دن تینوں کے خراب گزرے۔“

”اس پیشے میں یہی ہے۔ آغاز اچھا، انجام برا۔“ یہ کہہ کر جہاں دار بیگم نے مجھ سے کہا:
”اب جاؤ۔ میں دن کے کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کرتی ہوں۔ باقی باتیں کل۔“



میں جہاں دار بیگم کی حویلی جاتا اور وہاں کتابیں دیکھتا رہا لیکن وہ مسودہ جس کی مجھے
تلاش تھی ابھی تک میرے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ میں نے کتابوں کے اس بہت بڑے ڈھیر سے
بہت سی کتابیں چھانٹ کر الگ کر لی تھیں۔ کتابوں کی چھنٹائی کے دوران کبھی سلیمان میرا کھانا
کمرے پر لے آتی اور کسی کسی دن جہاں دار بیگم مجھے بلا کر دسترخوان پر اپنے ساتھ کھلاتیں اور
کتابوں کی چھنٹائی کا حال پوچھتیں۔ مسودے کے اب تک نہ ملنے پر ایک دن بولیں:
”شاید وہ کتاب وہیں چھوٹ گئی ہو جہاں سے عمو جان کی چھوٹی ہوئی کتابیں
آئی تھیں۔“

”اگر وہاں ہوتی تو اب تک مجھے معلوم ہو جاتا۔“ میں نے کہا:

”وہ کیسے؟“

”نادر آغا صاحب جو پرانی کتابوں کو بیچتے خریدتے ہیں، اسی علاقے میں رہتے ہیں۔“

میں سب سے پہلے انہیں سے ملا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”اگر وہ کتاب وہاں ہوتی تو انہیں اس کا علم ضرور ہوتا۔“ یہ کہہ کر انہیں بتایا: ”جو چھٹائی کے لئے رہ گئی ہیں، میرا دل کہتا ہے اسی میں ہوگی۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔ اتنے دن سے لگے ہو۔ محنت رنگ لائے گی۔“

”اچھا ایک بات بتائیے۔“ میں نے جہاں دار بیگم سے پوچھا۔

”کیا؟“

”امراؤ جان نام کی دو ناچنے والیاں تھیں یا ایک؟“

”ایک۔“

”بہت سے لوگ کہتے ہیں دو تھیں۔“

”نہیں ایک ہی تھیں اور یہ وہی ہیں جن کا ذکر عمو جان نے کیا ہے۔“ جہاں دار بیگم نے کہا۔ ”ہمارے کچھ عزیز وہیں بزازے کے ہیں۔ ایک زمانے تک ہمارا آنا جانا وہاں بہت رہا۔ عمو جان نے امراؤ جان والی کتاب میں ذکر کیا ہے بزازے کا۔“

”جی۔“

”کہاں پر، بتاؤ۔“

”جہاں خانم سے ان کی بیٹی بسم اللہ کے لڑنے کا ذکر ہے۔ وہیں پر لکھا ہے کہ بسم اللہ جان خانم سے لڑ کے بزازے کے پچھواڑے کوئی مکان تھا، وہاں جا کر رہیں تھیں کچھ دنوں کے لئے۔“

”ہاں۔ وہ اسی مکان کے پہلو میں تھا جہاں ہمارے عزیز رہتے تھے۔“ جہاں دار بیگم بولیں: ”تو وہ عزیز بتاتے تھے کہ پورے ٹکسال میں اور چوک والی سڑک کے دونوں طرف یہ ناچنے والیاں رہتی تھیں۔ ان میں سے بہت سوں کے نام بہت ملتے جلتے تھے۔“ یہ کہہ کر انہوں نے آگے بتایا: ”انہیں میں ایک امراؤ تھیں جو سنڈیلے کی، وہ جو ملیج آباد کے آگے ہے، رہنے والی تھیں چوک میں آ کر بسنے کا حال نہیں معلوم بس یہ معلوم ہے کہ انہوں نے جان کے بجائے بیگم لگایا تھا اپنے نام کے آگے۔“

”کیوں؟“

”طوائف کا ٹھہر نہ لگ جائے اُن پر۔ لیکن کام وہی ناچنے گانے ہی کا کرتی تھیں۔“

چھپ چھپا کر شہر سے باہر مجرے کو جاتیں۔ گلا اچھا نہیں تھا، جسم میں تھرکن بھی نہیں تھی۔“
انہوں نے کہا۔ ”بھاؤ بتا نہیں پاتی تھیں اس لئے بہت کم مجرے ملتے۔ انہیں امراؤ بیگم کی وجہ
سے لوگ سمجھنے لگے کہ امراؤ جان دو تھیں۔“

”کسی اور نے یہ نہیں بتایا۔“

”کوئی اور بتا بھی نہیں سکتا۔“ جہاں دار بیگم نے کہا۔ پھر بولیں: ”وہ تو عمو جان اور ان کی
اس کتاب کی وجہ سے ہمارے گھر میں ان سب کا اتنا زیادہ ذکر ہوتا کہ بہت کچھ بھول جانے
کے بعد بھی.....“

”بہت کچھ آپ کو یاد رہ گیا۔“

”ہاں۔“ جہاں دار بیگم بولیں۔ پھر سلیمین کو آواز دے کر ایک کٹورا پانی لانے کے لئے
کہا اور پانی سے بھرا کٹورا ختم کرنے کے بعد بولیں:
”زیادہ بولو تو گلا خشک ہونے لگتا ہے۔“ پھر کہا:

”اور سنو! یہ جو امراؤ بیگم تھیں یہ بہت حسین تھیں بلکہ ان کے خاندان میں سب کی
صورتیں بہت اچھی تھیں اور لطف کی بات یہ کہ امراؤ بیگم کو چھوڑ کر گلا بھی سب کا بہت اچھا تھا۔“
پھر اپنا خاصہ ان کھولتے ہوئے بولیں:

”امراؤ بیگم کی بیٹی سردار جہاں بہت عمدہ گاتی تھیں۔ بہت پکی آواز تھی ان کی۔ اور ان
کی بھانجی اقبال بیگم جنہیں سب لوگ رجو کہتے تھے ان کی آواز تو دور دور تک مشہور تھی۔ اسی
آواز نے انہیں رجوڑے تک پہنچا دیا اور.....“ جہاں دار بیگم کہتے کہتے رکیں۔

”اور.....؟“ میں نے پوچھا۔

”گانے والی سے محل والی بن گئیں، گانا چھوڑ سوز اور نوحہ پڑھنے لگیں۔ اب اُس محل کی
عزاداری انہیں کے دم سے ہے۔“ یہ بتا کر بولیں:

”اب کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ اچھن بی کی اولاد میں ہیں۔“

”کون اچھن بی؟“

”سندیلے والی۔ ناچ گانا جن کا پیشہ تھا، لکھنؤ میں ان لوگوں کے دو گھر تھے۔“

”کہاں؟“

”ایک تو نخاس والی سڑک پر۔ وہ جو چڑیا بازار ہے اس کے فوراً بعد۔“
”اور دوسرا؟“

”نخاس سے جو سڑک رکاب گنج کی طرف گئی ہے، اسی پر کچھ دور چل کر بائیں طرف۔“
جہاں دار بیگم نے کہا۔ پھر بولیں: ”پتہ نہیں وہ گھر ہیں کہ بک گئے۔“
”آپ تو بہت جانتی ہیں ان لوگوں کے بارے میں۔“

”رجواڑے میں جانے سے پہلے رتو ہر بڑی مجلس میں سوز پڑھنے کے لئے بلائی جاتی تھیں۔ مجلس کے بعد ان کے بارے میں جو باتیں ہوتیں، انہیں میں یہ سب سننے کو ملتا۔“
”آپ کی والدہ نے امراؤ جان کو بھی سنا تھا، سوز پڑھتے۔“

”نہیں بتا چکی ہوں وہ اپنے ہی لوگوں میں پڑھتی تھیں۔ خانم کے یہاں پورے محرم گانا
بجانا موقوف رہتا۔ اس کی جگہ سوز خوانی ہوتی، مرثیہ پڑھا جاتا اور اس میں اس پیشے کے
سارے لوگ شریک ہوتے۔“
”سارے لوگ؟“

”ہاں جو عزاداری کرتے تھے وہ بھی اور جو نہیں کرتے تھے وہ بھی۔ ان روزوں آپس
میں یہ نفرتیں نہیں تھیں۔ اور اس پیشے والوں میں تو بالکل بھی نہیں تھیں۔“
”اچھا اب آپ آرام کیجئے۔ میں نے بہت کام کر ڈالا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اب میں
دو چار دن بعد آؤں گا۔ ایک سا کام کرتے کرتے جی اوب گیا۔“
”ٹھیک ہے کام تمہارا ہے۔ جس طرح چاہو کرو۔“
”تو اجازت دیجئے۔“ یہ کہہ کر میں جہاں دار بیگم کو سلام کر کے ان کی حویلی سے باہر نکل آیا۔

○

جہاں دار بیگم کی حویلی میں مسودے کی تلاش والا کام روک دینے کے بعد میں نے ایک
دن گھر پر آرام کیا۔ اسی آرام کے دوران مجھے خیال آیا کہ اپنا آبائی محلہ چھوڑے ہوئے مجھے
زمانہ گزر چکا ہے۔ جہاں دار بیگم نے اپنی حویلی میں اس محلے اور اس کے اطراف کی بہت سی
باتیں مجھ سے کی تھیں اس لئے دوسرے دن سویرے سویرے میں اپنی پرانی رہائش والے
علاقے کی طرف نکل پڑا اور سب سے پہلے پھانک مرزا منعم بخت کا رخ کیا۔ پھانک میں

داخل ہوتے ہی میں نے فلم والی ریحانہ کے مکان کی طرف دیکھا تو اس کے دروازے پر نئی صورتیں نظر آئیں اور اس کے باہری حصے میں جہاں ریحانہ کی ماں شاہجہاں کی بڑی بہن بیگم بائی رہتی تھیں، کوئی اور رہنے لگا تھا۔ پھانک کے دوسرے لوگوں سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ریحانہ کا مکان کلکتے سے آئے ہوئے کسی رئیس نے خرید لیا ہے، شاہجہاں ڈی نواب کے ساتھ کہیں اور چلی گئی ہیں، بیگم بائی اللہ کو پیاری ہو گئیں اور ان کا نواسا جس کے ساتھ میں ریحانہ کے مکان والی ریہرسل دیکھا کرتا تھا، کسی مسجد کے حوض میں جہاں وہ نہانے جایا کرتا تھا ڈوب کر مر گیا۔ میں اپنے پرانے والے مکان سے ملے ہوئے مکان میں داخل ہوا تو اس کے آنگن میں پہلے ہی کی طرح ماسٹر آفتاب ایک کرسی پر بیٹھے آٹے کی گولیاں بنانا کر بوتروں کے سامنے ڈال رہے تھے۔ اس پھانک میں ماسٹر آفتاب کے آنے اور یہاں آکر رہ پڑنے کی بھی عجیب کہانی ہے۔ وہ سہارنپور سے لکھنؤ پڑھنے کے لئے آئے تھے۔ اُن کی طالب علمی کے زمانے ہی میں مرزا منعم بخت نے انہیں اپنے نواسے کو انگریزی پڑھانے کے لئے اتالیق مقرر کیا اور مکان میں رہنے کے لئے جگہ بھی دی۔ پھر وہ پھانک کے دوسرے بچوں کو پڑھانے لگے۔ اور جب منعم بخت کی حویلی بک گئی تو ماسٹر آفتاب اسی پھانک میں بنی ہوئی ایک چھوٹی سی مسجد میں رہنے لگے اور ان سے پڑھنے والے سارے بچے جو انہیں اتا کہتے تھے، اسی مسجد میں اُن سے پڑھنے لگے۔ میں نے ماسٹر آفتاب کو سلام کیا تو وہ ٹھٹھک کر بولے:

”ہائیں! یہ آج کہاں نکل پڑے، اتنے زمانے بعد۔“

”ایک معاملے میں بہت الجھا رہا، اب بھی اسی میں الجھا ہوا ہوں، ادھر آنے کا موقع نہیں ملا۔“

”کون سا معاملہ؟“

”بتاؤں گا آپ کو۔“

ماسٹر آفتاب سے یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اندر سے مکان مالک ظہیر حسن کی سب سے بڑی بیٹی فوزیہ نکل آئی۔ ماسٹر آفتاب کی طرح اس نے بھی اتنے زمانے بعد میرے اس طرف آنے پر حیرت ظاہر کرتے ہوئے پوچھا:

”کہاں غائب رہے؟“

”بس، موقع نہیں ملا ادھر آنے کا۔“ میں نے کہا۔ ”یہاں تو بہت کچھ بدل گیا۔“

”ہاں بتایا ہوگا باہر والوں نے۔“

”بیگم بائی کی لڑکی زہرہ کہاں چلی گئیں؟“ میں نے پوچھا۔

”یہیں کہیں قریب میں رہنے لگی ہیں۔“

”اور ان کی چھوٹی بہن، سلمیٰ؟“

”نوٹشکیوں میں ناچتی ہیں۔“

”اور زہرہ کے دونوں بھائی؟“

”بڑے والے سلمیٰ کے ساتھ نوٹشکی میں گانا گاتے ہیں، چھوٹے کا نہیں معلوم۔“

فوزیہ سے میری بات چیت کے بیچ ماسٹر آفتاب کبوتروں کے آگے آٹے کی گولیاں

ڈالتے ڈالتے اچانک کرسی سے اٹھے اور فوزیہ سے بولے:

”آفاق کو پڑھانے جا رہا ہوں، ادھر سے کہیں اور جاؤں گا۔ شام تک لوٹوں گا۔“

اُن کے جانے کے بعد میں نے فوزیہ سے پوچھا:

”یہ آفاق کون ہیں؟“

”کٹاکے بھانجے۔“

”کون کٹاکے؟“

”سردار جہاں، سنڈیلے والی۔“

”وہ جو چڑیا بازار کے آگے رہتی ہیں۔“

”ہاں۔“

”زندہ ہیں یا.....“

”زندہ ہیں لیکن بہت لٹ گئی ہیں۔ نوے کو پہنچ رہی ہیں۔“

”بات دات کر لیتی ہیں۔“

”ہاں جب بولتی ہیں تو بڑھا پاناغاب ہو جاتا ہے۔ لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو۔“

”ملنا ہے ان سے۔“

”کیوں؟“

”کچھ پوچھنا ہے۔“

”کس بارے میں؟“

”تمہیں نہیں بتاؤں گا۔“

”کیوں؟“

”تم نہیں سمجھو گی۔“

”تو ٹھیک ہے کسی دن آ کر ابا کے ساتھ چلے جاؤ، وہ ملوادیں گے۔“

”کل آؤں گا۔ ماسٹر صاحب سے کہنا وہاں جائیں تو مجھے ساتھ لے کر جائیں۔“

چلتے چلتے میں نے فوزیہ کے والد ظہیر حسن کے بارے میں پوچھا:

”اُو کہاں ہیں؟“

”ہوٹل پر۔ وہیں مل لو جا کر۔“



فوزیہ کے والد ظہیر حسن اپنے زمانے کے دہنگوں میں تھے۔ پرانے لکھنؤ میں ہر کوئی انہیں جانتا تھا۔ گٹھا ہوا جسم، بڑی بڑی مونچھیں، کشادہ سینہ اور اس پر گھنے بال۔ گرمیوں میں صرف تہد اور بنیان پہنتے تھے۔ کہا جاتا ہے جوانی میں دو چار کی جان بھی لے لی تھی لیکن حکومت میں خاندان کا رسوخ تھا اس لئے بچ نکلے۔ پورے علاقے میں ظہیر و کے نام سے مشہور تھے۔ بڑے آتش مزاج تھے۔ غصہ آتا تو سامنے والے کی ایسی تیسی کر دیتے۔ بزازے کی گلی سے باہر دائیں طرف ان کا چائے کا ہوٹل تھا۔ ان کی چٹی لگی ہوئی چائے بہت مشہور تھی جسے پینے کے لئے لوگ دور دور سے آتے تھے۔ لیکن اس ہوٹل پر لوگوں کے آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ظہیر حسن لکھنوی گالیوں کو شاعرانہ رنگ دینے کے ماہر تھے۔ لوگ آتے چائے پیتے اور جان بوجھ کر کوئی نہ کوئی ایسی بات چھیڑتے جس پر مشتعل ہو کر ظہیر حسن کے مونہہ سے گالیاں نکلنے لگتیں اور وہ اُن گالیوں میں نئے نئے پہلو پیدا کرتے چلے جاتے۔ طرح طرح کی ایجاد کی ہوئی گالیوں میں اپنا کمال دکھانے کے بعد ظہیر حسن نظم کے میدان میں قدم رکھتے اور مردوزن کی بے حجابانہ قریبتوں کا ایسا شاعرانہ بیان کرتے کہ لوگ داد دیے بغیر نہ رہ پاتے۔ اُن کی گالیاں سننے کے لئے یہاں بیٹھ کر چائے پینے والوں کے پاس بڑے آسان طریقے تھے۔

فوزیہ کے والد ظہیر

ہوٹل میں پڑی ہوئی تپائی پر بیٹھتے ہی کوئی کہتا:
”ظہیر و بھائی آج دودھ لگ گیا ہے۔“

یہ سنتے ہی ظہیر حسن شروع ہو جاتے اور جب ان کی ماں بہن ختم ہوتی تو دوسرا چائے کا
ایک گھونٹ پی کر کہتا: ”آج چٹی لگانا بھول گئے۔“

تیسرا شکر کم ہونے کی شکایت کرتا اور ہر بار ظہیر حسن کے مونہہ سے نئی نئی گالیاں نکلنے
لگتیں۔ ان کے ہوٹل پر طرح طرح کے لوگ جمع ہوتے۔ ان میں شاعر اور ادیب بھی تھے، کام
دھندے والے بھی اور وہ لاخیرے بھی جو صبح گھر سے نکلنے کے بعد رات گئے لوٹتے۔ ظہیر حسن
شاعری کے بہت شوقین تھے۔ طبیعت موزوں تھی، اس لئے کبھی کبھی ہلکے پھلکے شعر بھی کہہ
لیتے۔ جس چوڑی سڑک پر ان کا ہوٹل تھا اس کے آس پاس رہنے والے شاعروں میں سے
جب کوئی چائے پینے کے لئے آ جاتا تو بڑے شوق سے اس کے شعر سنتے اور اسے اپنے شعر
سناتے۔ ان میں سے بیشتر شاعر ان کے یہاں قرض کی چائے پیتے تھے اور ان میں سے کسی کسی
ہی کا حساب چکلتا ہو پاتا۔ جوش اور جگر ان کے محبوب شاعر تھے اور گم نام شاعروں کا فحش کلام ہر
وقت ان کی زبان پر رہتا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ کلام ان کے ہاتھ لگ گیا تھا یا اسے انہوں نے
دوسروں سے سن کر یاد کر لیا تھا۔ لکھنؤ کے مشہور طبیب حکیم صاحب عالم کا مکان ان کے ہوٹل
سے دو قدم پر تھا۔ جب ان کے ہوٹل پر بہت سے شاعر ایک ساتھ جمع ہوتے تو ظہیر حسن ان
سب سے بڑے فخر سے کہتے: ”جوش صاحب، حکیم صاحب عالم کے یہاں جانے سے پہلے
یہاں بیٹھتے تھے۔ پہلے میری غزل سنتے پھر اپنی نظم سناتے، پھر میں ان کے لئے خاص طرح کی
چائے بناتا۔“ جب وہ یہ کہہ رہے ہوتے تو چائے پینے والوں میں سے کوئی پوچھتا:

”اس کے بعد.....“

”اس کے بعد.....“ یہ کہہ کر وہ پوچھنے والے کو قہر آلود نگاہوں سے گھورتے پھر کہتے:

”اس کے بعد مجھ سے وہی سنتے جو تم لوگوں کو سناتا ہوں۔“

”سن کر کیا کہتے؟“

”کہتے، ظہیر و تم نے ملیح آباد کو پیچھے چھوڑ دیا۔“ یہ کہہ کر شان سے بتاتے: ”انعام میں

آموں سے بھری ٹوکری لاتے میرے لئے۔“

ظہیر حسن بڑے کمال کے آدمی تھے۔ اپنے قہر و غضب کے باوجود کسی کا دکھ ان سے دیکھا نہ جاتا۔ چائے کے چھوٹے سے ہوٹل کی آمدنی میں پورا کنبہ سنبھالے ہوئے تھے اور بہت سے عزیزوں اور قرابت داروں کی نگہداشت بھی انہیں کے ذمے تھی۔ شام ہوتے ہی ان کے ہوٹل کے باہر دو چار فقیر آ کر بیٹھ جاتے اور ظہیر حسن بازار سے خمیری روٹیاں اور آلو کا سالن منگا کر انہیں کھلاتے۔ ایک فقیر نے جو چلنے سے معذور تھا ان کے ہوٹل کے اس حصے کو جہاں ان کی بھئی کا کونکہ ڈالا جاتا اپنا مستقل ٹھکانہ بنالیا تھا۔ ظہیر حسن اسے کھلاتے پلاتے بھی تھے اور نہلاتے دھلاتے بھی۔ کسی کسی دن غصہ آتا تو اسے خوب گالیاں دیتے اور اس کی گدڑیوں کا گٹھر بنا کر اسے وہاں سے چلے جانے کا حکم سنا دیتے۔ لیکن دوپہر ہوتے ہوتے کچھ کہے بغیر اپنا حکم واپس لے لیتے اور اس کی گدڑیوں کا گٹھر کھول کر کھانے کی سینی اس کے سامنے لگا دیتے۔



بزازے والی سڑک کے دوسری طرف چوک والی گلی کی فٹ پاتھ پر کچھ ایسے مکان تھے جن میں معمولی آمدنی والے لوگ رہتے تھے۔ ان مکانوں کے نیچے بنی ہوئی دکانوں میں بہت سی بازار و عورتیں آ کر بس گئی تھیں۔ اُن سب نے ان دہری دکانوں میں آگے پیچھے دو مسہریاں ڈال لی تھیں۔ ان دونوں مسہریوں کے درمیان ایک پردہ پڑا رہتا۔ مسہریوں پرستے داموں والی موٹی دریوں کے اوپر کم پیسوں والی چھالٹین کی چادریں پڑی رہتیں۔ دونوں مسہریوں کے پایوں کے اوپری حصوں پر ریشمی کپڑوں سے بنے معمولی قسم کے رنگ برنگے پھولوں کے گچھے لگے رہتے اور تکیوں پر سادہ سی کڑھائی والے غلاف چڑھے رہتے۔ باہر والی مسہری بیٹھنے کے لئے اور اندر والی بیٹھک (ہم بستری) کے لئے استعمال ہوتی۔ اندر والے حصے میں ایک معمولی سا آئینہ لگا رہتا اور وہیں ایک چھوٹی سی میز پر ان عورتوں کی آرائش کا معمولی سامان سجا رہتا۔ اسی حصے میں ان سب نے جگہ جگہ کھونٹیاں لگا کر اپنے کپڑوں کے ٹانگنے کا انتظام کر لیا تھا۔ کسی کسی دکان میں کسی فلمی ہیروئن کی تصویر بھی ایک معمولی سے فریم میں دیوار پر لگا دی گئی تھی۔ جب ان عورتوں کو نہانا دھونا ہوتا، یہ سڑک پار کے ٹل سے بالٹیاں بھر لاتیں اور ایک پلنگ کی آڑ کر کے نہا دھو لیتیں۔

بہت سے رکشے والے جوکل تک رکشہ چلا کر مزدوری کماتے تھے، اب ان عورتوں کی

کمانی کھانے لگے تھے۔ یہ سب قصبوں اور دیہاتوں سے بہلا پھلا کر انہیں بھگااتے اور یہاں سا کر ان سے پیشہ کراتے۔ یہ عورتیں دن میں کئی بار ظہیر حسن کے ہوٹل سے چائے رچاتیں اور کبھی کبھی خود بھی چلی آتیں۔ انہیں میں ایک خالدہ بھی تھی۔ جب وہ نئی نئی آئی تھی تو اس کی صورت اور کاٹھی کے بڑے چرچے تھے۔ بزازے اور اس کے آس پاس کے گلوں کے آوارہ نوجوان اس کے ارد گرد منڈلاتے رہتے مگر اس کے پیشے میں عشق اور رومان کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ ان سب کو اپنی باہر والی مسہری پر بیٹھی دیکھا کرتی اور مسکراتی رہتی۔ خالدہ کا آدمی شفیق جو اسے بھگا کر لایا تھا اس پر کڑی نگاہ رکھتا۔ شفیق نے ایک اور رکشے والے کو جو رضا بانگے کے نام سے جانا جاتا تھا خالدہ کے چھوٹے موٹے کاموں کے لئے رکھ چھوڑا تھا۔ رضا بانگے خالدہ کے لئے گا ہک بھی لاتا، اس کے کام بھی کرتا اور موقع پا کر اس سے خوش فطیاں بھی شروع کر دیتا۔ خالدہ جب پانسنگ شو سگریٹ پیتی ہوئی ظہیر حسن کے ہوٹل پر آتی تو وہاں بیٹھے ہوئے شاعر اسے اس وقت تک کنکھیوں سے دیکھتے رہتے جب تک وہ چلی نہ جاتی۔ ان میں سے ایک آدھ نے اس پر کچھ شعر بھی کہہ ڈالے تھے۔

میں جب ظہیر حسن سے ملنے ہوٹل پہنچا تو وہ کسی گا ہک کو بڑی بڑی گالیاں اس لئے دے رہے تھے کہ اس نے چائے پینے کے لئے انہیں رائے کی چوٹی دی تھی۔ ظہیر حسن نے اسے اپنی ہتھیلی پر گھس کر دیکھا اور جیسے ہی ان کی ہتھیلی پر ہلکے سبز رنگ کی لکیر بنی انہوں نے وہ چوٹی دیکھتی ہوئی محنتی میں ڈال دی۔ جعلی چوٹی دینے والے گا ہک کو بہت سی گالیاں دینے کے بعد جب ان کا قصہ کم ہوا تو میں نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے کچھ دیر تک مجھے دیکھتے رہنے کے بعد کہا:

”جیتے رہو۔ اسی شہر میں ہو یا کہیں اور چلے گئے۔“

”نہیں، یہیں ہوں۔“

”اتنے دن بعد آگے تو ہم یہی سمجھیں گے شہر چھوڑ دیا۔“

یہ کہہ کر انہوں نے میرے لئے چائے بنائی اور دو سکے ہوئے تو سوں پر مکھن لگا کر انہیں بیٹ میں رکھا پھر چائے کی پیالی اور تو سوں کی پلیٹ میرے سامنے رکھتے ہوئے بولے:

”پیو۔ گھر ہو کر آ رہے ہو؟“

”جی۔“

یوں بھی ہم تو بازار والے ہیں۔ ایک ہی طرح سے اپنی ٹانگیں تڑواتے ہیں۔“ خالدہ نے کہا۔
 پھر بولی: ”ہمارا بھی جی چاہتا ہے کہ بڑے لوگوں کے یہاں سے کوئی سواری لے کر آئے، ہمیں
 لے جائے۔ سو پچاس آدمی ہمارا ناچ گانا سنیں اور ہم پر پیسے لٹائیں۔“
 ”میں تو کہتا ہوں رضا سے شادی کرلو۔“ ظہیر حسن نے کہا:

”نہیں۔ ایسا کروں گی تو شفیق کا کیا ہوگا۔ بھوکوں مر جائے گا۔ اب تو کسی کو بھگا کر بھی
 نہیں لاسکتا۔“ خالدہ نے کہا۔ پھر بولی: ”رضا مجھے چاہتا بہت ہے، کئی بار کہہ چکا ہے یہ ٹھکانہ
 چھوڑ، سامنے والی گلی میں رہ میرے ساتھ۔ سب شریف لوگ رہتے ہیں وہاں۔ اپنی عورت
 سے خوش نہیں ہے۔“ پھر اپنی دوسری سگریٹ جلاتی ہوئی بولی: ”یہ بھی کہتا ہے تو بہت گوری ہے
 محرم میں کالے کپڑے پہنے گی تو بہت اچھی لگے گی۔“
 ”ٹھیک تو کہتا ہے۔“

”نہیں میں تعز یہ نہیں رکھ سکتی۔“

”کیوں؟“

”ہم آپ کے مذہب والے نہیں ہیں۔“

”لیکن رمضان تو رکھتی ہے۔ اور بہت پہلے سے رکھتی ہے۔“ ظہیر حسن نے اس علاقے
 میں بہت پہلے سے آئی ہوئی ایک بازار و عورت کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔
 ”ہاں، رمضان تو رکھتی ہے۔ رات بھر اس تعزی کے سامنے بیٹھ کر روتی ہے۔“ خالدہ
 بولی۔ پھر بتایا: ”ہم لوگوں کو بلا کر لے جاتی ہے۔ نوکی رات ہم اُسی کی وجہ سے کالے کپڑے
 پہنتے ہیں۔ برابر والیوں میں سے کئی کی چوڑیاں بھی تڑوائی ہیں اس نے۔“

خالدہ ظہیر حسن سے یہ باتیں کر رہی تھی کہ ایک دو شاعر ہوٹل میں آ کر بیٹھ گئے اور نظر
 بچا بچا کر بغیر دوپٹے والی خالدہ کو دیکھنا شروع کر دیا اور ایک دوسرے کو اپنے شعر بھی سنانے
 لگے۔ خالدہ ان سب سے بے نیاز ہوٹل سے تھوڑی دور پر گدڑیوں کے بیچ بیٹھے ہوئے فقیر کو
 دکھ بھری نگاہ سے دیکھتے ہوئے بولی:

”ظہیر و بھائی اسے ایک چائے اور ایک بتا شادے دیجیے۔“ پھر چائے سے بھرا ہوا اپنا
 گلاس لے کر ان شاعروں پر ایک اچھتی سی نگاہ ڈالتی ہوئی سڑک کے اس پار چلی گئی۔ ہوٹل میں

بیٹھے ہوئے شاعر خالدہ کو سڑک پار کرتے ہوئے یوں دیکھتے رہے جیسے اس سے پہلے اس طرح چلتے ہوئے انہوں نے کسی کو نہ دیکھا ہو۔

خالدہ کے جانے کے بعد ظہیر حسن نے مجھ سے کہا:

”تم نے تو آنا ہی چھوڑ دیا اس طرف۔“

”آپ تو جانتے ہیں اماں سے مجھے کتنی محبت تھی۔“ میں نے کہا۔ ”ان کی موت کے بعد میں بہت دن تک گھر سے نہیں نکلا۔ پھر کچھ الجھنیں بھی آپڑیں۔“ میں نے انہیں بتایا۔

”آج کیسے نکل آئے۔“

”آپ سب کو دیکھنے۔“

اتنی دیر میں کسی گاہک نے چائے میں نمک نہ ڈالنے کی شکایت کی تو ظہیر حسن نے اسے فراشی گالیاں دینا شروع کر دیں۔

”کب کہا تھا نمک ڈالنے کے لئے۔ تیری.....“

”کہا تھا آپ نے سنا نہیں۔“

”بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات

سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر“

ظہیر حسن نے غالب کا یہ شعر پڑھ کر اسے ایک اور گالی دی اور اس کے برابر بیٹھے ہوئے ایک شاعر کو جو بیڑی جلا جلا کر چائے کے گھونٹ لے رہے تھے، مخاطب کرتے ہوئے کہا:

”اسے مطلب سمجھائیے غالب کے اس شعر کا۔“

میں ہوٹل میں بیٹھا ظہیر حسن کی یہ ساری باتیں سنتا رہا پھر اُن سے اجازت لے کر دوبارہ جلد آنے کا وعدہ کر کے ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ باہر نکلتے ہی میں نے سوچا کہ ادھر آیا ہوں تو چوک کا بھی ایک چکر لگا لوں۔ جب سے میں نے یہ علاقہ چھوڑا تھا، میں ادھر بہت کم آیا تھا اور آیا بھی تو چوک کی طرف نہ جاسکا۔ مجھے وہ خاتون بھی یاد آئیں جنہوں نے بہت پہلے مجھ سے کلچے نہاری منگوائے تھے اور میری طرف کا حال احوال پوچھا تھا۔ میں نے سڑک پار کی اور چوک والی گلی میں داخل ہونے سے پہلے خالدہ اور اس کے ساتھ والیوں کے ٹھکانوں کی طرف ایک نگاہ ڈالی۔ خالدہ اپنے ٹھکانے سے باہر پیپل کے پیڑ کے نیچے بانس کے پلنگ پر اپنی ہم

پیشہ عورتوں کے ساتھ بیٹھی سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے کر اپنے پیشے والی زبان میں کسی
خوائے والے کو کھری کھری سنار ہی تھی۔ اُسے برا بھلا کہتے کہتے اس نے اپنے بلاؤز سے ایک
چھوٹا سا رنگین بٹوہ نکالا اور اس خوائے والے کو پیسے دیتے ہوئے اس سے بولی:
”یہ تیرے سودے کے اور یہ تیری مٹھائی کے۔ سید کے یہاں سے امرتی خرید کر گھر لے
جانا، اپنی جو رو کے لئے۔“

چوک والی گلی میں داخل ہو کر میں تیزی سے اس مکان کی طرف بڑھا جہاں وہ کلچے نہاری
منگوانے والی خاتون رہتی تھیں۔ مکان کے دروازے پر پہنچ کر میں نے دیکھا وہاں ایک تختی لگی
ہے جس پر لکھا تھا۔ ”بغیر اجازت اندر آنا منع ہے۔“ میں اس تختی کو دیکھ ہی رہا تھا کہ اندر سے
ایک شخص نے نکل کر مجھے بہت گھور کر دیکھا اور اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے کچھ پوچھے میں آگے
بڑھ گیا۔ میرا جی چاہا کہ میں اس سے پوچھوں کہ اس مکان میں رہنے والی خاتون کہاں گئیں
لیکن میری ہمت نہیں پڑی۔ اس مکان میں ان خاتون کا نہ ہونا مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں نے
ڈاک خانے کے سامنے والی ایک چھوٹی سی دکان میں جہاں اسکو لی بستے بنائے جا رہے تھے،
کام کرنے والے ایک شخص سے اس مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا:

”وہ سامنے والے مکان میں ایک بوڑھی عورت رہتی تھیں.....“

”چلی گئیں مکان بیچ کر۔“

”بتا سکتے ہیں کہاں؟“

”جاتے وقت بتایا نہیں۔“

”مکان کیوں بیچ دیا۔“

وہ شخص دکان میں کام کرنے والے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھ کر مسکرایا پھر بولا:

”پیسوں کی ضرورت رہی ہوگی۔“ پھر کہا: ”کوٹھے بند ہوئے تو سب نیچے آ گئے۔ نیچے

کام نہیں چلا تو چلے گئے۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں۔“

”کہاں رہتے ہیں؟“ جواب دینے کے بجائے اس نے پوچھا۔

”پہلے اسی طرف رہتا تھا، اب کہیں اور رہتا ہوں۔“

”اسی طرف رہتے تھے تو سمجھ لینا چاہئے۔“ یہ کہہ کر وہ دوسرے کام کرنے والوں کی طرف دیکھ کر پھر مسکرایا۔

میں نے اس سے الجھنا مناسب نہیں سمجھا اور آگے بڑھ گیا۔ گلی کے بعد والے چھتے میں پہنچا تو وہاں کچھ اوباش نوجوان ایک دوسرے کو بری بری گالیاں دے رہے تھے۔ میں ان کی گالیاں سنتا ہوا چوک والی تنگ سڑک پر آیا اور بائیں طرف مڑ کر رحیم کی دکان پہنچ گیا۔ میں نے سوچا اس طرف آیا ہوں تو رحیم کے کلچے نہاری بھی کھالوں۔ یوں بھی مجھے تھوڑی تھوڑی بھوک لگنے لگی تھی۔ رحیم کی دکان تحسین علی خاں کی مسجد کے عین سامنے اور چوک کے ایک مشہور کوٹھے کے نیچے تھوڑی سی اونچی جگہ پر تھی۔ اس دکان میں داہنی طرف تنور تھا جس میں بغیر ہاتھ روکے کلچے لگائے جا رہے تھے اور اچھی طرح سنک جانے کے بعد انہیں باہر نکالا جا رہا تھا۔ داہنی طرف ایک شلوکا اور چوخانے کی تہہ پہنے رحیم نہاری کے پتیلوں کے سامنے بیٹھے تھے۔ پتیلوں کے برابر بڑی بڑی کٹوریوں میں پیاز کے تلے ہوئے لچھے، کٹی ہوئی ہری مرچ اور ہر ادھنیا رکھا تھا۔ رحیم اپنے ملازموں کو گالیاں دے دے کر دکان میں بیٹھنے والے گاہکوں کے لئے نہاری نکال رہے تھے۔ وہ پہلے طشتریوں میں تیرہ ڈالتے پھر پیاز کے لچھے اور ہری مرچ کے قتلے پھر ہر ادھنیا۔ پھر چٹکی سے ایک دو مسالے چھڑک کر طشتریاں ملازموں کی طرف بڑھا دیتے۔ میں نے جب ان خاتون کے لئے نہاری کلچے لئے تھے اُس وقت رحیم اتنے بوڑھے نہیں تھے، اب وہ اسی کے اوپر پہنچ رہے تھے مگر آواز میں اب بھی وہی کڑک تھی۔ میں جب دکان میں داخل ہو رہا تھا تو ایک بچہ اپنی ایڑیوں پر کھڑے ہو کر اپنی المونیم کی چھوٹی سی ڈولچی کسی طرح رحیم تک پہنچا کر ان سے کہہ رہا تھا:

”رحیم دادا! دو پیسے کی نہاری۔“

رحیم نے اس کی ڈولچی پٹک کر اسے ایک موٹی سی گالی دیتے ہوئے کہا:

”ابے اپنے باپ سے کہنا دو پیسے کا زمانہ گیا۔ بھاگ یہاں سے۔“

”ہم اپنے لئے لینے آئے ہیں، ابا کے لئے نہیں۔“

رحیم نے یہ سنتے ہی اس کی ڈولچی نہاری سے بھر دی پھر اس سے پوچھا:

”کیا نہاری پینے کے لیے لیے جا رہا ہے۔“ یہ کہہ کر تنور پر بیٹھے ہوئے آدمی سے کہا:

”لو نڈے کو ایک کلچہ بھی دے دو۔“

جاءه

میں نے رحیم کی دکان میں بیٹھ کر نہاری کھانے کھائے اور اُن کی وہ گالیاں بھی سنیں جو بات بے بات وہ اپنے ملازموں اور کسی کسی گاہک کو دے رہے تھے۔ رحیم کی دکان سے اٹھ کر میں سامنے تحسین علی خاں کی مسجد کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر اس کے کُٹن میں پہنچ گیا۔ یہ مسجد اپنی خاص طرح کی تعمیر اور قسیدے کی اس محفل کے لئے بہت مشہور ہے جو رجب کی بارہویں تاریخ کو ہوتی ہے اور جس میں پہلے امام کی شان میں رات بھر منقبتیں پڑھی جاتی ہیں۔ مسجد کے صحن میں پہنچ کر میں داہنی طرف کے حوض کو پار کرتا ہوا نیچی بنی ہوئی دیوار کی منڈیر پر جا کر بیٹھ گیا اور قیاس لگانا شروع کیا کہ پھانک حیدر حسین کے آس پاس کے مکانوں میں کون سا کمرہ منشی احمد حسین کا ہو سکتا ہے اور کون سا وہ کمرہ ہو سکتا ہے جس میں امراؤ جان رہا کرتی تھیں۔ رسوا نے جس وقت پھانک حیدر حسین اور اس کے اطراف کا حال لکھا تھا اس وقت سے آج کے زمانے تک یہاں بہت کچھ بدل چکا تھا اس لئے منشی احمد حسین اور امراؤ جان کے کمروں والی جگہوں کا صحیح اندازہ لگانا بہت مشکل تھا۔ پھر بھی اس پھانک کی جگہ پر بنے ہوئے ایک دو مکانوں کو دیکھ کر میں نے یقین کر لیا کہ رسوا کے زمانے میں انہیں مکانوں کی زمین پر وہ کمرے بنے ہوں گے۔ میں کچھ دیر تک منڈیر پر بیٹھا رہا پھر مسجد کے وسیع اور کشادہ چبوترے پر چڑھ کر دیر تک مسجد کے میناروں اور گنبدوں کو دیکھتا رہا۔ مسجد کے بہت بڑے دالان میں منبر کے قریب بچھی ہوئی چٹائی پر بیٹھا ہوا ایک بہت بوڑھا شخص بہت دیر سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس علاقے میں بہت زمانے تک رہنے کے باوجود میں نے مسجد میں آ کر اسے اتنے غور سے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مسجد کے صحن اور دالان کے درمیان بنی ہوئی محرابوں کی روکاروں پر بہت عمدہ گلکاری اور خطاطی کی گئی تھی اور بیچ والی محراب کے اوپر بنی ہوئی سنگ مرمر کی چھ پٹریوں پر فارسی میں ایک قطعہ لکھا تھا۔ میں اس قطعے کو ایک ایک کر پڑھ رہا تھا کہ منبر کے قریب بیٹھا ہوا شخص میری پشت پر آ کر اسے بلند آواز میں پڑھنے لگا:

ایں خانہ کہ جلوہ گاہِ انوارِ جلیست
 تعمیرِ مقدس سعید ازلیست
 آصف زخرد سالِ بنایش پُرسید
 گفتا کہ مسجدِ تحسینِ علیست

قطعہ پڑھنے کے بعد مجھے اس نے اس کا مطلب سمجھایا پھر مجھ سے پوچھا:
 ”معلوم ہے یہ کس کے ہاتھ کا لکھا ہے؟“
 ”نہیں آپ بتائیں۔“

”اوپر کا سفید پتھر حافظ نور اللہ کے ہاتھ کا ہے۔ حافظ نور اللہ کا نام سنا ہے؟“
 ”نہیں۔“

”اپنے زمانے کے بہت عمدہ خطاط تھے۔ اس زمانے میں اُن سے بہتر نستعلیق کوئی نہیں
 لکھتا تھا۔“ یہ بتا کر بتایا:

”اور نیچے کا زردی مائل پتھر..... دونوں ایک ہی ہاتھ کے نہیں ہیں۔“
 ”نیچے والا پتھر کس نے لکھا ہے؟“

”اُن کے بیٹے حافظ ابراہیم نے۔“ انہوں نے کہا۔ پھر مجھے بتایا:
 ”آصفی مسجد کا پتھر بھی حافظ نور اللہ ہی کے قلم کا اعجاز ہے۔“

ان کے یہ بتانے سے میں سمجھ گیا کہ یہ کمر خمیدہ بزرگ مسجد کے بارے میں
 بہت کچھ جانتے ہیں۔

”یہ تحسین علی خاں کون تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”نواب ناظر میاں تحسین علی خاں شجاع الدولہ کے خواجہ سراؤں میں تھے۔“ انہوں
 نے بتانا شروع کیا: ”قوم کے کھتری تھے۔ مسلمان ہونے سے پہلے ان کا نام بھولا ناتھ تھا۔
 آصف الدولہ کے زمانے میں فیض آباد سے لکھنؤ آ گئے اور توشہ خانے کے داروغہ مقرر ہوئے۔“
 ”مسجد بنوائی بہت عمدہ ہے۔“ میں نے کہا۔

”غریبوں کا بہت خیال رکھتے تھے جب چوک کی آبادی بڑھنے لگی اور یہاں بازار لگنے لگا
 تو ایک سرائے بنوادی۔“ آگے بتایا: ”جب مسافر آ کر ٹھہرنے لگے تو بھٹیاریوں کو بھی بسادیا۔“
 ”وہ جو ٹکسال میں میوے والی سرا ہے وہی؟“

”نہیں، انہوں نے سرا مسجد کی پشت پر بنوائی تھی۔“

”اس مسجد کی سیڑھیوں پر کبھی میر تقی میر بیٹھا کرتے تھے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ سعادت علی خاں والا واقعہ بہت مشہور ہے۔ اور سنور رمضان کے مہینے میں اس

مسجد کی رونق بہت بڑھ جاتی تھی۔ ظہر سے پہلے رئیسوں کے مصلے بچھا دیے جاتے۔“ انہوں نے کہا۔ پھر بتایا: ”انیس و دہر ایک ہی وقت میں یہاں جمع ہوتے تھے اور ان کے چاہنے والے اشتیاق بھری نظروں سے انہیں دیکھتے تھے۔“

”آپ تو بہت جانتے ہیں اس مسجد کے بارے میں۔“

”جانوں گا کیوں نہیں۔ دو سو برس سے ہمارا ہی خاندان اس مسجد کو دیکھ رہا ہے۔“ وہ بولے۔ پھر کہا: ”مسجد ہی نہیں میں اس علاقے کی ایک ایک اینٹ سے واقف ہوں۔ مسجد کے اندر داہنی اور بائیں طرف جو مکان ہیں اس میں ہمارے ہی خاندان کے لوگ رہتے ہیں۔“

”تو آپ مرزا رسوا کو بھی جانتے ہوں گے۔“

یہ سن کر انہوں نے اپنی جھکی ہوئی کمر پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ پھر پوچھا: ”وہ امراؤ جان والے؟“

”جی۔“

”بالکل جانتا ہوں۔ اس مسجد میں برابر آتے تھے نماز پڑھنے۔ بچپنا تھا میرا، میں انہیں پہچانتا نہیں تھا۔“ انہوں نے کہا۔ ”لیکن جب انہوں نے کتاب امراؤ جان لکھی اور اس کی شہرت ہوئی اور میں کچھ اور بڑا ہوا، تب معلوم ہوا کہ یہ وہی صاحب ہیں جو پھانک حیدر حسین کے سامنے والے کوٹھے پر آتے تھے اور یہاں نماز پڑھ کر جاتے تھے۔“

”اُس کوٹھے پر، کون رہتا تھا؟“

”وہی امراؤ جان، جن پر انہوں نے کتاب لکھی ہے۔“

”لیکن لوگ کہتے ہیں امراؤ جان تھیں ہی نہیں۔“

”اب میں نے تو انہیں دیکھا نہیں لیکن سنتے یہی ہیں کہ بزازے سے چوک کی طرف آنے والی گلی کے ختم پر یہ جو چھتہ ہے یہ کبھی حیدر حسین کا پھانک تھا، یہیں تھا ان کا مکان۔“ انہوں نے کہا۔ پھر بولے: ”مرزا رسوا نے اسے سید حسین کا پھانک لکھا ہے جو غلط ہے۔ اصل میں یہ حیدر حسین خاں کا پھانک ہے جو انہوں نے سید حسین کے کڑے میں بنوایا تھا۔“ یہ بتا کر انہوں نے بتایا:

”حیدر حسین خاں محمد علی شاہ کے زمانے میں داروغہ تھے۔“ پھر پھانک کے سامنے اور

پہلو والے مکانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:
”یہ مکان دیکھ رہے ہیں، انہیں میں کہیں پر تھا ان کا ٹھکانہ۔ یہ بھی سنا ہے کہ مرزا اپنی
جوانی میں یہاں برابر آتے تھے اور امرا و جان سوجان سے اُن پر صدقے تھیں۔“

”آپ کا اسم گرامی؟“ میں نے ان سے پوچھا۔
”سید محمد نقی۔“ نام بتا کر بولے۔ سب مجھے نقی کہتے ہیں۔ نوے کا ہوں۔ اور یہ جو علاقہ
ہے اس کو بہت کچھ دیکھ چکا ہوں اور بہت کچھ اس کے بارے میں سن چکا ہوں۔“ میرے
پوچھنے سے زیادہ انہیں بتانے میں مزہ آنے لگا تھا۔

”کیا کیا دیکھا اور کیا کیا سنا آپ نے؟“
”سنا یہ ہے.....“ انہوں نے کہنا شروع کیا: ”گرمیوں میں اس مسجد کی منڈیر پر
کچھ سفید پوش بیٹھا کرتے تھے جو بازار کی رونق دیکھ کر اپنا دل بہلایا کرتے تھے
اور.....“ وہ کہتے کہتے رُکے۔
”اور.....“

”کیا بتاؤں میاں۔ پوتے کے برابر ہیں آپ میرے۔“
”یہ سب باتیں اب کون بتائے گا۔ جو کچھ سنا ہے سنا ہے۔“
”..... اور کچھ شوقین مزاج بھی یہاں بیٹھتے جو سامنے کے نظارے کیا کرتے۔“
یہ کہہ کر بولے:

”اُس زمانے میں یہ کوٹھے بہت آباد تھے۔ ایک سے ایک ناچنے والی اور ایک سے ایک
بجانے والے۔ عورتیں نکھ سکھ سے درست، برآمدوں میں پردے پڑے ہوئے۔ سودے
کے لئے ٹوکری لٹکائی بھی تو مجال ہے کوئی ایک چوڑی دیکھ لے۔“ پھر بولے: ”یہ شوقین مزاج
اُن کی ایک جھلک پانے کے لئے گھنٹوں مسجد کی منڈیر پر بیٹھے رہتے۔ انہیں لوگوں کے لیے
یہاں کے کسی شاعر نے کہا تھا۔“ یہ کہہ کر انہوں نے یہ مصرعہ پڑھا:

ع مفلّس تماشِ بینوں کا مسجد میں ہے قیام
مصرعہ سنا کر بولے: ”اور امان علی سحر کا قطعہ تو بہت مشہور ہے لیکن اس کے پہلے دو
مصرعے مجھے یاد نہیں۔“

”جو یاد ہیں وہی سنائیں۔“

”اللہ کے گھر میں بھی میں گھوروں گا بتوں کو

تحسین کی مسجد سے مصلیٰ نہ اٹھے گا“

”اور دیکھا کیا آپ نے؟“ زاجنے والیاں اور میرا لکھنؤ سی اچھا

”انہیں کوٹھوں کو اجڑتے ہوئے۔ پہلے ناچنے والیاں لکھنؤ کی یا آس پاس کی ہوتی

تھیں۔ یہیں کے سازندوں سے تعلیم پاتیں۔ زبان سکھانے اور گفتگو کا سلیقہ بتانے کے لئے

استاد مقرر تھے۔ سب کی سب گفتگو میں طاق، بلا کی حاضر جواب۔“ یہ بتا کر بولے: ”اور تو اور

یہ سب ضلع، رعایت اور پھرتی بھی خوب جانتی تھیں۔ آپ سمجھتے ہیں ان چیزوں کو؟“

”جی نہیں۔“

”کہاں کے ہیں؟“

”یہیں لکھنؤ کا۔“

”تعجب ہے لکھنؤ کے ہو کر نہیں سمجھتے۔“

”آپ کیسے جانتے ہیں اتنا سب کچھ؟“

”بھائی ہم زبان والے ہیں اور پھر میرا نیس کے مکان سے دو ہی قدم پر تو ہیں۔ سب

کچھ سن کر آ گیا۔“

”وہ کیسے؟“

”مرثیے پڑھے ہیں آپ نے میرا نیس کے؟“

”جی پڑھے ہیں۔“

”اور انہیں کسی مرثیہ خوان سے سنا بھی ہے؟“ یہ کہہ کر سیدنتی بولے: ”لیکن اب ویسے

پڑھنے والے کہاں رہے۔“ پھر بولے: ”ایسے پڑھتے تھے حرف حرف بول اٹھتا تھا۔“

”جی پہلے تو ناچنے والیاں اُس طرح کی تھیں اور اب؟“ میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

”اب! اب نہ جانے کہاں کہاں سے آ کر بس گئی ہیں۔ کچھ تو اُدھر بچھم کی طرف کی

ہیں، آدمی بھی ان کے اُدھر ہی کے ہیں۔ رنگ تو صاف ہے لیکن لہجہ؟ سنو نو جیسے کانوں پر

ہتھوڑے پڑ رہے ہوں۔“ یہ کہہ کر سیدنتی نے کہا: ”ناچتی کیا ہیں کو لہجے مٹاتی ہیں۔ راگ سُر

سے ناواقف کچھ نو دو لیتے گول دروازے سے گجرے خرید کر لہراتے ہوئے آئے، نو سیکھے سازندوں کی سنگت میں انہیں کو لہے تھرکانے والیوں سے دو چار فلمی نغمے سنے، نوٹ پھینکے، چلتے بنے۔“ پھر کان پکڑ کر توبہ کرتے ہوئے بولے:

”میں بھی یہاں مسجد میں ایسی باتیں کر رہا ہوں۔ لیکن کیا کروں آپ نے پوچھا تو جو دیکھا وہ بتا دیا۔“

”کچھ تو ادھر پچھم کی ہیں اور دوسری؟“ میں نے پوچھا۔

”ان کی نہ پوچھو۔ وہ تو..... خیر چھوڑو اس قصے کو۔“

”بتائیے بتائیے۔ ان کے بارے میں بھی بتائیے۔“

”میاں بڑی گندی بات ہے۔ زبان پر نہیں لاسکتا، وہ بھی یہاں۔ وہ جو امراؤ جان کی

زبانی کہلوا یا تھا مرزا رسوانے آبادی کے لئے.....“

”لوٹو گھیری! سفلی چھوری۔“

”ہاں“

”آپ کو تو امراؤ جان کا سب یاد ہے۔“

”کس کو نہیں یاد۔ جس نے ایک بار پڑھ لی اسے جملے کے جملے حفظ ہو گئے۔ ملا مولوی

سب نے چھپ چھپ کر پڑھی ہے۔ تو یہ سب لوٹو گھیری ہیں۔“

بتاتے بتاتے سید غصے میں آ گئے تھے۔ بولے: ”پان منھ میں دبائے سودے کے لئے

نکل آتی ہیں باہر، اور لوٹو گھیر پھبتیاں کہتے ہیں تو خوش ہو کر مسکراتی ہیں۔“ یہ بتا کر بولے:

”ابھی کل ہی کی بات ہے..... میاں ظہر کا وقت ہونے والا ہے۔“

”جی وہ کل والی بات تو بتا دیجیے۔“

”وہ جو رحیم کی دکان سے پہلے والے دو کوٹھے ہیں، دیکھ رہے ہیں۔“

”جی دیکھ رہا ہوں۔“

”ان میں سے ایک پر کچھ عورتیں کہیں سے لائی گئی ہیں۔ کل ان میں سے دو نیچے اتر آئیں۔

ایک سید حلوائی، اسی مسجد کے نیچے والی دکان، کے یہاں امرتیاں لینے پہنچ گئی۔ اور دوسری.....“

”دوسری؟“

”نڈے کی بھٹی کے آگے کھڑی وہ جوان کا کٹا والا ہاتھ ہے، اس میں دبی پیاز کی گٹھی کو جھلتے دیکھ رہی ہے اور اچھل اچھل کر کہہ رہی ہے: ”ہائے کتنے باریک لچھے ہیں۔ کتنے باریک لچھے ہیں۔ ایک ہاتھ سے اتنی بڑی چھری سے کیسے کاٹ رہے ہیں۔“ یہ بتا کر غصے سے بولے: ”نہ آنچل کی سدھ نہ پلو کا دھیان۔ گاہک کھڑے مزہ لے رہے ہیں۔“

”آپ مسجد سے باہر نکلتے ہیں؟“

”کیوں نہیں، ضرورت کی چیزوں کے لئے تو ٹکنا ہی پڑتا ہے۔“ سیدنتی نے کہا۔ پھر بولے: ”میری عمر پر نہ جائیے، صرف کمر جھکی ہے، اعضا پوری طرح کام کر رہے ہیں۔ نیچے اترتا ہوں تو افسوس بہت ہوتا ہے۔“

”کس بات کا؟“

”چیزوں کے بدل جانے کا، بہت کچھ بدل گیا ہے اور بہت کچھ بہت تیزی سے بدل رہا ہے؟“

”کیا کیا بدل رہا ہے؟“

”ارے میاں ابھی تو بتایا آپ کو۔ اسی چوک میں بہت کچھ بدل گیا ہے۔ ان کوٹھوں پر رہنے والیاں جنہیں ناچنا آتا تھا اور جو کوٹھوں کے آداب سے واقف تھیں، کوٹھے چھوڑ کر چلی گئیں، ان کی جگہ نکاہیوں نے لے لی ہے۔“ سیدنتی بولتے بولتے غصے میں آ گئے۔ اسی غصے میں بولے: ”اور غضب تو یہ ہے کہ آگے ادھر جو گلی اکبری دروازے کی ڈھلان سے شاہ گنج کی طرف جاتی ہے وہاں نئے کوٹھے بن گئے ہیں، ان کے برآمدوں میں عورتیں کھلے عام بیٹھتی ہیں اور راہ چلتے لوگوں کو اپنی طرف بلاتی ہیں، کم بختوں کو ذرا بھی لحاظ نہیں۔ شریفوں نے تو اس گلی سے گزرنا چھوڑ دیا ہے۔“

”آپ، جس گلی میں تنبوقات کی دکان ہے، اس کی بات کر رہے ہیں؟“

”اسی کی بات کر رہا ہوں۔ کبھی وہاں خیمہ دوزوں کی دکانیں تھیں۔ دری چاندنی، نمکیرہ، ڈیرے، تنبوسب کرائے پر ملتے تھے۔“ سیدنتی نے کہا۔ ”اسی کے آگے چاول کی دکانیں تھیں۔ عورتیں موصل لیے دھان کوٹتی تھیں، اسی لیے اس کا نام چاول والی گلی پڑ گیا۔“ یہ کہہ کر سیدنتی نے کہا: ”اب اُس گلی کا نام زبان پر لاتے ہوئے لوگ ڈرتے ہیں۔ فوجی پولیس کی گاڑی روز وہاں کھڑی رہتی ہے۔ روز اس کوٹھے سے وہ جوان پکڑے جاتے ہیں جو دودھ

چار چار روپے دے کر.....“ سیدنتی یہ کہہ کر ر کے پھر بولے: ”یہی حال بزازے کے سامنے والی فٹ پاتھ کا ہے۔ وہاں بھی ایسی ہی عورتیں جمع ہیں۔“

”جی جی۔ وہاں نیچے دکانوں میں یہ کاروبار ہو رہا ہے۔“

”اُن کوٹھوں پر جگہ بہت کم ہے۔“ سیدنتی نے کہا۔ ”بتانے والے بتاتے ہیں اتنی چھوٹی

سی جگہ میں آٹھ آٹھ دس دس کورکھ چھوڑا ہے۔ سب باہر والیاں ہیں، ادھر پہاڑ کی طرف کی۔“

سیدنتی زور زور سے بول کر اپنے دل کی بھڑاس نکالتے رہے۔ اچانک انہیں ظہر کا وقت پھر یاد

آیا۔ بولے: ”اب جائیے۔ نماز کا وقت ہو گیا ہے، یہ باتیں پھر کسی وقت۔“

”میں آپ سے ملتا رہوں گا، آپ کے سینے میں بہت کچھ ہے۔“ میں نے کہا۔

”جب وقت ملے تب آئیے۔ مسجد کا یہی دالان میرا مسکن ہے۔“



سیدنتی سے بہت سی باتیں کرنے کے بعد میں جب مسجد کی سیڑھیوں سے نیچے اتر اتو سہ پہر

کا وقت ہو چکا تھا۔ مسجد کے نیچے اور اس کے سامنے والی دکانوں پر لوگوں کا ہجوم تھا اور سب

سے زیادہ لوگ ٹنڈے کی دکان پر جمع تھے۔ یہاں لوگ کباب خریدنے بھی آتے اور یہ دیکھنے

بھی کہ حاجی مراد علی عرف ٹنڈے پیاز کے باریک لچھے کاٹنے میں اپنے ڈیڑھ ہاتھ کا کمال کس

طرح دکھاتے ہیں۔ میں ان کی دکان سے گزرتے وقت وہاں کچھ دیر کے لئے ٹھہر گیا۔ لکھنؤ

کے مشہور کباب فروش ٹنڈے بھی رحیم ہی کی عمر کے تھے لیکن دونوں کے مزاج میں بڑا فرق

تھا۔ رحیم جتنی دیر دکان پر بیٹھتے چینٹتے چلاتے رہتے لیکن ٹنڈے دو جیبوں والا سفید شلوکا اور

چوڑی دار پائجامہ پہنے بھٹی پر چڑھے ہوئے ماہی توڑے کے برابر چپ چاپ کھڑے یا تو پیاز

کے لچھے کاٹتے رہتے یا کبابوں کے لئے تیار کئے ہوئے قیمے میں اس مسالے کو ڈالتے رہتے

جس کا نسخہ صرف انہیں کو معلوم تھا۔ ٹنڈے کی وضع قطع خالص لکھنوی تھی۔ پیچھے کی طرف کھنچے

ہوئے ان کے سن سفید بالوں کے پٹے اور ان کے سر پر دوپٹی ٹوپی بہت پہلے کے لکھنؤ کی یاد

دلاتی۔ اور ضرورتاً جب وہ اپنے ملازموں سے دو چار جملے بولتے تو یوں لگتا جیسے لکھنؤ بول رہا

ہو۔ اس وقت بھی ٹنڈے گا کہوں کے ہجوم سے بے نیاز اپنے کٹے ہوئے ہاتھ میں دبی ہوئی پیاز

کی گٹھی سے مہین مہین لچھے تراش رہے تھے۔ میں دیر تک انہیں ان لچھوں کو تراشتے ہوئے

دیکھتا رہا۔ پھر ان کے قریب جا کر ان سے پوچھا:

”ایک بات بتائیں گے؟“

”پوچھیے۔“

”اتنے لذیذ کباب آپ کس طرح بناتے ہیں؟“

”باپ دادا کا نسخہ ہے، اسی کو استعمال کرتا ہوں۔“ انہوں نے مجھے مشتبہ نگاہوں سے

گھورتے ہوئے کہا۔ پھر پوچھا: ”کہاں سے تشریف لائے ہیں؟“

”یہیں لکھنؤ کا ہوں۔ ہمارے گھر میں آپ کے یہاں کے بھی کباب کھائے جاتے ہیں

اور پل غلام حسین والے اصغر کے یہاں کے بھی۔“

”وہ دوسرا نسخہ استعمال کرتے ہیں اور ان کے کبابوں کی قسم بھی دوسری ہے۔“

انہوں نے کہا۔ ”وہ سیخ کے ہیں یہ ٹکیا کے۔ آپ کے یہاں دونوں پسند کئے جاتے

ہوں گے لیکن ذائقہ دونوں کا الگ ہے۔“

”لیکن آپ دونوں کے پاس نسخے شاہی زمانے کے ہیں۔“

”صحیح فرمایا آپ نے۔“ ٹنڈے نے بڑے نستعلیق انداز میں کہا۔ پھر بولے:

”کبابوں کی لکھنؤ میں بے شمار قسمیں ہیں۔“ یہ بتا کر انہوں نے کبابوں کی قسمیں گنانا

شروع کر دیں۔ بھٹی کے قریب کھڑے ہوئے گا ہک ان کی باتیں غور سے سننے لگے۔ جب وہ

ساری قسمیں گنا چکے تو میں نے کہا: ”لیکن ایک قسم بتانا بھول گئے آپ۔“

”وہ کون سی؟“

”رومالی کباب، انہیں پوٹلی کے کباب بھی کہتے ہیں۔“

”بھولا نہیں ہوں جناب۔ یہ کبابوں کی خانہ ساز قسم ہے۔ ایسے پکوان ہماری زبانوں پر

نہیں رہتے۔“ انہوں نے کہا۔ پھر پوچھا:

”جناب کا تعلق کس محلے سے ہے؟“ وہ سمجھ گئے تھے کہ کوئی کھانوں کا جاننے والا ان

سے یہ سب پوچھ رہا ہے۔

”بزازے کا ہوں۔ ڈاک خانے والی گلی سے نکل کر سڑک کے اُس طرف والا محلہ۔“

”ارے تو آپ تو بہت جانتے ہوں گے کھانوں کے بارے میں۔ رئیسوں اور نوابوں کا

محلہ ہے آپ کا۔ طرح طرح کے پکوان وہاں پکتے ہیں گھروں میں۔“ ٹنڈے مسکراتے ہوئے
بولے۔ پھر کہا: ”آپ کو یہ بھی بتادوں جو قسم آپ نے بتائی ہے وہ کس گھر کی ہے؟“
”کس گھر کی؟“

”حکیم میرن صاحب کے۔“

یہ سن کر میں اچھل پڑا۔

”آپ کو کیسے معلوم؟“

”خاندان بہت بڑا ہے میرا۔ جب رئیسوں کے یہاں کوئی جشن یا کوئی بڑی مجلس ہوتی
ہے تو شہر کے مشہور باورچیوں کو بلایا جاتا ہے۔ خاندان میں ہمارے ایک سے ایک باورچی
ہیں، جب وہ ایسے موقعوں پر کھانا پکانے جاتے ہیں تو وہیں یہ ساری باتیں معلوم ہوتی ہیں۔“
”یہاں چوک میں بھی کہیں پکایا ہے آپ نے؟“
”میں نے نہیں، میرے والد نے پکایا ہے۔ میں تو بہت چھوٹا تھا لیکن ان کے
ساتھ لگا رہتا تھا۔“

”کہاں، بتا سکتے ہیں، کچھ یاد ہے آپ کو۔“

”بالکل یاد ہے۔ ادھر حیدر حسین کے پھانک میں نوابوں کے خاندان کے کچھ لوگ تھے،
وہاں شادیوں اور بڑی مجلسوں کے موقع پر والد صاحب بلائے جاتے تھے اور.....“ بتاتے
بتاتے وہ رکے۔ پھر بولے: ”اسی پھانک کے سامنے ایک کوٹھا تھا۔ بہت مشہور ناچنے والی رہتی
تھیں اس میں۔ نام آپ نے سنا ہوگا۔“

”کون؟“

”امراؤ صاحب۔ کوٹھے کی مالکن، سب انہیں خانم صاحب کہتے تھے، محرم کے مہینے میں
نوکری رات ایک بڑی مجلس کرتی تھیں۔ شیرمال اور کباب کا حصہ بانٹتی تھیں۔“ ٹنڈے نے
بتایا۔ ”مجلس سے پہلے آنے والوں کو کھانا بھی کھلاتی تھیں جس میں طرح طرح کی چیزیں ہوتی
تھیں۔ یہ ساری چیزیں کوٹھے کی چھت پر جو بہت کشادہ تھی، تیار ہوتیں۔ تنور پھانک کے
سامنے والی جگہ پر لگایا جاتا۔“

”امراؤ صاحب کو آپ نے دیکھا تھا؟“

”نہیں۔ اُن میں سے باہر والوں کے سامنے کوئی نہیں آتا تھا۔“ یہ کہہ کر ٹنڈے بولے:
 ”وہ لوگ انہیں کے سامنے آتی تھیں جو ان کا ناچ گانا سننے آتے تھے۔ مجلس کا سارا انتظام خانم
 صاحب کے ہاتھ میں رہتا۔ والد صاحب اور ان کے ساتھ والوں کو وہی ہدایتیں دیتی رہتیں۔
 کیا پکنا ہے، کتنا پکنا ہے، یہاں تک کہ یہ بھی بتائیں کیسے پکنا ہے۔“
 ”کیسے پکنا ہے؟ کیا کھانا پکانا جانتی تھیں؟“

”طرح طرح کے نسخے والد صاحب کو بتاتی تھیں۔ میری تو اس وقت کچھ سمجھ میں آتا
 نہیں تھا۔ بس سنتا رہتا تھا۔“ ٹنڈے نے کہا۔ پھر بتایا: ”اور کھانے کی شوقین بھی بہت تھیں۔
 اُن کے یہاں دونوں وقت بڑا دسترخوان لگتا اور اس پر طرح طرح کے کھانے ہوتے۔“ یہ
 بتانے کے بعد کہا: ”کبھی کبھی امراؤ صاحب کی فرمائشیں بھی آتی تھیں والد صاحب کے پاس۔
 آج زرگی کو فٹے بھجوا دیجیے۔ آج خٹائی کباب اور پنجنی پلاؤ۔ اور والد صاحب ان چیزوں کو
 بڑے شوق سے پکوا کر ان کے لئے بھجواتے۔“

”کیوں شوق سے کیوں؟“

”وہ کہتے تھے امراؤ صاحب کسی طرف سے ناچنے والی معلوم ہی نہیں ہوتیں۔“
 ”ابھی تو آپ نے بتایا ان میں سے باہر والوں کے سامنے کوئی آتا نہیں تھا۔“
 ”خانم صاحب جب بھی والد صاحب کو بلواتیں، امراؤ صاحب آداب سلام کے بعد
 اُن سے پردے کے پیچھے سے بات کرتیں۔ وہ بتاتے تھے ایسے بولتیں جیسے منہ سے پھول
 جھڑ رہے ہوں۔ لیکن ایک دن.....“ یہ بتا کر وہ ٹھہر گئے۔ پھر بولے: ”دیکھیے گا ہک بہت جمع
 ہو گئے ہیں، یہ باتیں پھر کسی دن۔“

”لیکن ایک دن..... کیا ہوا۔ بس اتنا بتا دیجیے۔“

”ایک دن، والد صاحب بتاتے تھے، امراؤ صاحب کہیں غائب ہو گئیں۔“

”پھر آئیں نہیں پلٹ کر؟“

”کوٹھے سے ان کے نکلنے کے بعد والد صاحب اس طرف نہیں گئے۔“

”کیوں؟“

کہتے تھے امراؤ صاحب کے نکلنے کے بعد کوٹھا سونا ہو گیا۔“

”اور خانم صاحب۔“

”انہوں نے بہت دن امر او صاحب کا انتظار کیا لیکن وہ لوٹ کر نہیں آئیں۔ دھیرے دھیرے کوٹھے کی دوسری عورتیں بھی ادھر ادھر ہو گئیں۔“ ٹنڈے نے افسردہ لہجے میں کہا۔ پھر بتایا: ”پھر ایک دن اُن کی بوا کباب لینے آئیں تو بتایا خانم صاحب نہیں رہیں۔ رات کے اندھیرے میں بڑی خاموشی سے ان کا جنازہ اٹھا دیا گیا۔“ یہ بتا کر بولے: ”اب جائیے۔ بکری کا وقت ہے۔ یہ سب پھر کبھی آ کر پوچھئے گا۔“

میں ٹنڈے کی دکان سے اکبری دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے اُس گلی کی طرف نگاہ ڈالی جس کا ذکر کرتے کرتے سید نقی غصے میں آ گئے تھے۔ وہاں کوٹھوں کے برآمدوں میں اس وقت بھی عورتیں معمولی قسم کا سرخی پاؤڈر لگائے بیٹھی تھیں اور ہر گزرنے والے کو فحش اشارے کر کر کے اپنی طرف بلا رہی تھیں۔ میں ان سب کو دیکھتا ہوا اپنے ٹھکانے کی طرف لوٹ آیا۔

○

دوسرے دن دوپہر کے بعد میں پھانک مرزا منعم بخت ماسٹر آفتاب سے ملنے پہنچ گیا۔ ظہیر حسن کی بڑی بیٹی فوزیہ انہیں بتا چکی تھی کہ مجھے سردار جہاں سے ملنا ہے۔ ماسٹر آفتاب روز کی طرح کبوتروں کے آگے آٹے کی گولیاں ڈال رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے: ”آؤ فوزیہ نے مجھے بتا دیا ہے۔ کچھ دیر بیٹھو پھر چلتے ہیں اُس طرف۔“

ماسٹر آفتاب کچھ دیر کبوتروں کے آگے آٹے کی گولیاں ڈالتے رہے پھر اٹھے اور تیار ہو کر میرے ساتھ نکل پڑے۔ سردار جہاں کا گھر یہاں سے بہت دور نہیں تھا۔ کچھ ہی دیر میں ہم ان کے مکان پر پہنچ گئے۔ سردار جہاں کی رہائش عمارت کے اوپری حصے میں تھی اور نیچے کے حصے میں زینے کے دونوں طرف کمرانے کی دو مشہور دکانیں تھیں۔

ماسٹر آفتاب نے زینہ چڑھ کر آواز لگائی:

”آفاق میاں.....!“

فورا ہی اندر سے آواز آئی: ”آئیے۔“

میں ماسٹر آفتاب کے ساتھ اندر داخل ہوا تو صحن کے اُس طرف ایک بڑے کمرے میں

گھلتے ہوئے رنگ کی ایک عمر دراز عورت چھوٹے پایوں کے تحت پرچھی ہوئی سفید رنگ کی شفاف چادر پر سیاہ ریشمی ساری پہنے منہ میں بیڑی دبائے بیٹھی تھیں۔ ماسٹر آفتاب سے علیک سلیک کے بعد انہوں نے میری طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا تو میں نے انہیں سلام کیا۔
 ”جیتے رہیے۔“ انہوں نے کہا اور ایک بار پھر ماسٹر آفتاب کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔
 ”یہ.....“ ماسٹر آفتاب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا..... ”جہاں میں رہتا ہوں اسی کے برابر والے مکان میں رہتے تھے اب کہیں اور رہتے ہیں۔“
 ”ہاں ہاں۔ کچھ دیکھے دیکھے سے لگ رہے ہیں۔“ سردار جہاں نے کہا۔
 ”یہ تم سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔“

”کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“ سردار جہاں نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
 ”جی..... بات یہ ہے کہ..... آپ مرزا رسوا کے بارے میں تو جانتی ہوں گی۔“
 ”مرزا ہادی رسوا؟“
 ”جی۔“

”بالکل جانتی ہوں۔ اور پڑھے لکھوں میں کون ہے جو انہیں نہیں جانتا۔ اور کتاب تو امراؤ جان والی ان کی بہت مشہور ہوئی۔“
 ”جی۔ اُسی کتاب کے بارے میں کچھ معلوم کرنا ہے۔“
 ”کیا معلوم کرنا ہے۔“

”کہا جاتا ہے پہلے انہوں نے امراؤ جان کا اصل قصہ لکھا تھا، بعد میں اسے بدل دیا۔“
 میں نے کہا۔ ”اور یہ اصل قصہ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا کہیں موجود ہے۔“
 ”چھپی ہوئی کتاب میں جو قصہ ہے وہ تو میں نے پڑھا ہے اور بہت بار دوسروں سے پڑھوا کر سنا ہے۔“

”لیکن اصل قصہ وہ نہیں ہے جو چھپی ہوئی کتاب میں ہے۔“
 ”اصل قصہ کیا ہے؟“

”اصل قصہ، جیسا بتایا جاتا ہے، یہ ہے کہ جب امراؤ جان فیض علی کے ساتھ چوک سے باہر نکلیں تو بہت دن اسی کے ساتھ رہیں۔“ میں نے انہیں بتایا۔

یہ سن کر سردار جہاں اسی طرح ٹھٹھکیں جس طرح کوئی جانے ہوئے سچ کو سننے کے بعد ٹھٹھکتا ہے۔

”تو؟“ یہ تو انہوں نے اس طرح کہا جیسے جو کچھ انہیں معلوم ہے وہ مجھ سے سننا چاہ رہی ہوں۔
”پھر فیض علی سے ان کے یہاں کوئی اولاد ہوئی۔“

”پھر؟“

”اگر یہ سچ ہے اور شاید یہی اصل قصے میں لکھا ہے.....“ میں کہتے کہتے رکا۔

”تو؟“

”وہ اولاد اگر زندہ ہے تو لکھنؤ میں کہیں نہ کہیں موجود ہوگی۔“

”تو صاحبزادے اصل قصے کو تلاش کرو۔“ یہ کہتے وقت سردار جہاں کی آنکھوں میں یہ بات چھپی ہوئی تھی کہ وہ اس بارے میں جانتی ہیں لیکن بتانا نہیں چاہتیں۔
”تلاش کر رہا ہوں، اصل قصے کو تلاش کر رہا ہوں۔“
”کہاں تلاش کر رہے ہو؟“

”لکھنؤ میں جہاں جہاں پرانی کتابیں موجود ہیں وہاں وہاں جا کر دیکھ چکا ہوں۔ مرزا صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتاب کہیں نہیں ملی۔“ میں نے کہا پھر انہیں بتایا: ”اب وہاں دیکھ رہا ہوں جہاں مرزا سوا حیدر آباد جانے سے پہلے رہے تھے، جہاں دار بیگم کی حویلی میں۔“
”وہ جو مشک گنج میں ہے؟“ سردار جہاں نے پوچھا۔ اُن کے یہ پوچھنے سے ایسا لگا جیسے نہ چاہتے ہوئے یہ بات ان کی زبان سے نکل گئی ہو۔

”آپ انہیں جانتی ہیں؟“

”ہاں کچھ کچھ۔“ سردار جہاں نے بات کو ٹالنے کے سے انداز میں کہا۔

”انہوں نے اپنے بزرگوں سے بہت کچھ سنا ہے امراؤ جان کے بارے میں۔“ میں نے کہا۔ ”اور میرے پوچھنے پر بہت کچھ بتایا بھی ہے۔“
”کیا بتایا ہے؟“

”بتایا ہے کہ امراؤ جان دو نہیں ایک تھیں۔“ میں نے کہا۔ ”اور یہ بھی بتایا ہے دو کی بات اس لئے پھیلی کہ چوک میں ایک امراؤ بیگم بھی تھیں اسی لئے لوگ سمجھنے لگے کہ امراؤ جان دو تھیں۔“

یہ سن کر سردار جہاں کے منہ میں دبی ہوئی بیڑی چھوٹ گئی اور اس سے پہلے کہ وہ بیڑی چادر کو جلانے انہوں نے اسے اٹھا کر دوبارہ منہ میں لگا لیا۔
 ”تو مجھ سے کیا جاننا چاہتے ہو؟“ سردار جہاں نے پوچھا۔
 ”دونوں باتیں۔“

”کون سی دونوں باتیں؟“

”ایک یہ کہ امراؤ جان کی واقعی کوئی اولاد تھی اور.....“

”اور دوسری.....؟“ سردار جہاں میری بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑیں۔

”یہ امراؤ بیگم کون تھیں؟“

میرے یہ پوچھنے پر سردار جہاں اور ماسٹر آفتاب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر سردار جہاں بولیں: ”تم ان باتوں میں کہاں پڑ گئے۔ یہ سب بہت الجھے ہوئے معاملے ہیں۔“
 ”لیکن ان کا جاننا میرے لئے ضروری ہے۔“

”کیوں ضروری ہے؟“

”جو سچ ہے وہ سامنے آنا چاہئے۔“

سردار جہاں یہ سن کر کچھ دیر خاموش رہیں پھر انہوں نے اپنی بھانجی کو آواز دیتے ہوئے کہا:
 ”ہنگا! دیکھو ماسٹر آفتاب کسی مہمان کے ساتھ آئے ہیں۔ دو تین پیالی چائے بنا لو۔“
 چائے کے آنے اور اس کے ختم ہونے تک سردار جہاں ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں پھر ماسٹر آفتاب یہ کہتے ہوئے کہ میں ذرا آفاق کو دیکھ لوں دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ کمرے سے ماسٹر آفتاب کے نکلتے ہی سردار جہاں مجھ سے بولیں:

”یہ امراؤ جان کے پیچھے تم کیوں پڑے ہو۔“

”یہ جاننے کے لیے کہ سچ کیا ہے۔ ابھی تو بتایا آپ کو۔“

”اچھا تو سنو جو کچھ مجھے معلوم ہے بتائے دیتی ہوں۔ امراؤ صاحب جب لکھنؤ سے فیض علی کے ساتھ نکلیں تو بڑی مصیبتوں سے کانپور پہنچیں۔ مرزا صاحب نے قصہ یہاں تک صحیح لکھا ہے۔“ سردار جہاں نے کہا۔ پھر بتایا: ”اس کے بعد جیسا ہمارے سننے میں آیا ہے، فیض علی کچھ دن ان کے ساتھ رہ کر انہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ امراؤ صاحب کانپور میں بہت دن رہنے کے

بعد اپنی بیٹی کے ساتھ لکھنؤ چلی آئیں۔ اب یہ نہیں معلوم کہ ان کی یہ بیٹی فیض علی سے تھی یا کسی اور سے۔“ سردار جہاں بتاتی رہیں: ”لکھنؤ آنے کے بعد امراؤ خانم کے کوٹھے پر نہیں گئیں بلکہ وہیں چوک میں ایک دوسرا مکان لے کر اپنی بیٹی کے ساتھ رہنے لگیں۔“

”یہ سب آپ کو کس نے بتایا۔“ میں نے سردار جہاں کو بیچ میں روک کر پوچھا۔

”پہلے سنو۔ یہ بعد میں پوچھنا۔“ سردار جہاں نے یہ کہہ کر پھر بتانا شروع کیا:

”امراؤ صاحب نے بیٹی کو بھی سب کچھ اسی طرح سکھایا جیسے خانم صاحب نے امراؤ صاحب کو سکھایا تھا۔ کچھ ہی دن میں ان کی بیٹی ناچ گانے میں لگی ہو گئی۔ لیکن...“ سردار جہاں کہتے کہتے رکیں۔

”لیکن؟“

”سب کچھ سکھانے کے بعد بھی امراؤ صاحب نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی بیٹی روز روز کوٹھے پر ناچے۔“

”کیوں؟“

”دو باتیں تھیں۔ ایک تو ناچ گانے کے سمجھنے والے لکھنؤ میں رہ نہیں گئے تھے اور دوسرے.....“

”دوسرے.....“

”دوسرے یہ کہ امراؤ صاحب کے دل میں کوئی خوف سما گیا تھا۔“

”کون سا خوف؟“

”وہ ڈرتی تھیں کہ انہیں کی طرح ان کی بیٹی کو بھی.....“

”کوئی بھگا کر نہ لے جائے۔“

”میاں آپ میرے نواسے کے برابر ہیں۔ امراؤ صاحب کے لئے ایسے لفظ نہ استعمال کریں۔“

میرے اس طرح کہنے پر سردار جہاں کو غصہ آ گیا تھا۔ اسی غصے میں وہ بولیں: ”امراؤ صاحب ناچنے والی ضرور تھیں لیکن بازار و عورت نہیں تھیں۔ کوٹھا انہوں نے کیوں چھوڑا یہ ایک الگ قصہ ہے۔“

”معافی چاہتا ہوں زبان سے نکل گیا۔“

”بڑوں کے سامنے سوچ سمجھ کر بولا کیجیے۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ امراؤ صاحب نے بہت دکھ جھیلے تھے اپنی زندگی میں۔ وہ چمک دمک جو مرزا صاحب نے دکھائی ہے اپنی کتاب میں وہ بس دیکھنے بھر کی تھی۔ اندر سے کوٹھے کی ہر عورت.....“

یہ کہتے کہتے سردار جہاں کی آواز بھڑانے لگی۔ انہوں نے ہنگا سے پینے کے لئے پانی منگوایا اور پانی پینے کے بعد کہا:

”اندر سے کوٹھے کی ہر عورت اس پیشے میں کھوکھلی ہو جاتی ہے۔“ یہ کہہ کر سردار جہاں نے پوچھا: ”بات سمجھے آپ میری.....“ اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ خود ہی بولیں:

”جیسے دیمک نظر آئے بغیر اندر اندر لکڑی کو چاٹ جاتی ہے ویسے ہی یہاں بھی دکھائی کچھ نہیں دیتا بس ایک دن معلوم ہوتا ہے طبلے کی تھاپ اور ہارمونیم کی تان پر تھرکنے والا جسم اندر سے خالی ہو چکا ہے۔ اور اسی وقت یہ عمارت گر کر ریلے میں بدل جاتی ہے۔“

یہ کہہ کر سردار جہاں نے کہا: ”دوسری کوٹھے والیوں کی طرح امراؤ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ لیکن امراؤ اپنے کوٹھے کی دوسری عورتوں سے بہت پہلے ٹوٹ گئیں۔“ سردار جہاں آگے کہتے کہتے رکیں تو میں نے پوچھا:

”بتا سکتی ہیں کیوں؟“

”وہ کوٹھے کی عورت بنائی گئی تھیں، کوٹھے کی عورت تھیں نہیں۔“

”لیکن وہ چوک میں دوبارہ آ کر رہیں کہاں؟“

”یہ مجھے نہیں معلوم اور شاید کسی کو نہ معلوم ہو۔“

”کیوں؟“

”انہوں نے اپنے ٹھکانے کو راز میں رکھا۔“

”کیوں؟“

”وہ نہیں چاہتی تھیں دوبارہ کوئی انہیں امراؤ کے نام سے جانے۔“

”تو آپ کو یہ سب کیسے معلوم؟“

”جس نے مجھے بتایا تھا اس نے قسم دی تھی میرا نام کسی کو نہ بتانا۔“

”اچھا یہ بتائیے امراؤ جان کی بیٹی کا نام کیا تھا؟“
 ”یہ بھی نہیں بتا سکتی، بس اتنا بتا سکتی ہوں اگر وہ زندہ ہے تو میری ہی عمر کی ہوگی۔“
 ”آپ نے ان کی بیٹی کو دیکھا تھا؟“

”نہیں۔ جو کچھ بتایا ہے وہ دوسروں سے سنا ہے۔“
 ”تو پھر آپ نے امراؤ بیگم کے بارے میں بھی سنا ہوگا۔ وہ کون تھیں؟“
 یہ سن کر سردار جہاں نے ہنگامہ کو جوان کے لئے پانی لانے کے بعد انہیں کے پاس بیٹھ کر
 ہم لوگوں کی باتیں سننے لگی تھی، ٹھٹھک کر دیکھا۔ پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولیں:
 ”یہ تم کیوں جاننا چاہتے ہو؟“

”کسی نے مجھے ان کے بارے میں بتایا ہے۔“
 ”کس نے؟“

”چوک میں رہنے والے ایک شخص نے۔“ میں نے قصداً جہاں دار بیگم کا نام نہیں لیا۔
 ”کس شخص نے؟“

”نام اُن کا میں نہیں جانتا۔ تحسین علی خاں کی مسجد میں ملے تھے۔ عمر رہی ہوگی یہی کوئی
 اسی پچاسی برس کی۔ امراؤ جان کے زمانے کی باتیں نکلیں، اُسی میں انہوں نے بتایا۔“
 ”نام بتانے کے ساتھ اور کیا بتایا؟“

”بتایا کہ سنڈیلے والی اچھن بی کی اولاد تھیں۔“
 یہ سنتے ہی سردار جہاں بولیں:

”تو سنو امراؤ بیگم ماں تھیں ہماری اور اُسی زمانے میں جب امراؤ صاحب خانم صاحب
 کے کوٹھے پر تھیں، وہ بھی چوک کے ایک مکان میں رہتی تھیں۔ بہت زمانے تک وہاں رہنے
 کے بعد جب انہوں نے یہ مکان خرید لیا تو ہم ادھر آ گئے۔“

ان کے یہ بتانے کے بعد میں خاموش ہو گیا۔ اسی وقت ہنگامہ نے سردار جہاں سے پوچھا:
 ”خالہ پانی لائیں۔“
 ”لے آؤ۔“

میرے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد سردار جہاں نے کہا:

”پوچھو اور کیا پوچھنا ہے۔“

”جی بس یہی معلوم کرنا تھا یہ امراؤ بیگم کون تھیں؟“

”تم پوچھو نہ پوچھو لیکن میں بتاتی ہوں ان کے بارے میں۔“ یہ کہہ کر سردار جہاں نے کہنا شروع کیا: ”اچھن بی کی ماں یعنی ہماری نانی اودھ کی شریف زادیوں میں تھیں۔ ان کی شادی ایک بڑے رئیس سے ہوئی تھی جن کی بہت سی جاگیریں تھیں۔ شوہر کے مرنے کے بعد انہیں جاگیروں کی وجہ سے بہت لوگ ان کے دشمن ہو گئے۔ پہلے تو ہماری زمینوں پر قبضے ہوئے پھر لوگ جان لینے پر تل گئے۔“ وہ رکیں پھر کہنا شروع کیا: ”اس وقت ہماری نانی پندرہ سولہ کی رہی ہوں گی۔ اُن کی ماں نے کسی کو بتائے بغیر چپکے سے انہیں لکھنؤ اپنے کسی دور کے عزیز کے پاس بھیج دیا۔ پھر غدر میں کچھ پتہ نہیں کہ نانی کی ماں کہاں گئیں اور ان کی زمین جائداد کا کیا ہوا۔ اچھن بی، ہماری نانی یہاں لکھنؤ میں اکیلی تھیں۔ جان بچانے کے لئے انہوں نے جس شخص سے نکاح کیا وہ اچھا آدمی نہیں تھا۔ اس نے انہیں ناچ گانے پر لگا دیا اور ناچ گانا سیکھ کر اچھن بی جب اپنا پیٹ پالنے لگیں تو اچھن بی سے اچھن بی سنڈیلے والی بن گئیں۔“ یہ بتا کر انہوں نے سامنے رکھے ہوئے گلاس سے ایک گھونٹ پانی پیا پھر بولیں: ”امراؤ بیگم اسی برے آدمی کی اولاد تھیں۔ اچھن بی نے زندہ رہنے کے لئے، اور یہ نہ کرتیں تو کیا کرتیں، امراؤ بیگم کو بھی ناچ گانا سکھا دیا لیکن ناچ گانے میں ان کا دل زیادہ لگتا نہیں تھا۔ امراؤ بیگم کی جوانی کے دنوں میں ایک رئیس زادے نے اچھن بی کے یہاں کچھ زیادہ ہی آنا جانا شروع کر دیا۔ اسی آنے جانے میں ایک دن انہوں نے امراؤ بیگم سے شادی کی پیشکش کی، اچھن بی نے اسے فوراً قبول کر لیا لیکن وہ رئیس زادے امراؤ بیگم کے ساتھ دو چار مہینے رہنے کے بعد غائب ہو گئے۔ میں اسی غائب ہو جانے والے رئیس زادے کی اولاد ہوں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے کہا: ”لیکن اب کوئی نہیں جانتا ہم بھی کبھی شریف زادیوں میں تھے۔ اب تو سب ہمیں ناچ گانے والا سمجھتے ہیں۔“

سردار جہاں کے پہلو میں بیٹھی ہوئی ان کی بھانجی ہنگامہ کو سردار جہاں کا اس طرح سب کچھ بتانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ انہیں یہ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ میں یہ سب کیوں پوچھ رہا ہوں۔ سب کچھ بتانے کے بعد سردار جہاں بیڑی کے لمبے لمبے نش لیتے ہوئے کہیں کھوسی گئیں۔ ان

کی بھانجی ہنگامہ سے باہر چلی گئی تھیں۔

جب سردار جہاں نے بیڑی ختم کی اور انگلی سے اُسے بجھا کر اس طشتری میں ڈالا جس میں چائے کی پیالی رکھی ہوئی تھی تو میں نے ان سے چلنے کی اجازت طلب کی۔ انہوں نے سمجھی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا:

”کچھ اور پوچھنا ہے۔“

”نہیں، آپ نے بہت کچھ بتا دیا۔ اب یہ پتہ لگانا ہے امراؤ جان کی وہ بیٹی جو آپ کی ہم سن ہیں، کہاں ہیں؟“

”کوئی بیس برس اُدھر کسی نے کسی سے سن کر بتایا تھا کہ وہیں چوک میں تھیں۔ میں نے بتانے والے سے زیادہ پوچھا نہیں۔“ سردار جہاں نے کہا۔ پھر کہا: ”میں تو ایک زمانہ ہوا اُس طرف گئی نہیں۔“

”کیوں؟“

”ان کوٹھوں پر نگاہ پڑتے ہی وحشت ہونے لگتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے بہت سے دیو وہاں بہت سی پریوں کو دبوچے بیٹھے ہیں۔“ سردار جہاں بولیں: ”جس دن اماں کے زمانے کی باتیں یاد آتی ہیں اس دن میں خواب بھی اسی طرح کے دیکھتی ہوں۔“

”کس طرح کے؟“

”کبھی دیکھتی ہوں بہت سی عورتیں سیاہ کپڑے پہنے ایک بہت قہر و غضب والی عورت کے سامنے دوزانو بیٹھی اپنی رہائی کی فریاد کر رہی ہیں۔ اور کبھی دیکھتی ہوں کہ بہت سی خوبصورت اور اچھی پوشاک والی عورتیں اچانک بوڑھی ہو گئی ہیں اور پھٹے ہوئے کپڑے پہنے چوک کی گلیوں میں بھیک مانگتی پھر رہی ہیں۔ اور ایک بار تو ایک عجیب خواب دیکھا.....“

”وہ کیا؟“

”ایک دیو قامت پرندہ آسمان سے اتر آیا اور اس نے اُن سارے کوٹھوں پر اپنے پروں کو پھیلا دیا۔ اس کا ایک پنچہ اس مکان پر تھا جہاں میری ماں رہتی تھیں اور ایک پنچہ خانم صاحب کے کوٹھے پر.....“

”پھر.....؟“

”پھر اس نے سب ناچنے والیوں اور انہیں جوان کوٹھوں کی مالک تھیں اپنے بچوں میں
جکڑ لیا اور اڑ گیا۔“
”پھر.....“

”اس کے بچوں میں جکڑی ہوئی عورتیں چیخ چیخ کر مدد مانگتی رہیں مگر وہ پرندہ انہیں اپنے
بچوں میں دبائے اڑتا رہا۔“
”پھر.....؟“

”پھر اس نے بہت دور لے جا کر انہیں ایک جگہ جہاں ایک بہت گہرے گڑھے میں
آگ دہک رہی تھی، ڈال دیا۔“
”پھر.....؟“

”اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ آنکھ کھلتے ہی میں نے پاگلوں کی
طرح اس گھر کے ایک ایک کونے میں پکار پکار کر اپنی ماں امر او بیگم کو ڈھونڈنا شروع کر دیا۔
میری آواز سن کر سب کے سب جاگ پڑے اور جب مجھ سے پوچھا کیا ہوا تو میں نے اماں
کہاں ہیں اماں کہاں ہیں کہنا شروع کر دیا اور تب ہینگا نے مجھے زور سے پکڑ کر کہا: ”خالہ آپ
نے کوئی برا خواب دیکھا ہے اور تب مجھے یقین آیا جو کچھ میں نے دیکھا تھا وہ خواب تھا۔“
سردار جہاں نے کہا۔ پھر بتایا: ”اُس دن سورج نکلنے کے بہت دیر بعد تک میں اپنے بستر پر
چپ چاپ پڑی رہی پھر نہ جانے کب مجھے نیند آ گئی اور سوتے میں پھر طرح طرح کی
تصویریں میری آنکھوں میں گھومنے لگیں۔“

”اُن تصویروں میں آپ نے کیا دیکھا؟“
”سب سے پہلے وہ مکان جہاں اماں کے ساتھ میرا بچپن گزرا تھا۔“

”آپ نے وہاں کیا دیکھا۔“
”میں نے دیکھا اس کے دالان اور صحنچیاں ویران پڑی ہیں۔ ہر طرف مکڑی کے
جالے ہیں۔ فرش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا ہے۔ دیواروں میں شگاف پیدا ہو گئے ہیں اور

چھتیں گرنے والی ہیں۔“
”اور کیا دیکھا؟“
لکھنؤ کی مٹی سیوٹی تہذیب

۸۷

لہٰذا صحن میں جھاڑ جھنکاڑ بھرا ہے۔ اماں کے باورچی خانے میں پتیلیاں اونڈھی پڑی ہیں۔ جس چوکی پر اماں بیٹھتی تھیں اس کے پائے ٹوٹ چکے ہیں اور ان کا بڑا سا نقشہ پاندان کھلا پڑا ہے۔“

”اور.....؟“

”اندروالے دالان کے گاؤتیکے جس سے لگ کر وہاں کبھی کبھی آنے والے رئیس زادے بیٹھتے تھے، ٹیڑھے ترچھے پڑے ہیں اور ان کے اندر کی روئی جگہ جگہ سے باہر نکلی ہوئی ہے۔“

”آپ کو تو پورا خواب یاد ہے۔ اور کیا دیکھا؟“

”اور اب جو دیکھا اسے بتاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔“

”بتائیے میں سننا چاہتا ہوں۔“

”ہماری بوازینب جو ہمیں اکبری دروازے والی دکان سے کھلونے دلوانے کے لئے چادر اڑھا کر باہر لے جاتی تھیں اور خود بھی چاروں طرف سے اپنے جسم کو چھپائے رہتی تھیں.....“ بتاتے بتاتے سردار جہاں کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

میں کچھ دیر خاموش رہا پھر پوچھا:

”آگے؟“

”میں نے دیکھا بوازینب اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے صحن میں مردہ پڑی ہیں اور ان کے جسم پر کوئی کپڑا بھی نہیں ہے۔ ان کی دونوں آنکھیں کھلی ہیں اور ان کے ایک ہاتھ کی مٹھی میں وہی چوٹیوں کے بڈھے والا کھلونا ہے جس کا سر ہلتا رہتا تھا اور جسے خریدنے کے لئے میں ان سے ضد کیا کرتی تھی۔ ان کے بے جان جسم کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کھلونا مجھے دینے کے لئے میرا انتظار کر رہی ہوں۔ اور اسی وقت ہنگامی آواز میرے کانوں میں آئی: ”خالہ سہ پہر کی چائے۔“ میں نے آنکھ کھولی تو میرے دونوں رخسار بھیگے ہوئے تھے۔“

سردار جہاں نے پورا خواب بیان کرنے کے بعد کہا:

”اسی وجہ سے میں اس طرف نہیں جاتی۔ ڈرتی ہوں اس طرف گئی تو ایسے ہی ڈراؤنے خواب دکھائی دیں گے۔ چوک تو دور میں تو اس فٹ پاتھ کی طرف بھی نہیں دیکھتی جس کی گلیاں چوک کی طرف نکلتی ہیں۔“ سردار جہاں نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔ ”ضرورت کا جو سامان

وہاں سے آنا ہوتا ہے ہنگا اور کتو لے آتی ہیں۔“

انہوں نے اپنے رشتے کی بھانجیوں کے نام لیتے ہوئے کہا۔

”بچپن میں آپ نے وہاں کیا کیا دیکھا؟“

”ہم گھر سے باہر کبھی کبھی ہی نکلتے تھے وہ بھی بہت تھوڑی دیر کو۔ جتنی دیر ہم باہر رہتے بوازینب ہماری انگلی پکڑے رہتیں۔ باہر نکلتے پر کبھی وہ ہمیں گول دروازے کی طرف لے جاتیں اور کبھی تحسین کی مسجد کے آگے ورق کوٹنے والوں کی دکانوں تک۔“ یہ بتانے کے بعد سردار جہاں بولیں: ”ہم کبھی اکبری دروازے والے اس چھتے سے، جہاں کھلونے بکتے ہیں، آگے نہیں گئے۔“ پھر بتایا: ”بھیڑ میں کبھی ہماری انگلی چھوٹ جاتی اور ہم ادھر ادھر ہو جاتے تو بوازینب پریشان ہو کر آواز لگانے لگتیں: سردارو! سردارو! اور فوراً ہم اپنی انگلی ان کے ہاتھ میں دے دیتے۔“

”اور آپ کی ماں امراؤ بیگم؟ انہوں نے تو وہاں سب کچھ دیکھا ہوگا۔“

”انہوں نے بھی چوک میں رہنے کے باوجود چوک پوری طرح نہیں دیکھا۔ وہ خاص خاص موقعوں پر گھر سے نکلتی تھیں یا اس وقت نکلتی تھیں جب انہیں شہر سے باہر بھرے کے لیے جانا ہوتا تھا۔“

”وہ شہر کے اندر بھر نہیں کرتی تھیں؟“

”بالکل نہیں۔ شہر میں بہت کم لوگ ان کے بارے میں جانتے تھے۔ اور لکھنؤ کے جو گئے چنے رئیس کبھی کبھار ہمارے یہاں آتے تھے انہیں بھی اماں کی تاکید تھی یہاں آنے کی بات وہ کسی کو نہ بتائیں۔“

”آپ کی ماں خانم صاحب کے یہاں کبھی گئیں؟“

”نہیں۔ وہ خانم صاحب کو بہت سفلی عورت سمجھتی تھیں۔ امراؤ صاحب سے بہت ملنا چاہتی تھیں لیکن انہوں نے اصول بنالیا تھا نہ کسی کے کوٹھے پر جائیں گی نہ کسی کو اپنے یہاں بلائیں گی۔“ سردار جہاں نے کہا۔ ”جب کسی سے امراؤ صاحب کے ناچ گانے کی تعریف سنتیں تو بہت خوش ہوتیں اور امراؤ صاحب سے ملنے کو بے چین ہو جاتیں۔ ایک مرتبہ..... یہ بھی ہمارے بچپن ہی کی بات ہے.....“ سردار جہاں نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا: ”محرم کی نو کو

وہ صبح سے بہت بے چین تھیں۔ سیاہ لباس پہنے کبھی صحن میں جاتیں کبھی دالان میں واپس آتیں کبھی صحنچی میں جا کر بیٹھ جاتیں۔ ”سردار جہاں یاد کر کر کے بتاتی رہیں: ”اسی بے چینی کے عالم میں سہ پہر کو بال کھول کر امام باڑے کے سامنے بیٹھ گئیں اور سوز اور مرثیہ پڑھنا شروع کر دیا۔ بوازینب نے دیکھا تو کہا ابھی شب نہیں لگی ہے۔ یہ سب رات میں پڑھنا۔ اماں بولیں شب میں خانم صاحب کے یہاں کی مجلس کروں گی اور امراؤ صاحب کا سوز سنوں گی۔ یہ سن کر بوا زینب بولیں: ”ایسا غضب نہ کرنا۔ خانم صاحب بہت چلتی ہوئی عورت ہیں خدا معلوم کس کس سے کیا کیا کہیں اور پھر لکھنؤ کا دستور ہے کوئی کسی کے یہاں بن بلائے نہیں جاتا۔ اس پر اماں بولیں: ”مجلس میں کیسا بلاوا۔ عزا کے فرش پر کوئی کسی کو بلاتا نہیں ہے۔“ جواباً بوازینب نے کہا: ”ایسا ہی جی بے چین ہے تو امراؤ کو یہاں کیوں نہیں بلا لیتیں۔“ اماں بولیں: ”بلا تو لیتی بیچ میں خانم دیوار بنی ہوئی ہیں۔“ قصہ مختصر بوازینب نے اماں کو خانم صاحب کے یہاں جانے نہیں دیا۔ اُس رات اماں امام باڑے کے سامنے بیٹھ کر مشکل راگوں والے سوز پڑھتی رہیں اور زار و قطار روتی رہیں۔ بوازینب نے جو بازو کے طور پر ان کا ساتھ دے رہی تھیں راگ غلط ہو جانے پر جب انہیں ٹوکا کہ بی بی جو راگ نہیں جانتیں اس میں کیوں پڑھ رہی ہو تو اماں بولیں: ”میں امراؤ بیگم نہیں، امراؤ جان بن کر پڑھ رہی ہوں۔ سُڑھیک لگے نہ لگے امراؤ جان تو مجھ سے لگی بیٹھی ہیں۔“ سردار جہاں پورا قصہ بتا کر رکیں تو میں نے پوچھا: ”وہ کون سے راگ تھے جن پر بوازینب نے انہیں ٹوکا تھا۔ کچھ یاد ہے آپ کو؟“

”ساگر، درگا اور پیلو۔ بہت مشکل راگ ہیں۔ ہر ایک سے نہیں سنبھلتے۔“

”آپ کی ماں نے یہ مکان کب خریدا؟“ ان کی بات ختم ہوئی تو میں نے پوچھا۔

”میں اس وقت پندرہ یا سولہ کی رہی ہوں گی یا شاید اس سے کچھ زیادہ۔ ستر سے زیادہ

سال ہو چکے ہیں اس مکان میں رہتے ہوئے۔“ سردار جہاں نے کہا۔ ”اس وقت اماں یہ

مکان نہ خریدتیں تو آج ہمارے سروں پر چھت نہ ہوتی۔“

”اور چوک انہوں نے کب چھوڑا؟“

”چھوڑا نہیں چھوڑنا پڑا۔ اماں کے ناپنے کی عمر نکل چکی تھی۔ اُدھر رئیسوں کی دولت بھی

ختم ہو رہی تھی۔ اب ان کے وہ ٹھاٹ نہیں رہ گئے تھے اس لئے کوٹھوں پر اُن کا آنا جانا برائے

نام رہ گیا تھا۔" سردار جہاں نے بتایا: "جن کے پاس نئی نئی دولت آئی تھی، تمیز تہذیب سے
نابلد وہ کم ظرفی دولت کے زور پر عیش کرنا چاہتے تھے۔ امراؤ بیگم کو یہ گوارا نہ تھا۔ ادھر فیض
علی کے ساتھ امراؤ صاحب کے نکلنے کی بات پھیل چکی تھی۔ اماں نے سنا تو ڈھ گئیں۔ اس
دن سے انہیں چوک سے وحشت ہونے لگی۔ بس ایک دن وہ مکان بیچا اور یہ مکان خرید لیا۔"
"جب امراؤ جان سے ان کا ملنا جلنا نہیں تھا تو پھر چوک سے ان کے نکلنے کا انہیں افسوس
کیوں ہوا؟"

"میں بھی آج تک نہیں سمجھ سکی کہ امراؤ صاحب کو دیکھے اور اُن سے ملے بغیر وہ اُن سے
اتنی محبت کیوں کرنے لگی تھیں۔"
"اس بارے میں بتایا نہیں کبھی؟"

"نہیں، لیکن کوئی بات تھی جو دونوں میں ایک سی تھی۔ اسی وجہ سے اماں اُن سے ملے بغیر
انہیں چاہنے لگی تھیں۔"

"وہ ایک سی بات امراؤ جان بھی جانتی تھیں آپ کی ماں کے بارے میں؟"
"دل کہتا ہے ضرور جانتی ہوں گی۔ بوا حسینی اور بوا زینب گاہے بگاہے ایک دوسرے سے
ملا کرتی تھیں اور دونوں اماں اور امراؤ صاحب کے بارے میں سب کچھ جانتی تھیں اور دونوں
نے اماں اور امراؤ صاحب کو ایک دوسرے کی ساری باتیں بتائی ہوں گی۔"
اپنی ماں کے بارے میں یہ باتیں بتانے کے بعد سردار جہاں نے اپنے بیڑی کے بنڈل سے
ایک بیڑی نکال کر جلائی اور ایک لمبا کش لے کر بہت سا دھواں چھوڑا تو میں نے ان سے پوچھا:
"لیکن وہ ایک سی بات کون سی ہو سکتی ہے؟"

"اصل میں مرزا رسوانے یہ بات اپنی کتاب میں....." وہ رکیں پھر بولیں: "غلط لکھی
ہے کہ امراؤ صاحب دلاور خاں سے اپنے باپ کی دشمنی کی وجہ سے انتقاماً فیض آباد سے لکھنؤ
لائی گئی تھیں اور انہوں نے یہ بھی غلط لکھا ہے کہ وہ کسی جمعدار کی بیٹی تھیں؟" سردار جہاں نے
کہا۔ پھر بولیں: "امراؤ صاحب اسی لکھنؤ کی تھیں اور ان کی پرورش ایک بڑے رئیس کے گھر
میں ہوئی تھی۔ مرزا صاحب نے کتاب لکھنے کے لئے اپنی کہانی بنالی۔"

"کس رئیس کے گھر میں؟"

”یہ مجھے نہیں معلوم۔“ سردار جہاں نے کہا۔ پھر بتانا شروع کیا: ”اتنا سنا ہے کہ اُن رئیس کے پاس پشتینی دولت تھی۔ ان کی زمین جائداد کی دیکھ بھال کرنے والے ایک کارندے نے محصولی کی رقم میں بڑی خرد برد کی۔ اُن رئیس زادے نے اسے نوکری سے نکال دیا۔ انتقام لینے کے لیے اس کارندے نے حویلی کی ایک مغلائی کو بہت سے پیسے دے کر اپنی طرف ملا لیا۔ وہ مغلائی امراؤ صاحب کو جب وہ بہت چھوٹی تھیں پھسلا کر حویلی سے باہر لے آئی اور اس کارندے نے انہیں خانم صاحب کے پاس لا کر ان سے بڑی رقم لے لی اور اس مغلائی کا منہ بند رکھنے کے لیے کچھ پیسے اسے بھی دے دیے۔“ یہ سب کہنے کے بعد سردار جہاں نے کہا:

”لیکن یہ سب سنی سنائی باتیں ہیں۔“

”تو آپ کی ماں اور امراؤ جان دونوں اشراف سے تھے۔“

”جو کچھ میں نے کہا ہے اگر وہ سچ ہے تو سمجھو ایسا ہی ہے۔“

یہ کہہ کر کچھ دیر چپ رہیں پھر بولیں:

”امراؤ جان واقعی اشراف سے تھیں۔ اس کے لیے ایک قصہ جو ہم تک جس

طرح پہنچا ہے، سن لو:

”کون سا قصہ؟“

”حسین باندی کا۔“

”کون حسین باندی؟“

”چوک والی۔ خانم کے کوٹھے سے کچھ ہی دور تھا ان کا کوٹھا۔“

”قصہ کیا تھا؟“

”کسی نے مرزا دبیر صاحب کو بتایا کسی محفل میں حسین باندی نے آپ کی غزل گا کر

خوب داد لوٹی۔“ سردار جہاں نے قصہ بتانا شروع کیا۔ ”یہ سن کر مرزا صاحب کو بہت رنج ہوا۔

حسین باندی کو مرزا صاحب کی ناراضی کا پتہ چلا تو اجازت لے کر اُن کی ڈیوڑھی پر حاضر

ہوئیں۔ مرزا صاحب نے ان سے پوچھا تم کو میری بہت سی غزلیں یاد ہیں۔ وہ بولیں بس ایک

غزل۔ مرزا صاحب نے مطلع پوچھا۔ حسین باندی نے مطلع پڑھا۔ پوچھا غزل میں کتنے شعر

ہیں۔ وہ بولیں پانچ۔ یہ سن کر مرزا صاحب گھر کے اندر گئے اور ایک توڑہ پانچ سو روپے کا ایک

رومال میں باندھ کر لائے اور حسین باندی کو دیتے ہوئے بولے: ”یہ روپیہ اپنی ڈولی میں رکھ لو اب سے یہ غزل مت گانا۔“ حسین باندی شرم سے پانی پانی ہو گئیں۔ پسینہ پونچھتے ہوئے بولیں: ”کنیز آپ کے در کی لونڈی ہے خدا کے واسطے روپیہ رکھ لیجیے میں آئندہ اس غزل کو نہ گاؤں گی۔“ مرزا صاحب راضی نہ ہوئے بولے میں روپیہ نکال چکا تم اسے کسی کارِ خیر میں صرف کر دینا۔ حسین باندی آنسو پونچھتی وہاں سے نکل آئیں۔“

سردار جہاں پورا قصہ بتا کر بولیں:

”امراؤ صاحب نے جب یہ قصہ سنا تو قصیدہ اور مرثیہ کہنے والوں کا عاشقانہ کلام گانا چھوڑ دیا۔“ یہ کہہ کر وہ بہت دیر تک خاموش رہیں پھر میں نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا:

”اچھا ایک بات پوچھوں؟“

”اتنی بہت سی باتیں پوچھ لی ہیں تو ایک بات اور پوچھ لو۔“

”آپ نے ناچ گانا نہیں سیکھا؟“

”نہیں۔ گلاتو میرا اچھا تھا لیکن اماں مجھے اس راہ پر نہیں لگانا چاہتی تھیں۔“

”برانہ مانیں تو ایک بات اور پوچھوں۔“

”پوچھو پوچھو۔“

* سرفا اس طرح کا سوال نہیں کرتے۔

”آپ کے ساتھ کئی لوگ رہتے ہیں ان سب کا.....“

”خرچ کس طرح چلتا ہے؟“

”جی۔“

”سرفا اس طرح کا سوال نہیں کرتے لیکن اب تم نے پوچھ ہی لیا ہے تو بتا دوں نیچے جو

دکانیں ہیں ان کا اچھا خاصا کرایہ آتا ہے۔ دوسرے اماں کی چھوڑی ہوئی بہت سی رقم ہے اس کا

سود مل جاتا ہے۔“ یہ بتا کر سردار جہاں نے کہا: ”لیکن ایک فکر ستاتی رہتی ہے۔“

”وہ کیا؟“

”خرچ بڑھتا جا رہا ہے۔ اب اصل میں سے بھی خرچ ہونے لگا ہے۔ ڈر لگا رہتا ہے

کہیں ایک دن.....“

”ایک دن.....“

”یہ مکان نہ ہاتھ سے نکل جائے۔“ یہ کہہ کر سردار جہاں خاموش ہو گئیں اور بڑی دیر تک خاموش رہیں۔

میں بھی بہت دیر تک کچھ نہیں بولا۔ اس خاموشی کے درمیان دوسرے کمرے سے ہنگا کی آواز آئی:

”خالہ اب کچھ دیر آرام کیجئے، بہت دیر سے باتیں کر رہی ہیں۔“
 ”وہ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اب آپ آرام کیجئے اور مجھے اجازت دیجئے۔“ یہ کہہ کر میں سردار جہاں کو سلام کر کے ان کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ زینے کے دروازے پر ہنگا کھڑی تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی میں نے کہا: ”معاف کیجئے گا میں نے آپ کی خالہ کو بہت پریشان کیا اور آپ کو بھی۔ اُن سے کہیے گا پھر کسی دن حاضر ہوں گا۔“
 ہنگا نے یہ سن کر ناگواری سے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا:
 ”لیکن اب زیادہ پریشان نہیں کروں گا۔“



جہاں دار بیگم سے میں کہہ کر تو یہ آیا تھا کہ دو چار دن بعد آؤں گا لیکن دو ہفتوں سے زیادہ گزر جانے کے بعد بھی ان کے یہاں نہیں جاسکا۔ ان دو ہفتوں میں ایک بھی لمحہ ایسا نہیں تھا جب میں نے اُس مسودے کے بارے میں جسے میں ڈھونڈ رہا تھا، نہ سوچا ہو۔ اس لیے جیسے ہی مجھے اپنے علاقے والے کاموں سے فرصت ملی میں جہاں دار بیگم کی حویلی کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچا تو باہری دروازے پر سلیمن کھڑی مل گئی، مجھے دیکھتے ہی بولی:

”آپ کہاں غائب ہو گئے تھے۔ بیگم صاحب آپ کو پوچھتے پوچھتے ہلکان ہو گئیں۔ اپنا کچھ اتا پتا بتا کر بھی نہیں گئے کہ ہم آپ کو ڈھونڈ لاتے۔“ سلیمن نے قدرے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔ پھر بولی: ”بیگم صاحب روز پوچھتیں بھیا آئے، دن کے دسترخوان پر بیٹھتیں تو آپ کے لئے بھی کھانا لگواتیں اور جب انتظار کے بعد بھی آپ نہ آتے تو دو چار لقمے توڑ کر دسترخوان بڑھوا دیتیں۔“ یہ بتا کر بولی: ”دن میں کئی بار کتابوں والے کمرے کی طرف بھی جاتیں اور جو کتابیں آپ نے الگ کی تھیں انہیں چھو چھو کر وہیں رکھ دیتیں۔“ سلیمن بتاتی رہی: ”کسی سے آپ کے لئے بہت قیمتی کپڑے کے دو تین تھان بھی منگوائے ہیں۔ جب میں

نے پوچھا بیگم صاحب یہ کیوں؟ تو بولیں بھینا آ جائیں تو درزی بلوا کر ان کی ناپ دلو اوں گی اور ان کے لیے دو تین اچھی سی شیر و انیاں سلواؤں گی۔“ پھر کہنے لگیں: ”اس کی شادی میں ہی کروں گی اور اس گھر میں اس کے لئے ایک اچھی سی دہن لاؤں گی۔“ یہ بتا کر مجھ سے بولیں: ”اور سلیمین ان دونوں کے لئے تم بہت اچھے اچھے کھانے پکانا۔“

میں سلیمین کی زبان سے یہ سب سنتا رہا اور سوچتا رہا میں جہاں دار بیگم کے سامنے کس طرح جاؤں۔ مجھے سوچتا ہوا دیکھ کر سلیمین بولی:

”کیا سوچ رہے ہیں؟“

سید

”یہی کہ میں ان کے سامنے کس طرح جاؤں۔ بہت ناراض ہوں گی۔“

”ارے ناراض کیا ہوں گی، اٹھ کر گلے سے لگالیں گی۔ ہو سکتا ہے رونے بھی لگیں۔“

یوں بھی کوئی پرانی بات یاد آتی ہے تو رونے لگتی ہیں۔“

”تو میرے آنے کے بارے میں انہیں بتادو۔“

”نہیں ایسے بتاؤں گی تو وہ دوڑی ہوئی دروازے پر چلی آئیں گی۔“ سلیمین نے کہا۔

پھر بولی:

”آپ میرے پیچھے پیچھے آئیے۔ اس وقت صحنچی میں لیٹی ہوئی ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ ہی

کا انتظار کر رہی ہوں۔“ سلیمین نے کہا۔ ”جب آپ دالان والے دروازے پر پہنچ جائیں

گے تب میں انہیں بتاؤں گی اور جیسے ہی میں بتاؤں، آپ صحنچی کے قریب آ جائے گا۔“

میں نے ویسا ہی کیا جیسا سلیمین نے کہا تھا۔ دالان کے دروازے پر پہنچ کر سلیمین نے

آواز لگائی:

”بیگم صاحب! اس کی آواز سنتے ہی جہاں دار بیگم اندر سے بولیں:

”کیا بھینا آ گئے؟“

”آ گئے اور یہیں دالان کے پاس کھڑے ہیں۔“

”تو اندر کیوں نہیں بلاتی وہاں کیوں کھڑا کر رکھا ہے۔“

اور اس سے پہلے کہ جہاں دار بیگم اٹھ کر اپنے تخت پر ٹھیک سے بیٹھیں، میں نے صحنچی کے

سامنے آ کر انہیں سلام کیا۔

”میں تم سے بہت ناراض ہوں۔“ انہوں نے محبت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”دو چار دن کے لیے کہہ کر گئے تھے اور آج سولہواں سترہواں دن ہے۔ ایسی بے رخی۔“ اس بار ان کی محبت میں تھوڑا سا غصہ بھی شامل ہو گیا تھا۔

”نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ وہی آپ کی امراؤ جان، انہیں کے بارے میں چوک اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں پوچھتا پھر رہا تھا۔“ میں نے کہا: ”اور اسی میں سردار جہاں جو امراؤ بیگم کی بیٹی ہیں، ان سے ملاقات ہو گئی، بہت سی باتیں ان سے معلوم ہوئیں۔“

”اچھا یہ سب باتیں بعد میں۔ پہلے کچھ کھاؤ پیو اور آج یہیں بیٹھو میرے پاس۔ کتابیں دیکھنے والا کام کل سے کرنا۔“ یہ کہہ کر انہوں نے سلیمین کو آواز دی۔ وہ سامنے آئی تو بولیں:

”نعمت خانے سے وہ جو بھیتا کے لیے بالائی کا حلوہ میں نے بنایا ہے، وہ نکال لا۔ اور سن جو پکے ہوئے شریفے تڑوائے ہیں انہیں بھی لیتی آ۔“

کچھ دیر بعد سلیمین ایک بڑی سی کشتی میں سب چیزیں سجا کر لے آئی۔ جہاں دار بیگم نے کشتی میں رکھی ہوئی ایک چھوٹی طشتری میں حلوے کی دو چار لوزاتیں رکھ کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

”تم دو چار دن بعد آنے کے لیے کہہ گئے تھے۔ میں نے تمہارے جانے کے چوتھے یا پانچویں دن یہ حلوہ بنایا تھا۔ اس پر جو ورق لگا ہے، خاص چاندی کا، وہ چوک میں زرکوبوں والی دکان سے منگوا یا ہے۔“ جہاں دار بیگم بتاتی رہیں: ”روز انتظار کرتی تھی کہ آج تم آؤ گے۔ مجھے ڈرتھا دن گزر جانے پر حلوہ خراب نہ ہو جائے۔ خدا کا شکر ہے خراب نہیں ہوا۔ لو کھاؤ۔“

میں نے حلوے کی دو لوزاتیں کھا کر ہاتھ روک لیا۔ میرے ہاتھ روکتے ہی جہاں دار بیگم بولیں:

”اور کھاؤ۔ سب تمہارے لیے ہے۔ جو بچے گا وہ تمہارے ساتھ کر دوں گی۔“ یہ کہہ کر انہوں نے سلیمین کو آواز دی۔ وہ آئی تو بولیں:

”وہ جو حلوہ نعمت خانے میں رہ گیا ہے اسے ایک ڈبے میں رکھ کر اچھی طرح بند کر دے۔ بھیتا اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ اور ہاں ایک گلاس پانی لے آ۔“

پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولیں:

”کھانے کی کشتی میں پانی نہیں لایا جاتا۔ معلوم ہے کیوں؟“ *

”کیوں؟“

”بدشگونی ہے۔ ایسا بس فاتحے کے کھانے کے ساتھ ہوتا ہے۔“

”حلوہ بہت مزے کا ہے۔“

”ہاں جب یہ زندہ تھے تو ہر جاڑے میں ان کے لیے بہت سائنتی تھی۔“ یہ سے مطلب

ان کے شوہر تھے۔

”اچھا لگ رہا ہے تو اور کھاؤ۔ اور جب زبان سے اس کا ذائقہ جاتا رہے تو شریفہ

کھانا۔ اس کی مٹھاس بالکل الگ ہے۔“ جہاں دار بیگم نے کہا۔ پھر بولیں: ”اب بتاؤ

کھانے میں کیا کھاؤ گے۔“

”جو پک جائے گا۔“

”نہیں تمہیں جو پسند ہے وہی پکواؤں گی۔“ یہ کہہ کر مجھ سے پوچھا:

”کو فتنے اچھے لگتے ہیں؟“

”جی بہت۔“

”اور دو پیازہ۔“

”وہ بھی۔“

”اور ست پیتھا۔“

”جی جی۔ وہ بھی۔“

”اچھا بتاؤ میں نے یہی چیزیں کیوں پوچھیں۔“

میں خاموش ہو گیا۔

”تمہاری ماں ذاکیہ بیگم کو یہ تینوں چیزیں بہت پسند تھیں۔ اور یہ تینوں چیزیں وہ

بہت عمدہ پکاتی تھیں۔ پکاتی تو وہ اور بھی چیزیں بہت عمدہ تھیں، میں نے سوئے والا

مٹر پلاؤ جیسا ان کے ہاتھ کا کھایا اور کہیں نہیں کھایا۔“ یہ سب کہنے کے بعد انہوں نے

پھر سلیمین کو بلایا اور اس سے کہا:

”دیکھ حنیف کے یہاں سے آدھ سیر بڑے کا قیمہ لے آ اور بابو چکوے کے یہاں سے

ایک سیر چھوٹے کا گوشت، ران اور سینے پرکا۔ کہنا بیگم صاحب نے کہا ہے اچھی بوٹی نکالے۔“
 یہ کہہ کر کہا: ”بھیا آج کو فٹے اور دو پیازہ کھائیں گے۔ اور اسی کے ساتھ ست پتھہ۔ اور سن
 ست پتھہ کے لئے وہ جوار و اچاول ہیں، وہ پکا۔“ سلیمین کو یہ سب بتانے کے بعد بولیں:
 ”آج مجھے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔ تمہارا دل کمرے میں تو نہیں لگا ہے۔“

”جی نہیں۔ وہ کام کل کر لوں گا۔“

”ہاں جہاں اتنے دن نہیں کیا وہاں ایک دن اور سہی۔“

”جی جی۔ آپ جی بھر کے باتیں کیجئے۔ میں یہیں بیٹھا ہوں آپ کے پاس۔“ یہ سن کر
 وہ کچھ دیر خاموش رہیں پھر اٹھ کر صحنہ کی داہنی طرف رکھی ہوئی شیشم کی ایک بڑی سی الماری
 کھول کر اس میں سے ایک پتھہ نکالی اور اسے میرے سامنے رکھتے ہوئے بولیں:

”اس میں لکھنؤ میں جو ادھر ادھر ہماری زمینیں اور مکانات ہیں، ان کے کاغذات ہیں۔“

اب میں بہت دن تو جیوں گی نہیں اس لئے تم سے مشورہ کرنا ہے ان سب کا کیا کروں۔“

”یہ مشورہ تو کسی وکیل سے کیجئے۔ میں یہ چیزیں اچھی طرح نہیں سمجھتا۔“

”وکیل بہت چالاک ہوتے ہیں۔ جعلی کاغذات بنا کر انہوں نے لکھنؤ میں کتنے لاولد

لوگوں کی جائدادیں ہڑپ لیں۔“ جہاں دار بیگم نے کہا۔

”جی۔ اماں بتاتی تھیں یہاں ایسے لوگ بھی ہیں جو نقلی کاغذات بنانے کے ماہر

ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ہر وقت اس فراق میں رہتے ہیں کہ لوگوں کی جائدادیں اور ان کے

جھگڑے کیسے معلوم ہوں۔“

”ہاں تمہاری طرف کے محلوں میں تو اس طرح کے لوگ بہت ہیں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے ہلکا

ساقہ تھپہ لگایا۔ پھر بولیں: ”اچھا تو سنو! میں سوچتی ہوں ساری جائداد وقف کردوں۔ علی الخیر۔

اور یہ کام تمہاری موجودگی میں ہو۔“ یہ کہنے کے بعد کہا: ”میں اپنی زندگی میں تمہیں اس کا متولی

بنادوں گی۔“ پھر بتایا: ”ادھر ایک دو برسوں سے میرے عزیزوں نے میرے گھر کے چکر لگانا

شروع کر دیے ہیں۔ مگر ان میں سے کسی کو پھوٹی کوڑی نہیں دوں گی۔“

”لیکن آپ مجھ پر اتنا بھروسہ کیوں کر رہی ہیں؟“

”سیدانی کے بیٹے ہو۔ تمہارے من میں کھوٹ کبھی نہیں آئے گی۔“ جہاں دار بیگم نے

کہا۔ ”تمہاری ماں صوم و صلوٰۃ کی پابند تھیں، کیا مجال کہ ایک وقت کی نماز قضا ہو جائے۔ لوگ بہت قیمتی قیمتی چیزیں امانتاً ان کے پاس رکھواتے تھے۔ ایسی دیندار اور پاک باطن عورتیں میں نے بہت کم دیکھی ہیں۔“ یہ کہہ کر دھیمی آواز میں بولیں:

”ایک بات تمہیں اور بتا رہی ہوں جو صرف سلیمان کو معلوم ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گئیں۔
”کون سی بات؟“

”اماں کو میری دے کا مرض تھا۔“

”جی بتایا تھا آپ نے۔“

”وہی عارضہ مجھے بھی ہے۔ میں جب کھانستی تھی، تم میری طرف دیکھتے تھے۔“

”نہیں، تھوڑی بہت کھانسی تو سب کو آتی ہے۔“

”یہ تھوڑی بہت والی کھانسی نہیں ہے۔ رات میں بہت بڑھ جاتی ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”کبھی کبھی تو سلیمان کو رات رات بھر پیٹھ سہلانا پڑتی ہے۔ گھیاری منڈی والے حکیم کا علاج برسوں سے کر رہی ہوں۔ مرض کبھی کم ہو جاتا ہے، کبھی بہت بڑھ جاتا ہے۔ کیا پتہ کب آنکھ بند ہو جائے۔“

”ایسا مت کہیے۔“

”مرنا تو ہے ہی۔ اور یوں بھی اب مرض سے لڑنے کی عمر نہیں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے بچھی سے نکالے ہوئے کاغذات کھولنا شروع کر دیے۔ پھر ایک کاغذ میرے سامنے رکھتے ہوئے بولیں:

”یہ دیکھو، اٹھیا میں وہ جو لیج آباد کے راستے میں ہے، وہاں آموں کے دو بڑے بڑے باغ ہیں۔ وہاں جو میرے عزیز رہتے ہیں، انہیں دے رکھے ہیں۔ وہی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ فصلیں کن داموں بکتی ہیں مجھے نہیں معلوم۔ جو پیسے لا کر دے دیتے ہیں رکھ لیتی ہوں۔ دو چار ٹوکڑے آموں کے بھی دے جاتے ہیں۔“ یہ بتا کر بولیں: ”لیکن اب میری آنکھ بند ہونے کے انتظار میں ہیں۔“

پھر دوسرے کاغذ الٹ پلٹ کر مجھے دکھاتے ہوئے کہا:

”یہ کالے پہاڑوں سے پہلے جہاں شہرے کی مسجد ہے، وہاں کے کاغذ ہیں۔ وہاں

سات آٹھ بیگھا زمین ہے۔ بہت سی زمین پر قبضہ بھی ہو گیا ہے۔ اسے تو میں اپنے رہتے نکال دوں گی۔ تم ادھر ادھر جاتے رہتے ہو۔ ذکر کرنا اور کوئی اچھا خریدار ملے تو بتانا۔“

”ضرور بتاؤں گا۔ لیکن یہ بتائیے جب آپ کے پاس اتنی زمین جائداد ہے تو آپ نے کوئی مختار کیوں نہیں بنایا۔“

”بنایا تھا۔ جب پتہ چلا وہ گڑ بڑ کر رہا ہے تو ہٹا دیا۔ لیکن ہتے ہتے بھی اس نے بہت کچھ ہتھیا لیا۔“ جہاں دار بیگم نے غصے سے کہا۔ پھر بولیں: ”اب ان معاملات میں کسی اور کو نہیں ڈالوں گی۔ عزیز اقارب سب کی آنکھیں میری دولت پر لگی ہیں۔“ وہ بتاتے بتاتے رکیں تو میں نے کہا:

”میں تو سمجھ رہا تھا بس یہی ایک حویلی ہے۔“

”نہیں نہیں۔ بہت ہے۔ اور بہت کا تو ہمیں علم نہیں۔ اب بتاتے تھے بہت دور دور تک زمینیں تھیں ہماری۔ لیکن.....“

”لیکن؟“

”کچھ تو ابانے اپنی زندگی میں نکال دیں۔ بہت سے مکان عزیزوں کو رہنے کے لئے دیے پھر ان سے واپس نہیں لیے۔ رہتے رہتے وہ انہیں کے ہو گئے۔ اور اماں.....“ جہاں دار بیگم نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ پھر کہا: ”اماں ان چیزوں سے بے نیاز رہیں۔ خیر یہ باتیں بہت لمبی ہیں۔ بات یہ ہے کہ جب سے تم یہاں آئے ہو مجھے موت کا ڈر زیادہ ستانے لگا ہے۔“

”کیوں؟“

”تمہارے یہاں آنے کے بعد میرا جی چاہتا ہے کچھ اور جیوں..... اور..... اور زندہ رہنے کی اسی چاہت نے موت کا ڈر بڑھا دیا ہے۔“

”ابھی اب بہت جنیں گی انشاء اللہ۔“

”نہیں۔ اب شاید اور نہ جیوں۔ اسی لیے چاہتی ہوں جو کچھ زمین جائداد ہے، اپنے جیتے جی اس کا انتظام کر دوں۔“

”اب تک کیوں نہیں کیا؟“

”بس آج کل پہ لٹتا رہا۔ آس پاس کوئی ایسا نظر نہیں آیا جس پر بھروسہ کر سکوں۔“ انہوں

نے کہا، پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بڑے یقین کے ساتھ بولیں:

”لیکن تم پر میں بھروسہ کر سکتی ہوں، پوری طرح۔“

”میں تو وہ کتاب ڈھونڈنے آیا ہوں آپ کے یہاں۔ اس کے مل جانے کے بعد کیا پتہ کب آنا ہو۔“

”نہیں ایسا مت کہو۔ میں چاہتی ہوں تم یہیں رہو میرے پاس۔ اس حویلی میں جگہ ہی جگہ ہے۔ جہاں چاہو رہو۔“ وہ بولیں: پھر کہا: ”جس جگہ تم رہنا پسند کرو گے میں اسے ٹھیک کرادوں گی، تمہارے حساب سے۔“

”جی شکریہ۔ لیکن ایک بات جو میں آپ سے کہنے جا رہا ہوں، اور اسے آپ بھی خوب سمجھتی ہیں۔“

”وہ کیا؟“

”میں یہاں رہا تو سب سمجھیں گے آپ کی جائداد پر میری نظر ہے۔ اور پھر یہ بھی کہ آپ کے جو عزیز ہیں، انہیں آپ کیا بتائیں گی میں کون ہوں۔“

”اپنا بیٹا.....“

جہاں دار بیگم کی زبان سے یہ سن کر مجھے بہت اچھا لگا۔ بہت دیر تک یہ فقرہ میری سانسوں میں دوڑتا رہا۔

”کیا سوچنے لگے؟“ جہاں دار بیگم نے مجھے خاموش دیکھ کر پوچھا۔ پھر خود ہی بولیں:

”میرا بیٹا بننا اچھا نہیں لگا۔“

”جی نہیں ایسی بات نہیں۔“

”پھر چپ کیوں ہو گئے۔“

”آپ کے بیٹا کہنے پر ماں یاد آ گئیں۔“

”ہاں، بہت چاہتی تھیں تمہیں۔ بچپن میں تم بہت گول مٹول تھے۔ بہت گورے چٹے۔ سب ٹماٹر کہتے تھے تمہیں۔“ یہ بتا کر بولیں: ”ایک روز میں تمہارے گھر میں تھی کہ گلی سے ایک ہاتھ دیکھنے والا گزرا۔ تمہاری ماں نے اسے بلا کر تمہارا ہاتھ دکھایا۔ ہاتھ دیکھ کر وہ بولا: ”بیگم صاحب یہ لڑکا بہت آگے جائے گا۔ تمہاری ماں یہ سن کر بہت خوش ہوئیں۔“

جہاں دار بیگم نے کہا۔ پھر بولیں: ”پڑھنے لکھنے سے تمہاری جو رغبت ہے وہ تمہیں بہت آگے لے جائے گی۔“ یہ کہہ کر کہا:

”عمو جان کو دیکھو۔ کتاب کے کیڑے تھے۔ اماں بتاتی تھیں ہر وقت ہاتھ میں کوئی نہ کوئی کتاب رہتی تھی۔ پڑھ پڑھ کر کیا کیا کتابیں لکھیں اور کیسا نام کمایا۔“

”اُن کی برابری کون کر سکتا ہے۔ پتہ نہیں کون سا دماغ لے کر پیدا ہوئے تھے۔“

”دماغ تو اُن کا اچھا تھا ہی لیکن محنتی بھی بہت تھے۔ خالی نہیں بیٹھتے تھے کسی وقت اور یہی بات میں تم میں بھی دیکھتی ہوں۔“ یہ کہہ کر بولیں:

”تو بتاؤ کب سے آ رہے ہو، رہنے کے لئے؟“

”پہلے یہ کتاب ڈھونڈنے والا کام کر لوں، پھر بتاؤں گا۔“

”تو مختار بننے کے لئے تو راضی ہو؟“

”جی یہ بھی اسی وقت بتاؤں گا۔“

”ایک بات اور کہوں۔“

”جی کہیے۔“

”میں چاہتی ہوں تمہاری شادی یہیں سے ہو، میرے گھر سے۔“

”لیکن شادی بیاہ کے بارے میں تو میں نے ابھی سوچا نہیں۔“

”لیکن میں چاہتی ہوں..... اپنی آنکھ بند ہونے سے پہلے میں تمہاری دلہن لے آؤں۔“

میں چپ رہا۔ وہ کہتی رہیں:

”یہ جو کمرہ چمن کے پہلو والا ہے جس میں تم وہ کتاب ڈھونڈ رہے ہو، کتاب مل جانے

کے بعد میں اسے خالی کرا کر تمہارے رہنے کے قابل بنادوں گی۔“ پھر کچھ ٹھہر کر بولیں:

”ابھی تو چمن اجاڑ پڑا ہے، جب تم رہنے کے لئے آؤ گے تو کوئی اچھا سامالی بلوا کر اسے

ٹھیک کرادوں گی۔“ اتنا کہہ کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا:

”اور ایک بات اور کہنا ہے۔“

”وہ کیا؟“

”میرے مرض کا، جیسا میں نے تمہیں بتایا، سلیمان کے سوا کسی اور کو علم نہیں ہے۔ اب

دوسرے تم ہو۔“ انہوں نے کہا۔ پھر کہا: ”ابھی تک وہی حکیم صاحب سے حال کہہ کر میری دوا لاتی ہے۔ لیکن.....“ وہ کہتے کہتے رکیں۔
”لیکن.....؟“

”آج سے میری دوا تم لاؤ گے۔ گھبراؤ نہیں۔ دوا روز نہیں آتی۔ حکیم صاحب ہفتے ہفتے بھر کی دیتے ہیں۔ تمہیں بھی ہفتے میں ایک بار وہاں جانا ہوگا۔“
میں جہاں دار بیگم کی باتیں سنتا رہا لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ دوا مجھ سے کیوں منگوانا چاہتی ہیں۔

”اور وہ دوا آج آنا ہے۔ حکیم صاحب مغرب بعد اپنے مطب پر بیٹھ جاتے ہیں، گھسیاری منڈی میں۔“ جہاں دار بیگم نے کہا:
”کیا نام ہے اُن کا۔“ میں نے پوچھا۔
”احمد رضا۔ حکیم احمد رضا۔“

”جی جی۔ جانتا ہوں انہیں۔ پہلے ہماری ہی طرف بیٹھتے تھے۔“
”ہاں..... فرنگی محل کے سامنے حکیم آشفۃ کے مطب میں۔ اب ادھر آ گئے ہیں گھسیاری منڈی کی طرف۔“ انہوں نے کہا۔ ”قلبی امراض کے ماہر ہیں۔ ان کے استاد حکیم آشفۃ نے اماں کو اپنی دوا سے بہت دن زندہ رکھا۔“ پھر ذرا ٹھہر کر بڑی محبت سے حاکمانہ لہجے میں بولیں:
”آج تمہیں دوا لانا ہے۔“
”لے آؤں گا۔“

”شام تک یہیں رہو۔ دن کے کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کرنا۔ سہ پہر کو میں تمہیں بیل کا شربت پلوؤں گی۔ تب تک شام ہو جائے گی۔“
”جی ٹھیک ہے۔“

میں اُن کی باتیں سن تو رہا تھا لیکن میرا دل کتابوں والے کمرے میں لگا تھا۔
”پھر کہیں کھو گئے۔“ جہاں دار بیگم کی آواز پچھنی میں گونجی۔ ”آج کچھ کھوئے کھوئے سے ہو، کسی پریشانی میں ہو۔“
”نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔“

”میں دیکھ رہی ہوں کچھ کچھ دیر بعد تم کہیں گم ہو جاتے ہو۔“

”میں آپ کی باتیں سن رہا ہوں، غور سے سن رہا ہوں۔“

جہاں دار بیگم کو باتیں کرتے کرتے بہت دیر ہو گئی تھی۔ کھانے کا وقت قریب آنے لگا تھا۔ بولتے بولتے انہوں نے مجھ سے کہا: ”ذرا باہر نکل کے سلیمن کو آواز دو، دیکھوں باورچی خانے کا کیا حال ہے۔“

میں نے باہر نکل کر سلیمن کو آواز دی۔ وہ ڈوپٹے کے پلو سے ماتھے اور گلے کا پسینہ پونچھتے ہوئے جہاں دار بیگم کے سامنے آئی تو انہوں نے اس سے پوچھا:

”باورچی خانے کا کیا حال ہے؟“

”ہنڈیاں چڑھائے دیر ہو گئی۔ تیاری پر ہیں۔ جب کہیے گا دسترخوان لگا دوں گی۔“

”پتیلیاں صحیح آنچ پر لگانا۔“ جہاں دار بیگم بولیں۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا:

”لکھنؤ میں اب کھانے والے رہ گئے نہ پکانے والے۔“

”صحیح کہہ رہی ہیں۔“

”کیا صحیح کہہ رہی ہوں۔ تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے کھانوں کے بارے میں

بہت کچھ جانتے ہو۔“

”نہیں، بہت نہیں جانتا لیکن اماں کو باورچی خانے میں دیکھتا رہتا تھا۔ طرح طرح کے کھانے طرح طرح سے پکاتی تھیں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ نے ان کے سوئے والے مٹر پلاؤ کا ذکر کیا تھا۔ وہ ارہر کی کھجڑی بھی بڑے اہتمام سے پکاتی تھیں۔ ہنڈیا چڑھا کر چولہے کی آنچ بدلتی رہتی تھیں۔ جب وہ تیاری پر آتی تو دھیمی آنچ کر کے ڈھکنی پر آٹے کا لیپ لگا کر اس پر انگارے رکھ دیتیں۔ اس سے کھجڑی بہت سوندھی ہو جاتی۔“

”خیر ان کا کیا کہنا۔ وہ تو ہنڈیا چکھ کر مسالے تک بتا دیتی تھیں کیا کیا پڑا ہے اور

کتنا کتنا پڑا ہے۔“

ہم لوگ یہ باتیں کر رہے تھے کہ سلیمن کی آواز آئی:

”بیگم صاحب، دسترخوان لگا دیا ہے۔“

”چلو بہت اچھی بھوک لگی ہے۔“ جہاں دار بیگم بولیں۔

ہم صحنی سے نکل کر ہال میں آئے تو دسترخوان پر کھانوں سے بھری ہوئی قابیں اور
طشتریاں بہت سلیقے سے رکھی تھیں اور ان کے ساتھ کئی طرح کے اچار اور چٹنیاں بھی۔
دسترخوان پر بیٹھتے ہی جہاں دار بیگم نے کہا:

”آج تمہاری طشتری میں کھانا میں نکالوں گی۔“ یہ کہہ کر انہوں نے میری طشتری لے کر
دو کوفتے نکالے اور تھوڑا سا دو پیازہ۔ پھر اس میں اچار اور چٹنیاں رکھ کر اسے میری طرف
بڑھاتے ہوئے بولیں:

”شروع کرو۔“

ایک دو لقموں کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا:
”کیسا ہے؟“

”بہت مزے کا۔ دونوں چیزوں کا پکانا بہت مشکل ہے۔“

”لیکن سلیمان ماہر ہو چکی ہے۔ میں نے اسے سب کچھ سکھا دیا ہے۔“

ساری چیزیں میں نے بڑے شوق سے کھائیں۔ جہاں دار بیگم نے ان چیزوں کا مزہ
چکھنے کے لئے ایک ایک دو لقمے کھائے پھر تھوڑا سا پیتھا اور چاول کھا کر ہاتھ روک لیا۔
میں نے ان کی طرف دیکھا تو بولیں:

”میری غذا اتنی ہی ہے۔“

دسترخوان سے اٹھتے اٹھتے انہوں نے کہا:

”ماں کے مرنے کے بعد ایسا ست پیتھا بھی تم نے کہیں اور نہیں کھایا ہوگا۔“

”جی بالکل۔ ایسا لگتا ہے جیسے آپ نے اپنا ہاتھ سلیمان کو دے دیا ہے۔“

”ہاں۔ ساری بات ہاتھ ہی کی ہے اور مزہ سب کے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔“
انہوں نے کہا۔ ”سارے مسالے ٹھیک ٹھیک پڑنے کے بعد بھی اگر ہاتھ میں مزہ نہیں
ہے تو ہنڈیا بے مزہ ہو جاتی ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“

”اچھا اب تم آرام کرو۔ میں یہیں ہال میں تمہارا بستر لگوائے دیتی ہوں۔ سہ پہر کے
بعد سلیمان تمہیں جگادے گی۔“ یہ کہنے کے بعد جہاں دار بیگم نے سلیمان سے دسترخوان

بڑھانے کے لئے کہا اور جب وہ دسترخوان بڑھا چکی تو اس سے بولیں:
 ”عبدال سے کہہ ہال میں بھیتا کے لیے بستر لگا دے اور جب تک یہ سوئیں
 پنکھا جھلتا رہے۔“

○

شام سے کچھ پہلے سلیمان نے مجھے جگا کر مجھ سے کہا:
 ”صحیحی میں چلیے۔ بیگم صاحب آپ کو یاد کر رہی ہیں۔“
 میں صحیحی میں پہنچا تو اسٹول پر ایک کشتی میں بیل کے شربت کے دو گلاس رکھے تھے۔
 مجھے دیکھتے ہی جہاں دار بیگم نے پوچھا:
 ”اچھی نیند آئی؟“
 ”بہت اچھی۔“

”یہ شربت پیو اور مغرب بعد حکیم صاحب کی طرف چلے جاؤ۔ دوالا نے۔ اور حال اگر یاد
 نہ رہے تو ایک پرچے پر لکھ لو۔ کاغذ ہے کوئی تمہارے پاس۔“
 ”جی یاد رہے گا، آپ بتائیں۔“
 ”کہنا سینے میں سوزش بہت ہے، بھوک اور کم ہو گئی ہے، بلغم زیادہ بن رہا ہے۔ ایک بھل
 زیادہ دیر تک لیٹو تو کھانسی زیادہ آنے لگتی ہے۔“ یہ بتا کر بولیں:
 ”یاد رہے گا اتنا سب۔“

”میں لکھے لیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے جیب سے کاغذ قلم نکالا اور جو کچھ انہوں نے بتایا
 تھا اسے بول بول کر لکھنا شروع کر دیا۔ سب کچھ لکھنے کے بعد میں نے کہا:
 ”اب میں نکلتا ہوں۔ پہنچتے پہنچتے مغرب کا وقت ہو جائے گا۔“
 ”جگہ سمجھ گئے۔“

”گھسیاری منڈی سے جو گلی نئے گاؤں کی طرف نکلتی ہے، وہیں کہیں بیٹھتے ہیں۔“
 ”ہاں مطب ان کا بہت مشہور ہے۔ کسی بھی راہ چلتے سے پوچھ لینا بتا دے گا۔“ انہوں
 نے کہا۔ ”یہ نسخہ لو اور سنبھال کر رکھو۔“

جہاں دار بیگم کی حویلی سے نکل کر میں رکاب گنج والی سڑک پر آیا اور ایک رکشے پر بیٹھ کر

تیسرا باغ، گھسیاری منڈی کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر گھسیاری منڈی سے نئے گاؤں کی طرف نکلنے والی گلی میں داخل ہوتے ہی میں نے ایک راہ گیر سے پوچھا:

”حکیم احمد رضا کہاں بیٹھتے ہیں؟“

”وہ سامنے داہنی طرف سرخ رنگ کی جو عمارت دکھائی دے رہی ہے، اسی میں۔“ وہ بولا۔

”مریض آنا شروع ہو گئے ہیں۔“

میں کچھ دور چل کر داہنی طرف بنی ہوئی سرخ رنگ کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ وہاں بہت سے مریض برآمدے میں پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ میں بھی ایک کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ حکیم صاحب نے مریضوں کو دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ ایک شخص حکیم صاحب کے کمرے کے باہر کھڑا مریضوں کے نام لے لے کر پکار رہا تھا۔ حکیم صاحب ایک ایک مریض کو دیر دیر تک دیکھ رہے تھے۔ میں نے سوچا اس طرح تو بہت دیر ہو جائے گی۔ میں نے اس شخص سے جو مریضوں کے نام پکار رہا تھا، دھیمی آواز میں کہا:

”ایک کام کر دیں گے۔“

”بتائیے۔“

”حکیم صاحب سے بتادیں جہاں دار بیگم کی حویلی سے کوئی بیگم صاحب کی دوا لینے آیا ہے، حال بھی کہنا ہے۔“

”حکیم صاحب مریضوں کو نمبر سے دیکھتے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”آپ صرف اُن سے بتادیں۔ اگر بلا لیں گے تو ٹھیک ہے، ورنہ میں اُسی وقت جاؤں

گا جب میرا نمبر آئے گا۔“

وہ شخص اندر گیا اور کچھ دیر بعد باہر نکل کر مجھے بتایا:

”جو مریض اندر ہے اسے دیکھ لیں تو آپ چلے جائیے گا۔“

میں نے ایسا ہی کیا۔ جیسے ہی اندر والا مریض باہر نکلا میں اندر چلا گیا اور حکیم صاحب کو سلام کر کے جیب سے جہاں دار بیگم کے حال والا پرچہ اور نسخہ نکال کر اُن کی طرف بڑھایا۔ ”دونوں چیزیں لے کر حکیم صاحب نے مجھے اس اسٹول پر بیٹھنے کا اشارہ کیا جو مریضوں کو دیکھنے کے لیے ان کے قریب رکھا تھا۔“

”مشک گنج سے آئے ہیں؟“ انہوں نے پوچھا۔
”جی۔“

”دوا تو ان کی بوالینے آتی تھی۔“
”جی۔“

”تو آپ کیسے آگئے، عزیز ہیں ان کے؟“
”جی نہیں۔“
”پھر؟“

ابھی حال ہی میں ان کے یہاں آنا جانا شروع ہوا ہے۔“
حکیم صاحب نے یہ سن کر مجھے غور سے دیکھا۔ پھر پوچھا:
”کس سلسلے میں؟“

میں نے حکیم صاحب کو سارا قصہ مختصر بتایا تو وہ بولے:
”بھئی یہ افسانہ لکھنؤ میں بہت سوں کی زبان پر رہا۔ میرے خاندان میں بھی اس کے
بڑے چرچے ہوئے لیکن آج تک وہ مسودہ کسی کے ہاتھ نہ آیا۔“ یہ کہہ کر کہا: ”خدا معلوم ایسا
کوئی مسودہ ہے بھی یا نہیں۔“

”جی ہے، بالکل ہے۔ بہت لوگوں نے بتایا ہے۔“
”وہ کون لوگ ہیں؟“

”کچھ مرزا رسوا کے خاندان کے اور کچھ وہ جو کسی نہ کسی طرح ان سے متعلق رہے۔“
”تو بیگم صاحب کے یہاں اس کے ہونے کی امید ہے؟“

”جی۔ مرزا صاحب اپنی ساری کتابیں، جب وہ جہاں دار بیگم کے یہاں رہنے کے لیے
آئے، اپنے ساتھ لیتے آئے۔ اور جونچ رہیں وہ بعد میں ان کے یہاں بھجوا دیں۔“ میں نے
کہا۔ پھر انہیں بتایا: ”خاصا بڑا ذخیرہ ہے، اسی میں ڈھونڈ رہا ہوں۔ دن دن بھر لگا رہتا ہوں۔“
”تو ابھی ہاتھ نہیں لگاؤ مسودہ۔“

”بہت کتابیں دیکھ چکا ہوں اور بہت سی ابھی دیکھنا ہیں، انہیں میں کہیں ہوگا۔“
”بہت دلچسپ آدمی تھے مرزا صاحب بھی۔“

”آپ سے بھی کچھ تعلق ہے ان کا۔“

”کیوں نہیں۔ یہ باتیں جب آپ دوبارہ آئیں گے، تفصیل سے بتاؤں گا۔ اس وقت بس اتنا سن لیجیے کہ مرزا صاحب بہت عمدہ طبیب بھی تھے۔“ انہوں نے کہا: ”مغرب نسخوں کی ایک پوری بیاض تھی ان کے پاس۔“ یہ کہہ کر بولے: ”اور کچھ دوائیں خاص خاص امراض کے لئے انہوں نے خود تیار کی تھیں۔“ پھر بتایا: ”لکھنؤ میں مرزا حضرات میں بڑے بڑے طبیب تھے۔ طبیب الملک حکیم مرزا علی خاں کو کون نہیں جانتا۔ دو ہزار ماہانہ پر سلطانی طبیب مقرر کیا گیا تھا ان کو۔ نامی حکیم مرزا محمد جعفر شاہی دارالشفاء سے منسلک تھے۔ مسیح الدولہ خطاب تھا ان کا۔“ یہ سب کہنے کے بعد بولے:

”آپ کو شاید معلوم نہیں لکھنؤ کے بڑے حکیموں کے بزرگ شام اور مصر اور ایران ہوتے ہوئے لکھنؤ آ گئے تھے۔ شجاع الدولہ کے زمانے میں لکھنؤ ان طبیبوں سے بھرا ہوا تھا۔ خیر یہ باتیں کسی اور وقت..... بتائیے بیگم صاحب نے کیا حال کہلایا ہے؟“

”پرچہ آپ کو دے چکا ہوں اور نسخہ بھی۔“

حکیم صاحب نے پرچہ مجھے واپس کرتے ہوئے کہا: ”پڑھیے کیا لکھا ہے۔“

”سینے میں سوزش بہت ہے، بھوک اور کم ہو گئی ہے، بلغم زیادہ بن رہا ہے۔ ایک کروٹ سے زیادہ دیر لیٹتی ہیں تو کھانسی زیادہ آنے لگتی ہے۔“ میں نے پرچے میں لکھا ہوا حال انہیں پڑھ کر سنایا۔

”ہوں۔ آپ بیگم صاحب کے یہاں روز جاتے ہیں؟“

”سمجھ لیجیے اب روز ہی جاؤں گا۔“

”یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے، انہیں کون سا مرض ہے۔“

”جی معلوم ہے، ان کی ماں کو بھی یہی مرض تھا۔“

”ہاں۔ دوا تو میں دے رہا ہوں اور اچھی سے اچھی دوا دے رہا ہوں لیکن.....“

”لیکن.....؟“

”شاید وہ بہت دن زندہ نہ رہیں، رہ بھی سکتی ہیں۔ لیکن دوا کے ساتھ ایک اور چیز ہے جو انہیں زندہ رکھ سکتی ہے۔“

”وہ کیا.....؟“

”کسی کی قربت، اکیلی ہیں اور بہت زمانے سے اکیلی ہیں۔ زمین جائداد بہت ہے،

آپ کو تو معلوم ہی ہے۔“

”جی۔“

”کسی پر بھروسہ نہیں کرتیں، کرنا بھی نہیں چاہیے۔“ انہوں نے کہا۔ پھر کہا: ”یہ لکھنؤ

ہے۔ یہاں اچھے لوگ بھی ہیں اور بہت برے بھی۔“

”صحیح کہہ رہے ہیں۔“

”مجھے لگتا ہے آپ پر بھروسہ کرنے لگی ہیں۔“

”ایسا آپ کیوں کہہ رہے ہیں؟“

”اپنے مرض کے بارے میں انہوں نے سوا اپنی بوا کے کسی اور کو بتایا؟“

”نہیں۔“

”لیکن آپ کو بتایا۔“

”جی۔ بتایا اور یہ کہہ کر بتایا کہ اس بارے میں سوا سلیمان کے اور کوئی نہیں جانتا۔“

”بس تو بھروسہ ہے آپ پر ان کو، پورا۔“ حکیم صاحب نے کہا۔ ”پھر بولے: ”اب

آپ کی بھی ایک ذمہ داری ہے۔“

”جی بتائیں۔“

”خیال رکھیے ان کا، دے کا مرض ہے انہیں لیکن ایک اور بھی مرض ہے، اس کا تعلق جسم

سے نہیں دماغ سے ہے۔“

”وہ کیا؟“

”تنہائی۔ ایک تو بے اولادی ہیں دوسرے عزیزوں میں بھی کوئی بہت قریب کا نہیں

ہے۔“ حکیم صاحب نے کہا۔ ”اس لئے انہیں کسی ایسے کی ضرورت ہے جو ان کی تنہائی کا بھی

شریک ہو اور جس پر وہ پورا بھروسہ کر سکیں۔“ اتنا کہہ کر حکیم صاحب بولے:

”اب آپ ہی ہیں جو انہیں زیادہ دن زندہ رکھ سکتے ہیں۔ ایک بات اور.....“

”وہ کیا.....؟“

”جسمانی مرض میں بھی انہیں ایک اور مرض ہے۔ اس مرض میں انسان کو بھوک بالکل نہیں لگتی لیکن وہ کھانے کی باتیں ہر وقت کرتا رہتا ہے۔“

”جی یہ تو ہے۔ بیگم صاحب ہر وقت کھانے کی باتیں کرتی ہیں اور ہر وقت کچھ نہ کچھ کھلانے کو تیار رہتی ہیں۔“

”جی..... اسی لیے جب بھی وہ آپ سے کھانے کے لیے کچھ کہیں، انکار نہ کیجیے گا۔“

”بہتر ہے۔“

”یہ سب میں آپ سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ لکھنؤ کے حکیم علاج کرتے وقت بہت سی چیزیں دیکھتے ہیں۔“

”کیا کیا چیزیں دیکھتے ہیں؟“

”مریض کی عمر اور اس کا مزاج۔“ یہ بتا کر حکیم صاحب بولے: ”اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ علاج کے وقت موسم کیسا ہے۔ اور مزاجی کیفیت کا جاننا بھی ہمارے طریقہ علاج میں بہت ضروری ہے۔ اسی کے حساب سے نسخے لکھے جاتے ہیں۔“ پھر مسکرا کر بولے:

”دلی کے حکیموں کی طرح ہم گشتوں کا استعمال نہیں کرتے۔ اور ہمارے مرگبات بھی ان لوگوں سے مختلف ہیں، ایک بات اور۔ بیگم صاحب کی بوا سے کہیے گا کہ دو روز دے اور وقت پردے۔ اور ایک بات آپ کے لئے۔“

”وہ کیا؟“

”بیگم صاحب کو ناراض مت کیجیے گا۔ جو کہیں وہی کیجیے گا۔ ان امراض میں زود درنجی بہت مہلک ہوتی ہے۔“

”جی بہتر ہے۔“

”دوا لے جائیے اور جیسا میں نے کہا ہے ویسا ہی کیجیے گا۔“

”جی بالکل۔ مرزا رسوا کے بارے میں.....؟“ میں نے اٹھتے اٹھتے کہا۔

”کسی وقت اور۔ یہ مریضوں کے دیکھنے کا وقت ہے۔ بتاؤں گا، بہت دلچسپ باتیں

بتاؤں گا۔ اب جائیے۔“

”جی بس ایک بات.....“

ساقی از باب حقوق

PDF BOOK COMPANY

مدد، مشاورت، تجاویز اور شکایات:

Muhammad Husnain Siyalvi

0305-6406067

Sidrah Tahir

0334-0120123

Muhammad Saqib Riyaz

0344-7227224



”بتائیں۔“

”جناب کا دولت خانہ۔“

1 ٹوریہ گنج، پہلے وکٹوریہ گنج تھا، اس کے آگے جو شاہی خیرات خانہ ہے، اسی کے بعد رانی بلسی کی کوٹھی ہے اس کے بالکل سامنے والی گلی میں۔ کسی سے بھی پوچھ لیجیے گا حکیم آشفتم کا مکان کہاں ہے، بتا دے گا۔“

”وہ تو کھالا بازار کا علاقہ ہے۔“

میرے یہ کہنے پر حکیم صاحب نے تیوریاں چڑھا کر مجھے دیکھا۔

”کھالا بازار نہیں خالق بازار۔ لکھنؤ میں کتنی تیزی سے جگہوں کے نام بگڑ رہے ہیں۔“

”میں تو ایک زمانے سے یہی سنتا آیا ہوں۔“

”بزرگوں میں کوئی ہے آپ کے یہاں؟“

”ماں تھیں، اب نہیں رہیں۔“

”ہوئیں تو بتائیں صحیح نام کیا ہے۔“ یہ کہہ کر بولے: ”شکر ہے نالے کے اس طرف کے

محلے کا نام نہیں بدلا اس طرف والے کا بدل گیا۔“

”جی.....؟“

”ہم جہاں رہتے ہیں یہ اشرف آباد ہے۔ رسالدار اشرف علی خاں نے بسایا تھا اسے اور

نالے کے اس طرف مشرف آباد تھا۔ اسے انہیں اشرف علی خاں کے بھائی مشرف علی خاں نے بسایا تھا۔ لیکن.....“ حکیم صاحب کہہ کر رکے۔

”لیکن.....؟“

”اب وہ نوبستہ ہو گیا۔ کوئی نہیں جانتا پہلے یہ مشرف آباد تھا۔“ یہ کہہ کر بولے: ”اور وہ جو

حسین آباد میں شیث محل تھا وہ شیش محل ہو گیا۔“

حکیم صاحب یہ سب بتا کر چپ ہوئے تو میں انہیں سلام کر کے ان کے مطب سے باہر

نکل آیا اور جہاں دار بیگم کی حویلی پہنچ کر دوا انہیں دیتے ہوئے کہا:

”بہت اچھے حکیم ہیں۔ آپ کے مرض کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔“

”حال اچھی طرح کہہ دیا تھا۔“

”جی۔ اور انہوں نے اچھی طرح سمجھ بھی لیا۔“ یہ کہہ کر میں نے ان سے پوچھا:
”حکیم آشفۃ سے ان کا کیا تعلق ہے۔“

”والد ہیں ان کے۔ حکیم آشفۃ کو جانتے ہو؟“

”نام بہت سنا ہے۔ لیکن یہ نہیں معلوم تھا یہ ان کے بیٹے ہیں۔ آپ کے عموجان کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ پھر انہیں بتایا: ”وعدہ کیا ہے اگلی بار بہت دلچپ باتیں بتائیں گے ان کے بارے میں۔“

”ہاں۔ انہیں بھی بہت کچھ معلوم ہوگا۔ عموجان کا کچھ سلسلہ حکیموں کے خاندان سے بھی تھا۔“ جہاں دار بیگم کے پاس کچھ دیر بیٹھنے کے بعد میں نے ڈرتے ڈرتے ان سے کہا:
”تو اب میں چلوں؟“

”کل آؤ گے نا۔“

”آؤں گا، بالکل آؤں گا۔“

”کل کیا کھاؤ گے۔ بتاتے جاؤ۔“

”جو آپ کھلائیں گی۔“

”ٹھیک ہے جاؤ۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔“



دوسرے دن میں دن چڑھے جہاں دار بیگم کی حویلی پہنچ کر سیدھے کتابوں والے کمرے میں چلا گیا اور ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر، بغیر دیکھی ہوئی کتابوں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ میرے پہنچنے سے پہلے سلیمان نے وہ سارا سامان وہاں رکھ دیا تھا جس کی مجھے ضرورت پڑ سکتی تھی۔ کتابیں بھی میں جس طرح چھوڑ کر گیا تھا، اسی طرح رکھی تھیں۔ جہاں دار بیگم نے انہیں چھونے کے باوجود ادھر سے ادھر نہیں ہونے دیا۔ بغیر دیکھی ہوئی کتابوں میں سے دو چار کتابیں اٹھانے کے بعد مجھے ایک بڑا بنڈل نظر آیا۔ میں نے اٹھا کر اسے کھولا تو یہ سب علم طب سے متعلق رسالے تھے اور اسی کے بعد طب سے متعلق کچھ موٹی موٹی کتابیں۔ ان میں سے ایک دوفن طب سے متعلق تھیں اور دوا ایک کا تعلق طبابت کی تاریخ سے تھا۔ ایک کتاب بوعلی سینا پر تھی اور ایک میں مشہور حکیموں کا ذکر تھا۔

میں نے پڑھنا شروع کیا: علی ابن ابیطری، محمد بن ذکریا، علی بن عباس مجوسی، فتح اللہ شیرازی، کلیم علی گیلانی۔۔ ایک لمبی فہرست تھی۔ میں نے ان حکیموں کے نام کبھی نہیں سنے تھے۔ ان کتابوں اور رسالوں کو دیکھ کر مجھے حکیم احمد رضا کی کل کی بات یاد آئی:

”مرزا صاحب بہت عمدہ طبیب تھے اور مجرب نسخوں کی پوری ایک بیاض تھی ان کے پاس۔“ میں نے ان کتابوں اور رسالوں کو الگ ایک کونے میں رکھتے ہوئے سوچا: ”وہ بیاض بھی انہیں میں کہیں مل جائے گی۔“ میں کتابیں اٹھاتا گیا اور انہیں دیکھ دیکھ کر الگ رکھتا گیا۔ میں جب بھی کوئی کتاب اٹھاتا، اس کا موضوع اتنا دلچسپ ہوتا کہ اسے پڑھنے کو جی چاہنے لگتا۔ میں نے سوچا اگر یہ سلسلہ شروع ہوا تو مسودہ کئی دن تک نہیں ملے گا۔ اس لیے میں نے کتاب پڑھنے کی خواہش کو روکا اور کتابوں کے عنوانات دیکھ دیکھ کر انہیں الگ کیا اور یہ کام میں نے تیزی سے شروع کیا تا کہ وہ مسودہ جلد سے جلد مل جائے۔ کتابیں دیکھنے اور کچھ کچھ وقفے کے لیے آرام کرنے میں وقت خاصا گزر گیا۔ دوپہر ہو چکی تھی اور اب کسی بھی وقت کھانے کے لئے سلیمین کی آواز آ سکتی تھی۔ اور وہی ہوا۔ میں نے کتابوں پر سے نظر ہٹائی تو دیکھا سلیمین کمرے کے دروازے پر کھڑی ہے۔

”دستر خوان لگ گیا ہے، بیگم صاحب یاد کر رہی ہیں۔“ اس نے کہا۔

میں نے کتابیں دیکھنے کا کام بند کیا اور سلیمین کے پیچھے پیچھے اُس دالان میں پہنچ گیا جہاں دستر خوان لگا ہوا تھا۔ جہاں دار بیگم کو سلام کر کے میں دستر خوان پر بیٹھا تو انہوں نے میرے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا: ”جب سے تم کتاب ڈھونڈنے کا کام کر رہے ہو، کچھ دبے ہو گئے ہو۔“ پھر دستر خوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں:

”آج میں نے تمہارے لیے درقی پرائیٹے پکوائے ہیں اور گھٹواں کباب۔ کھاؤ۔“

”سلیمین نے آپ کو وقت پر دوا دی؟“ میں نے لقمہ منہ میں ڈالنے سے پہلے پوچھا۔

”دی۔ دی۔ بہت خیال رکھتی ہے میرا۔ پوری عمر اسی حویلی میں گزری ہے، اس کی ماں

بھی یہیں پیدا ہوئی تھی۔“ یہ کہہ کر مجھ سے پوچھا:

”یہ بتاؤ تم نے اچکن اور شیردانی پہنی ہے کبھی؟“

”نہیں ابھی تک تو نہیں پہنی۔“

”پہنا کرو۔ دونوں تم پر بہت اچھی لگیں گی۔ تمہارے باپ کو، جب تک ان کا تمہاری ماں سے میل رہا، میں نے شیروانی اور چھتری کے بغیر کبھی نہیں دیکھا۔“ جہاں دارنگیم نے کہا۔ پھر بولیں: ”میں تمہارے لیے شیروانی بھی سلوار ہی ہوں اور اچکن بھی۔ حسن ماسٹر کو بلوایا ہے کل، ناپ کے لیے۔“ یہ کہہ کر پوچھا: ”تمہیں اچکن اور شیروانی کا فرق معلوم ہے؟“

اُن کے یہ پوچھنے پر میں خاموش رہا۔

”تمہیں ہی نہیں بہت سوں کو نہیں معلوم۔ لکھنوی پہناؤں کے نام، ان کی پہچان لوگ بھولتے جا رہے ہیں۔“ یہ بتا کر بولیں: ”اچکن میں گھیر زیادہ ہوتا ہے اور بٹن چودہ لگتے ہیں اور شیروانی میں..... گھیر کم ہوتا ہے اور بٹن سات لگتے ہیں۔“

”آپ اتنا کیوں کر رہی ہیں میرے ساتھ۔“ میں نے کہا۔

”بیٹا بنایا ہے تمہیں۔ جو اپنے بیٹے کے ساتھ کرتی وہ تمہارے ساتھ کروں گی۔“ یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کے لئے کہیں کھو گئیں۔ نوالہ ان کے ہاتھ میں تھا اور چہرے پر افسردگی۔

”آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔“ میں نے کہا:

”بات یہ ہے کہ..... ہمارے قریبی عزیزوں میں ایک.....“ وہ کہتے کہتے رکیں۔

”جی آپ کے قریبی عزیزوں میں.....“

”ایک عزیز جوانی میں بگڑ گئے اور ایک ناچنے والی کو گھر بٹھالیا۔“

”تو.....“

”اُس سے ایک اولاد ہوئی۔ اس اولاد کے بڑے ہوتے ہوتے وہ عزیز اللہ کو پیارے ہو گئے۔“

”پھر.....؟“

”جو کچھ عزیز نے چھوڑا تھا، بچی کی ماں اسی سے اس کی پرورش کرتی رہی لیکن ایک دن.....“

”ایک دن.....؟“

”جب بچی سولہ سترہ کی ہوئی یا اس سے کچھ آگے تو بچی کی ماں بھی چل بسی۔“

”پھر.....؟“

”جب لڑکی اور بڑی ہوئی تو اس پر غلط نگاہیں پڑنے لگیں۔ لڑکی کی ماں تکلیف کے دنوں میں لفافے بناتی تھی، وہی کام یہ لڑکی بھی کرتی ہے اور محلے میں جو دو چار پتنگوں کی دکانیں ہیں، ان سے چھوٹی پتنگیں بنانے کا کام مل جاتا ہے۔“ یہ بتا کر جہاں دار بیگم نے بتایا: ”ان روزوں وہ لڑکی بڑی تکلیف میں ہے۔ کھانے پینے کے لالے پڑے ہیں اور.....“

”لوگ بتاتے ہیں بھوکی سو جاتی ہے لیکن کسی سے بتاتی نہیں کہ بھوکی ہے۔“ یہ بتانے کے بعد جہاں دار بیگم نے افسردہ لہجے میں کہا:

”لفافے اور پتنگیں بنانے میں کتنا مل جاتا ہوگا۔ کل سلیمن کو بھیجوں گی اس کی خیریت لینے۔ بتانے والے نے بتایا ہے.....“

”کیا بتایا ہے؟“

”عزیز کے عزیزوں نے اس سے کہا ہے ایک ہفتے میں مکان خالی کر دے ورنہ.....“

”ورنہ؟“

”سامان باہر پھٹکوا دیں گے۔“

”کیوں پھٹکوا دیں گے۔ مکان پر تو لڑکی کا حق ہے۔“ میں نے کہا۔

”نہیں جائز حق نہیں ہے۔ سوچتی ہوں یہاں بلا کر رکھ لوں لیکن.....“

”لیکن.....؟“

”لوگ کیا کہیں گے۔“

”لوگوں کو کہنے دیجیے۔ یہ تو نیک کام ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اگر آپ نے نہیں رکھا اور خدا نخواستہ وہ کسی اور راہ پر چل پڑی تو آپ کو بہت دکھ ہوگا۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہو۔ تمہارے یہ کہنے سے مجھے بہت سکون ملا۔ کل ہی سلیمن کو بھیجوں گی وہاں۔“

”آپ کھانا کھائیے۔ اتنی دیر میں آپ نے ایک بھی نوالہ منہ میں نہیں رکھا۔“

”کھانا کیسا لگا؟“

”بہت اچھا۔ ان کھانوں کے ذریعے آپ ہر روز ماں کی یاد دلا دیتی ہیں۔“

”مجھے بھی میرے بعد اسی طرح یاد کرو گے؟“

”ایسا نہ کہیے..... یہاں آنے کے بعد آپ نے مجھے.....“ کہتے کہتے میری آواز بیٹھنے لگی۔
”کہو کہو۔ یہاں آنے کے بعد.....“

”آپ نے مجھے ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔“

کھانا ختم ہونے کے بعد جب سلیمان دسترخوان بڑھانے آئی تو جہاں دار بیگم نے اس سے کہا:

”سُن کل سویرے سویرے کاظمین کے آگے وہ جو محلہ ہے نور باڑی.....“

”دیان الدولہ کی کربلا کے آگے؟“ سلیمان بیچ ہی میں بول پڑی۔

”دیان الدولہ نہیں دیانت الدولہ۔ ہمارے یہاں رہ کر غلط مت بولا کر۔“

”ارے زبان پر دیان الدولہ چڑھا ہوا ہے۔ سب یہی بولتے ہیں۔“

”لکھنؤ میں نام بہت تیزی سے بگڑ رہے ہیں۔“

”جی۔ حکیم صاحب بھی یہی کہہ رہے تھے۔“

”کل یہ مشک گنج مسک گنج ہو جائے گا۔“

”غلط تو اب بھی ہے۔ مشک کون سا لفظ ہے۔ مشک ہونا چاہیے۔“

یہ سُن کر جہاں دار بیگم چونکیں۔ بولیں: ”صحیح کہہ رہے ہو مشک ہونا چاہیے۔“ پھر سلیمان سے کہا: ”تو وہ جو نور باڑی ہے، وہاں پہنچ کر نواب عالم کا مکان، چھوٹے نواب کے نام سے بھی مشہور ہیں، پوچھ لینا، کوئی پوچھے کیوں پوچھ رہی ہو تو کچھ بتانا مت۔“ یہ کہہ کر اس سے کہا: ”اس مکان میں ایک لڑکی رہتی ہے اکیلی۔ اس سے کہنا مشک گنج سے آئے ہیں۔ پھر میرا نام لے کر اس سے کہنا: ”بیگم صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔ اور پوچھے کیوں بلایا ہے تو کہنا بیگم صاحب چاہتی ہیں آپ وہیں رہیں، اُن کے ساتھ۔ آنے کو راضی ہو جائے تو اپنے ساتھ لے آنا۔“ یہ کہہ کر جہاں دار بیگم نے اس سے پوچھا:

”چلی جائے گی۔“

”چلی جاؤں گی۔ کاظمین اور اس سے آگے والی کربلا تو ہم ہر محرم میں جاتے ہیں۔“

”اب کوئی نہیں جانتا کاظمین سے آگے والی اس کربلا کے بانی کا پورا نام کیا تھا۔“

سلیمان کے جانے کے بعد جہاندار بیگم نے کہا۔

”کیا تھا پورا نام؟“

”دیانت الدولہ معتمد علی خاں بہادر امانت جنگ۔“ یہ بتا کر بولیں:

”واجد علی شاہ نے انہیں کی مدح میں یہ شعر کہا ہے:

دیانت میں اس طرح سے تھا سیر کہ جس طرح پروانہ ہو شمع پر

یہ شعر پڑھ کر جہاندار بیگم بہت پیار سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولیں:

”تو کیا سوچا تم نے؟“

”کس بارے میں؟“

”یہاں رہنے اور میرے مختار بننے کے بارے میں۔“

”بتاؤں گا، کتاب مل جانے دیجیے۔“

”اور شادی؟“

”پہلے کسی لائق تو ہو جاؤں۔“

”جب مختار بن جاؤ گے تو کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی تمہارے پاس۔“

”مجھے اپنے پیروں پر کھڑے ہونا ہے۔“

”جیسی تمہاری مرضی۔“ یہ کہہ کر جہاں دار بیگم نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا:

”میرے نصیب میں نہیں ہے اپنی بہود بیکھنا۔“

میں چپ رہا اور کچھ دیر بعد اُن سے اجازت لے کر اپنے ٹھکانے پر چلا آیا۔



دوسرے دن جہاں دار بیگم کی حویلی پہنچ کر جب میں کتابوں کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا

تو سلیمان دوڑی دوڑی میرے پاس آئی، بولی: ”بیگم صاحب آپ کو یاد کر رہی ہیں۔“ میں کتابوں

کے کمرے کی طرف جانے کے بجائے جہاں دار بیگم کے پاس چلا آیا۔ مجھے دیکھتے ہی بولیں:

”کل سلیمان کو میں نے اُس لڑکی کے پاس بھیجا تھا، نور باڑی۔ لیکن اس نے آنے

سے انکار کر دیا۔“

”کیوں؟“

”کہتی ہے اُسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔“ جہاندار بیگم نے کہا۔ ”جب سلیمین نے اس سے کہا لوگ یہاں آپ کے دشمن ہیں، آپ سے مکان خالی کرانا چاہتے ہیں تو بولی کہیں اور پڑ رہیں گے، کسی اسکول میں آیا کی نوکری کر لیں گے۔ وہیں رہنے کی جگہ مل جائے گی۔“

”میں چاہتی ہوں آج تم سلیمین کے ساتھ جاؤ اور کسی طرح اسے راضی کر کے لے آؤ۔“

”لیکن کیا.....؟“

”میرا جانا مناسب رہے گا۔ لوگ کیا سوچیں گے۔“

”ارے سلیمین تمہارے ساتھ ہوگی۔ سمجھ لیں گے ملاقاتی ہیں، ملنے آئے ہیں۔“

”آپ کہتی ہیں تو میں چلا جاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے سلیمین سے کہا: ”تم وہاں پہنچو میں پیچھے پیچھے آتا ہوں۔“

میں اور سلیمین آگے پیچھے الگ الگ سواریوں میں بیٹھ کر لمبا فاصلہ طے کرنے کے بعد دیانت الدولہ کی کربلا پہنچ گئے۔ وہاں سے ہم دونوں اس لڑکی کے مکان کی طرف چل پڑے۔ کربلا کے پہلو والی گلی پار کرنے کے بعد ہم اس کشادہ حصے میں آ گئے جہاں نور باڑی کا محلہ آباد تھا۔ سلیمین اور میں جب اس لڑکی کے مکان پر پہنچے تو آس پاس کے لوگوں نے ہمیں گھور گھور کر دیکھنا شروع کر دیا۔ مکان کے باہری حصے میں لکھوری کی ایک اونچی دیوار بہت دور تک چلی گئی تھی اور جہاں جہاں سے یہ دیوار کمزور ہو کر گر گئی تھی وہاں وہاں خالی حصوں کو مکان کے اندر لگے ہوئے پیڑوں کی ٹوٹی ہوئی شاخوں سے بھر دیا گیا تھا۔ باہر سے آم، گولر، امرود اور جامن کے درختوں کی شاخیں دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے دروازے پر پہنچ کر ہار سنگھار کے پھولوں کی خوشبو محسوس کی اور جب سلیمین سے کہا بہت عمدہ خوشبو آ رہی ہے تو وہ بولی: ”اندر بہت سے خوشبودار پھولوں کے درخت ہیں۔“

سلیمین نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور جیسے ہی دروازہ کھلا، سر پر ڈوپٹہ ڈالے گورے رنگ کی ایک بہت تیکھے ناک نقشے والی لڑکی نے حیرت سے سلیمین کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ آج پھر.....“

میں آڑ میں ہو گیا تھا، اس لیے وہ مجھے نہیں دیکھ سکی۔ سلیمین نے اس سے کہا:
 ”آج بیگم صاحب نے اپنے بیٹے کے ساتھ مجھے بھیجا ہے، وہ آپ سے کچھ بات کرنا
 چاہتے ہیں، یہ سن کر لڑکی اندر گئی اور ایک سیاہ چادر سے اپنا پورا جسم چھپا کر دروازے پر آئی اور
 دروازہ تھوڑا سا کھول کر بولی:

”اندر آ جائیے۔“

میں سلیمین کے ساتھ اندر داخل ہوا تو لڑکی نے ہم دونوں کو ایک بڑے سے دالان میں
 ایک ایسی تپائی پر لے جا کر بٹھایا جو پاؤں کے بجائے گتوں پر ٹکی تھی۔ دالان میں دو چھوٹی
 چھوٹی چٹائیاں بچھی تھیں اور دونوں چٹائیوں پر ڈھائی تین فٹ لمبی بہت کم اونچائی والی دو
 چوکیاں پڑی تھیں۔ ایک چوکی پر ایک بڑی سی رکابی میں آٹے کی لٹی رکھی تھی اور وہ لفافے
 رکھے تھے جن کے کاغذوں کو موڑا جا چکا تھا اور جن پر لٹی لگائی جانا باقی تھی۔ دوسری چوکی پر رنگ
 رنگ کے بہت سے کاغذ مڑے رکھے تھے اور انہیں کاغذوں کے پہلو میں کانپ ٹھڈے، اور
 ان کانپ ٹھڈوں کے برابر ایک بڑے سے المونیم کے پیالے میں تو تیا ملی ہوئی نیلے رنگ کی
 لٹی۔ لڑکی جس نے آنکھیں چھوڑ کر اپنا پورا چہرہ چھپا رکھا تھا، ہمیں تپائی پر بٹھا کر اس طرح دیکھ
 رہی تھی جیسے ہمارا آنا اسے پسند نہ آیا ہو۔ میری نگاہ اس کے ہاتھوں کی طرف گئی تو میں نے
 دیکھا اس کی انگلیوں پر وہ لٹی سوکھ چکی تھی جسے ہمارے آنے سے پہلے وہ لفافوں کے موڑ
 چپکانے کے لئے اُن پر لگا رہی تھی۔

”میں ابھی آئی۔“ لڑکی یہ کہہ کر گھر کے بہت بڑے آنگن کے ایک کونے میں لگے
 ہوئے نل پر ہاتھ دھونے چلی گئی۔ واپس آ کر سلیمین سے مخاطب ہوتے ہوئے اس نے کہا:
 ”میں آپ لوگوں کے لئے چائے بناتی ہوں۔“

”نہیں چائے کی زحمت نہ کیجیے۔ ہم پی کر آئے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ایک پیالی یہاں بھی پی لیجیے۔“ اس لڑکی نے میری طرف دیکھے بغیر کہا! پھر اسی
 دالان کے آخری حصے میں بنے مٹی کے چولہے میں لکڑیاں جلا کر ایک چھوٹی سی المونیم کی پتیلی
 میں پانی چڑھا دیا۔ کچھ دیر بعد جب پتیلی پر رکھی ڈھکنی کھڑکھڑانے لگی تو اس نے اسے ہٹا کر
 لپٹن کے دو پیسے والے لفافے کو چاک کر کے پتی پتیلی میں ڈال کر اسے چولہے سے اتار لیا۔

پھر تین مٹ میلی پیالیوں میں پتیلی کا رنگ ڈال کر اور ان میں دودھ اور شکر ملا کر چائے تیار کی اور ایک میلی سی اچاری سے تھوڑے سے نمک پارے نکال کر انہیں ایک طشتری میں رکھا۔ پھر ان سب کو دونوں طرف ہتھے والی پتیل کی کشتی میں رکھ کر ہمارے سامنے لے آئی۔

”لیجیے۔“ اس نے بڑی شائستگی سے کہا۔ ۱

”سلیم کو میرے پاس بیٹھنے اور میرے ساتھ چائے پینے میں تامل ہو رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ پہلو بد لے میں نے ایک پیالی اس کی طرف بڑھادی، دوسری اپنے ہاتھ میں لے لی اور تیسری پیالی خود اس لڑکی نے اٹھالی اور اٹھاتے ہی نمک پاروں کی طشتری میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ”یہ بھی لیجیے۔“

”شکریہ۔“

”بتائیے کیسے تکلیف کی۔“

”بیگم صاحب، جہاں دار بیگم آپ کے والد کے عزیزوں میں ہیں۔“

”جی۔ ماں کی عزیز ہو بھی نہیں سکتیں۔“

”نہیں۔ میرا مطلب.....“

”جی۔ ماں ہماری جیسی بھی تھیں اچھے گھرانوں کی بہو بیٹیوں سے اچھی تھیں۔ باپ کو کسی طرح کی تکلیف نہیں ہونے دی۔“ لڑکی کے لہجے میں ہلکی سی ناگواری تھی۔

”بیگم صاحب چاہتی ہیں.....“

”کہ میں ان کے ساتھ رہوں۔“ اس نے میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی لہجے میں تھوڑی سختی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ پھر بولی: ”نہیں میں کسی کا احسان نہیں لے سکتی۔ لفافے اور پتنگیں بنانے میں دو چار پیسے مل جاتے ہیں، اسی سے کام چل جاتا ہے۔“

”یہاں آپ اکیلی ہیں۔ بیگم صاحب کہہ رہی تھیں لوگ آپ کو پریشان کر رہے ہیں۔“

”جی۔ والد کے عزیز..... کہتے ہیں یہ گھر ہمارا ہے۔ تم یہاں سے جاؤ۔“

”تو اچھا ہے۔ آپ بیگم صاحب کے پاس چلی آئیں۔“

”جی نہیں۔ یہ لفافوں اور پتنگوں والا کام چھوڑ کر لڑکیوں کے کسی ایسے اسکول میں نوکری

کریں گی جہاں رہنے کی جگہ مل جائے۔“

”ایک بات کہوں۔“

”کہیے۔“

”آپ بیگم صاحب کا احسان نہیں لینا چاہتیں، نہ لیجیے۔ آپ وہاں رہ کر یہی پتنگوں اور لفافوں والا کام کیجیے، اپنا چولہا الگ رکھیے، ایک آدمی کے ٹھکانے کا جو کرایہ بنتا ہو وہ مہینے مہینے مجھے دے دیجیے۔ میں اکٹھا بیگم صاحب کو دے دوں گا۔“

میری تجویز سننے کے بعد لڑکی نے پہلی بار مجھے یوں دیکھا جیسے وہ اپنے کسی عزیز کو دیکھ رہی ہو۔ وہ چپ رہی تو میں نے کہا:

”زمانہ خراب ہے۔ آپ لڑکی ذات ہیں۔ بیگم صاحب کہہ رہی تھیں کسی بھی جگہ آپ کا اکیلا رہنا ٹھیک نہیں۔“

اس بار لڑکی نے پھر مجھے دیکھا اور اس بار آنکھیں چار ہوتے وقت اس نے فوراً اپنی آنکھیں نہیں جھکائیں۔ مجھے دیکھتے وقت میں نے اس کی آنکھوں میں پڑھ لیا کہ وہ مجھے واقعی اپنا ہمدرد سمجھ رہی ہے۔

”بات تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن.....“

”لیکن ویکن کچھ نہیں..... بیگم صاحب بہت اچھے دل کی عورت ہیں۔ وہ بھی اکیلی ہیں۔ اس وقت انہیں اپنوں کی ضرورت ہے۔ وہاں چلیے گا تو آپ کو سب معلوم ہو جائے گا۔“

”اس سے پہلے تو انہوں نے ہمیں کبھی نہیں پوچھا۔“ لڑکی نے کہا۔

”بیگم صاحب کئی برس سے بیمار ہیں۔ برسوں ہو گئے گھر سے نہیں نکلیں۔“ میرے بولنے سے پہلے سلیمین بول پڑی۔ پھر بتایا: ”کچھ دن پہلے آپ کی طرف کا آیا تھا کوئی انہیں دیکھنے۔ باتوں باتوں میں اسی نے آپ کے بارے میں بتایا۔“ یہ کہہ کر سلیمین نے بہت افسردہ لہجے میں کہا:

”جب سے آپ کے بارے میں سنا ہے بہت پریشان ہیں۔“

”اچھا اُن سے کہیے ایک دن کی مہلت دیں۔“

”ٹھیک ہے میں پرسوں آؤں گا۔ سامان تیار رکھیے گا۔ گھر کی چابی سلیمین آپ کے عزیزوں کو دے آئیں گی۔“ یہ کہہ کر میں نے سلیمین سے پوچھا:

”کیوں ٹھیک ہے۔“

”بالکل ٹھیک۔ بی بی کے آجانے سے بیگم صاحب بہت خوش ہوں گی۔“

میں اٹھنے لگا تو لڑکی بولی: ”بیٹھیے۔ اماں نے ہماری اس گھر میں بہت پیڑ لگائے تھے۔ یہ علاقہ وزیرباغ سے بہت قریب ہے۔ وہاں کی مٹی لوگ دور دور سے آ کر لے جاتے ہیں۔ میں نے کل ہی بہت سے امرود توڑ کر رکھے ہیں۔ بہت مزے کے ہیں۔ اُن کے کچالو آپ کو کھلاتی ہوں۔“

”اب چلنے دیجیے۔ بیگم صاحب انتظار کر رہی ہوں گی۔“

”انہیں کچالو کھا کر جائیے۔“ یہ کہہ کر لڑکی جھٹ سے دالان کے کونے میں گئی۔ ایک ٹوکری سے امرود نکالے۔ انہیں دھویا۔ پھر ان کے قتلے بنا کر دو چھوٹی چھوٹی طشتریوں میں رکھا اور ان پر سیاہ مرچ اور نمک چھڑک کر نیبو نچوڑا پھر شکر ملا کر انہیں ایک طرف رکھ دیا۔ پھر ہمارے پاس آ کر بولی:

”کچھ دیر بیٹھیے۔ کچالوؤں میں شیرہ بن جائے تو لاؤں۔“

”ایک بات بتائیے۔“ اس کی بات ختم ہوتے ہی میں نے کہا۔

”پوچھیے۔“

”مکان کا کیا قصہ ہے؟“

”ہم اتنا جانتے ہیں کہ اس پر ہمارا حق نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ پھر بولی:

”اپنی بیماری کے زمانے میں اماں بتاتی تھیں میرے بعد تمہارے باپ کے عزیز تمہیں

بہت پریشان کریں گے۔ مکان چھوڑنے کو کہیں تو چھوڑ دینا۔“

”تو اس کا اصل وارث کون ہے؟“

”ہمارے ابا کے بھائی۔ چھوٹے بھائی۔ اسی محلے میں ایک گلی چھوڑ کر جو بنیاد باغ کی طرف نکلتی ہے اسی میں ہے اُن کا مکان۔“ لڑکی نے کہا۔ پھر بتایا: ”ابا کے مرتے ہی وہ اماں کو پریشان کرنے لگے تھے۔ اماں دو دو چار چار دن کی مہلت مانگ کر یہاں رکنے کی مدت

بڑھاتی رہیں اور ان کے بعد.....“

”ان کے بعد.....؟“

”ابا کے چھوٹے بھائی آئے دن دروازے پر کھڑے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں مکان خالی
 کرو ورنہ سامان پھینکوا دیں گے۔“
 ”ایک اور بات پوچھوں؟“
 ”پوچھیے۔“

”اماں آپ کی یہیں لکھنؤ کی تھیں۔“
 ”جی لکھنؤ کی۔ اب آگے اور کچھ نہ پوچھیے گا۔ کبھی موقع ملا تو جو کچھ اماں سے سنا ہے،
 آپ کو بتا دوں گی۔“ لڑکی نے کہا۔ پھر بولی: ”کچالوؤں میں شیرہ بن گیا ہوگا لاتی ہوں۔“ یہ
 کہہ کر لڑکی وہ دونوں طشتریاں لے آئی۔
 ہم نے مزے لے لے کر وہ کچالو کھائے اور جب ہم چلنے لگے اور جب وہ ہمیں
 دروازے تک پہنچانے آئی تو میں نے پلٹ کر اس سے کہا:
 ”میں نے اب تک آپ کا نام نہیں پوچھا۔“
 ”شہبا۔“

”اچھا نام ہے۔“
 ”شکریہ۔ معنی معلوم ہیں آپ کو اس نام کے؟“
 ”نہیں اتنی اردو نہیں جانتا۔“ یہ کہہ کر میں نے کہا:
 ”تو میں پرسوں آؤں گا سلیمان کے ساتھ۔“
 وہ خاموش رہی۔ دروازے سے نکلتے نکلتے ایک بار پھر میں نے کہا:
 ”انشاء اللہ پرسوں۔“

شہبا کے گھر سے باہر نکلتے ہی آس پاس کے لوگوں نے پھر ہمیں گھورنا شروع کر دیا۔ ہم
 تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے دیانت الدولہ کی کربلا تک آئے اور وہاں سے میں نے سلیمان کو ایک
 سواری میں بٹھا کر مشک گنج یہ کہہ کر روانہ کر دیا کہ بیگم صاحب سے کہہ دے اب میں کل آؤں گا۔

○

دوسرے دن میں جہاں دار بیگم کے یہاں پہنچا تو انہوں نے فوراً مجھے اپنے پاس بلوا بھیجا
 اور نہ دیکھتے ہی کہا: ”سلیمان نے مجھے سب کچھ بتایا لیکن تم بتاؤ وہ آنے کے لئے تیار ہے۔“

”پوری طرح تو ہاں نہیں کہی لیکن..... میرا خیال ہے آ جائیں گی۔“
”خدا کرے آ جائے۔“

”مکان بہت بڑا ہے، لیکن بہت خستہ حالت میں ہے۔“ میں نے کہا: ”جیسے آپ کے یہاں پھولوں اور پھلوں کے درخت لگے ہیں، ایسے ہی وہاں بھی بہت ہیں۔“
”ہاں۔ اس کی ماں کو بہت شوق تھا باغبانی کا۔“

”کچا لو کھلائے ہم لوگوں کو، گھر کے امرودوں کے۔ بہت مزے کے تھے۔“

”ہاں۔ لڑکی بہت سنگھڑ ہے۔ اُس کی ماں نے بہت کچھ سکھا دیا ہے اسے۔“

”میں چلتا ہوں کتابوں والے کمرے کی طرف۔“ میں نے کہا۔ ”جو رہ گئی ہیں، انہیں

دیکھ ڈالوں۔“ جہاں دار بیگم سے یہ کہہ کر میں کتابوں والے کمرے کی طرف چلا آیا لیکن آج میرا دل کتابیں دیکھنے میں لگ نہیں رہا تھا۔ میں جو کتاب اٹھاتا، اس میں شہبا کی شکل دکھائی دینے لگتی۔ کبھی مجھے اس کی نازک اور مخروطی انگلیوں میں آٹے کی لٹی لگی ہوئی نظر آنے لگتی۔ کبھی

نظر آتا کہ وہ چولہے پر چڑھی ہوئی پتیلی میں چائے کی پتی ڈال رہی ہے اور کبھی میں دیکھتا کہ وہ

امرود کے کچالوؤں پر سیاہ مرچ اور نمک چھڑک رہی ہے اور کبھی وہ اس سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی

نظر آنے لگتی جسے اس نے اپنا جسم چھپانے کے لئے اوڑھ رکھا تھا۔ میں نے سوچا اس طرح تو

میں کوئی کتاب نہیں دیکھ سکوں گا، اس لیے میں نے شہبا کی شکل کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا اور

نگاہ جما کر کتابوں کے عنوانات پڑھنا شروع کر دیے لیکن دو چار کتابوں کے بعد پھر شہبا کی

تصویر آنکھوں میں گھومنے لگی۔ اب میں نے کتابیں دیکھنے کا کام اس ڈر سے بند کر دیا کہ اس

حالت میں کہیں وہ مسودہ جسے ڈھونڈنے کے لیے میں اتنی محنت کر رہا ہوں، ہاتھوں میں آنے

کے باوجود نظر نہ آئے۔ میں بچی ہوئی کتابوں کے ڈھیر کے پاس آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔

مجھے نہیں معلوم میں کتنی دیر اسی طرح بیٹھا رہا۔ اس حالت سے میں اس وقت باہر نکلا جب

سلیمن کی آواز میرے کانوں میں آئی۔

”بھئیادستر خوان لگ گیا ہے۔“

”نہیں آج میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ میرے جانے کے بعد بیگم صاحب

سے بتا دینا میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اس لیے چلا گیا۔ یہ کہہ کر میں نے اس سے کہا: ”اور

ہاں کل دس بجے وہیں دیانت الدولہ کی کربلا کے سامنے پہنچ جانا اگر سامان زیادہ ہوا تو ایک ٹھلیا کا انتظام کرنا پڑے گا۔“

”لیکن بیگم صاحب بہت ناراض ہوں گی۔“

”میں نے جیسا کہا ہے، ویسا ہی کرو۔“ سلیمین سے یہ کہہ کر میں جہاں دار بیگم کی حویلی سے باہر نکل آیا۔



رات مجھے ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ دیانت الدولہ کی کربلا کے پہلو اور پشت کا علاقہ میری نگاہوں میں گھومتا رہا اور جب کچھ دیر کے لئے میں نیند کی آغوش میں گیا تو وہ مکان جواب شہبا سے چھینا جانے والا تھا، میرے خواب میں بار بار آتا رہا۔ اُس کا دالان، اس کا صحن اور اس کے درخت مجھے بار بار دکھائی دیتے۔ بیچ بیچ میں جب بھی میری آنکھ کھلتی تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی کہ میں اپنے ٹھکانے پر ہوں۔

صبح میں دیر تک آنکھیں بند کیے پڑا رہا اور جب آنکھ کھول کر گھڑی دیکھی تو نو بج چکے تھے۔ میں اٹھا، نہادھو کر تیار ہوا، ناشتہ کیا اور کاظمین کی طرف چل پڑا۔ اور جب وہاں پہنچا تو سلیمین دیانت الدولہ کی کربلا کے دروازے پر موجود تھی۔ میں اسے لے کر شہبا کے مکان پر آیا تو وہاں کچھ لوگ موجود تھے جو دروازے سے لگی ہوئی شہبا سے کہہ رہے تھے:

”دو دن بعد ہم تمہارا سامان پھنکوا دیں گے۔“

مجھے اور سلیمین کو دیکھ کر وہ لوگ ادھر ادھر ہو گئے لیکن ہمیں گھور گھور کر دیکھتے رہے۔ ہم دونوں کو اپنے دروازے پر دیکھتے ہی شہبا نے پورا دروازہ کھول دیا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو وہ کچھ پریشان سی نظر آئی۔ ہمارے کچھ پوچھنے سے پہلے وہ بولی:

”آج تو آپ لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔“

”جی۔ اچھا یہی ہے کہ آپ یہ مکان فوراً چھوڑ دیں۔“

”تمیں سے زیادہ برس گزارے ہیں ہم نے یہاں اور اماں نے ہماری چالیس سے بھی زیادہ۔ اس کی ایک ایک اینٹ سے محبت ہے ہمیں۔“ یہ کہہ کر وہ اپنی چھوٹی سی بغیا کے درختوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی: ”اماں نے یہ پیڑ بڑی محنت سے لگائے تھے اور یہ کیاریاں

ہم نے بہت جی لگا کر بنائی ہیں۔ اماں کی طرح ہمیں بھی بہت شوق ہے ہریالی کا۔ اچھے دنوں میں وہ تھا ہمارا باورچی خانہ۔“ اس نے صحن سے دور کے ایک حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اب اس کی چھت گر چکی ہے۔ طرح طرح کے کھانے پکتے تھے ہمارے یہاں۔“ پھر وہ ہمیں دالان کے بعد والے حصے میں لے گئی۔ یہ ایک بہت بڑا ہال تھا جس کی چھت جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ ہال میں آ کر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا: ”یہاں اماں ہماری تخت پر پاندان لگا کر بیٹھتی تھیں۔“

”پاندان ہے ابھی۔“

”اماں کے برے دنوں میں بک گیا اور باورچی خانے کے سارے پیتل اور تانبے والے برتن بھی۔ باورچی خانہ اب ہم نے یہاں بنالیا ہے، اسی دالان میں۔ رہتے بھی یہیں ہیں اور اپنا کام بھی اسی میں کرتے ہیں۔“

”لیکن دالان کی چھت بھی.....“

”ہاں، برسات میں جگہ جگہ سے ٹپکتی ہے۔“

”اب اس مکان کو چھوڑ دینا ہی اچھا ہے۔ کب تک ان کی باتیں سنئے گا۔“

”صحیح کہہ رہے ہیں۔ لیکن جب کوئی یہ مکان چھوڑنے کو کہتا ہے تو.....“ شہبا کہتے کہتے رُکی۔

”تو.....“

”ہمیں ایسا لگتا ہے جیسے ہمارے سر سے چادر چھینی جا رہی ہو۔“

”ایک بار تو دل پر پتھر رکھنا پڑے گا آپ کو۔ بیگم صاحب کے یہاں آ کر بھول جائیں گی آپ یہ سب۔“

”کل آپ کے جانے کے بعد میں نے بہت سوچا۔ آپ کی بات مجھے ٹھیک معلوم ہوئی۔“ شہبا نے کہا۔ ”میرے پاس بہت کم سامان ہے، میں نے اسے باندھ لیا ہے۔“

”اچھا کیا۔ کچھ میری مدد کی ضرورت ہے؟“

”نہیں۔ دو چار پوٹلیاں، دو چھوٹی چھوٹی چوکیاں، ایک کھٹولہ، ایک آدھ گٹھری اور ایک دو بکسے۔ ایک تانگہ کر دیجیے۔ اُس پر آ جائے گا سب۔“

”تو میں تانگہ لینے جاؤں؟“

”نہیں رک جائیے۔ میں آپ لوگوں کے لیے چائے بنا لوں۔ یہ میرے اس چولہے کی آخری چائے ہوگی۔ جب تک آپ لوگ چائے پیئیں گے، میں اپنے درختوں کے سارے پھل توڑ لوں گی۔“ یہ کہہ کر بولی: ”بیگم صاحب کے لیے کچھ تولے جاؤں یہاں سے۔“

شہبانے جلدی جلدی چائے بنائی۔ پھر پھلوں کو توڑنے والا بانس اٹھایا اور درختوں کے نیچے ایک چادر بچھا کر بہت تیزی سے سارے پھل توڑ کر انہیں چادر میں باندھ لیا۔ چائے ختم ہوتے ہی میں سلیمین سے یہ کہہ کر تانگہ لینے چلا گیا کہ جو سامان رہ گیا ہے اسے بندھوانے میں شہبا کی مدد کرے۔

میں تانگہ لے کر آیا تو سامان تیار تھا۔ میں نے سارا سامان تانگے پر رکھوایا، شہبا کو اس پر بٹھایا اور مکان میں تالا لگا کر شہبا سے کہا:

”بوا کو بتائیے آپ کے ابا کے بھائی کا مکان کہاں ہے، انہیں بلا کر لے آئے۔“

شہبانے سامنے کی گلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

”اسے پار کرتے ہی دوسرا مکان ہے ان کا۔“

سلیمین گئی اور ان صاحب کو بلالائی اور جب سلیمین نے ان کو مکان کی چابی دی تو شہبا نے تانگے پر بیٹھے بیٹھے ان سے کہا:

”آج سے یہ مکان آپ کا ہے۔“ یہ کہہ کر بولی: ”آپ کو ہمارا سامان پھنکوانا نہیں پڑا۔“

میں نے شہبا کی طرف دیکھا تو وہ اپنی چادر کے کونے سے اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں پونچھ رہی تھی۔ میں نے سلیمین کو تانگے پر بٹھا کر دونوں کو جہاں دار بیگم کی حویلی کی طرف روانہ کر دیا۔

تانگے کے آگے بڑھ جانے کے بعد جن صاحب کو چابی دی گئی تھی، انہوں نے مجھ سے پوچھا:

”کہاں سے آئے ہیں؟“

”جو مکان چھوڑ کر گئی ہیں ان کا عزیز ہوں۔“

”اس سے پہلے اُن کے کسی عزیز کو نہیں دیکھا۔“

”نہ دیکھا ہو، لیکن عزیز تو ہیں ان کے۔ اور یہاں سے کہیں اور نہیں اپنے عزیزوں ہی

کے پاس گئی ہیں وہ۔“

یہ کہہ کر میں نور باڑی سے نکل کر کاظمین والی سڑک سے ہوتا ہوا جہاں دار بیگم کی حویلی کی طرف جانے کے بجائے اپنے ٹھکانے پر چلا آیا۔ آج اُن کی طرف جانے کو میراجی نہیں چاہ رہا تھا۔ شہبا کے اس گھر سے نکلنے کا منظر میری آنکھوں میں گھوم رہا تھا، مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے مجھے اپنے ٹھکانے سے بے دخل کر دیا گیا ہو۔ میں جہاں دار بیگم کی حویلی جا کر کسی کمرے یا پینچی میں شہبا کے سامان کے رکھے جانے کا منظر نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ میرے کانوں میں شہبا کا وہ جملہ بار بار گونج رہا تھا جو اس نے اس وقت کہا تھا جب میں نے اس سے مکان چھوڑنے کی بات کہی تھی۔

”.....جیسے ہمارے سر سے چادر چھینی جا رہی ہو۔“

میں اپنے بستر پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ کچھ دیر گزر جانے کے بعد میں نے سوچنا شروع کیا..... اب شہبا جہاں دار بیگم کی حویلی پہنچ چکی ہوگی۔ اب اس کا سامان اتار کر کسی کمرے یا پینچی میں لے جایا جا رہا ہوگا۔ اب جہاں دار بیگم اس سے گلے مل کر رو رہی ہوں گی اور اب کھانے پر میرا انتظار کیا جا رہا ہوگا۔ یہی سوچتے سوچتے مجھے نیند آ گئی۔



اگلے دن میں حویلی پہنچ کر سیدھا جہاں دار بیگم کی طرف گیا۔ شہبا ان کے پہلو میں بیٹھی اُن سے باتیں کر رہی تھی۔ جہاں دار بیگم مجھے دیکھتے ہی بولیں:

”بھئی تم انہیں لے آئے، تمہارا بہت بہت شکریہ۔ کل ہم نے کھانے پر بہت انتظار کیا تمہارا۔“

”یہ ایسے ہی نہیں آئی ہیں، بہت شرطیں لگائی ہیں۔“

”کیا شرطیں لگائی ہیں؟“

”میرا چولہا الگ رہے گا۔ میں لفافوں اور پتنگوں والا کام کرتی رہوں گی اور یہاں رہنے کا جتنا کرایہ ہوگا، بیگم صاحب کو مہینے مہینے دیتی رہوں گی۔“

”ٹھیک ہے جیسا یہ کہتی ہیں کریں۔ لیکن جب تک یہ اپنا چولہا الگ نہیں کر لیتیں، کھانا ہمارے ساتھ کھائیں۔“

میں کچھ دیر جہاں دار بیگم کے پاس بیٹھ کر کتابوں والے کمرے میں چلا آیا اور نگاہ جما کر

پچی ہوئی کتابوں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ جب میں نے بہت سی کتابیں دیکھ ڈالیں اور جب مجھے تکان محسوس ہونے لگی تو میں نے دروازے پر آہٹ سی محسوس کی۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے شہباز اپنا پورا چہرہ چھپائے چائے کی کشتی لیے کھڑی تھی۔

”آپ؟“

”جی میں۔ بوانے مجھے بتایا اس کمرے میں بہت سی کتابیں ہیں، آپ وہ کتابیں دیکھنے کا کام کر رہے ہیں اور بیچ بیچ میں چائے ضرور پیتے ہیں۔“ شہباز نے کہا۔ پھر بولی: ”بوا سے کہہ کر آج میں نے چائے بنالی۔ آپ کے لیے بھی اور اپنے لیے بھی۔ لیجیے پیجیے۔“ یہ کہہ کر اس نے چائے کی ایک پیالی میری طرف بڑھائی اور دوسری پیالی لے کر اس اسٹول پر بیٹھ گئی جس پر پانی کا جگ اور گلاس رکھا ہوا تھا۔ اسٹول پر بیٹھ کر چائے کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے اس نے کہا:

”آپ ہمارے یہاں دوبار آئے لیکن ہم آپ کی کوئی خاطر نہیں کر سکے۔“

”نہیں آپ نے بہت اچھی چائے پلائی، بہت مزے کے کچا لو کھلائے۔“

جب ہمارے اچھے دن تھے، اماں ہماری کھانا کھلائے بغیر کسی مہمان کو جانے نہیں دیتی تھیں۔“

”بیگم صاحب آپ کے آنے سے بہت خوش ہیں۔“ میں نے کہا۔

”جی بہت۔ بہت اچھے دل کی عورت ہیں۔ ورنہ..... خیر جانے دیجیے۔“

”نہیں نہیں بتائیے۔ ورنہ.....؟“

”ہمیں کیوں بلاتیں اپنے یہاں۔“

”آپ کے باپ اُن کے عزیز ہیں۔“

”ماں تو نہیں ہیں۔ اُنہیں باپ کے گھر میں اور باپ کے عزیزوں میں کسی نے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا۔“

”جان سکتا ہوں کیوں؟“

”ان کے خیال میں ہماری ماں اچھی عورت نہیں تھیں اور وہ.....“

”اور وہ.....؟“

”کسی اور وقت بتاؤں گی آپ کو۔“ ابھی جانے دیجیے۔“

”اچھا ایک بات بتائیے۔“

”پوچھئے۔“

اس مکان پر جسے آپ نے چھوڑا ہے، آپ کا حق کیوں نہیں ہے۔“
”اصل میں.....، آپ نے یہ بات دوبارہ پوچھی ہے اس لیے آپ کو بتادوں، جب ہماری ماں ہمارے باپ کے مکان میں آ کر رہیں تو دادا نے باپ کو عاق کر دیا۔ اس طرح وہ اپنے باپ کے ترکے سے محروم ہو گئے۔“ یہ بتا کر شہبانے بتایا۔ ”دادا نے بس اتنا کیا کہ ابا کی زندگی تک انہیں اس مکان میں رہنے کی اجازت دے دی۔“

”عاق کیوں کر دیا؟“

”دیکھئے آپ پہلے شخص ہیں۔“ شہبانے کہا۔ پھر کچھ ٹھہر کر بولی: ”جسے پتہ نہیں کیوں میں وہ سب بتا دینا چاہتی ہوں جسے میں نے اپنی ماں سے سنا ہے۔“ شہبانے کہا۔ پھر بولی: ”میں سمجھتی ہوں آپ کو وہ سب بتا کر میرا جی ہلکا ہو جائے گا۔“
”تو بتائیے۔“

”ابھی نہیں۔ اب تو میں یہاں ہوں۔ آپ بھی روز آتے ہیں۔ کسی دن بتادوں گی سب کچھ۔“ یہ کہہ کر شہبانے مجھ سے پوچھا:

”یہ بتائیے آپ ان کتابوں میں کیا ڈھونڈ رہے ہیں۔“
”امراؤ جان۔ کتاب امراؤ جان۔“ یہ سن کر وہ ٹھٹھکی۔ پھر اسے ہنسی آ گئی۔
”وہ تو ہر جگہ مل جاتی ہے۔“

”یہ وہ امراؤ جان نہیں ہے۔“

”پھر کون سی ہے؟“ اس نے پوچھا۔
اور تب میں نے شہبا کو پوری تفصیل بتائی۔ سب کچھ سننے کے بعد وہ کہیں کھوسی گئی۔
”کہاں کھو گئیں؟“

”اماں سے سنی ہوئی باتوں میں۔ اس قصے کے بارے میں بہت کچھ بتاتی تھیں وہ۔“
”کیا بتاتی تھیں؟“

”وہی جو آپ نے کہا ہے۔“

”یعنی؟“

”امراؤ جان واقعی تھیں۔ یہ فرضی قصہ نہیں ہے۔ اماں اُن کے بارے میں ایسے باتیں کرتی تھیں جیسے امراؤ جان اور ان کے خاندان کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں۔“

”آپ کو سب یاد ہے ان کا بتایا ہوا۔“

”سب یاد ہے، یہ ایک دن کا قصہ نہیں تھا۔ اماں روزا نہیں یاد کرتی تھیں اور اُن کی بیٹی کو بھی۔“

یہ سن کر میں اُچھل پڑا۔ ”اُن کی بیٹی کو بھی؟“

”جی بیٹی کو بھی۔ یہ کوئی دادی جان والی کہانی نہیں تھی جو مجھے بہلانے کے لیے وہ سناتی ہوں۔ وہ وہی بتاتی تھیں جو کچھ انہوں نے دیکھا تھا اور جو کچھ ہماری نانی سے سنا تھا۔“ یہ بتا کر شہبا نے بتایا:

”اور بتاتے بتاتے ان کے آنسو بہنے لگتے جب میں پوچھتی اماں آپ رو کیوں رہی ہیں تو کہتیں ہم سب کے دن بہت دکھ میں گزرے۔ یہ کہہ کر انہیں چپ سی لگ جاتی۔“

”تو جو کچھ آپ نے سنا ہے اپنی ماں سے، بتائیے۔“

”ابھی نہیں۔ آپ کے پاس میرا اتنی دیر بیٹھنا ٹھیک نہیں۔“ شہبا نے کہا۔ ”کل ہی اس گھر میں آئی ہوں میں نہیں چاہتی کوئی کہنے والی بات ہو۔ خالہ، اب میں انہیں خالہ کہنے لگی ہوں، سورہی تھیں، اس لیے ادھر چلی آئی۔ اب جاگ گئی ہوں گی۔“ یہ کہہ کر چائے کی کشتی اٹھا کر بولی: ”اب چلتی ہوں۔“

دن کے کھانے پر جہاں دار بیگم نے مجھے بلوایا تو شہبا دسترخوان پر موجود تھی۔ میں دسترخوان پر بیٹھا تو وہ بولیں:

”بڑی مشکل سے راضی کیا ہے انہیں کھانے پر۔ یہ تو آج ہی سے اپنا دسترخوان الگ کرنے والی تھیں۔“

دو چار نوالے کھانے کے بعد جہاں دار بیگم نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے شہبا سے کہا:

”یہ آئے تھے یہاں کتاب ڈھونڈنے اور بن گئے ہمارے بیٹے۔ میں نے تمہیں بلایا ہے یہاں رہنے کے لئے، تم ہماری بیٹی بن جاؤ۔“

”یہ آپ کے بیٹے بن سکتے ہیں، میں آپ کی بیٹی نہیں بن سکتی۔“
”کیوں؟“

”یہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔ میری تکلیف سن کر آپ نے رہنے کا ٹھکانہ دے دیا یہ میرے لیے بہت ہے۔“

جہاں دار بیگم یہ سن کر کچھ دیر چپ رہی، پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولیں:
”میں نے آج ماسٹر صاحب کو بلوایا ہے، اچکن اور شیردانی کی ناپ کے لیے۔ چلے نہ جانا چپکے سے۔“

”آپ یہ کیوں کر رہی ہیں؟“

”میں نے کہا نا اچکن اور شیردانی تم پر بہت اچھی لگے گی۔ اچکن کالے رنگ کی اور شیردانی گہرے نیلے رنگ کی۔ تمہارے صاف رنگ پر دونوں بہت کھلیں گی۔“
یہ سن کر شہباز نے میری طرف دیکھا پھر اپنی نظریں جھکا لیں۔

سہ پہر بعد حسن ماسٹر آئے، ناپ لی گئی۔ جہاں دار بیگم نے خریدا ہوا کپڑا ان کے حوالے کیا۔ ناپ دے کر جب میں چلنے لگا تو پیچھے سے آواز آئی:
”سنیے!“

”میں نے پلٹ کر دیکھا تو شہباز سا منہ کھڑی تھی۔“

”کل آئیں گے نا۔“

”بالکل آؤں گا۔ جب تک کتاب نہیں مل جاتی روز آؤں گا۔“ یہ کہہ کر میں شہباز کی طرف دیکھے بغیر جہاں دار بیگم کی حویلی سے باہر نکل آیا۔

○
لکھنوی شہباز

✓
دوسرے دن حویلی میں داخل ہو کر جب میں اپنے کمرے میں پہنچا تو آج وہ مجھے زیادہ صاف نظر آیا۔ جو دیکھی ہوئی کتابیں میں نے چھانٹ کر الگ رکھی تھیں وہ بہت قرینے سے ایک طرف لگا دی گئی تھیں۔ اسٹول کو سفید رنگ کے ایک بہت اچلے کپڑے سے ڈھک کر اس پر بڑی نفاست سے پانی کا جگ اور گلاس رکھ دیا گیا تھا اور اسی کے پہلو میں ایک بہت خوبصورت چینی کی طشتری دوسری چینی کی طشتری سے ڈھک دی گئی تھی۔ میں نے اوپر کی طشتری اٹھائی تو دیکھا

امرو د کے کچالو ہیں جن کا شیرہ تیار ہو چکا تھا۔ میں نے سلیمین کو بلا کر اس سے پوچھا:
”یہ سب کس نے کیا؟“

”جو بی بی آئی ہیں انہوں نے، اور مجھے قسم دی ہے یہ سب بیگم صاحب کو مت بتاؤں۔“
کمرے سے سلیمین کے چلے جانے کے بعد میں نے کچالو کھائے، پانی پیا اور اپنے کام
میں لگ گیا۔ کچھ دیر بعد کل ہی کی طرح شہبا ایک کشتی میں چائے لے کر آ گئی اور کل ہی کی
طرح وہ اس اسٹول پر بیٹھ گئی جس پر گلاس، پانی کا جگ اور کچالوؤں کی طشتی رکھی تھی۔
”آپ نے کمرہ کیوں صاف کیا، سلیمین کر دیتی ہے یہ کام“ میں نے کہا۔
”آپ کو برا لگا ہو تو کل سے نہیں کروں گی۔“

”نہیں ایسا نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ.....“
”میری اور سلیمین کی صفائی میں کچھ فرق نظر آیا آپ کو؟“
”آپ نے بہت اچھی طرح صفائی کی ہے، کمرہ بہت اچھا لگ رہا ہے۔“
”جو کام دل لگا کر کیا جاتا ہے، اچھا ہی ہوتا ہے۔“
”کچالوؤں کا شکریہ اور چائے کا بھی۔“

”جو پھل توڑ کر لائی تھی خالہ کو دے دیے۔“ شہبا نے کہا۔ پھر کہا: ”کچھ امرو د اپنے پاس
رکھ لیے۔ اس دن ہمارے گھر پر آپ کو کچالو بہت اچھے لگے تھے۔ میں نے سوچا ایک دو دن
یہاں بھی آپ کو کھلا دوں۔“ شہبا نے کہا پھر پوچھا:

”یہ بتائیے کتاب مل جانے کے بعد بھی آپ آئیں گے۔“
”کہہ نہیں سکتا۔ بیگم صاحب نے بھی یہی پوچھا تھا۔“
”خالہ تو آپ کو اپنا بیٹا بنا چکی ہیں۔“

”ہاں۔ بہت محبت کرنے لگی ہیں۔ جن حکیم صاحب سے اپنا علاج کر رہی ہیں، اُن
سے دوا اُن کی میں ہی لا رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے شہبا کو بتایا: ”حکیم صاحب نے کہا ہے
انہیں اکیلا نہ چھوڑیے گا۔“

”کیا مرض ہے خالہ کو۔“
”دے گا۔“ یہ سن کر شہبا ٹھٹھکی پھر بولی: ”ہاں پرسوں میں آئی تو مجھے گلے لگاتے ہی

کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔“

”حکیم صاحب نے کہا ہے یہ مرض علاج سے نہیں ٹھیک ہوگا۔“ میں نے کہا۔ پھر کہا:
”بتا رہے تھے بیگم صاحب اکیلے پن سے پریشان ہیں۔ کوئی رہے ان کے ساتھ، کوئی
ایسا جسے وہ اپنا سمجھتی ہوں۔“ یہ بتا کر میں نے شہبا سے کہا:
”اچھا ہوا آپ آگئیں۔“

”آپ کو بہت چاہنے لگی ہیں۔ مجھ سے بہت باتیں کیں آپ کی اور آپ کی ماں کی بھی۔“
”ہاں۔ بیگم صاحب آپ کے باپ کی عزیز ہیں اور میری ماں کی۔“
”آپ لوگ کہاں رہتے ہیں لکھنؤ میں۔“

”بزازے میں۔ نخاس سے جو سڑک چوک منڈی کی طرف جاتی ہے اسی پر داہنی طرف۔“
”جانتی ہوں، جانتی ہوں۔ اماں ادھر بہت جاتی تھیں سوز پڑھنے۔“
”سوز پڑھنے؟“

”ہاں۔ بہت اچھا سوز پڑھتی تھیں اماں ہماری۔ گلاب بہت اچھا تھا۔ تھوڑا بہت ہمیں بھی
سکھا دیا۔“ یہ کہہ کر شہبا نے بتایا: ”جب ان کا سینہ کمزور ہونے لگا تو مجھ سے پڑھوانے لگیں۔“
”کیا ہوا تھا انہیں؟“

”وہی دمہ جو خالہ کو ہے۔“

”بیگم صاحب کو یہ مرض اپنی ماں سے ملا ہے۔“ میں نے کہا۔ لیکن یہ کہتے ہی مجھے
احساس ہوا یہ جملہ غلط نکل گیا میری زبان سے۔ میں نے فوراً کہا: ”لیکن ضروری نہیں ہر
خاندان میں ایسا ہوتا ہو۔“

شہبا چپ رہی وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن کہتے کہتے رک گئی۔ تھوڑے سے وقفے کے بعد بولی:
”خالہ آپ کے لیے اچکن اور شیر وانی سلوار ہی ہیں۔“
”ہاں کئی دن سے کہہ رہی تھیں۔ کل ناپ دلوادی۔ کہتی ہیں تمہاری شادی یہیں سے
کروں گی۔ اسی گھر میں لاؤں گی تمہاری دلہن۔“

”تو آپ نے کیا کہا۔“

”منع کر دیا۔ جب تک اپنا گھر نہیں ہوگا، گھر نہیں بساؤں گا۔“

”تو کیا آپ کا بھی گھر؟“

”نکل گیا۔ اب یہ مت پوچھیے گا کیسے۔“

”نہیں، نہیں پوچھوں گی۔ اماں کہتی تھیں لکھنؤ میں بہت سے قصے ایک جیسے ہیں۔“

”صحیح کہتی تھیں۔“

”تو کوئی آپ کا ہے نہیں۔“

”نہیں۔ ایک ماں تھی، بڑے ہوتے ہوتے چل بسی۔“

”اور.....“

”باپ؟ وہ ماں سے پہلے ہی.....“

”تو اکیلے ہیں آپ۔“

”جی۔ تو آپ اماں سے سنی ہوئی باتیں کب بتائیں گی۔“ میں نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

”بتاؤں گی۔ ضرور بتاؤں گی۔ اب چلنے دیجیے۔ آج آپ کے پاس کچھ زیادہ بیٹھ گئی۔“ شہبانے کہا۔ پھر کہا: ”دن کے کھانے کے بعد میں آپ کو، خالہ نے پیچھے جو کمرہ رہنے کے لیے دیا ہے، وہ دکھاؤں گی۔ میں نے اپنا چولہا بھی بنالیا ہے۔ کل سے اسی پر اپنا کھانا پکاؤں گی۔“ یہ بتا کر شہبا میرے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد میرا دل کتابیں دیکھنے میں نہیں لگا۔ میں نے بغیر دیکھی ہوئی کتابوں کو دیکھنے کے بجائے دیکھی ہوئی کتابوں کو دوبارہ دیکھنا شروع کر دیا۔ اب میرا جی چاہنے لگا کہ وہ کتاب جسے میں دیکھنے کے لئے یہاں آیا ہوں، مجھے بہت جلدی نہ ملے۔

دوپہر بعد سلیمان مجھے کھانے کے لئے بلانے آئی۔ میں ہال میں پہنچا تو شہبا دسترخوان پر نظر نہیں آئی اور اس سے پہلے کہ میں اس کے بارے میں پوچھتا جہاں دار بیگم بولیں:

”شہبانے اپنا چولہا الگ کر لیا ہے۔ اب وہ ہمارے ساتھ نہیں کھائے گی۔“ یہ کہہ کر بولیں:

”آج شملہ مرچ پکائی ہے اس نے، مسالہ بھری ہوئی۔ دے گئی ہے، کہہ گئی ہے کھا کر بتائیے گا کیسی پکی ہے۔“ یہ بتا کر بولیں: ”میں نے بہت کہا کچھ دن ہمارے ہی ساتھ کھاؤ لیکن راضی نہیں ہوئی۔ ہوگی بھی نہیں۔ اپنی ماں ہی کی طرح بڑی غیرت والی ہے۔ لفافے بنانے والا

کاغذ اور پتنگیں بنانے کا سامان بھی لے آئی ہے۔ کل سے شروع کر دے گی اپنا کام۔“
میں خاموش رہا۔ دو ایک نوالوں کے بعد جہاں دار بیگم نے پوچھا:

”آج تم بہت چپ چپ ہو۔“

”نہیں بس تھوڑی سی تکان ہے۔“

”کل میری دوا آنا ہے۔ تم بھول گئے شاید۔“

”نہیں بھولا نہیں ہوں، کل جاؤں گا۔“

کھانے کے بعد جہاں دار بیگم نے ادھر ادھر کی دو چار باتیں کیں پھر وہ اپنی صحنچی میں چلی گئیں اور میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ شام ہونے سے کچھ پہلے میں نے شہبا کو اپنے کمرے کی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ آنکھیں چارہ ہوتے ہی وہ مجھ سے بولی:

”چلیے آپ کو دکھاؤں اپنا کمرہ اور اپنا چولہا۔ آپ ہی لائے ہیں مجھے یہاں۔“

میں شہبا کے ساتھ اس کے رہنے والی جگہ پر پہنچا تو دیکھا کمرے میں سارا سامان بڑے قریب سے لگا ہوا ہے۔ کمرے کے بیچ میں اُس کے پہلے والے مکان کی طرح چٹائیوں پر وہ چوکیاں رکھی تھیں جن پر وہ لفافے اور پتنگیں بناتی تھی۔ اس کے محراب دار طاقتوں میں دفنی سے بنے ہوئے گلدان رکھے تھے اور اُن میں رنگین کاغذوں سے بنائے ہوئے بہت خوبصورت پھول سجائے گئے تھے۔ کمرے کے دونوں کونوں میں ان بکسوں کو جو شہبا اپنے ساتھ لائی تھی، پتنگیں بنانے والے کاغذوں میں لپٹے ہوئے گتوں پر رکھ دیا گیا تھا اور انہیں خوبصورت کڑھے ہوئے کپڑوں سے ڈھک دیا گیا تھا۔ ان کپڑوں سے ڈھکے ہوئے ان بکسوں پر کچھ پرانی کتابیں، ایک خاصدان اور اچھی نقاشی والی ایک پند نیا رکھی ہوئی تھی۔ دیواروں کے جگہ جگہ سے اکھڑے ہوئے پلاسٹر کو پھول پتیوں والی شکل کے کاغذوں سے چھپا دیا گیا تھا۔ کمرے میں لگی ہوئی ایک بہت پرانی چھت گیری پر جمی ہوئی گرد صاف کی جا چکی تھی۔ برآمدے میں ایک طرف تین منہ والا مٹی کا چولہا بنا ہوا تھا جس پر چکنی مٹی کا لپ لگا کر اس کی سطحوں اور کناروں کو اچھی طرح ہموار کر دیا گیا تھا۔ اسی مٹی کے چولہے کے پہلو میں ایک چبوترہ بنا کر اس کے ایک طرف سنسی، دست پناہ، کرچھا اور کف گیر رکھ دیے گئے تھے اور دوسری طرف المونیم کی پتیلیاں، کھانے کے برتن، دال چاول رکھنے والے ڈبے اور مسالوں کی چھوٹی چھوٹی اچاریاں رکھی تھیں۔

سب کچھ دیکھنے کے بعد میں نے کہا:

”آپ نے تو بہت اچھا بنا لیا اپنے رہنے کا ٹھکانہ۔“ پھر پوچھا:

”لیکن یہ بتائیے چھت گیری کیسے صاف کی؟“

”بائس میں جھاڑو باندھی۔ بکسے پر کھڑے ہوئے، سارے جالے اور یہ چھت گیری والی گرد صاف کر ڈالی۔“ یہ کہہ کر اس نے مجھ سے کمرے میں رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا، اور خود اسی کرسی کے سامنے رکھے ہوئے اسٹول پر بیٹھتے ہوئے بولی:

”یہ دونوں چیزیں خالہ نے یہاں رکھوا دی ہیں۔“

میں نے بکسے پر رکھی ہوئی کتابوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا:

”یہ کتابیں؟“

”ابا کی ہیں۔ انہوں نے بہت کتابیں جمع کی تھیں۔ بہت سی اسی مکان کی سیلن میں برباد ہو گئیں۔ جو بچ رہیں وہ لے آئی۔“ شہباز نے کہا۔ پھر بتایا:

”اماں کو ہماری پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ایک مولی صاحب رکھ کر انہوں نے ہم کو بھی اردو اور تھوڑی بہت فارسی پڑھوائی۔ اماں پہلے یہ کتابیں خود پڑھتی تھیں پھر ہم سے پڑھوا کر سنتی تھیں۔ جب میں کہتی خود پڑھ کر مجھ سے کیوں پڑھواتی ہیں تو کہتیں اس طرح تمہاری زبان صاف ہو جائے گی۔“

”صحیح کہتی تھیں۔“ میں نے کہا۔ ”اور آپ سے بات کر کے میری زبان صاف ہو جائے گی۔“

”یہ مت کہیے۔ خالہ اٹھتے بیٹھتے آپ کا ذکر کرتی ہیں اور آپ کی ماں کا بھی۔ بتاتی ہیں ماں آپ کی بہت پڑھی لکھی عورت تھیں اور آپ کے لیے کہتی ہیں.....“

”کیا کہتی ہیں؟“

”سب گن اس میں اپنی ماں کے ہیں، بہت آگے جائے گا۔“

میں نے کچھ کہنے کے بجائے بکسے پر رکھی ہوئی کتابیں دیکھنا شروع کر دیں۔ ان میں طلسم ہوشربا کی ایک۔ دو جلدیں، فسانہ آزاد، قصہ چہار درویش، مثنوی زہر عشق، امراؤ جان، بی بی سیدہ کی کہانی، احسن المجالس، نیرنگ خیال اور اسی طرح کی کچھ اور کتابیں تھیں۔

”یہ سب آپ کی پڑھی ہوئی ہیں۔“ میں نے ان کتابوں کو دیکھنے کے بعد شہباز سے پوچھا۔

”جی پڑھی ہوئی ہیں اور ان میں لکھا ہوا مجھے یاد بھی ہے۔“
”ہم نے دن کے کھانے پر آپ کی پکائی ہوئی شملہ مرچ کھائی۔ بہت مزے کی تھی۔“
”واقعی؟“
”جی۔“

”کل پھر پکا دوں گی۔“
”نہیں نہیں۔ کل آپ دسترخوان پر نہیں آئیں؟“ میں نے پوچھا۔
”دو چار دن اگر خالہ کے ساتھ بیٹھ گئی تو پھر وہ روز بٹھائیں گی۔ اور ہم یہ نہیں چاہتے۔“
”اندھیرا پھیلنے والا ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔“ میں نے کہا۔
”خالہ سے مل کر جائیے گا۔“
”نہیں ادھر گیا تو بیٹھنا پڑے گا۔ سلیمین سے کہہ کر چلا جاؤں گا۔“
”کل کس وقت آئیں گے۔“
”جس وقت روز آتا ہوں۔“

”اچھا آپ ذرا بیٹھیے میں آتی ہوں۔“ شہباز یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک ناشتہ دان تھا جسے اس نے ایک کپڑے میں باندھ کر مجھے دیتے ہوئے کہا:

”اس میں قیمے کے پراٹھے ہیں اور چاول کی کھیر۔ رات میں یہی کھائیے گا۔“
”اس کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو.....“
”ہوٹل میں کھاتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے۔ اسی لیے دے رہی ہوں کہ ہوٹل کا کھانا آپ سے چھوٹ جائے۔“

میں نے شہباز سے ناشتہ دان لیا اور اسے خدا حافظ کہہ کر اس کے رہنے والی جگہ سے باہر نکل کر اپنے ٹھکانے پر چلا آیا۔

رات میں نے شہبا کے پکائے ہوئے قیمے کے پراٹھے کھائے اور اپنی بھوک سے زیادہ کھائے اور کھیر بھی مزے لے لے کر کھائی۔ صبح جب میں جہاں دار بیگم کی حویلی پہنچا تو میرا جی چاہا میں سیدھا شہبا کے کمرے کی طرف جا کر اس کے کھانے کی تعریف کروں۔ لیکن یہ سوچ کر کہ یہ ٹھیک نہیں ہے میں کتابوں والے کمرے کی طرف چلا گیا۔ ابھی اس کمرے میں میں نے دو چار کتابیں ہی دیکھی تھیں کہ شہبا چائے لے کر آگئی اور مجھے سلام کرتے ہوئے بولی:

”آج سے اُس کام میں میں بھی آپ کا ہاتھ بٹاؤں گی۔ اس طرح کام جلدی نمٹ جائے گا۔“
 ”لیکن بیگم صاحب۔“

”ان سے میں نے کہہ دیا ہے، کہہ دیا ہے کہ مجھے کتابوں کا بہت شوق ہے اور یہ بھی کہہ دیا ہے کہ میرے ہاتھ بٹانے سے اُن کا کام آسان ہو جائے گا۔“
 ”بیگم صاحب نے کیا کہا؟“

”بہت خوش ہوئیں۔ بولیں تم دونوں میرے لیے فرشتے بن کر آئے ہو۔ دونوں کو خدا خوش رکھے۔“ یہ بتا کر شہبا نے کہا: ”چائے پی لیجیے، پھر ہم کام شروع کرتے ہیں۔“
 ہم نے چائے پی اور دونوں مل کر کتابیں دیکھنے کے کام میں لگ گئے۔
 ”قیمے کے پراٹھے بہت مزے کے تھے اور کھیر بھی۔“
 ”شکریہ۔ خالہ کہہ رہی تھیں.....“ شہبا کہتے کہتے رکی۔
 ”کیا کہہ رہی تھیں؟“

”کہہ رہی تھیں سلیمن جو پکاتی ہے سو پکاتی ہے ایک آدھ چیز تم بھی اپنے ہاتھ کی اُس کے لیے پکا دیا کرو۔ آج میں رکھوچے پکاؤں گی۔“
 ”رکھوچے تو ماں کو بہت پسند تھے۔“
 ”اور ہماری اماں کو بھی۔“

چائے ختم ہوتے ہی ہم نے کام شروع کر دیا۔ ایک دو کتابیں اٹھانے کے بعد شہبا نے پوچھا: ”وہ کتاب جسے آپ ڈھونڈ رہے ہیں، اس پر کیا لکھا ہوگا؟“

”امراؤ جان یا امراؤ جان کی کہانی یا امراؤ جان کی سرگذشت اور اس کے نیچے
مرزا محمد ہادی رسوا۔“

ڈھیر میں سے ایک دو کتابیں اور اٹھانے کے بعد شہباز نے مجھ سے کہا: ”اب میں
جارہی ہوں رکھو چے پکانے۔ دن کے کھانے کے بعد پھر آپ کے ساتھ لگوں گی۔“ یہ کہہ
کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں نے کتابیں دیکھنے کی رفتار سے کر دی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا جو کتابیں میں دیکھ
چکا ہوں انہیں پھر بغیر دیکھی ہوئی کتابوں میں ملا دوں۔ دو پہر تک میں نے جان بوجھ کر
بہت کم کتابیں دیکھیں۔

سلیم کے آواز دینے پر جب میں دسترخوان پر پہنچا تو بیگم صاحب نے سب سے پہلے
میرے سامنے رکھو چوں والی رکابی بڑھائی:

”یہ شہباز نے تمہارے لیے پکائے ہیں۔ کل میں نے اس سے کہا تھا ایک آدھ چیز اپنے
ہاتھ کی تمہارے لیے بھی پکا دیا کرے۔“ یہ کہہ کر بولیں: ”کھاؤ اور بتاؤ کیسے ہیں۔“
میں نے رکھو چوں کا ایک نوالہ منہ میں رکھ کر کہا: ”بہت مزے کے۔“

”ہاں، اپنی ماں کی طرح اس لڑکی کے ہاتھ میں بھی بہت مزہ ہے۔ اور ایک بات اس
میں تمہاری جیسی ہے۔“
”وہ کیا؟“

”کتابیں پڑھنے کا شوق۔ اسکو لی تعلیم تو زیادہ نہیں ہوئی لیکن اردو کی ساری اچھی کتابیں
پڑھ رکھی ہیں۔ کچھ کچھ فارسی بھی آتی ہے۔“ یہ بتانے کے بعد جہاں دار بیگم نے کہا:
”کتابیں دیکھنے کے کام میں اسے بھی لگا لو اپنے ساتھ۔“

میں نے آج کی بات دانستہ ان سے نہیں بتائی۔ دسترخوان پر رکھی ہوئی چیزوں میں سے
میں نے رکھو چے کچھ زیادہ کھالے۔ بیگم صاحب یہ دیکھ کر بولیں:
”لگتا ہے رکھو چے تمہیں زیادہ اچھے لگے۔“

”نہیں ایسا نہیں ہے۔ بہت دن بعد کھانے کو ملے، اس لیے زیادہ کھالے۔ اور اس لیے
بھی زیادہ کھالے کہ یہ اماں کو بہت پسند تھے۔“

”آج ہماری دوا آنا ہے۔“ بیگم صاحب بولیں:

”جی یاد ہے۔“

”حکیم صاحب سے کیا کہو گے؟“

”جو آپ بتائیں گی۔“

”کہنا، بہت فائدہ ہے آپ کی دوا سے، آج کل بہت خوش ہیں۔ بھوک کھل گئی ہے۔“

”سینے کی سوزش بھی کم ہے..... لیکن دوا بند نہ کریں۔“

کھانا کھا کر میں دالان سے باہر نکلنے لگا تو جہاں دار بیگم نے مجھے آواز دی:

”سنو!“

میں پلٹا تو بولیں:

”سلیمان سے کہہ کر شہبا کو بلوالینا، بہت محنتی ہے اور سنجیدہ بھی۔“

”جی بلوالوں گا۔“

میں کمرے پر آیا تو شہبا وہاں موجود تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی:

”میں نے کئی کتابیں دیکھ ڈالیں، انہیں الگ رکھ دیا ہے۔ ایک نظر آپ بھی دیکھ لیں۔“

”رکھو چے بہت مزے کے تھے۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے زیادہ کھا لیے اور بیگم صاحب

نے کہہ بھی دیا کہ تم نے رکھو چے زیادہ کھائے، لگتا ہے تمہیں زیادہ اچھے لگے۔“

”آپ کی ماں کو جو چیزیں پسند تھیں، مجھے بتاتے جائے میں ایک ایک دن ایک

چیز پکاتی جاؤں گی۔“

”آج مجھے بیگم صاحب کی دوا لینے جانا ہے۔ مغرب کے وقت۔“

”یہ آپ بیگم صاحب بیگم صاحب کیا کہتے رہتے ہیں۔ میری طرح خالہ کیوں

نہیں کہتے انہیں۔“

”اب سے شروع کر دوں گا کہنا۔“

بغیر دیکھی ہوئی کتابوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے انہیں دیکھ کر اندازہ لگایا تو

وہ دو چار دن سے زیادہ کا کام نہیں تھا۔ اور اگر وہ مسودہ جسے میں ڈھونڈ رہا ہوں پہلے ہی نکل آیا

تو یہ دو چار دن بھی پورے نہیں ہوں گے۔ اس کے بعد اس حویلی میں آ کر دیر تک بیٹھنے کا

میرے پاس کوئی اور بہانہ نہیں ہوگا۔ جہاں دار بیگم اگرچہ مجھے اپنا بیٹا کہنے لگی ہیں، حویلی میں رہنے کے لیے بھی کہتی ہیں لیکن اس طور یہاں رہنا مجھے منظور نہیں۔ وہ دیر سے اٹھتی ہیں اور دن کے کھانے کے بعد دیر تک آرام کرتی ہیں۔ کتاب مل جانے کے بعد میں یہاں آیا بھی تو دوپہر سے پہلے کچھ ہی دیر ان کے پاس بیٹھ سکوں گا۔ بہت کہیں گی تو کھانا بھی ان کے ساتھ کھالوں گا۔ اس کے بعد؟ شہبا کی طرف جانا ٹھیک نہیں۔ سلیمین کے علاوہ حویلی میں اور بھی ملازم ہیں، وہ کیا سوچیں گے..... میں کتابیں دیکھنے کے بجائے یہی سب سوچتا رہا۔
 ”کہاں کھو گئے؟“

”کہیں نہیں۔ سوچ رہا تھا بہت کم کتابیں رہ گئی ہیں۔ جس کتاب کو ڈھونڈ رہا ہوں وہ بہت جلد مل جائے گی۔“

”اور خدا نخواستہ..... ان میں بھی نہیں ملی تو؟“ شہبانے کہا۔
 ”نہیں۔ ملے گی ضرور۔ بیگم صاحب معاف کرنا..... معاف کیجیے..... خالہ کہہ رہی تھیں مرزا صاحب کی سب کی سب کتابیں یہیں ہیں۔“
 ”یہ معاف کرنا کے بعد معاف کیجیے کیوں کہا آپ نے۔“
 ”زبان پھسل گئی تھی۔“

”صحیح پھسل گئی تھی۔ تم پر آنے میں بہت دیر لگ رہی ہے آپ کو۔“ شہبانے کہا۔
 ”لکھنؤ کچھ زیادہ ہی بس گیا ہے آپ کے اندر۔“ یہ کہہ کر مجھ سے پوچھا:
 ”سہ پہر کی چائے پیئیں گے۔“
 ”ضرور پیئیں گے۔“

”چلیے اب کتابیں دیکھی جائیں۔“
 کتابیں دیکھنے کے دوران شہبا کو دو تین بار کھانسی آئی اور ایک آدھ بار زیادہ آئی۔
 ”کھانسی کچھ زیادہ آ رہی ہے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”جی موسم بدل رہا ہے۔ رات گئے ٹھنڈ ہو جاتی ہے۔ اسی میں سردی لگ گئی شاید۔“
 ”احتیاط کیجیے۔“

”خالہ نے ایک رضائی بھجوا دی ہے۔ آج سے اسے اوڑھ کر لیٹوں گی۔“

سہ پہر کا وقت آتے ہی شہبا اپنے کمرے میں چائے بنانے چلی گئی۔ میں اس کے آنے تک جو کتاب ہاتھ میں تھی، اس کی ورق گردانی کرتا رہا۔ وہ چائے لے کر آئی اور وہی کتاب جو اس کے جاتے وقت میرے ہاتھ میں تھی، دیکھ کر بولی: ”آگے نہیں بڑھے۔“

”سوچا آپ آجائیں تو آگے بڑھیں۔“

”آپ کچھ کھوئے کھوئے سے رہنے لگے ہیں۔“

”نہیں۔ کچھ باتیں اپنے آپ پریشان کرنے لگتی ہیں۔“

”کون سی باتیں؟“

”یہی کہ میں خالہ کی بات مان بھی نہیں سکتا اور انہیں دکھ بھی نہیں پہنچا سکتا۔“

”کون سی بات؟“

”یہاں رہنے کی اور یہیں سے اپنی شادی کرنے کی۔ ان دونوں باتوں کے نہ ماننے پر

انہیں بہت دکھ ہوگا۔“

”دکھ تو ہوگا۔“

”آپ کو کیسے معلوم؟“

”کل شام اپنے پاس بلا کر مجھ سے کہہ رہی تھیں.....“

”کیا کہہ رہی تھیں؟“

”شہبا اب میں ایک فکر سے آزاد ہوگئی۔ میں نے پوچھا کون سی فکر تو بولیں: ”یہ جو لڑکا

یہاں آتا ہے، میں نے اپنے عزیزوں میں لڑکی ڈھونڈ لی ہے اس کے لئے۔ بس وہ ہاں

کردے تو میں اس کی شادی کر دوں۔“

”اور میں ہاں کر نہیں سکتا۔“

شہبا یہ سن کر خاموش ہوگئی۔ ایک دو کتابیں دیکھنے کے بعد میں نے کہا:

”ایک فکر اور ستاتی رہتی ہے مجھے۔“

”وہ کیا؟“

”خالہ کی عمر بہت ہو چکی ہے اور بیماری ان کی بڑھتی جا رہی ہے۔“

”تو؟“

”اس عمر میں دو از یادہ کام نہیں کرتی۔“

”تو؟“

”خالہ کے بعد، خدا نخواستہ اچانک ان کی آنکھ بند ہوگئی تو اس حویلی کا کیا ہوگا؟ اور آپ..... آپ کہاں جائیں گی۔“

”میری فکر مت کیجیے۔ میں اپنا انتظام کر لوں گی۔ ہاتھ پیر سلامت ہیں۔“ یہ کہہ کر شہبانے کہا: ”آپ کو مختار بنا تو رہی ہیں اپنی جائیداد کا۔ کل یہ بھی کہہ رہی تھیں شادی کر لے تو سب اسی کے نام کر دوں۔“

”نہیں۔ ہم مفت خوروں میں نہیں ہیں۔ برے دنوں میں اماں ہماری چولہے میں آگ جلا کر پانی سے بھری ہوئی پیتلیاں چڑھا دیتی تھیں تاکہ آنے والا یہ نہ سمجھے چولہا ہمارا ٹھنڈا ہے۔“ میں آگے کچھ کہنے والا تھا کہ شہبانے اچانک اپنا ہاتھ میرے منہ کی طرف بڑھایا پھر کچھ سوچ کر واپس کھینچ لیا۔ پھر بولی:

”آگے مت کہیے۔ دوسروں کے قصے بھی آپ سے الگ نہیں ہیں۔ اماں بتاتی تھیں یہ جو اس نوبت کو ہم پہنچے ہیں، اس میں کچھ ہمارے مقدر کا ہاتھ ہے اور کچھ زمانے کی گردشوں کا۔“ یہ کہہ کر اس نے کہا: ”چائے پیچھے اور سوچنا بند کیجیے۔ شکر کیجیے کہ آپ کا دکھ بانٹنے والے موجود ہیں۔“

ہمارا وقت باتوں میں زیادہ، کتابیں دیکھنے میں کم گزرا۔ شام ہونے لگی تھی۔ میں نے دیکھی ہوئی کتابیں ایک طرف رکھتے ہوئے شہبا سے کہا:

”اب میں نکلتا ہوں دوالانے کے لیے۔ وہاں سے واپس آتے آتے دیر ہو جائے گی۔“ یہ کہہ کر میں نے شہبا سے کہا: ”آپ اپنے کمرے میں آرام کیجیے اور ادراک اور کالی مرچ اور تھوڑا سا گڑ پانی میں ڈال کر کھولا لیجیے اور اسے پی لیجیے۔ کھانسی کم آئے گی۔“

”جی ایسا ہی کروں گی۔ آپ نکلئے۔“

○

راستے میں سوار یوں کا ہجوم ہونے کی وجہ سے حکیم احمد رضا کے مطب تک پہنچنے میں مجھے دیر لگی۔ میں جب وہاں پہنچا تو وہ بہت سے مریضوں کو دیکھ چکے تھے اور اب بہت کم مریض ان

کے مطب میں رہ گئے تھے۔ میں نے مریضوں کا نام پکارا۔ نہ والے کے ہاتھ اپنا پرچہ بھجوا یا تو اس نے باہر آ کر کہا:

”بہت کم مریض رہ گئے ہیں، انہیں دیکھ لیں تو آپ کو بلاتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے کہا: ”حکیم صاحب نے کہا ہے آپ سے کچھ باتیں کرنا ہیں اس لیے تھوڑا انتظار کر لیں۔“ میں کنارے والی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ بچے ہوئے مریضوں کو دیکھنے کے بعد حکیم صاحب نے مجھے اندر بلوایا۔ میرے سلام کرنے کے بعد انہوں نے پوچھا:

”کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہوں۔“

”بیٹھے۔ اور بیگم صاحب کیسی ہیں؟“

”آپ کی دوا سے بہت فائدہ ہے۔ آج کل بہت خوش ہیں۔ بھوک گھل گئی ہے۔ سینے کی سوزش بھی کم ہے۔“ یہ بتا کر میں نے حکیم صاحب سے بیگم صاحب کا آخری جملہ کہا:

”یہ بھی کہا ہے دوا بند نہ کریں۔“

”دوا تو چلتی رہے گی۔ لیکن جو کچھ آپ نے بتایا، جان کر خوشی ہوئی۔“

”ایک دوا الگ سے بھی چاہیے ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کھانسی اور زکام کی۔“

”وہ کس کے لیے؟“

”بیگم صاحب کی ایک عزیزہ ان کے یہاں آ کر رہی ہیں۔ انہیں ٹھنڈ لگ گئی ہے۔“

”کھانسی بار بار آ رہی ہے۔“

”کون سی عزیزہ؟“

”کاظمین کے آگے دیانت الدولہ کی کربلا کی پشت پر ایک محلہ ہے.....“

”نور باڑی۔“

”جی۔“

”وہیں سے آئی ہیں۔ ماں باپ دونوں نہیں ہیں۔“

”کس کی بیٹی ہیں؟“

”نواب سلطان بہادر کی۔ چھوٹے نواب کے نام سے بھی مشہور ہیں۔“
”سمجھ گیا سمجھ گیا۔ سترہ سو والی کے بیٹے۔“
”سترہ سو والی؟“

”جی۔ بہت بڑا وثیقہ تھا اُن کا۔ بڑی نواب زاد یوں میں تھیں۔“
”تو آپ جانتے ہیں ان کے ماں باپ کو۔“

”خوب جانتا ہوں۔ شہر ہمارا بہت بڑا نہیں ہے۔ سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور
میں جس پیشے میں ہوں اس میں خود بخود لوگ میرے تعلق میں آ جاتے ہیں۔“ یہ کہہ کر حکیم
صاحب بولے: ”تو یہ صہبا خانم کی بیٹی ہیں۔ کیوں آ کر رہی ہیں وہاں؟“
”نواب سلطان بہادر کے چھوٹے بھائی روز مکان پر اپنا حق جتاتے تھے۔ روز
سامان پھنکوانے کے لیے کہتے تھے۔“ میں نے اُنہیں بتایا۔ ”بیگم صاحب کو جب ان کی
پریشانی کا علم ہوا تو اپنے یہاں بلا لیا۔“

”اچھا کیا۔ صہبا خانم کی زندگی بڑی تکلیف میں گزری۔“
”کچھ کچھ بتاتی ہیں اُن کی بیٹی۔“

”بہت اچھے دل کی عورت تھیں۔ جس دن سے چھوٹے نواب انہیں اپنے گھر لائے،
گھنگھڑا تار کرناچ گانے سے توبہ کر لی۔“ حکیم صاحب نے آگے بتایا:
”رات رات بھر نمازیں پڑھتیں۔ دل میں خدا کا خوف ایسا بیٹھا کہ صبح سے دوپہر تک
تلاوت کرتیں۔ مجلس ماتم کے سوا کوئی اور شغل نہیں تھا۔“
”یہ سب آپ کو کیسے معلوم؟“

”میاں ہم دوا دیتے ہیں، مریضوں کو ٹھیک کرتے ہیں۔ بہت سے ہماری دوا سے
دوسری زندگی پا جاتے ہیں۔“ حکیم صاحب کہتے رہے: ”لوگ ہماری مسیحتی پر ایمان لا کر
سمجھنے لگتے ہیں مرض کی تکلیف کے ساتھ ساتھ ہم ان کی دوسری تکلیفیں بھی دور کر دیں
گے۔“ حکیم صاحب ر کے پھر بولے: ”اسی لیے لوگ ہم سے وہ سب بھی کہہ دیتے ہیں جو
کسی اور سے نہیں کہہ سکتے۔“
”تو یہ صہبا خانم کیا.....“

”جنم سے ناچنے والی نہیں تھیں، جیسے امراؤ جان نہیں تھیں۔“ حکیم صاحب نے کہا۔ پھر کہا: ”میاں غدر کے بعد اس شہر میں بہت سی نجیب زاد یوں کا حشر وہی ہوا جو نادر شاہ کے حملے کے بعد دہلی کی شریف زاد یوں کا ہوا تھا۔ لکھنؤ کی تباہی کا حال بہت سی کتابوں میں لکھا ہے، اسے پڑھیے۔“ یہ کہہ کر مجھ سے کہا:

”آپ تو، بتایا تھا آپ نے شاید، ناظم صاحب کے امام باڑے والی گلی میں رہتے ہیں۔“
”جی بزازے میں۔“

”تو وہاں تو مرثیے کی مجلسیں برابر ہوتی ہیں۔ شعر فہموں کا محلہ ہے۔“ حکیم صاحب نے کہا۔ ”بہت سے مرثیہ خواں تو اُسی گلی میں رہتے ہیں اور آپ کی گلی کے سامنے چوک والی گلی پار کر کے میرانیس کا دولت کدہ ہے۔ کیا نقشہ کھینچا ہے لکھنؤ کی تباہی کا سنیے:

در پر کوئی روتا ہے کوئی راہ گزر میں
تاریک ہے دنیا کسی غمگیں کی نظر میں
ہیں جمع محلے کی جو سب عورتیں گھر میں
اک حشر ہے ناموسِ شہ جن و بشر میں

سب مل کے بکا کرتے ہیں جب آتا ہے کوئی
یوں روتے ہیں جس طرح کہ مرجاتا ہے کوئی
اشراف ہیں جتنے وہ نکلتے نہیں گھر سے
دروازہ نہیں کھولتے لٹ جانے کے ڈر سے
ہو جاتی ہے جب شام ترّد میں سحر سے
سب کرتے ہیں سجدے کہ بلا ٹل گئی سر سے

یہ ظلم یہ بیداد نہیں اور کسی پر
مولا یہ تباہی ہے مہبانِ علی پر
بہت اچھی پڑھت کے ساتھ یہ بند سنا کر حکیم صاحب مجھ سے بولے:

”تو ایسی تباہی آئی تھی لکھنؤ پر۔ شہر ہمارا سنبھلا نہیں اس کے بعد۔ یہاں کے بادشاہوں نے کیسے کیسے کیا کیا بنایا تھا اجاڑنے والوں نے چشمِ زدن میں اجاڑ دیا سب کچھ۔“ یہ کہہ کر حکیم

صاحب نے کہا: خدائے سخن نے کیا خوب کہا ہے:

کیونکر کوئی غمزدہ نہ فریاد کرے
جب ملک کو یوں غنیم برباد کرے
مانگو یہ دعا کہ پھر خداوندِ کریم
اجڑے ہوئے لکھنؤ کو آباد کرے

حکیم صاحب چپ ہوئے تو میں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا:
”تو شہبا کی ماں کا نام صہبا تھا۔“

”کون شہبا؟“ شہبا کا نام سن کر حکیم صاحب نے پوچھا۔

”جو بیگم صاحب کے یہاں رہی ہیں آ کر۔“ میں نے کہا۔

”اور یہ صہبا خانم.....“ حکیم صاحب نے کہنا شروع کیا۔ پھر خود ہی بولے:

”چھوڑیے اس قصے کو، کسی اور موقع پر بتاؤں گا۔ یہ بتائیے مرزا صاحب والے
معاملے میں کچھ کامیابی ملی؟“

”ابھی تو نہیں۔“ میں نے کہا۔ پھر انہیں بتایا: ”کچھ کتابیں علم طب سے متعلق ملی ہیں ان
کے ذخیرے میں۔ مجھے تو بہت نایاب لگیں۔ اگلی بار آؤں گا تو اپنے ساتھ لیتا آؤں گا۔“
”اگر وہ کتاب، جسے آپ ڈھونڈ رہے ہیں، ملی تو بہت حیران کرنے والی باتیں
ہوں گی اس میں۔“

”وہ کیسے؟“

”ان کے قصے ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ اُس کتاب میں بہت کچھ اُن کی زندگی کا
ماجرا بھی ہے۔“ حکیم صاحب نے کہا۔ ”امراؤ جان کا اصل قصہ مرزا صاحب کے
زمانے کے لوگوں کو معلوم تھا۔“
”کیا تھا اصل قصہ؟“

”امراؤ جان، جیسا لوگ بتاتے ہیں۔ بنگلے کی نہیں لکھنؤ کی تھیں اور بہت بڑے گھر سے
تعلق تھا اُن کا۔ مرزا صاحب سے لاگ لگاؤ کا جب کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو ایک بڑا قدم اٹھالیا۔“
”وہ کیا؟“

”حامد ڈاکو کے بھائی فیض علی کو عاشق صادق جان کر کوٹھا چھوڑ دیا۔ اور کانپور کی طرف چلی گئیں۔“ یہ کہہ کر حکیم صاحب نے اپنے مطب کی چھت کو یوں دیکھا جیسے آسمان کی طرف دیکھ رہے ہوں۔ پھر بولے: ”اس کے بعد کا حال لکھنؤ والوں کو نہیں معلوم۔“

”یہی سردار جہاں بھی کہتی تھیں۔ مگر وہ کہتی تھیں لکھنؤ آئی تھیں لیکن اپنے ٹھکانے کو راز میں رکھا۔“

”کون سردار جہاں، سنڈیلے والی؟“

”آپ انہیں بھی جانتے ہیں۔“

”کیوں نہیں جانتا۔ امراؤ جان، سردار جہاں، صہبا خانم سب کے تار ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔“ حکیم صاحب نے کہا۔ ”یہ لوگ یک پیشہ تو ہیں ہی لیکن نسباً بھی سب کی شاخیں ایک ہی درخت سے پھوٹی ہیں۔“

”مطلب؟“

”ابھی میں نے نجیب زادیوں کا ذکر کیا تھا۔“

”جی۔“

”تو سمجھ لیجئے سب کی سب اشرف سے تھیں۔ قسمت بگڑی تو نام و نسب کھو بیٹھیں۔“ یہ بتا کر بولے: ”جب میں آپ کی طرف بیٹھتا تھا تو یہ صہبا خانم برابر آتی تھیں میرے مطب پر اور سردار جہاں بھی۔ مرض کا حال بھی بتاتیں اور دوسرے احوال بھی۔ سردار جہاں تو گا ہے گا ہے اب بھی چلی آتی ہیں اپنی بھانجیوں کے ساتھ۔“ حکیم صاحب نے کہا۔ ”بہت کچھ معلوم ہوا ان لوگوں سے اس لکھنؤ کے بارے میں۔“

”کس لکھنؤ کے بارے میں؟“

”جو میں نے نہیں دیکھا اور اچھا ہوا نہیں دیکھا۔“

”کیوں؟“

”دکھ بھری دنیا کسی کو اچھی نہیں لگتی۔“ یہ کہہ کر حکیم صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ پھر جہاں دار بیگم اور شہبا کی دوا دیتے ہوئے کہا:

”یہ دوا لے جائیے۔ دونوں کی ہے۔ صہبا خانم کی بیٹی..... کیا نام بتایا تھا آپ نے؟“

”شہبا۔“

”جی۔ تو وہ جو بوا بیگم صاحب کی دوا لینے آتی تھیں ان سے کہیے گا شہبا سلمہا کا خیال رکھیں۔ ان کی رگوں میں اشراف کا خون ہے۔“ یہ کہہ کر میرے چہرے پر آنکھیں جما کر کہا: ”ذرا سی ٹھیس لگنے سے آگینے ٹوٹ جاتے ہیں۔“ پھر بولے: ”سمجھ گئے آپ؟“

”جی سمجھ گیا۔“

”اب جائیے۔ آج بہت دیر ہوگئی۔ حویلی پہنچتے پہنچتے آپ کو اور دیر ہو جائے گی۔ اگلی بار وہ جو طب والی کتابیں ہیں انہیں لیتے آئیے گا۔“



جہاں دار بیگم کی حویلی پہنچ کر میں نے خالہ کو ان کی دوا دے کر بتایا: ”آج حکیم صاحب نے سب مریضوں کو دیکھنے کے بعد بلایا پھر اپنے پاس دیر تک بٹھایا اسی میں دیر ہوگئی۔“

”دیر تک کیوں بٹھایا۔“ انہوں نے پوچھا۔

”کچھ پرانی باتیں نکل آئیں، قصے انہیں یاد آتے گئے وہ انہیں سناتے گئے۔“

میں نے صہبا خانم والی بات انہیں دانستہ نہیں بتائی اور میں نے جو دوا شہبا کے لیے لی تھی اس کے بارے میں بھی انہیں نہیں بتایا۔ خالہ کو دوا دے کر میں شہبا کے کمرے کی طرف آیا تو دیکھا وہ ناشتے دان میں کچھ رکھ رہی ہے۔ مجھے دیکھتے ہی بولی:

”بہت دیر لگ گئی حکیم صاحب کے یہاں۔“

”خالہ بھی یہی کہہ رہی تھیں۔ حکیم صاحب کو پرانے قصے بہت یاد ہیں وہی سنانے لگے۔“ یہ کہہ کر میں نے شہبا سے کہا: ”یہ دوا لایا ہوں آپ کے لیے۔“

”آپ کے لیے نہیں تمہارے لیے۔“

”تمہارے لیے۔ سات پڑیاں ہیں اور معجون۔ ایک پڑیا گنگنے پانی میں ڈال کر روز پینا ہے اور تھوڑی سی معجون انگلی میں لے کر اسے چاٹنا ہے۔ نہ کھانسی آئے گی نہ بلغم بنے گا۔“

دوا لے کر شہبا نے پہلی بار مجھے شکر گزار آنکھوں سے دیر تک دیکھا۔ پھر آنکھوں

میں آئی ہوئی نمی کو پونچھتے ہوئے بولی:

”لماں ہماری، جب ہماری طبیعت خراب ہوتی، بہت پریشان ہو جاتیں۔ اسی طرح کی

دوائیں لا کر ہمیں دیا کرتیں۔“

”اور ہو سکتا ہے وہیں سے لاتی ہوں جہاں سے میں لایا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”دیر بہت

ہو گئی ہے اب میں چلتا ہوں۔“
”رکیے۔“

میں اسٹول پر بیٹھ گیا۔ شہبانے بکسے پر رکھے ہوئے ایک بہت پرانے ڈبے میں سے کچھ نکالا پھر میرے قریب آ کر بولی: ”یہ تعویذ ہے اسے اپنے گلے میں ڈال لیجیے۔ اس میں چاروں قل ہیں۔ آیہ الکرسی ہے اور دعائے فتح۔ اماں نے مجھے پہنایا تھا اب اسے آپ پہنیے۔“
”جب تمہیں، آپ کہتا تو شہبا پھر ٹوکتی، پہنایا گیا ہے تو تمہیں پہنے رہو۔“

”میں اپنے لیے دوسرا بنا لوں گی۔ آپ کو مجھ سے زیادہ ضرورت ہے بلاؤں سے بچنے کی۔“ شہبانے کہا: ”کل ایک اچھا سا امام ضامن بھی بنا دوں گی، اسے بازو پر باندھ لیجیے گا۔“
یہ کہہ کر اس نے کپڑے میں لپٹا ہوا ناشتے دان مجھے دیتے ہوئے کہا:

”اس میں سوئے والا مٹر پلاؤ ہے۔ ناشتے دان کپڑے سے اچھی طرح باندھ دیا ہے، گھر تک ٹھنڈا نہیں ہوگا۔ پہنچ کر فوراً کھا لیجیے گا۔“

”تعویذ تو میں پہن لوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن یہ ناشتے دان نہیں لے جاؤں گا۔ بس ایک دن ہو گیا۔ روز روز اچھا نہیں لگتا۔“

”جانتے ہیں یہ میں نے آپ کے لیے کیوں پکایا ہے۔“
میں چپ رہا۔

”جو کھانے آپ کی ماں کو پسند تھے وہ کھائیں گے تو ماں آپ کو یاد آتی رہیں گی۔“
”لیکن..... اچھا ایسا کرو سامان میں لا کر دے دیا کروں پکا تم دیا کرو۔“

”یہ کام تو سلیمن بھی کر سکتی ہے۔ آپ نہیں لے جانا چاہتے نہ لے جائیے۔“
شہبا کے چہرے پر دکھ بھی تھا اور ناگواری بھی۔ مجھے فوراً حکیم صاحب کی بات یاد آئی:

”بھیس لگنے سے آگینے ٹوٹ جاتے ہیں۔“
میں نے ناشتے دان اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا: ”تمہارا دل دکھا ہو تو مجھے معاف کر دینا۔ میں گھر پہنچتے ہی پلاؤ کھاؤں گا۔“

شہبا کا پکایا ہوا پلاؤ واقعی بہت مزے کا تھا۔ میں نے اسے مزے لے لے کر کھایا اور جب اپنے بستر پر لیٹا تو میری آنکھوں میں شہبا کی وہ آنکھیں گھومنے لگیں جو دوا لیتے وقت مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے ان آنکھوں میں بہت کچھ پڑھ لیا تھا۔ شکرگزاری کے پردے میں ایک یقین تھا کسی کے ساتھ محفوظ رہنے کا۔

شہبا کی آنکھیں جب میری آنکھوں سے اوجھل ہوئیں تو میں نے سوچا: دیکھنے کے لیے اب کتابیں بہت کم رہ گئی ہیں۔ اگر مسودہ انہیں بچی ہوئی کتابوں میں ہے تو کل پرسوں میں مل جائے گا۔ اس کے بعد؟ حویلی جا کر میں اس کمرے میں دیر دیر تک کیسے بیٹھوں گا۔ پھر میں نے سوچا اگر مسودہ مل گیا تو میں جہاں دار بیگم سے یہی کہوں گا کہ ابھی نہیں ملا ساری کتابیں پھر سے دیکھنا پڑیں گی تاکہ میں اس کمرے میں بیٹھ کر دیر دیر تک شہبا سے باتیں کر سکوں۔ لیکن اسی کے ساتھ میں نے یہ بھی سوچا کیا شہبا میرے اس جھوٹ میں شریک ہوگی۔ یہی سوچتے سوچتے مجھے نیند آ گئی۔

صبح دھوپ کے پوری طرح پھیل جانے کے بعد میں حویلی پہنچ کر جب کتابوں والے کمرے کی طرف گیا تو سلیمان مجھے دیکھتے ہی بولی:

”بٹیا سے بتادوں آپ آگئے ہیں، کہا تھا آجائیں تو بتا دینا۔“

”تھوڑی ہی دیر بعد شہبا چائے لے کر آگئی اور اس کے ساتھ دوا بلے ہوئے انڈے بھی۔“

میں نے اس کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا تو بولی:

”اماں کہتی تھیں صبح کو انڈے ضرور کھانا چاہئے، بڑی غذائیت ہوتی ہے ان میں۔“

میں کچھ نہیں بولا۔ چائے پینے اور انڈے کھانے کے بعد میں نے شہبا سے کہا:

”کتابیں بہت کم رہ گئی ہیں۔ ایک آدھ دن میں شاید وہ کتاب مل جائے پھر یہاں میں

کس بہانے سے آؤں گا۔“ یہ سن کر شہبا بولی: ”خالہ نے آپ کے آنے پر روک تھوڑی لگائی

ہے۔ وہ تو چاہتی ہیں آپ یہیں رہیں۔“ اس کی اس بات پر میں نے کہا:

”خالہ کئی بار پوچھ چکی ہیں۔“

”کیا پوچھ چکی ہیں۔“

”یہی کہ کتاب مل جانے کے بعد بھی آتے رہو گے۔“

”آپ نے کیا کہا؟“

”میں نے کہا آتا رہوں گا، لیکن یہاں رہوں گا نہیں۔“ یہ کہہ کر میں نے شہبا کو بتایا:
”لیکن کتاب ملنے کے بعد آؤں گا تو دیر تک یہاں رکنا ٹھیک نہیں۔“ کچھ دیر خاموش
رہنے کے بعد میں نے کہا: ”کتاب مل جانے کے بعد میں خالہ سے یہی کہوں گا کہ ابھی نہیں
ملی۔ کتابوں کو پھر سے دیکھنا پڑے گا۔“

”نہیں یہ ٹھیک نہیں ہے۔ میں آپ کو پورا جھوٹ نہیں بولنے دوں گی۔“
”پھر؟“

”کتاب مل جانے کے بعد آپ خالہ سے کہیں.....“
”کیا کہیں؟“

”اس کتاب میں کچھ ایسی باتیں ہیں جن کے لیے مرزا صاحب کی دوسری کتابیں دیکھنا
پڑیں گی۔ اور یہ غلط بھی نہیں ہے۔“
”تم ٹھیک کہتی ہو۔ جن حکیم صاحب سے میں دوا لینے جاتا ہوں، انہوں نے بتایا تھا
مرزا صاحب بہت عمدہ طبیب تھے اور مجرب نسخوں کی پوری ایک بیاض تھی ان کے پاس۔“ میں
نے کہا: ”ابھی وہ بیاض نہیں ملی ہے۔ ممکن ہے نظر میں آنے سے رہ گئی ہو۔ میں خالہ سے کہوں
گا وہ کتاب بھی ڈھونڈنا ضروری ہے۔“

”ہاں اس طرح آپ کو خاصا وقت مل جائے گا۔“

”اچھا سنو!“ کتاب ڈھونڈنے کا کام اب میں اکیلے ہی کروں گا۔“ میں نے کہا۔
”جیسے کرتا رہا ہوں۔“

”کیوں؟“

”تمہارا بہت نقصان ہو رہا ہے۔“

”کیا نقصان ہو رہا ہے۔“

”لفافوں اور پتنگوں والا کام نہیں ہو پاتا۔“

”اس کی فکر مت کیجیے۔ وہ میں رات میں کر لیتی ہوں۔“ شہبا نے کہا۔ پھر بولی:

”ایک بات کہوں۔“

”کہو“

”کتاب ہم لوگ ساتھ ساتھ ڈھونڈ رہے ہیں لیکن وہ ملے گی مجھی کو۔“

اس کی یہ بات سن کر میں ہنس دیا۔

”ہنسیے نہیں۔ جب سے میں اس کام میں آپ کے ساتھ لگی ہوں مجھے ایسا ہی لگ رہا ہے۔“

”اچھا ایک بات اور۔“

”کہئے۔“

”ایسا کرو یہ لفافوں اور پتنگوں والا کام مجھے سکھا دو، میں رات میں گھر پر بناؤں گا، صبح

تمہیں لا کر دے دیا کروں گا۔“

”نہیں آپ جو کام کر رہے ہیں وہی کیجیے۔ پتنگیں اور لفافے مجھی کو بنانے دیجیے۔ میں

کسی اور کی مزدوری کیوں لوں۔“ یہ کہہ کر شہبانے پوچھا:

”ویسے کتاب ڈھونڈنے سے پہلے آپ کرتے کیا تھے؟“

”آوارہ گردی۔“

”مذاق مت کیجیے۔ بتائیے کیا کرتے تھے۔“

”ماں کے مرنے کے بعد بہت دن لاخیروں کی زندگی گزاری پھر.....“

”پھر؟“

”ایک رجواڑے میں نوکری کر لی۔ منشی گیری کی۔ کتاب ڈھونڈنے کے چکر میں اسے

چھوڑ دیا۔“ میں نے شہبا کو بتایا۔ پھر کہا: ”یہ کام ہو جائے تو کوئی اور کام پکڑوں۔“

”کام کے لیے پریشان مت ہوں۔“

”روٹی کیسے چلے گی۔“

”اللہ پر بھروسہ رکھیے۔ کوئی نہ کوئی انتظام ہو جائے گا۔ چلیے اب کتاب ڈھونڈیں۔“ یہ

کہہ کر اس نے کتابیں اٹھانا شروع کر دیں۔ کتابیں دیکھتے دیکھتے بولی:

”بہت اچھی کتابیں ہیں۔ میں ان میں سے ایک ایک کتاب روز لے جا کر پڑھوں گی۔“

”ضرور۔“

ہم کتاب کم ڈھونڈ رہے تھے باتیں زیادہ کر رہے تھے۔ اسی میں دوپہر ہو گئی۔ شہبا اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں کھانا کھانے کے لیے جہاندار بیگم کی طرف آ گیا۔ کھانے پر جہاندار بیگم نے مجھے بتایا:

”اس لڑکی کا جی لگ گیا ہے اس حویلی میں۔“

”یہ تو اچھا ہے۔“

”میرا بہت خیال رکھتی ہے۔ کئی بار آ کر حال پوچھتی ہے۔“ جہاندار بیگم نے کہا۔ ”دوا خود دینے لگی ہے، سلیمین کو منع کر دیا ہے۔ رات میں دیر تک میرا سر دباتی ہے اور جب تک مجھے نیند نہیں آتی سر ہانے سے بڑتی نہیں۔ بڑی خدمت گزار ہے۔“ پھر میری طرف دیکھ کر بولیں:

”تمہاری دلہن میں بھی ایسے ہی گن ہونا چاہیے۔ تمہاری ماں نے بہت نازوں سے پالا ہے تمہیں۔“ یہ کہہ کر بولیں: ”بیوی ایسی آئے جو تمہاری ہر بات کا خیال رکھے۔“

میں چپ چاپ جہاندار بیگم کی باتیں سنتا رہا۔ کھانا ختم ہونے کے بعد میں کتابوں والے کمرے میں آ گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد شہبا بھی آ گئی۔ سہ پہر سے پہلے پہلے ہم نے بہت سی کتابیں دیکھ ڈالیں پھر شہبا چائے بنانے چلی گئی اور میں ہاتھ روک کر آرام کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد شہبا چائے لے کر آ گئی اور پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی:

”میرا دل کہتا ہے آج وہ کتاب مل جائے گی۔“

یہ کہہ کر اس نے میری چائے ختم ہونے کا انتظار کیے بغیر کتابیں دیکھنا شروع کر دیں۔ چار چھ کتابیں دیکھنے کے بعد اس نے خاک سے اٹی ہوئی بڑے سائز کی ایک بہت خوبصورت جلد والی کتاب اٹھا کر اس کی گرد کو اپنی چادر کے ایک کونے سے پونچھنا شروع کر دیا۔ پھر بہت خوبصورت خط میں لکھے ہوئے اس کے الفاظ پڑھ کر اچھل پڑی:

”یہی ہے، یہی ہے شاید۔ لیجیے مل گئی۔“

میں نے فوراً کتاب اس کے ہاتھ سے لے لی اور دھڑکتے ہوئے دل سے اس پر لکھی ہوئی خوشنما عبارت کو پڑھنا شروع کیا۔ جلی حروف میں اس کی پیشانی پر لکھا تھا:

کہانی امراؤ جان کی

پھر قوسین میں یہ عبارت تھی:

(قصہ ایک شریف زادی کے طوائف بن جانے کا)

اس کے نیچے واوین میں لکھا تھا:

”میں یعنی مرزا محمد ہادی رسوا اس ناول کے پڑھنے والوں کے سامنے لکھنؤ کی ایک سچی اور اصلی کہانی پیش کر رہا ہوں۔ یہ کہانی ایک بڑے رئیس کی حویلی سے ایک کمسن بچی کے غائب ہو جانے اور کوٹھے پر پہنچ کر ایک مشہور طوائف بن جانے کی ہے۔

صاحبو! میں اس کہانی کو ہرگز نہ لکھتا اگر اس میں حزن و الم کے مرتفع موجود نہ ہوتے۔ اس کے لکھنے کا مقصود یہ بتانا ہے کہ حویلیوں اور محلوں کی تہذیب جگہیں بدل جانے کے باوجود اپنی شکل نہیں بدلتی اور اس کا مقصود یہ دکھانا بھی ہے کہ اصالت کے قامت پر شرافت کا جامہ ہمیشہ قائم رہتا ہے۔

غدر کے بعد لکھنؤ میں جو کچھ ہوا اور جس طرح ہوا قارئین اس قصے میں پڑھیں اور عبرت حاصل کریں۔“

قصہ نویس

مرزا محمد ہادی المتخلص بہ رسوا

میں اس عبارت کو جوش میں آ کر زور زور سے پڑھ رہا تھا اور جیسے جیسے میں اسے پڑھتا جا رہا تھا ویسے ویسے شہبا کی آنکھیں چمکتی جا رہی تھیں۔ خوشی سے بھری ہوئی اپنی آنکھوں سے جب میں نے شہبا کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں دکھ بھی تھا اور شادمانی بھی۔ اس نے تھوڑے دکھ اور تھوڑی خوشی والے لہجے میں کہا:

”آپ کی اتنے دنوں کی محنت کام آئی۔ مبارک ہو۔“ پھر بولی: ”مگر جو میں نے کہا تھا وہی ہوا۔ کتاب مجھی کو ملی آپ کو نہیں۔“ پھر کتاب میرے ہاتھ سے چھینتے ہوئے کہا:

”اسی لیے اسے پڑھنے کا پہلا حق میرا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے کتاب کے ورق الٹنا شروع کر دیے۔ میں اس کتاب کی عبارت پڑھنے کے لیے شہبا کے اتنا قریب آ گیا کہ میرے اور اس کے شانے کے بیچ بس بال برابر کا فاصلہ رہ گیا۔ شہبا نے آنکھوں سے اس

فاصلے کو دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ پوری کتاب بہت روشن خط میں لکھی ہوئی تھی۔ بہت سڈول حروف جیسے نستعلیق والے خط میں ہوتے ہیں۔ جہاندار بیگم بتا چکی تھیں کہ مرزا صاحب کا خط بہت عمدہ تھا۔ ادھر ادھر سے ورق الٹنے کے بعد جب شہباز نے کتاب اپنے پہلو میں رکھی تو میں نے اس سے کہا:

”اتنی محنت اور اتنے انتظار کے بعد یہ کتاب ملی ہے۔ میں اس میں لکھے ہوئے کو جاننے کے لیے بہت بے چین تھا۔ اب اسے پہلے تم پڑھنا چاہتی ہو تو پڑھو۔“

”میں آپ کی بے چینی سمجھتی ہوں، لیکن میں اسے پہلے کیوں پڑھنا چاہتی ہوں، بعد میں بتاؤں گی۔“ شہباز نے کہا: ”شام ہونے والی ہے۔ اب آپ گھر جائیے۔ میں کوشش کروں گی اسے جلد سے جلد پڑھ ڈالوں اور آپ کو بتاؤں کہ چھپی ہوئی اور ہاتھ کی لکھی ہوئی اس کتاب میں کہاں کہاں فرق ہے۔“

چلنے سے پہلے میں نے شہباز کو تاکید کی کہ کتاب ملنے کی بات خالہ کو نہ بتائے۔



میں نہ چاہتے ہوئے بھی کتاب شہباز کے پاس چھوڑ کر چلا آیا۔ رات میں جب بھی میری آنکھ کھلتی میں یہی سوچتا جو مسودہ ملا ہے اس میں کیا ہوگا اور یہ بھی سوچتا شہباز نے اسے پہلے پڑھنے کی ضد کیوں کی۔ میں جلد سے جلد جاننا چاہتا تھا کہ امراؤ جان فیض علی کے نکاح میں آئی تھیں یا نہیں، اگر آئی تھیں تو فیض علی سے کوئی اولاد ہوئی یا نہیں۔ اگر ایسا ہے تو مجھے ایک دوسری مہم پر نکلنا ہوگا۔ مجھے معلوم کرنا ہوگا کہ امراؤ جان کانپور سے لکھنؤ آ کر کہاں رہی تھیں۔ وہ ٹھکانہ چوک میں تھا یا چوک کے حدود سے باہر اور یہ کہ روپوشی کی زندگی میں کیا انہوں نے ناچنے گانے سے تعلق رکھا اور کیا اپنی اولاد کو بھی ناچ گانا سکھایا۔ یہ سب باتیں معلوم کرنے کے لیے مجھے بہت وقت چاہیے تھا۔ کل میں شہباز سے کہوں گا وہ پڑھنے اور ملان کرنے کا کام جلد کر ڈالے۔

صبح میں اٹھا تو میں نے محسوس کیا میرے سر سے بہت دنوں کا بوجھ اتر گیا ہے۔ مسودے کو ڈھونڈنے کی فکر نے مجھے بہت پریشان کر رکھا تھا۔ میں نے طے کیا میں کچھ دن گھر ہی پر رہوں گا، اس بیچ شہباز دونوں کتابیں پڑھ لے گی اور مجھے پتہ چل جائے گا کہ اصل مسودے میں کیا کیا

بدلا ہوا ہے۔ گھر پر گزارے ہوئے دنوں میں مجھے شہباز اور جہاندار بیگم کا بار بار خیال آیا۔ میں نے سوچا بتائے بغیر میرے غائب ہو جانے سے دونوں بہت پریشان ہو رہے ہوں گے۔ جہاندار بیگم..... شہباز اور سلیمین دونوں سے پوچھتی ہوں گی کہ بھیا اچانک کہاں غائب ہو گئے۔ گھر پر پڑے پڑے کئی بار میرا جی چاہا میں حویلی ہو آؤں لیکن یہ سوچ کر نہیں گیا کہ کیا تو شہباز سے دیر دیر تک باتیں ہوں گی اور کتابوں کو پڑھنے اور ملانے کے کام میں خلل پیدا ہوگا۔ میں نے طے کر لیا تھا اب میں اسی دن جاؤں گا جس دن مجھے جہاندار بیگم کی دوا لانا ہوگی۔

○

آج جہاندار بیگم کی دوا لانے کا دن تھا سو میں دھوپ کے پوری طرح پھلتے ہی ان کی حویلی کی طرف چل پڑا اور حویلی پہنچتے ہی وہی ہوا جیسا میں نے سوچا تھا۔ سلیمین مجھے دیکھتے ہی بولی: ”واہ بھیا آپ بھی خوب ہیں۔ بغیر بتائے غائب ہو جاتے ہیں۔ بیگم صاحب اور بیٹا تھک گئیں پوچھ پوچھ کر۔“ یہ کہہ کر بولی: ”آپ کو پتہ نہیں بیگم صاحب کتنا چاہتی ہیں آپ کو۔ ایک دن نہ آئیں یادیر سے آئیں تو دالان میں ٹہلنے لگتی ہیں۔ بیٹا بھی دن میں کئی کئی بار پوچھتی تھیں۔ کل مجھ سے کہنے لگیں بوا آپ کو معلوم ہے کہاں رہتے ہیں۔ جا کر دیکھیے تو کس حال میں ہیں۔ میں نے کہا وہ اپنا ٹھکانہ کسی کو نہیں بتاتے۔ پہلے بھی اسی طرح چلے گئے تھے۔ دو چار دن کے لیے کہہ کر گئے تھے اور آئے کئی دن بعد۔“ سلیمین کہتی چلی گئی پھر دھیمی آواز میں بولی: ”پہلے بیٹا کو صورت دکھا دیجیے پھر بیگم صاحب کی طرف جائیے۔ کل سے کئی بار کہہ چکی ہیں آئیں تو پہلے میری طرف بھیجنا۔“

میں شہباز کی طرف گیا اور چپکے چپکے قدم بڑھاتا ہوا جب برآمدے میں داخل ہوا تو دیکھا وہ مسودہ پڑھ رہی ہے اور ایک کاپی پر کچھ لکھتی جا رہی ہے۔ میں نے کمرے میں داخل ہو کر کھنکھار تو مجھے دیکھتے ہی وہ تیزی سے اٹھی اور چادر سر پر ڈالتے ہوئے بولی:

”کہاں رہے اتنے دن۔ بتا تو دیا ہوتا دو چار دن نہیں آئیں گے۔ خالہ پریشان، میں الجھن میں، بوا کو فکر۔ کہہ رہی تھیں بھیا ایک دن نہیں آتے تو اچھا نہیں لگتا۔“

یہ کہہ کر تھوڑی سی ناگواری کے ساتھ بولی: ”اور خالہ..... وہ تو بہت ناراض..... کل میں ان کی طرف گئی تو بولیں: ”بھیا کی یہ عادت اچھی نہیں۔ بتائے بغیر غائب ہو جاتے ہیں۔“

شہبا کہتی رہی میں سنتا رہا۔ یہ سب کہنے کے بعد اس نے کہا:
 ”اچھا اب آپ خالہ کی طرف جائیے۔ اٹھتے ہی بوا سے پوچھنا شروع کر دیا ہوگا۔ اُن
 سے مل کر کمرے میں آئیے، میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ یہ کہنے کے بعد طاق میں رکھی ہوئی
 ایک رکابی اٹھا کر بولی: ”یہ برنی چکھ لیجیے۔ میں روز اس پر مولا مشکل کشا کی نذر دیتی تھی۔“ پھر
 اُسی ڈبے سے جس سے تعویذ نکالا تھا سبز پٹی والا امام ضامن نکال کر بولی: ”آستین لیٹے میں
 اسے بازو پر باندھ دوں۔“ امام ضامن باندھ کر اس نے کہا:

”اب بتا کر جائیے گا کتنے دن نہیں آئیں گے۔“

کچھ دیر خاموش رہ کر میں نے پوچھا: ”مسودہ پڑھ ڈالا؟“

”تھوڑا سا رہ گیا ہے۔ اس میں تو بہت کچھ بدلا ہوا ہے۔ کمرے پر پہنچے، وہیں

آ کر بتاتی ہوں۔“

شہبا کے کمرے سے نکل کر میں جہاندار بیگم کی طرف جانے کے بجائے سلیمین کے پاس
 آیا اور اس سے کہا: ”بیگم صاحب سے بتا دو میں آ گیا ہوں اور انہیں کی طرف آ رہا ہوں۔“
 اور اس سے پہلے کہ سلیمین جہاندار بیگم کو یہ بات بتا کر صحیحی سے باہر نکلتی میں ان کے
 سامنے پہنچ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ غصے سے بولیں:

”یہ کیا وتیرہ بنا رکھا ہے تم نے۔ پہلے بھی اسی طرح غائب ہو گئے تھے اور اس بار بھی بتا کر
 نہیں گئے۔“ میں چپ رہا۔ وہ اپنے غصے کو روکنے کے لیے کچھ دیر خاموش رہیں۔ پھر بولیں:

”اب کھڑے کیوں ہو، بیٹھو۔ آج نہ آتے تو میں سلیمین کو دوڑاتی تمہیں ڈھونڈ کر لائے۔“

یہ کہہ کر محبت بھرے لہجے میں کہا: ”اب نہ غائب ہونا اتنے دن کے لیے۔“ پھر میری

آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا:

”میری کوئی بات بری لگی۔“

”جی نہیں۔“

”شہبا سے کچھ کہا سنی ہوئی۔ مجھے لگتا نہیں وہ ایسی لڑکی ہے۔“

”نہیں بالکل نہیں وہ تو.....“

”بہت خیال رکھتی ہے تمہارا۔ مجھے معلوم ہے۔“ جہاندار بیگم نے کہا۔ پھر کہا:

”ہم تینوں میں ایک بات ایک سی ہے۔“
”وہ کیا؟“

”تینوں اکیلے ہیں۔ میں اس بہت بڑی حویلی میں اکیلی۔ تم اپنے ٹھکانے پر اکیلے اور بٹیا پہلے بھی اکیلی تھی اور اب بھی اکیلی۔“ یہ کہہ کر انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا: ”اب ہم تینوں کی خوشی اسی میں ہے کہ ایک دوسرے کی نگاہوں کے سامنے رہیں۔“
”آج آپ کی دوا آنا ہے۔“ میں نے بات کا رخ بدلا۔
”تو اسی لیے آئے ہو؟“

”نہیں۔ کل آپ میرے خواب میں آئی تھیں۔“
”کیا دیکھا خواب میں۔“

”کچھ لوگ آپ کو یہاں سے کسی اور ٹھکانے پر لیے جا رہے تھے۔“
”دن ہمارے پورے ہو گئے شاید۔“
”ایسا مت کہیے۔“

”آگے کیا دیکھا۔“

”میں دوڑ کر آپ سے لپٹ گیا۔“
”پھر؟“

”اُن لوگوں نے بڑی بے رحمی سے مجھ کو آپ سے الگ کر دیا۔“
”پھر؟“

”میری آنکھ کھل گئی اور میں صبح ہوتے ہی ادھر چلا آیا۔ آپ کے پاس۔“
”ڈرو نہیں۔“ وہ بولیں۔ ”کوئی اتنی آسانی سے مجھے تم سے الگ نہیں کر سکتا۔ خوابوں کی تعبیر الٹی ہوتی ہے۔“ یہ کہتے وقت جہاندار بیگم کے چہرے کی زردی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر چپ رہیں پھر کہا: ”اچھا اب جاؤ اپنا کام کرو۔ اتنے دن غائب نہ ہوئے ہوتے تو کتاب مل گئی ہوتی اب تک۔“ اور اس سے پہلے کہ میں اُن سے اٹھنے کی اجازت لیتا وہ بولیں:
”اور ہو سکے تو آج بٹیا کو دن کے کھانے کے لیے راضی کر لینا۔ اتنے دن بعد آئے ہو، تینوں ایک ساتھ کھائیں گے تو اچھا لگے گا۔“

میں جہاندار بیگم سے کچھ کہے بغیر کتابوں والے کمرے میں چلا آیا۔ شہباز نے مجھے کمرے کی طرف جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا اس لیے وہ فوراً چائے لے کر آ گئی۔ کمرے میں اس کے آتے ہی میں نے بہت بے صبری سے پوچھا: ”تو کیا کیا بدلا ہوا ہے اس کتاب میں۔“

”بہت کچھ۔ میں نے، جہاں جہاں فرق ہے، اس کاپی میں لکھ دیا ہے۔“ شہباز نے کہا۔

”اور اسی کے پہلو میں چھپی ہوئی کتاب کی عبارت بھی لکھ دی ہے تاکہ آپ کو فوراً معلوم ہو جائے کہاں کہاں کیا کیا بدلا ہوا ہے۔“

یہ بتا کر وہ بولی: ”لیکن ابھی کچھ صفحے باقی رہ گئے ہیں۔ آج رات میں وہ بھی پڑھ لوں گی۔ اس لیے آپ اسے کل لیجیے گا۔“ پھر اس نے پوچھا:

”یہ آپ اچانک غائب کیوں ہو گئے تھے؟“

”بات یہ ہے اماں کو ہماری اختلاج کا مرض تھا۔“

”تو؟“

”بیٹھے بیٹھے رونے لگتی تھیں۔ ہم پوچھتے اماں آپ کیوں رو رہی ہیں تو کہتیں سب یاد آرہے ہیں۔ میں پوچھتا سب کون تو بتاتیں جو ہم سے قریب تھے اور جو اللہ کو پیارے ہو گئے۔“

”تو اس کا آپ کے غائب ہو جانے سے کیا تعلق ہے۔“

”مجھے بھی جب..... سب یاد آنے لگتے ہیں تو خوب رونے کو جی چاہتا ہے اور.....“

”اور.....“

”میں چاہتا ہوں مجھے روتا ہوا کوئی اور نہ دیکھے۔ ایسے وقتوں میں میں سب سے الگ ہو جاتا ہوں۔“

شہباز یہ سن کر خاموش رہی۔ پھر بہت آہستہ سے بولی: ”میں جا رہی ہوں۔“

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھ پر بھی ایسا ہی وقت آ پڑا ہے۔ کچھ دیر کے لیے میں بھی سب سے الگ رہنا چاہتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

دوپہر ہوتے ہی میں نے سلیمین کو بلایا اور اس سے کہا: ”بٹیا کے پاس چلی جاؤ اور میری طرف سے کہو آج ہم ساتھ کھانا کھائیں گے۔“

کچھ دیر بعد سلیمین نے آ کر بتایا: ”بٹیا نے دروازہ اندر سے بند کر رکھا ہے۔ کھٹکھٹانے پر بہت دیر تو بولیں نہیں پھر جب میں نے اونچی آواز میں آپ کی کہی ہوئی بات کہی تو بہت دھیمی آواز میں جواب دیا:

”کہہ دو آج ہماری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ہمیں معاف کر دیں کل آجائیں گے۔“
یہ سن کر میں بہت پریشان ہوا۔ میں نے سوچا کھانے پر جہاندار بیگم مجھ سے پوچھیں گی تو میں کیا کہوں گا۔ میں دالان میں جیسے ہی داخل ہوا انہوں نے مجھ سے پوچھا:

”بٹیا آ رہی ہے۔ تم نے اسے بتا دیا۔“
”بتا دیا لیکن ان کی طبیعت آج ٹھیک نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے آپ کی بات ان سے کہی تو بولیں خالہ سے کہیے گا آج کی معافی، آج کے بجائے کل۔“

یہ سن کر جہاندار بیگم بے چین سی ہوئیں لیکن کہا کچھ نہیں۔ دسترخوان پر ہم دونوں بڑی بے دلی سے نوالے اپنے منہ میں رکھ رہے تھے۔ کھانا ختم ہوتے ہی جہاندار بیگم کچھ آرام کرنے چلی گئیں اور میں کتابوں والے کمرے میں آ کر شام ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ کمرے میں بیٹھے بیٹھے کئی بار میرا جی چاہا میں شہبا کے کمرے کی طرف جا کر اس کا حال معلوم کروں۔ پھر سوچا آج اسے کمرے ہی میں رہنے دیا جائے۔

شام ہوتے ہی میں حکیم احمد رضا کے مطب کی طرف چل پڑا۔ دن کے کھانے پر جہاندار بیگم نے مجھے بتا دیا تھا حکیم صاحب سے کیا کہنا ہے۔ مطب پہنچ کر جب میں نے مریضوں کا نام پکارنے والے شخص سے بتایا کہ حکیم صاحب کو بتادے میں آ گیا ہوں تو وہ بولا:

”حکیم صاحب کو یاد ہے۔ کہا ہے سب مریضوں کے بعد بھیجنا۔“ پھر بولا:

”آپ چائے وغیرہ پیئیں تو میں لاؤں۔“

”نہیں۔ میں بیٹھا ہوں۔“

”مریض زیادہ نہیں ہیں۔ آپ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔“ اس نے کہا۔
حکیم صاحب مریضوں کو جلدی جلدی دیکھ رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد انہوں نے مجھے

اندر بلا لیا اور اسٹول پر بٹھاتے ہوئے مجھ سے پوچھا:

”کیسی ہیں بیگم صاحب؟“

”ٹھیک ہیں۔ آپ کی دوا سے طبیعت بگڑنے نہیں پائی۔“
 ”اور وہ بی بی جوان کے یہاں آ کر رہی ہیں، ان کی طبیعت کیسی ہے؟“
 ”ووو..... ان کی طبیعت کل سے کچھ ناساز ہے۔“
 ”خیر تو..... دوا تو میں نے طبیعت سنبھلنے والی دی تھی۔“
 ”کل سے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیے پڑی ہیں۔ بتائیں کچھ نہیں،
 کچھ اختلا جی کیفیت ہے۔“
 ”ایسا کیوں؟“
 ”مجھ سے بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔“ میں نے کہا۔ پھر انہیں بتایا: ”کچھ ان لوگوں کا ذکر
 آیا جو اس دنیا میں نہیں ہیں۔ پھر انہیں یاد کر کے رونے کا ذکر آیا۔ بس اسی وقت اٹھ کر چلی گئیں
 اور اسی وقت سے ان کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند ہے۔“
 ”ہوں..... اب ان کے سامنے ایسی باتیں مت کیجیے گا۔ اس مرض کا ہمارے
 پاس کوئی علاج نہیں۔“

”ایک بات آپ کو بتانا بھول گیا۔“ میں نے کہا۔ ”وہ مسودہ مل گیا۔“
 ”اچھا!!..... مبارک ہو۔ کیا نکلا اس میں؟“
 ”ابھی میں نے دیکھا نہیں ہے۔ شہباز سے ڈھونڈنے میں میرا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ ڈھونڈتے
 وقت وہ انہیں کے ہاتھ لگا۔“ یہ بتا کر میں نے حکیم صاحب کو بتایا: ”کتاب ہاتھ میں آتے ہی انہوں
 نے ضد کی پہلے میں پڑھوں گی۔ جب میں نے کہا میں اس میں لکھے ہوئے کو جاننے کے لیے بے
 چین ہوں تو بولیں میں اسے پہلے کیوں پڑھنا چاہتی ہوں بعد میں بتاؤں گی۔“
 ”ہوں.....“ اس لمبی ہوں کے بعد حکیم صاحب کہیں کھو گئے۔ کچھ دیر بعد بولے:
 ”حکمت الدولہ حکیم مرزا مہدی کی تیسری پشت کے ایک بگڑے ہوئے رئیس
 زادے نواب سلطان بہادر عرف چھوٹے نواب نوجوانی میں کوٹھوں پر جانے لگے۔ گھر پر
 بھی ناچ رنگ کی محفل سجاتے۔“ اتنا کہہ کر حکیم صاحب رکے پھر بولے: ”قصہ بہت درد
 بھرا ہے..... تو ان رئیس زادے نے ان بی بی کی ماں مسماۃ صہبا خانم کو ایک دن کوٹھے
 سے اپنے یہاں لا کر رکھ لیا..... صہبا خانم کی بھی عجیب کہانی ہے۔“ حکیم صاحب پھر

رکے۔ پھر بولے: ”کوٹھے پر وہ کس طرح پہنچیں یہ کسی کو نہیں معلوم لیکن کسی کسی کو یہ ضرور معلوم ہے کہ وہ بھی کسی اونچے خاندان کی عورت تھیں۔ سلطان بہادر کے والد نے ان بی بی کی ماں سے تو کچھ نہیں کہا لیکن اپنے بیٹے کو.....“

”عاق کر دیا۔“ میں نے حکیم صاحب کا جملہ پورا کر دیا۔

”آپ کو کیسے معلوم؟“

”خود شہبانے بتایا اور یہ بھی کہا پورا قصہ کسی اور وقت بتاؤں گی۔“

”تو انہوں نے کتاب پہلے پڑھنے کی ضد کیوں کی اب سمجھے آپ؟“

”نہیں۔ نہیں سمجھا۔“

”اس کتاب میں انہیں اپنی ماں کے بارے میں بھی کچھ مل جانے کی امید ہوگی۔ صہبا

خانم نے اپنی بیٹی کو سب کچھ تو بتایا نہیں ہوگا۔“ حکیم صاحب بولے۔ ”یہ بی بی سوچتی ہوں گی اور صحیح سوچتی ہوں گی کہ ایک ہی پیشے میں ہونے کی وجہ سے ممکن ہے.....“

”ممکن ہے.....؟“

”مرزا صاحب نے امراؤ جان کے ساتھ ان کی ماں کا بھی حال احوال لکھا ہو۔“ پھر

بات بدلتے ہوئے حکیم صاحب نے کہا: ”اچھا اب ان باتوں کو چھوڑیے۔ اب وہ سنیے جو میں

کہنے جا رہا ہوں۔“

”جی سنائیے۔“

”کل یہاں ایک صاحب آئے تھے، آپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔“

”کیا پوچھ رہے تھے۔“

”کوئی صاحب جہاندار بیگم کی دوا لینے آتے ہیں آپ سے؟“

”آپ نے کیا کہا؟“

”میں نے کہا آتے ہیں لیکن آپ انہیں کیوں پوچھ رہے ہیں اس پر وہ بولے یہ صاحب

اس حویلی پر قبضہ کرنے کی غرض سے وہاں گھے ہیں۔“ حکیم صاحب نے آگے بتایا:

”کہہ رہے تھے ہماری خالہ جہاندار بیگم بہت بھولی ہیں۔ ان صاحب نے انہیں شیشے

میں اتار لیا ہے۔“

”تو آپ نے ان سے کیا کہا؟“

”میں نے کہا میں یہاں مرض بتانے اور اس کی دوا دینے بیٹھا ہوں۔ یہ باتیں سننے کے لیے نہیں۔“ حکیم صاحب نے کہا۔ ”سینے میں درد کا بہانہ بنا کر آئے تھے۔ مجھے کچھ دال میں کالا نظر آتا ہے۔“ پھر مجھے تاکید کرتے ہوئے کہا: ”ہوشیار رہیے۔ اور حکیم صاحب سے کہیے گا وہ بھی ہوشیار رہیں۔ یہ لکھنؤ ہے جعلی کاغذات کے ذریعے جائیداد ہتھیا لینے کے واقعات یہاں عام ہیں۔“

یہ کہہ کر مجھ سے پوچھا: ”آپ نے شیخ حیدر بخش کا نام سنا ہے؟“
”نہیں۔“

”لیجیے۔ آپ امر او جان کے اصل قصے کے پیچھے پڑے ہیں اور شیخ حیدر بخش کو نہیں جانتے۔“
”کون تھے؟“

”بہت بڑے جعلیے اور مرزا رسوا کے والد کے بہت قریبی دوست۔ سنا ہے تحویلات اور جعلی دستاویزیں تیار کر کے بڑی بڑی جائیدادیں ہڑپ لیں۔ اسی میں انہیں بہت لمبی سزا بھی ہوئی۔“ یہ بتا کر حکیم صاحب ر کے پھر بولے: ”اور یہ حیدر بخش بہت ماہر خطاط بھی تھے۔ اس ساری جعل سازی میں ان کی یہی خطاطی کام آتی تھی۔“ پھر حکیم صاحب نے مریضوں کا نام پکارنے والے شخص سے پانی منگوایا اور دو چار گھونٹ پی کر بولے:

”تو جو صاحب آئے تھے کہہ رہے تھے خالہ ہماری بے اولاد ہیں، کسی وجہ سے ہم لوگوں سے ناراض ہیں اس لیے تعلق ختم کر لیا ہے لیکن ان کے بعد اس حویلی کے وارث ہمیں ہیں۔“
”کہاں سے آئے تھے؟“

”مہدی گنج سے۔ بتاتے تھے داد یہاں ہماری عمدۃ الملک ذوالفقار جنگ کی ہے۔“

”آپ جانتے ہیں ان ذوالفقار جنگ کو؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ کبھی امداد حسین خاں کی کر بلا گئے ہیں۔“

”وہاں تو برابر جانا ہوتا ہے۔“

”امداد حسین خاں کو امجد علی شاہ کے عہد میں امین الدولہ عمدۃ الملک ذوالفقار جنگ کا خطاب ملا تھا اور مسند وزارت بھی۔ اپنے زمانے میں بڑا بدبہ تھا ان کا۔“ یہ کہہ کر حکیم صاحب

نے بہت دیر تک کچھ نہیں کہا اور میں نے بھی ان سے کچھ نہیں پوچھا۔ دونوں طرف کی اس خاموشی کو توڑنے کے لیے انہوں نے گلاس میں بچا ہوا پانی پیا، ایک لمبی سانس لے کر کرسی سے ٹپک لگائی۔ پھر بولے: ”بیگم صاحب کی وہی دوا دے رہا ہوں جو دی تھی اور بی بی کی دوا..... ان کی دلجوئی ہے۔“ پھر رنجیدہ ہوتے ہوئے بولے:

”یہ بہت ستائے ہوئے لوگ ہیں، ان کے دکھ میں شریک رہنا ہی ان کی دوا ہے۔ سمجھ گئے آپ؟“

”جی سمجھ گیا۔ لیکن مرزا رسوا..... ان کے بارے میں آپ جو بتانے والے تھے، بتایا نہیں۔“

”دور کے عزیز تھے ہمارے۔ بہت ذی علم اور اسی کے ساتھ بڑے دل پھینک۔ خوبیاں بہت تھیں لیکن عیب بھی ان میں کم نہیں تھے۔“

”کیا عیب تھے۔“

”خوش چشموں کو دیکھ کر.....“

”خود کو روک نہیں پاتے تھے۔ یہی کہنا چاہتے ہیں۔“

”یہی کہنا چاہتا ہوں۔ سنتے ہیں بہت سے گھروں میں جہاں لڑکیاں جوان ہونے لگی تھیں، ان کے آنے پر روک تھی۔“ یہ کہہ کر حکیم صاحب میری طرف دیکھ کر مسکرائے پھر بولے: ”میری اور آپ کی عمر میں بڑا فرق ہے لیکن آپ پوچھ رہے ہیں تو سب بتانا پڑ رہا ہے۔ کسی کالج میں.....“

”ایک خاتون کو اکیلا دیکھ کر بے قابو ہو گئے۔“

”جی۔ اور اُس اچھے ناک نقشے والی خاتون کے ساتھ وہ کرڈالا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ واللہ اعلم۔ لیکن..... امراؤ جان کو ٹوٹ کر چاہا اور امراؤ جان نے بھی ان کے ساتھ رہنے کی سوتسمیں کھائیں۔“

”بہت سے لوگ بتا چکے ہیں یہ قصہ۔“ میں نے کہا: ”لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔“

”وہ کیا؟“

”جس طرح شہبا کے والد سلطان بہادر نے صہبا خانم کو گھر میں لا کر رکھ لیا تھا، مرزا رسوا بھی امراؤ جان کو لا کر رکھ سکتے تھے۔“

”نہیں۔ مرزا صاحب نے عشق تو کیا لیکن اپنی آن بان کا سودا نہیں کیا۔ پھر
 انہیں ایک اور بیماری تھی۔“
 ”کون سی؟“

”شریف بنے رہنے کی۔ اب کوٹھے کے عشق اور دکھاوے کی شرافت کا میل تو
 ہو نہیں سکتا۔“ حکیم صاحب نے کہا۔ ”اسی اوڑھی ہوئی شرافت کو عام کرنے کے لیے پوری
 ایک ناول لکھ ڈالی انہوں نے۔“
 ”شریف زادہ۔“

”جی۔ اچھا بہت ہو گیا مرزا صاحب کے بارے میں۔ اب یہ دوا بیگم صاحب کی لے
 جائیں اور ہاں مرزا صاحب کی وہ علم طب والی کتابیں، وہ نہیں لائے آپ۔“
 ”بھول گیا۔ انشاء اللہ اگلی بار۔“

میں دوا لے کر چلنے لگا تو حکیم صاحب نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا:
 ”اور وہ دلجوئی والی بات یاد ہے آپ کو۔“
 ”یاد ہے۔“ یہ کہہ کر میں مطب سے باہر نکل آیا۔



حویلی واپس آ کر میں نے سلیمان سے پوچھا: ”بٹیا کمرے سے باہر نکلیں۔“ اس نے بتایا:
 ”نہیں بیگم صاحب نے مجھے دو تین بار اُن کی طرف بھیجا لیکن ہر بار انہوں نے یہی کہا آج
 ہم آرام کریں گے ہمیں معاف کریں۔“ میں نے جہاندار بیگم کی دوا سلیمان کو دیتے ہوئے کہا:
 ”بیگم صاحب سے کہنا دوا حکیم صاحب نے بدلی نہیں ہے، اسی سے آرام ملے گا مجھے گھر جلدی
 پہنچنا ہے کل آ کر سب بتاؤں گا۔“



آج میں کھانا کھائے بغیر سو گیا۔ بہت دیر تک تو مجھے نیند نہیں آئی۔ کروٹیں بدل بدل کر
 میں یہی سوچتا رہا کہ شہبا اپنے کمرے میں کس حال میں ہوگی۔ میں نے سوچا مجھے اپنے رونے
 کا ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن اسے یہ بتانا ضروری تھا کہ جن یاد آنے والی باتوں پر رونا آتا
 ہے، وہ یاد آئیں تو کسی اور طرح سے جی نہیں بہلایا جاسکتا۔ یہی سوچتے سوچتے مجھے نیند آ گئی

لیکن یہ اکہری نیند تھی اور اس میں طرح طرح کے خواب آرہے تھے۔ ان میں سے رات کے آخری پہر والے خواب میں میں نے دیکھا جہاندار بیگم کی حویلی کے آس پاس کے علاقے ویران ہیں اور ان کی حویلی کی اینٹیں اپنی جگہ سے کھسک رہی ہیں۔ پہلے میں نے حویلی کی بہت بڑی ڈیوڑھی کو گرتے دیکھا اور دیکھا جو لوگ اس کے ایک حصے میں رہ رہے تھے وہ اپنی جان بچا کر بھاگ رہے ہیں۔ اسی جان بچا کر بھاگنے میں وہ لڑکی جو مجھے جہاندار بیگم کے دالان تک لے گئی تھی، ڈیوڑھی کے گرتے ہوئے دروازے کی زد میں آ گئی۔ پھر میں نے دیکھا حویلی کے چمن کے سارے درخت جھلس گئے ہیں اور اس کے حوض کے اندر سے آگ کے شعلے اٹھ اٹھ کر اوپر آرہے ہیں اور اس کے بعد دیکھا کتابوں والے کمرے کی ساری کتابوں کے ورق اڑ اڑ کر ہوا میں بکھر رہے ہیں اور میں اور شہبا اڑتے ہوئے اوراق کو پکڑنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ جہاندار بیگم کے دالان کی چھت جگہ جگہ سے چٹ رہی ہے اور وہ پچی کے ہلتے ہوئے تخت پر اپنی جائداد کے کاغذوں والی پچی اپنے سینے سے لگائے بڑی تکلیف سے کروٹیں بدل رہی ہیں اور ان کی زبان سے عجیب عجیب لفظ نکل رہے ہیں: اچکن، شیروانی، بھیا، شادی، اٹھیا کے باغ، کالے پہاڑوں والی زمین۔ میں دالان کی چھت سے کچھ کچھ دیر بعد گرنے والے بلے سے بچتا بچتا ان کے تخت کے پاس پہنچا اور پوچھا: خالہ آپ خیر سے تو ہیں۔ وہ بولیں: بی بی اپنے کمرے سے نکلیں، تم سے ناراض تو نہیں میں نے کہا نہیں خالہ وہ مجھ سے ناراض کیوں ہوں گی اس پر وہ بولیں: اُس کا خیال رکھنا، اُس دکھیا ری کا اس دنیا میں کوئی اور نہیں ہے۔ یہ پچی تمہیں دے کر جا رہی ہوں۔ تمہاری اچکن اور شیروانی دونوں سل کر آ گئی ہیں میں نے شہبا کو دکھائیں تو بولی: خالہ یہ مجھے دے دیجیے، دونوں چیزیں میں دوں گی انہیں۔ پھر میں نے دیکھا شہبا کے کمرے کی دیواریں بھی تین طرف سے ڈھے گئی ہیں اور وہ اس کمرے کے باہر ان چیزوں کے برباد ہو جانے پر بڑے افسوس میں ہے جو اس نے دکھ کے دنوں میں بڑے جتن سے جمع کی تھیں۔ پھر مجھے اُن شخصوں کی چھتیں اور دیواریں بھی گرتی ہوئی نظر آئیں جن میں جہاندار بیگم کے دوسرے ملازم رہ رہے تھے۔ میں یہ سب دیکھتا ہوا واپس جہاندار بیگم کی پچی میں پہنچا تو دیکھا وہ اپنے تخت پر بے جان پڑی ہیں اور کچھ لوگوں نے ایک صندوق اُن کے تخت کے پہلو میں لا کر رکھ دیا ہے۔ اور اسی کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔

کچھ دیر تک مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری رہی۔ جاگنے کے بعد بھی میں بستر پر آنکھ بند کیے پڑا رہا۔ بہت دیر بعد میں اٹھا اور ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر حویلی پہنچ گیا۔ سلیمان نے مجھے دیکھتے ہی خبر دی بٹیا اب ٹھیک ہیں، اپنے کمرے میں بیٹھی کچھ لکھ رہی ہیں۔ میں نے سلیمان سے کہا: ”ان سے بتادو میں آ گیا ہوں اور کتابوں والے کمرے میں ہوں۔“ میں کتابوں والے کمرے میں ابھی ٹھیک سے بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ شہبا آ گئی۔ میں نے اسے دیکھتے ہی پوچھا:

”طبیعت کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہے۔ میری وجہ سے آپ لوگ بہت پریشان ہوئے۔“

”پریشان تو ہوئے۔ حکیم صاحب کہہ رہے تھے اس مرض کا علاج ہمارے پاس نہیں ہے۔“

”کس مرض کا؟“

”یہ جو اکیلے رہنے والا مرض ہے۔“

”یہ تو آپ کو بھی ہے۔“ شہبا نے کہا۔ پھر بولی: ”کچھ گھڑیاں ایسی ہوتی ہیں جن

میں.....“ وہ کہتے کہتے رکی پھر بولی: ”آپ کو ان کے پاس بھی رہنا اچھا نہیں لگتا جنہیں آپ

بہت عزیز رکھتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ بولی: ”بس انہیں کے پاس بیٹھنا اچھا لگتا ہے.....“

”جو اس دنیا میں نہیں ہیں۔“

”جی۔“

”ایک بات پوچھوں۔“

”پوچھیے۔“

”ماں تم کو بہت یاد آتی ہیں؟“

”باپ بھی یاد آتے ہیں لیکن میں بہت چھوٹی تھی جب وہ اس دنیا سے اٹھ گئے۔ مجھے تو

ٹھیک سے ان کا چہرہ بھی یاد نہیں۔“ یہ کہنے کے بعد کچھ دیر خاموش رہ کر شہبا نے آگے کہا۔

”اور ماں کے ساتھ تو ہم بڑے ہوئے۔ ہمارے بڑے ہو جانے کے بعد بھی وہ ہمیں

اپنی گودی میں بٹھا کر کھلاتی رہیں۔ جب میں کہتی ماں اب میں بڑی ہو گئی ہوں تو کہتیں

دوسروں کے لیے تو بڑی ہوئی ہے میرے لیے تو ابھی دو ہی برس کی ہے۔ جب تک بستر سے

لگ نہیں گئیں نہ مجھ سے سرد بویا نہ میرے ہاتھ سے دوالی۔ ہمیشہ یہی کہتیں سرد بانے سے تیرے ہاتھ دکھ جائیں گے اور دواتو میں لے سکتی ہوں اپنی۔“

”ان کی موت کس طرح ہوئی۔“

”آپ کو بتا چکی ہوں۔ دے کا مرض تھا انہیں۔ ایک دن جب سردی بہت شدید تھی شام سے طبیعت بگڑنے لگی۔ بستر پر کبھی اس کروٹ لیٹتیں کبھی اس کروٹ پھر مجھ سے بولیں:

”پیٹھ سے تکیے لگا کر مجھے بٹھا دو جب میں نے پیٹھ سے تکیے لگا کر انہیں بٹھا دیا تو کہا:

”آج اذان کی آواز کانوں میں نہیں آئی کیا مغرب کا وقت ہو گیا۔ میں نے کہا اذان ہو چکی، کہنے لگیں سجدہ گاہ اور دعاؤں والی کتاب لے آؤ۔ یہ میری آخری نماز ہے۔ صبح کی اذان ہونے تک میں اس دنیا میں نہیں رہوں گی۔ میں نے کہا اماں کیسی باتیں کرتی ہیں تو کہا بیٹیا تمہیں نہیں معلوم موت مرنے والے کو بتا دیتی ہے میں آ رہی ہوں۔ میں نے سجدہ گاہ اور دعاؤں والی کتاب لا کر انہیں دی پھر انگلیٹھی میں کوئلے دہکا کر اسے ان کے قریب رکھ دیا۔ تکیوں سے لگے لگے انہوں نے نماز پڑھی پھر تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے دعاؤں والی کتاب کھولی اور جب نظر ان کی حروف پر نہیں جم سکی تو کہا بیٹیا ان دعاؤں کو اونچی آواز میں پڑھو اور ایک دو پارے بھی پڑھ کر مجھے سنا دو۔ سننے کا ثواب بھی اتنا ہی ہے جتنا پڑھنے کا۔ میں نے دعائیں اور پارے پڑھ کر انہیں سنائے۔ پارے اور دعائیں سن کر انہوں نے کہا اب یہ تکیے ہٹا دو میری مشکل آسان ہونے والی ہے۔ میں نے تکیے ہٹا کر انہیں لٹایا تو ان کی آواز ڈوبنے لگی۔ رات کا ایک پہر ہو چکا تھا میں دوڑی دوڑی پشت والی کربلا میں گئی اور وہاں کے حجروں میں رہنے والی اُن عورتوں کو جو ماتم مجلس میں ہمارے گھر آیا کرتی تھیں، بلا لائی۔ اُن عورتوں میں سے ایک بزرگ بی بی نے اماں کی نبض دیکھی، ان کے ماتھے پر ہاتھ رکھا پھر بولیں:

”یاسین پڑھنا شروع کرو۔ خدا ان کی مشکل آسان کرے۔“ آنے والوں میں سے ایک بی بی نے اماں کے سر ہانے بیٹھ کر یاسین پڑھنا شروع کر دی۔ صبح کی روشنی ہونے سے پہلے اماں کی آنکھ بند ہو گئی۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔ کربلا سے آنے والی انہیں بی بیوں نے ادھر ادھر سے پیسے جمع کر کے اماں کا جنازہ اٹھایا، اور اُن بی بیوں کے مردوں نے دور کی ایک کربلا میں لے جا کر انہیں دفن کر دیا۔ ہم تیسرے دن جب کچھ کچھ ہماری طبیعت سنبھلی، اُن کی قبر پر

گئے اور اس وقت تک وہاں بیٹھے رہے جب تک ہمیں وہاں سے اٹھا کر گھر نہیں لایا گیا۔ اماں کے مرنے کے دوسرے دن ہماری بغیا کے درختوں پر بہت پرندے آئے اور ان کی شاخوں پر دیر تک بیٹھے رہے۔ جب کر بلا والی بزرگ بی بی اماں کے مرنے والی جگہ پر قرآن پڑھنے آئیں تو میں نے انہیں بتایا خالہ آج ہمارے درختوں پر بہت پرندے آئے ہیں۔ وہ بولیں:

”یہ سب آسمانی فرشتے ہیں۔ صہبا خانم کے سارے گناہ معاف ہوئے۔“

شہبا اپنی ماں کی موت کا حال بتا رہی تھی اور میں صہبا خانم کو اپنے سامنے مرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ ماں کی موت کا پورا حال بتانے کے بعد وہ چپ ہو گئی۔ میں بھی بہت دیر تک کچھ نہیں بولا۔ بہت دیر بعد شہبا کی آواز میرے کانوں میں آئی:

”لفافوں اور پتنگوں والا کام روک کر میں نے بچے ہوئے صفحے بھی پڑھ ڈالے۔“

”ہوں۔“ میں نے بہت آہستہ سے کہا لیکن اس سے یہ نہیں پوچھا کہ ان صفحوں میں کیا لکھا ہے۔

”چائے بنا کر لاؤں۔“ شہبا نے پوچھا۔ ”میں نے جیسے ہی سنا آپ آئے ہیں دوڑی دوڑی ادھر چلی آئی۔ آپ کو یہ دکھانے کے میں اب ٹھیک ہوں۔“

میں کچھ بولے بغیر سر جھکائے بیٹھا رہا۔

”چپ کیوں ہیں، کچھ بولتے کیوں نہیں۔“

”تم نے کچھ دن پہلے کہا تھا لکھنؤ میں بہت سے قصے ایک جیسے ہیں۔“

”جی کہا تھا۔“

”اور یہاں موت کے منظر بھی ایک جیسے ہیں۔“

”مطلب؟“

”میری ماں کی بھی اسی طرح..... شام سے طبیعت بگڑی تھی۔ اسی طرح اُس کی بھی سانس اکھڑی تھی۔“ میں نے کہا: ”اس نے بھی نماز شب جو اس نے پوری زندگی نہیں چھوڑی، اسی طرح لیٹے لیٹے پڑھی تھی۔ اور صبح ہوتے ہوتے اسی طرح اس کا بھی دم نکلا تھا۔“

میرے یہ کہتے وقت شہبا کا ہاتھ میرے سر کی طرف بڑھا لیکن میرے بالوں میں الجھنے سے پہلے اس نے اسے واپس کھینچ لیا۔

”میں چائے بنا کر لاتی ہوں، آج ہم کوئی کام نہیں کریں گے۔“ شہباز نے کہا اور یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں ایک دوسرے سے بات کیے بغیر چائے پینے لگے۔ بہت دیر تک ہم نے کوئی بات نہیں کی۔ جب کھانے کا وقت قریب آنے لگا تو شہباز نے کہا:

”اٹھیے ہم سب آج ساتھ کھانا کھائیں گے۔“

اور پھر ہم تینوں ایک ساتھ دسترخوان پر بیٹھے۔ جہاندار بیگم کا چہرہ آج بہت چمک رہا تھا۔ میں کھانا بھی کھا رہا تھا اور بار بار دالان کی چھت اور صحنی کی طرف بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ میرے اس طرح دیکھنے پر جہاندار بیگم نے کہا:

”یہ کیا بار بار چھت اور صحنی کی طرف دیکھ رہے ہو۔“

”دالان کی چھت کتنی پرانی ہے؟“

”کیا مطلب؟“

”بتائیے اس کی چھت کتنی پرانی ہے۔“

”یہی کوئی ڈیڑھ دو سو برس۔ لیکن کیوں پوچھ رہے ہو۔“

”باہر کی ڈیوڑھی گرنے لگی ہے۔“

”ہاں لیکن دالان کی چھت میں بہت مسالے لگے ہیں۔ ابھی بہت دن نہیں گرے گی۔“

یہ سن کر میں نے تیزی سے منہ میں نوالے رکھنا شروع کیے۔ شہباز اور جہاندار بیگم میری طرف یوں دیکھ رہے تھے جیسے ان کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا ہو۔

”کل..... جب میں حکیم صاحب کے مطب پر گیا تو انہوں نے ایک عجیب بات

بتائی۔“ کھانا ختم ہوتے ہی میں نے جہاندار بیگم سے کہا۔

”وہ کیا؟“

”کوئی اُن سے میرے بارے میں پوچھنے گیا تھا۔“

”کیا پوچھنے گیا تھا۔“

”یہ صاحب حویلی میں کیوں آتے ہیں۔“

”جو پوچھنے گیا تھا، وہ کہاں سے آیا تھا؟“

”مہدی گنج سے۔“

”اچھ..... چھا..... تو ذوالفقار جنگ کی ذریت سے حرص ابھی گئی نہیں۔“ جہاندار بیگم غصے میں آ کر بولیں: ”میں نے اسی لیے اُن لوگوں کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیا۔“

”حکیم صاحب نے ایک اور بات بھی کہی۔“

”وہ کیا؟“

”بیگم صاحب سے کہیے گا ہشیار رہیں۔“

”یہ مہدی گنج والے ہیں تو ہمارے عزیز لیکن اطوار ان کے الگ ہیں۔ خدا نے بہت کچھ دیا ہے لیکن عزیزوں کی املاک پر ہمیشہ نگاہ رہی۔“ جہاندار بیگم اسی غصے سے بولیں۔ پھر ذرا رک کر کہا: ”مہدی گنج کے آس پاس وہ جو تروینی گنج اور بھوانی گنج ہیں وہاں اپنے عزیزوں کی بہت سی زمینیں اپنے نام کرائیں۔ اب وہ سب دوسروں کی ڈیوڑھیوں میں رہتے ہیں۔“ یہ کہہ کر پانی کے دو گھونٹ پیے پھر بولیں: ”ذرا طبیعت سنبھلے تو وکیل کو بلا کر یہ حویلی تم دونوں کے نام کر دوں۔“

ان کے یہ کہنے پر شہبانے میری طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

”تم دونوں اسے سنبھال کر رکھنا۔ کوئی حصہ کرائے پر مت دینا، کرائے دار آسانی سے نہیں نکلتے۔“ جہاندار بیگم کہتی رہیں۔

”لیکن خالہ.....“ شہبانے انہیں بیچ میں روکا۔ ”یہ ٹھیک نہیں ہے۔“

”کیوں ٹھیک نہیں ہے۔ کیا تم دونوں جھگڑا کرو گے۔ دیکھو جیسے آج کل ایک دوسرے کا

ہاتھ بٹا رہے ہو ویسے ہی میرے بعد بھی بٹانا۔“

”لیکن خالہ ابھی تو آپ ماشاء اللہ.....“

”نہیں اب اور نہیں جیوں گی۔ بھیا میری بات نہیں مانتے۔“ انہوں نے میری طرف

اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”نہ یہاں رہتے ہیں نہ اپنی شادی کرتے ہیں۔ اوپر جاؤں گی تو ان کی ماں سے یہ شکایت ضرور کروں گی۔“

”خالہ! اب آپ آرام کیجیے۔“ شہبانے کہا۔ ”میں سہ پہر کو آؤں گی۔ بال آپ کے بہت

الچھے ہوئے ہیں، ان میں تیل لگا کر گنگھی کروں گی اور کل صبح گھلی سے آپ کا سر دھوؤں گی۔“

”نہیں نہیں۔ بڑھاپے میں یہ جوانی والے چو نچلے نہیں کروں گی۔“
 ”خالہ..... میں سہ پہر کو آؤں گی۔ آپ کے بالوں میں تیل لگاؤں گی اور کل صبح گھلی
 سے آپ کا سر دھوؤں گی۔ سمجھیں۔“ شہبانے پہلی بار جہاندار بیگم سے اس طرح بات کی جیسے
 وہ ان کی بہت چہیتی بھانجی ہو۔

”اچھا، جیسا میری بیٹی کہتی ہے ویسا ہی کروں گی۔“
 شہبانے سلیمن کو بلا کر دسترخوان بڑھوایا۔ پھر ہم دونوں وہاں سے اٹھ کر کتابوں والے
 کمرے میں چلے آئے۔ کمرے میں آتے ہی شہبانے کہا:
 ”جو کتاب ملی ہے اس میں، جیسا میں نے آپ سے کہا تھا، بہت کچھ بدلا ہوا ہے۔“
 ”جیسے۔“

”سب کچھ تفصیل سے نہیں بتا سکتی، کاپی میں لکھ دیا ہے۔ کچھ کچھ سن لیجیے۔“ یہ کہہ کر شہبا
 نے بتایا: ”کتاب کے شروع میں منشی احمد حسین کے کمرے پر جلسے کا ذکر تو ہے لیکن وہ جو فضول
 کی شعر و شاعری ہے، وہ سب نہیں ہے۔ لگتا ہے مرزا صاحب نے چھپر۔ دئی کتاب میں صفحے
 بھرنے کے لیے وہ سب بڑھا دیا ہے۔ اس کتاب میں ایک دو شاعر ہیں اور امراؤ جان۔ بس۔
 سب ایک دوسرے کو اپنا کچھ کچھ کلام سناتے ہیں پھر مرزا رسوا امراؤ جان کو ان کا یہ شعر جو انہوں
 نے کچھ کچھ کلام سنانے کے دوران سنایا تھا.....“

”کس کو سنائیں حال دل زار.....“ میں نے پورا شعر پڑھا۔
 ”جی جی یہی شعر۔ یہی شعر یاد دلا کر امراؤ جان سے اپنی سرگزشت سنانے کا اصرار کرتے
 ہیں اور تھوڑے سے تامل کے بعد وہ اپنا قصہ کہنے پر راضی ہو جاتی ہیں۔“ یہ کہہ کر شہبانے کہا:
 ”آگے آپ دیکھ لیجیے گا انہوں نے کس طرح اپنی کہانی شروع کی ہے۔“
 ”اور وہ فیض علی والا قصہ۔“

”اس کے بارے میں جو کچھ آپ نے سنا ہے، صحیح ہے۔“
 ”یعنی۔“

”فیض علی سے ایک اولاد ہونے کا ذکر ہے اور تفصیل سے ہے۔ اسے بھی لکھ دیا ہے،
 پڑھ لیجیے گا۔“ شہبانے کہا۔ پھر کہا: ”اور بھی بہت سی جگہوں پر بہت کچھ بدلا ہوا ہے۔ چھپی

ہوئی کتاب میں خانم کے بارے میں زیادہ نہیں ہے، اس میں ہے۔“ یہ بتا کر بولی:

”اب یہ کاپی لیجیے اور چھپی اور بے چھپی کتابیں بھی۔ سب اپنے پاس رکھیے اور اپنا

کام شروع کیجیے۔“

”کل ہی سے لگتا ہوں اس کام پر۔ تم وہ جو مہدی گنج والے ہیں، ان پر نظر رکھنا اور خالہ کا خیال رکھنا۔“ میں نے شہبا سے کاپی اور دونوں کتابیں لیں اور اس سے یہ کہہ کر اپنے ٹھکانے پر آ گیا کہ دو چار دن نہ آؤں تو پریشان مت ہونا۔

○

دوسرے دن صبح کی اذان ہوتے ہی میں اٹھ بیٹھا اور روشنی پھیلنے سے پہلے ہی چائے پی کر وہ تینوں چیزیں جو میں شہبا سے لے کر آیا تھا، اپنے سامنے لے کر بیٹھ گیا۔ چھپی ہوئی کتاب مجھے حرف بہ حرف یاد تھی اسے الگ رکھ کر شہبا والی کاپی اور جو مسودہ ملا تھا اسے دیکھنا شروع کیا۔ شہبا نے صحیح کہا تھا۔ مرزا رسوانے اس کتاب میں قصہ شروع کرنے کے لیے بہت زیادہ تمہید نہیں باندھی تھی۔ ایک مختصر سی شعری محفل کے بعد منشی احمد حسین اور مرزا صاحب کی اشتعالک پر امراؤ جان نے ایک شعر پڑھ کر اور دو چار جملوں میں وہی باتیں کہہ کر جو مرزا نے چھپی ہوئی کتاب میں لکھی تھیں اپنا قصہ کہنا شروع کیا:

”سنیے مرزا صاحب:

بہت کچھ تو ہمیں یاد نہیں کہ ہم بہت چھوٹی عمر میں اپنے ٹھکانے سے باہر نکل آئے۔ لیکن اپنے گھر میں چھوٹے سے بڑے ہوتے ہوتے جو کچھ ہمارے کانوں میں پڑا، ہمیں یاد رہا۔ پالنے سے لے کر بڑے ہونے تک مغلا نیوں نے ہماری دیکھ بھال کی۔ جو استانی ہماری تعلیم پر مقرر تھیں، ہم انہیں سے مانوس تھے۔ وہی ہمارے بزرگوں کے بارے میں ہمیں بتاتی تھیں۔ انہیں سے، مطلب سمجھے بغیر جو کچھ ہم نے سنا تھا اور جس طرح سنا تھا آپ کو سنائے دیتی ہوں:

ہمارے پردادا آفتاب الدولہ نواب خورشید بہادر۔۔۔ ابوالفتح نصیر الدولہ محمد علی شاہ کے زمانے میں ناظم سرکار دولتدار تھے اور انہیں چودہ پارچے کا خلعت عطا ہوا تھا اور دادا ہمارے سلطان عالم واجد علی شاہ کے زمانے میں بندوبست کے مہتمم تھے اور شاہی کارخانے میں ان کا بڑا دخل تھا۔ دونوں کو اپنی خدمتوں کے صلے میں بہت سی زمینیں اور جاگیریں ملی تھیں۔ دادا نے

ہمارے، ہمارے ابا جان نواب علی نقی بہادر کے لیے تحسین گنج میں ایک بڑی حویلی بنوائی تھی اور اسی سے متصل ایک آراستہ باغ بھی انہیں دیا تھا۔ دربان ہماری ڈیوڑھی پر آٹھ پہرہ دیتے اور دروازے پر ہمارے ہاتھی بندھے رہتے۔ استانی بتاتی تھیں کہ ہمارے دادا نے ہمارے ابا جان کو یہ کہہ کر شاہی ملازمت سے دور رکھا کہ گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔

۱۱ اور اب وہ سناتی ہوں جو اپنے گھر میں دیکھا اور جو کچھ اماں جان نے ہماری بتایا۔ جب میں پانچویں برس میں تھی تو ہمارے امام باڑے کے علم میں پانچویں گرہ باندھ کر اماں نے ہمیں پنجن پاک کی ضمانت میں دیتے وقت بتایا ہماری پیدائش کا جشن بڑی دھوم دھام سے منایا گیا تھا۔ تحسین گنج سے چوک تک فقیروں کو قطار میں بٹھا کر کھانا کھلایا گیا اور غریب غرباء میں اشرفیاں بانٹی گئیں اور حویلی سے باہر والے میدان میں جو آتش بازی چھڑائی گئی تھی اس کا تماشا دیکھنے لوگ دور دور سے آئے۔ گھر کے سارے ملازموں میں بہت قیمتی جوڑے تقسیم کیے گئے جن میں سونے چاندی کے تار پروئے ہوئے تھے۔ تین دن تک لوگ محلوں محلوں سے آتے رہے اور بی بی سیدہ کے نام کا جو دسترخوان بچھایا گیا تھا اس پر طرح طرح کے کھانے کھاتے رہے اور امیروں اور منصب داروں کے گھر سے کئی دن تک تحفے ہمارے لیے آتے رہے۔

تو مرزا رسوا صاحب: دن ہمارے عیش و آرام سے گزر رہے تھے۔ چاندی کے پالنے میں ہمیں جھلایا جاتا اور چھینک بھی آتی تو ماما میں اور مغلانیاں دوڑی چلی آتیں اور مجھے جھولے سے اٹھا کر ایک سے دوسرے کی گود بدلتی رہتیں۔

لہذا جان ہمارے، یہ بھی مجھے کچھ یاد ہے، جب آسمان ابر آلود ہوتا اور بارش کے آثار نظر آتے، بلکھی دروازے پر لگواتے اور اس میں شکار کا سامان رکھ کر تحسین گنج سے محمد علی شاہ کے امام باڑے کی طرف جا کر گومتی کا رخ کرتے۔ وہاں بجز کنارے سے لگا ہوتا۔ ابا میاں اور ان کے دوست اس میں بیٹھ جاتے اور بجز گومتی کی موجوں پر ہلکورے کھاتا کوٹھی فرح بخش کے پیچھے سے ہوتا ہوا دلکشا کی طرف چل پڑتا۔ وہاں سے کچھ پہلے ہمارا ایک باغ بھی تھا۔ بجز دلکشا سے کچھ دور گومتی کے دوسرے کنارے پر لگا دیا جاتا اور ابا جان اور ان کے احباب اُس طرف کے گئے جنگلوں میں پیڑوں پر مچان بندھوا کر جب تک سورج کی روشنی رہتی شکار کھیلتے رہتے اور جب واپس آتے تو حویلی سے باہر والے میدان میں الاؤ جلا کر شکار کیے ہوئے جانوروں کا

گوشت بھونا جاتا اور باورچی ہمارے اس پر طرح طرح کے مسالے لگا کر اسے دوسرے کھانوں کے ساتھ دسترخوان پر سجاتے۔ اس دن دیر رات تک ہماری حویلی میں جشن کا ماحول رہتا۔
 میں اپنے ماں باپ کی اکیلی اولاد۔ پیش خدمتیں ہر وقت میری خدمت میں لگی رہتیں۔ ادھر منہ سے بات نکلی ادھر پوری ہوئی۔ ابا جان باہر کے حصے میں آراستہ محفل میں جانے سے پہلے میری پیشانی چومتے اور پوچھتے شہزادی ہماری اچھی تو ہے۔ میں ان کی گردن میں دونوں ہاتھیں ڈالتی اور کوئی نہ کوئی فرمائش کرتی جسے ابا جان فوراً پورا کرنے کا حکم دیتے۔ جب ہم کچھ اور بڑے ہوئے تو اپنی حویلی کے صحن اور اُس سے ملے ہوئے باغ میں درانہ آنے جانے لگے۔ مغلائیاں ہمیں پھول اور پھل توڑ کر دیتیں۔ برسات کے موسم میں جب گھٹا آسمان پر گہری ہو جاتی تو باغ کے پیڑوں پر جھولے ڈالے جاتے اور جامن کے درختوں سے پھلیندے توڑ کر انہیں مٹی کی ہانڈی میں بگھارا جاتا اور ہم اسی جھولے پر بیٹھ کر وہ بگھرے ہوئے پھلیندے کھاتے۔

ایک دن آتوجی نے سبق پڑھاتے پڑھاتے مجھے بتایا بی بی نجم النساء، یہی میرا نام رکھا گیا تھا، کسی اور سے مت کہنا تمہارے ابا جان نے اپنے بھائی کے بیٹے نواب قیصر شکوہ کا ہاتھ تمہارے لیے مانگا ہے۔ جلد ہی تمہاری منگنی ہونے والی ہے۔ اور کچھ ہی دن بعد نواب قیصر شکوہ سے میری منگنی ہوگئی اور جس دن میری منگنی ہوئی، اسی دن سے میں دلہن بننے کے خواب دیکھنے لگی۔ ہر وقت مجھے بھاری کام والے کارچوبی جوڑے اور سلیمی ستاروں والے ڈوپٹے دکھائی دیتے اور ماتھے پر جھومر، کانوں میں ہیرے جڑی ہوئی بالیاں اور بُندے، گلے میں بھاری موتیوں والے جگنا اور ہار، ہاتھوں میں کنگن اور جہانگیریاں، پیروں میں چاند توڑے اور پازیب جن میں نیلم اور پکھراج کا جڑاؤ کام ہوتا، سب میری آنکھوں میں گھومتے رہتے اور شہنائیاں میرے کانوں میں بجتی رہتیں۔ میری استانی جو نواب قیصر شکوہ کو بھی پڑھانے پر مقرر تھیں مجھے بتاتیں بی بی تمہارا دولہا بہت گورا اور بہت اچھے ناک نقشے کا ہے۔ جیسا چاند سا چہرہ تمہارا ہے ایسی ہی روشن صورت اس کی بھی ہے۔ دونوں کی جوڑی خوب جھے گی۔ آتوجی یہ بھی کہتیں جس دن تمہارا بیاہ ہوگا اس دن میں ایک تھیلی اشرفیوں بھری نواب صاحب سے لوں گی۔

یہ تو مرزا صاحب ادھر کی ہوئی اب ذرا دوسری طرف کی سنئے:

”جوز مینیں اور جاگیریں ہمیں ملی تھیں اُن کی دیکھ بھال کارندے کرتے تھے اور مٹی اس کا سارا حساب کتاب لکھتے۔ جو بتاتے ابا جان اسی کو صحیح سمجھ لیتے۔ اسی میں ہماری زمین جائداد میں خرد برد ہونا شروع ہوئی اور جب ابا جان کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے اس کارندے سے جس نے یہ خرد برد کی تھی، باز پرس کی اور جب ابا کو اس کے جعل فریب کا پتہ چلا تو انہوں نے اُسے نوکری سے نکال دیا۔ بس اسی وقت سے اس نے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ ہماری ایک مغلانی جو میرا بہت خیال رکھتی تھی، ایک دن جب ابا میرے شکار پر نکلے ہوئے تھے اور اماں حضرت عباس کی درگاہ گئی ہوئی تھیں، شاید جمعرات کا دن تھا، تو وہ مغلانی میرے پاس آ کر بولی: ”بی بی آپ کبھی گومتی کنارے نہیں گئیں۔ اس کے دوسری طرف جو رمنہ ہے اس میں شیر، نیل گائیں اور بارہ سنگھے گھومتے رہتے ہیں اور وہاں جو درخت ہیں اُن پر رنگ رنگ کے پرندے چہچہاتے ہیں۔ بجز کنارے پر لگا رہتا ہے، اس پر بیٹھ کر دیکھو تو بہت اچھا لگتا ہے۔ یہ کہہ کر بولی: بی بی آپ کہیں تو میں آپ کو اُس طرف کی سیر کرا لاؤں۔ میں نے کہا ابا جان کو معلوم ہوگا تو خفا ہوں گے اور اماں بھی خوش نہ ہوں گی۔ وہ بولی: دو گھڑی کی بات ہے بہلی میں بیٹھے، پلک جھپکتے میں وہاں پہنچے، بحرے پر گئے، پرندوں اور جانوروں کو دیکھا، چلے آئے۔ میں اس مغلانی کے کہنے میں آ گئی۔ بہلی ہمارے باغ کے دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ مغلانی نے مجھے اس پر بٹھایا اور وہ چل پڑی۔ میں نے چیخنا شروع کیا کہ بی اماں پیچھے رہ گئیں اس پر گاڑی بان مجھے چابک دکھا کر بولا: ”چپکی بیٹھی رہو۔ آواز نکالی تو ہم تمہارا گلا دبا دیں گے۔ میں نے سہم کر آنکھیں بند کر لیں اور ایک طرف کود بک گئی۔ بہلی کس طرف جارہی تھی مجھے کچھ نہیں معلوم۔ بہت دیر بعد وہ ایک جگہ رُکی اور اس میں ایک اور شخص آ کر بیٹھا اور بیٹھتے ہی بولا:

”تو گوہر خان تم نے جو کہا تھا کر دکھایا۔ آخر کو بدلہ نواب صاحب سے لے ہی لیا۔“

گوہر خاں: ”ہاں بھائی پیر بخش، ہم پٹھان بچے ہیں، جو کہتے ہیں کر دکھاتے ہیں۔ لو اب تم بہلی سنبھالو اور کوٹھی فرح بخش سے روشن الدولہ کی حویلی ہوتے ہوئے قیصر باغ کی طرف چلو اور وہاں سے عالم باغ والا راستہ پکڑو۔ نہریا پار کر کے ہم کچھ دیر وہاں رکیں گے۔“

پیر بخش : ”میں تو کہوں سعادت گنج ہو کر عالم نگر والا راستہ لو اور ادھر سے موہان کی طرف نکل چلو۔ اس طرف پہرہ بہت کم رہتا ہے نہ کوئی پوچھے گا نہ ٹوکے گا۔“

گوہر خاں : ”جیسا کہتا ہوں کرو۔ ہم اسے نواب گنج میں لے جا کر رکھیں گے۔ وہاں ایک بھٹیاریں سے ہماری یاری ہے۔ جتنے دن کہیں گے، اسے اپنے پاس رکھے گی۔“

پیر بخش : ”لیکن اس چھوکری کا کرو گے کیا۔“

گوہر خاں : ”پہلے سوچا تھا مار کر کہیں ڈال دوں گا تاکہ نواب کو معلوم ہو کہ پٹھان اپنا بدلہ کس طرح لیتا ہے۔ لیکن اب.....“

پیر بخش : ”ارادہ بدل گیا ہے۔“

گوہر خاں : ”اب سوچا ہے اسے اپنے ساتھ رکھوں گا اور بڑی ہو جائے گی تو اسے اپنی جو رو بنالوں گا۔“

پیر بخش : ”ایسا غضب نہ کرنا۔ نواب نے چاروں طرف اپنے آدمی دوڑا دیے ہوں گے اور شہر کو تو ال کو بھی خبر کر دی ہوگی۔ کوئی ایسا راستہ سوچو کہ اس چھوکری سے تمہاری جان بھی چھوٹے اور تمہارا کچھ فائدہ بھی ہو۔“

گوہر خاں : ”تو پھر تم ہی کہو۔“

پیر بخش : ”اماں چوک میں چل کر اس کے کوڑے کرلو۔“

گوہر خاں : ”ابھی نہیں۔ سال چھ مہینے اسے بھٹیاریں کے پاس رکھوں گا۔ جب نواب کے آدمی تھک ہار کر بیٹھ رہیں گے تب ہم اسے اچھے داموں کسی کے ہاتھ بیچ دیں گے۔“

مرزا صاحب! مجھے اپنے بیچے جانے کی بات سن کر سکون ہوا کہ اس طرح جان تو بچے گی لیکن یہ سوچ کر پھر دل ہولنے لگتا کہ گوہر خان پٹھان کا بچہ عقل کا اوندھا کب اس کا ارادہ بدلے اور کب اپنی کمر سے کٹاری نکالے اور میرے ٹکڑے کر کے کسی نالے میں پھینک دے۔ پھر دل کہتا پیر بخش کے ہوتے ایسا نہیں ہوگا کہ میرے بیچے جانے سے اسے بھی فائدہ ہوگا۔

بہلی قیصر باغ سے نکل کر چار باغ کی طرف آئی۔ وہاں سے اس نے عالم باغ کا رخ کیا اور نہریا پار کے پیر بخش نے اسے ایک جگہ روکا۔ ایک درخت سے دونوں بیلوں کو باندھا پھر کہیں سے آگ لا کر اپنا حقہ بھرا۔ کچھ دیر اُن دونوں نے اسی درخت کے نیچے آرام

کیا پھر بہلی میں بیل باندھ کر آگے بڑھے۔ کوئی آدھی رات کو ہم نواب گنج پہنچے۔ بہلی ایک سرائے کے سامنے رکی۔ گوہر خاں نے بہلی سے اتر کر بھٹیاریں کو آواز دی۔ کچھ دیر بعد وہ بھٹیاریں باہر آئی، گوہر خاں نے اسے ساری بات بتائی۔ دونوں میں کچھ کانا پھوسی ہوئی پھر مجھے بہلی سے اتار کر سرائے کے اندر لے جایا گیا۔ بھٹیاریں نے اسی وقت چولہا جلا کر جلدی جلدی آلو کا سالن اور روٹی پکائی۔ پیر بخش اور گوہر خاں نے سیر ہو کر کھایا لیکن میں نے ایک بھی نوالہ نہیں توڑا۔ بھٹیاریں نے جسے میری صورت اور میرے سن پر ترس آ رہا تھا زبردستی مجھے دو چار نوالے یہ کہہ کر کھلائے کہ گوہر خاں تمہیں غصے میں اٹھالایا ہے، دو چار دن یہاں رہو پھر ہم تمہیں تمہارے گھر پہنچا دیں گے۔“

اس کے آگے جہاندار بیگم کی حویلی سے ملنے والے مسودے میں لکھا تھا کہ بھٹیاریں نے نجم النساء کو کسی اور مقام پر لے جا کر رکھا اور وہ اس وقت تک وہاں رہی جب تک پیر بخش یہ خبر نہیں لایا کہ نواب علی نقی بہادر اب اپنی بیٹی کے ملنے سے مایوس ہو گئے ہیں۔ آگے لکھا تھا کوئی ایک سال بعد گوہر خاں نے بی بی نجم النساء کو بھٹیاریں کے ٹھکانے سے نکالا اور رات کے اندھیرے میں اسے چوک میں خانم کے دروازے پر لے آیا۔

اس کے بعد تھوڑے بہت رد و بدل کے ساتھ وہی لکھا تھا جو چھپی ہوئی کتاب میں ہے۔ لیکن چھپی ہوئی کتاب میں خانم کے بارے میں زیادہ نہیں تھا۔ تازہ مسودے میں امراؤ جان کی زبانی بتایا گیا تھا کہ خانم جن کا اصل نام سرفراز بیگم تھا، ناچ گانا ان کا خاندانی پیشہ تھا۔ ان کی نانی بادشاہ نصیر الدین حیدر کے زمانے میں جب گائیں اور جلسے والیاں ہر طرف موجود تھیں، کسی دور کے قصبے سے لکھنؤ آئی تھیں اور نام ان کا ممتاز بیگم تھا۔ یہ پری چہرہ خاتون موسیقی میں یکتا اور دلبری میں طاق تھیں۔ جلد ہی بادشاہ کے خصوصی طائفے میں شامل ہو گئیں اور ناچ گانے میں اپنا کمال دکھا کر بڑا نام پیدا کیا۔ خانم کی ماں سلطان بیگم محمد علی شاہ کے زمانے میں اپنے عروج کو پہنچیں لیکن بادشاہ سے انہیں مال و زر بہت نہیں ملا کہ شہر میں اس زمانے میں ناچنے والیوں کی بہتات تھی۔ جب امجد علی شاہ صاحب تخت و تاج ہو کر فرح بخش میں داخل ہوئے اور شہر میں ان کی دینداری اور پرہیزگاری کا شہرہ ہوا اور گائوں اور جلسے والیوں کی رسائی محل میں بند ہوئی تب سلطان بیگم کو تنگی کا منہ دیکھنا پڑا۔ جب ان کی جوانی

ڈھل چکی تو کسی رئیس زادے سے خانم پیدا ہوئیں۔ بڑھاپا آتے آتے سلطان بیگم نے سرفراز بیگم کو سب کچھ سکھلا دیا اور وہ بھی ناچ گانے میں طاق ہو گئیں۔ پھر جب دشمنوں کے ذریعے سلطان عالم واجد علی شاہ کی فضول خرچیوں کی خبر تابہ انگلستان ہوئی اور جب روپے کی آمد موقوف ہوئی تو سرفراز بیگم کا جن کا سن اس وقت بیس یا بائیس کا ہوگا، شاہی محل میں آنا جانا بند ہوا اور اس سے پہلے کہ ان کے برے دن آتے انہوں نے کچھ اچھی صورت کی چھوٹی عمر والی لڑکیوں کو جوتال سر کی سدھ رکھتی تھیں اور جن کے خاندان ناچ گانے پر زندہ تھے، اپنے گرد جمع کیا اور چوک میں اپنا کاروبار جمالیا۔ اسی چوک میں ایک آشنا سے ان کے یہاں ایک اولاد ہوئی جس کا نام بسم اللہ تھا۔

نئے مسودے کے قصے میں فیض علی کے آنے تک کہانی اسی طرح بیان کی جاتی رہی جیسی چھپی ہوئی کتاب میں موجود ہے۔ اس قصے میں بیان وہاں سے بدلا جب فیض علی نے کانپور پہنچ کر امراؤ جان کو لاٹھی محال میں اتارا اور وہاں سے کچھ دور پر ایک مکان میں انہیں لے جا کر رکھا۔ نئے مسودے میں فیض علی کے غائب ہو جانے کی بات نہیں تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ امراؤ جان اُس مکان میں فیض علی کے ساتھ بہت دنوں تک رہیں اور یہیں ان دونوں کی ایک چاندی بیٹی پیدا ہوئی۔ یہ پورا قصہ نئی کتاب میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

”تو مرزا رسوا صاحب! اس مکان میں جو کانپور میں فیض علی نے کرائے پر لیا تھا، ہم وہاں بہت دن تک رہے۔ سچ پوچھیے تو میں فیض علی کو اندر اندر بہت چاہنے لگی تھی اور مشکل وقت میں اُن کا ساتھ چھوڑنا مجھے گوارا نہ تھا۔ اس مکان میں کچھ دن رہنے کے بعد ایک روز فیض علی سہ پہر کے وقت آئے اور مجھ سے ایک مسجد میں چلنے کو کہا۔ میں نے سبب پوچھا تو بولے مغرب سے پہلے پہلے تم فیض علی کے نکاح میں آ جاؤ گی۔ میں کچھ نہ بولی۔ مسجد میں دو مولویوں نے ہمارا نکاح پڑھایا۔ فیض علی نے مجھے اور ان مولویوں کو شیرینی کھلائی اور دو چار اشرفیاں اُن مولویوں کے ہاتھ پر رکھ کر مجھے گھر لے آئے۔ اب میں نے ایک بیوی کی طرح پورا گھر سنبھال لیا۔ فیض علی پکڑے جانے کے خوف سے راتوں کو غائب رہتے اور دن میں کسی پہر آ کر میری خیریت معلوم کرتے۔ کبھی کبھی دن میں بھی نہ آتے۔ ایک ماما کھانا پکانے کو اور ایک عورت اوپر کے کام کو لا کر

رکھ دی۔ میں رات رات بھر مصلے پر بیٹھ کر ان کی سلامتی کی دعائیں مانگتی اور جب وہ آتے تو اُن کے لیے اچھے اچھے کھانے پکاتی اور جب وہ گھر سے نکلنے لگتے تو اُن پر حفظ و امان والی ساری دعائیں پڑھ کر پھونکتی۔ سال بھر یونہی چھپتے چھپاتے گزری۔ اسی بیچ ہمارے یہاں ایک چاندی بیٹی پیدا ہوئی۔ میں نے اس کا نام شملہ رکھا۔ فیض علی اس بچی پر جان چھڑکتے تھے۔ جب بھی آتے اُسی کے پالنے کے پاس بیٹھے رہتے۔ ایک دن فیض علی بہت پریشان سے گھر میں داخل ہوئے میں نے پوچھا خیریت تو، بولے بری خبر ہے۔ میرے بھائی حامد کو پولیس نے پتے پر سے پکڑ لیا ہے۔ دو چار روز میں مجھ تک بھی پہنچ جائے گی۔ یہ کہہ کر بچی کے سر پر ہاتھ رکھا اور مجھے گلے لگا کر بولے اگر میں پکڑا گیا تو پریشان مت ہونا۔ سزا بہت لمبی نہیں ہوگی۔ پھر گہنوں پاتوں سے بھرا ایک صندوقچہ اور روپیوں سے بھری ایک تھیلی میرے حوالے کی اور جیسے ہی سورج ڈوبا گھر سے نکل گئے اور مرزا صاحب! اُسی دن سے میری قسمت کا سورج بھی ڈوب گیا۔ دو چار روز بعد خبر آئی کہ فیض علی ڈاکو پکڑا گیا ہے اور اُسے کالے پانی کی سزا ہوگی۔ میں دل پکڑ کر بیٹھ گئی۔ دنیا میرے لیے اندھیر ہو گئی۔ دل یہ سوچ کر ہولنے لگا کہ ایک دو روز میں پولیس یہاں بھی آ پہنچے گی۔ میں نے اپنا گل سا مان باندھا۔ ماما اور کام کرنے والی عورت سے بہانہ کیا کہ ہم کچھ روز کو باہر جا رہے ہیں۔ دودھ پیتی بچی کو گود میں لیا اور اس مسجد میں جا پہنچی جہاں دو مولویوں نے میرا نکاح پڑھایا تھا۔ ایک مولوی اس وقت موجود تھے۔ اُن کی معرفت گوالٹولی میں ایک کمرہ کرائے پر لیا۔ کھانا پکانے کو ماما رکھ لی اور بچی سنبھالنے کو ایک کھلائی۔ جو کمایا ہوا میرے پاس تھا اور جو فیض علی دے کر گئے تھے اسی سے کام چلایا پھر جب ہاتھ تنگ ہوا اور بچی کچھ بڑی ہوئی تو سازندے تلاش کیے طائفہ درست کیا۔ شب کو پہر ڈیڑھ رات گئے تک کمرے پر گانے بجانے کا چرچا ہونے لگا۔ مجرے کثرت سے ملنے لگے۔ تھوڑے ہی دنوں میں بہت سارے پیہ کمالیا۔“

قصے کو اس طرح بدلنے کے بعد مرزا رسوانے دو چار باتیں وہی رکھیں جو چھپی ہوئی کتاب میں موجود ہیں۔ نئے قصے میں یہ معلوم ہونے کے بعد کہ فیض علی سے امراؤ جان کے یہاں ایک اولاد ہوئی تھی میں بہت جوش میں آ گیا تھا اور اس حالت میں مسودے کی آگے کی عبارت یکسوئی کے ساتھ نہیں پڑھ پا رہا تھا۔ اس لیے میں، جو کچھ میں نے اب تک پڑھا تھا،

اس پر غور کرنے لگا۔ ابھی میرے لیے یہ جاننا ضروری تھا کہ امراؤ جان کا وہ ٹھکانہ کہاں ہے جسے کانپور سے آنے کے بعد انہوں نے راز میں رکھا۔

میں نے اس مسودے کو اُس وقت پڑھنا شروع کیا تھا جب آسمان پر ستارے ایک کے بعد ایک غروب ہو رہے تھے۔ اب دھوپ پوری طرح چمکنے لگی تھی۔ دن کا دوسرا پہر شروع ہونے کو تھا۔ میں کچھ دیر کے لیے بستر پر لیٹ گیا اور لیٹتے ہی میں نے سوچنا شروع کیا کہ جہاندار بیگم اس وقت میرے آنے کے انتظار میں دالان میں ٹھہل رہی ہوں گی۔ شہبایا تو لفافے اور پتنگیں بنا رہی ہوگی یا برآمدے میں چولہے پر اپنا کھانا پکا رہی ہوگی۔ یہی سوچتے سوچتے کچھ دیر کے لیے میری آنکھ بند ہو گئی اور اس وقت کھلی جب تیسرا پہر گزر چکا تھا۔ میں نے اٹھ کر کچھ کھایا پیا اور مسودہ اپنے سامنے رکھ کر جہاں تک کی عبارت پڑھ چکا تھا، اس سے آگے کی عبارت پڑھنا شروع کی۔ جو اس طرح تھی:

”لکھنؤ میں آ کر میں کچھ دن چوک کی پشت پر جو محلہ چوپٹیاں ہے وہاں ایک علاحدہ کمرہ کرائے پر لے کر رہی اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ خانم کو میرے لکھنؤ آنے کا حال معلوم ہو۔ اگر میں ان کے مکان پر اترتی تو مجھے فیض علی سے اپنے نکاح اور اپنی اولاد شمیلہ کے بارے میں بتانا پڑتا اور یہ سب سن کر خانم کو بہت افسوس ہوتا۔ میں جب لکھنؤ آئی تو یہاں کا نقشہ بدلا ہوا تھا۔“

دو چار مہینے چوپٹیوں والے کمرے میں رہنے کے بعد میں چوک سے جو راستہ تحسین گنج کی طرف جاتا ہے جس کے داہنی طرف..... ملکہ جہاں کا امام باڑہ ہے اور بائیں طرف زین العابدین کا..... مرزا رسوا: ”جانتا ہوں۔ جانتا ہوں۔ زین العابدین خواجہ سرا میاں الماس کے نائب تھے۔ آگے بتائیے۔“

”اسی کے آگے تحسین گنج ہے۔ وہاں سے آگے نکل کر رفیق الدولہ کی کربلا سے بہت پہلے سرفراز گنج میں ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے لگی جس میں ایک بڑا دالان تھا، دو صحنچیاں تھیں ایک شہ نشین اور ایک کھلا ہوا صحن۔ کھانا پکانے کے لیے ایک ماما اور باہر کے کام کے لیے ایک مہری رکھ لی۔ مرزا صاحب اب یہ پوچھیے کہ میں تحسین گنج کے آگے سرفراز گنج میں رہنے کیوں گئی۔ دل کی کہوں تو میں تحسین گنج سے قریب رہنا چاہتی تھی۔ کوٹھے پر آنے کے

بعد ماں باپ کے سامنے کس منہ سے جاتی لیکن اس حویلی کی چہاردیواری کو تو دیکھ ہی سکتی تھی جس میں میرا بچپن گزرا تھا۔ مجھ قسمت کی ماری کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ماں باپ میرے کس حال میں ہیں۔ زندہ ہیں یا مر گئے۔ خیر مرزا صاحب یہاں رہ کر کچھ دن تو میں نے یونہی گزارے پھر شہر سے باہر کے مجرے کرنے لگی۔ بیٹی کو اپنی میں نے سب کچھ سکھا دیا تھا لیکن نہ کسی مجرے میں اسے لے جاتی نہ گھر پر ناچنے دیتی۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے جی میں آئی کہ اپنی حویلی کی طرف چلیں۔ ایک ڈولی بلا کر مہری کو ساتھ لیا اور کہاروں سے کہا تحسین گنج میں نواب علی نقی بہادر کی حویلی سے کچھ پہلے ڈولی روک لینا۔ مرزا صاحب! قسمت کی ماردیکھئے جس کا باپ سونے چاندی کے منقش پایوں والی پالکی میں بیٹھ کر گھر سے نکلتا تھا اور جس کی پالکی بانائی اور کارچوبی وردیوں والے کہاراٹھاتے تھے اور جو بڑے کڑو فر سے کوچہ و بازار میں نکلتا تھا، آج اس کی بیٹی سادہ سے پردوں والی ایک معمولی ڈولی میں بیٹھ کر اپنے باپ کی حویلی کی طرف جا رہی تھی۔ تو مرزا صاحب حویلی کے قریب پہنچ کر میں نے ڈولی کا پردہ ہٹا کر حویلی پر نگاہ ڈالی تو دیکھا ہر طرف ویرانی برس رہی ہے۔ ڈیوڑھی سے دربان غائب ہیں اور اس کی چھت پر گھاس اُگی ہوئی ہے اور اس کے دونوں پٹ آگے کی طرف جھک آئے ہیں۔ حویلی کی دیواروں کی اینٹیں جگہ جگہ سے باہر نکل آئی تھیں۔ یہ دیکھ کر میں نے سینے پر ایک دو ہتھ مارا۔ مہری جو میرے ساتھ تھی اس نے مجھے سنبھالا۔ میں نے دوبارہ حویلی کی طرف نظر اٹھائی تو دیکھا ڈیوڑھی کے باہر جواملی کا گھنا درخت تھا اس کے نیچے ایک بڑا سا گھڑا پلنگ پڑا ہے جس پر ایک بہت بوڑھا شخص بیٹھا حقہ پی رہا ہے اور ایک بوڑھی عورت اس کے سامنے بیٹھی ہے۔ میں نے مہری سے کہا جا اس بوڑھی عورت کو بلالا۔ مہری گئی اسے بلالائی۔ وہ عورت ڈولی کے قریب آئی تو میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ ہماری کھلائی سعیدن تھی جس کی گود سے میں بڑی مشکل سے اترتی تھی اور جوانگی پکڑ کر مجھے صحن اور دالان میں چلایا کرتی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا بوا یہ حویلی کس کی ہے۔ وہ بولی نواب صاحب کی۔ میں نے پوچھا کون نواب صاحب، بولی: نواب علی نقی بہادر۔ پھر میں نے پوچھا اور یہ جو پلنگ پر بیٹھے حقہ پی رہے ہیں یہ کون ہیں: خود نواب صاحب، بیٹی کے غم میں گھل گھل کر آدھے ہو گئے ہیں، یہ سن کر میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میں نے پوچھا کون بیٹی۔ اس پر اس نے باغ سے میرے غائب کیے جانے کی پوری

کہانی سنائی۔ میں نے پوچھا اور نواب صاحب کی بیگم وہ بولی بی بی ان کی نہ پوچھو۔ جس دن ہماری بی بی کو اُس موئے گوہر خاں نے اس گھر سے غائب کیا اُسی دن سے انہوں نے بستر پکڑ لیا۔ ہر وقت نجمو نجمو پکارا کرتیں۔ کھانا پینا سب چھوڑ دیا تھا۔ کچھ ہی دن میں آدھی ہو گئیں پھر ایک دن بستر سے لگے لگے ان کی آنکھ بند ہو گئی۔ یہ سنتے ہی میرا سینہ چھلنی ہو گیا اور میں ڈولی میں ایک طرف کو ڈھے گئی۔ سعیدن کہتی رہی: اس دن سے اس گھر پر ایسی تباہی آئی کہ سب مٹا چلا گیا۔ نواب صاحب کے ایک ہی دونو کر ہیں جو انہیں چھوڑ کر نہیں گئے۔ انہیں میں ہم بھی ہیں۔ نواب صاحب کی زمین جائداد سب بک چکی ہے۔ کچھ ہی دن میں یہ حویلی بھی بکنے والی ہے۔ جب تک نہیں بکے گی ہم اس کی دیوار سے لگے بیٹھے رہیں گے۔ سعیدن یہ سب کہنے کے بعد آنکھوں میں آنسو چھلکاتی ہوئی بولی: بی بی کو بہت دن اپنی گودی میں کھلایا۔ میری لوری کے بغیر وہ پالنے میں سوتی نہیں تھیں۔ انہیں کھلاتے سلاتے وقت مجھے یوں لگتا جیسے وہ میری ہی کوکھ سے جنمی ہوں۔ میں نے آنسو روکتے ہوئے سعیدن سے پوچھا نواب صاحب کی طبیعت کیسی ہے۔

سعیدن: ہر وقت بستر پر پڑے رہتے ہیں۔ کھانا پینا بس نام کو ہے۔ ہر ایک سے اپنی بٹیا کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ”یوں سوتی تھی، یوں بیٹھتی تھی یوں کھاتی تھی یوں کھیلتی تھی۔“ یہ کہہ کر اچانک بولی:

سعیدن: ”بی بی آپ کی آواز سنی سنی سی لگتی ہے۔“

میں: ”نہیں بوا میں تو لکھنؤ سے باہر کی ہوں۔ میں نے جھوٹ بولا۔“

سعیدن: ”آپ بولیں تو یوں لگا جیسے ہماری بی بی بول رہی ہوں۔“

میں کچھ دیر چپ رہی۔ پھر ایک اشرفی سعیدن کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولی میں کسی دن آؤں گی۔ نواب صاحب کو بتائے بغیر مجھے حویلی اندر سے دکھا دینا۔ سعیدن نے مجھے بہت سی دعائیں دے کر کہا ضرور دکھا دوں گی۔ آج آپ کی آواز سن کر مجھے اپنی بی بی یاد آ گئیں بالکل اسی طرح بولتی تھیں۔ میں نے مہری سے کہا کہا روں سے کہو ڈولی اٹھائیں اور واپس چلیں۔

مرزا رسوا صاحب! کیا بتاؤں حویلی اور اپنے بوڑھے باپ کو دیکھ کر مجھ پر کیا گزری۔ میں نے کئی دن تک مجرے نہیں کیے۔ اپنی قسمت کو کوستی رہتی اور اٹوائی کھٹوائی پڑی رہتی۔ کوئی دو

مہینے بعد کلیجے میں پھر ہوک سی اٹھی۔ ڈولی میں بیٹھ مہری کو ساتھ لے کر پھر حویلی پر جا پہنچی کہ
 سعیدن کو بلا کر حویلی کو اندر سے دیکھ لوں اور ابا جان کی صورت بھی۔ وہاں پہنچی تو لوگوں کو جمع
 دیکھا۔ مہری نے معلوم کیا تو پتہ چلا نواب علی نقی بہادر کا جنازہ اٹھ رہا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے
 کلیجہ پکڑ لیا۔ سانس سینے میں رکی جاتی تھی، آنسو آنکھ سے اٹدے آتے تھے۔ اسی عالم میں
 مہری سے کہا پوچھ کے آؤ نواب صاحب کس کر بلا میں دفن ہوں گے۔ مہری نے آ کر بتایا
 عباس باغ والی کر بلا میں اپنی بیوی کے پہلو میں۔ وہی یہاں سے قریب ہے۔ میں نے
 کہا روں سے کہا کر بلا رفیق الدولہ کی طرف چلو۔ وہاں پہنچ کر میں ڈولی سے اتر کر ایک پیڑ کے
 نیچے بیٹھ کر زار و قطار رونے لگی۔ کچھ دیر بعد جنازہ کر بلا پہنچ گیا۔ مرزا رسوا صاحب! جس کے
 دسترخوان پر بیسیوں لوگ بیٹھتے تھے۔ جس کے جلسوں میں سینکڑوں لوگ جمع ہوتے اور جس کی
 ڈیوڑھی میں دسیوں نوکر موجود رہتے اُس کا جنازہ ایک معمولی سے صندوق میں مٹھی بھر
 سو گواروں کے ساتھ کر بلا لایا گیا تھا۔ مجھ کو روتا دیکھ کر مہری مجھ سے بار بار پوچھتی نواب
 صاحب آپ کے کون تھے۔ جب ابا جان کو دفن دیا گیا اور مٹی دے کر سب لوگ باہر چلے گئے تو
 میں ان کی قبر پر جا کر ڈھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ پھر اماں کی قبر پر آئی اور جیسے ہی وہاں بیٹھ کر
 رونا شروع کیا مجھے محسوس ہوا دو ہاتھ قبر سے باہر نکلے ہوئے ہیں اور مجھے اپنی آغوش میں لینے کو
 بے چین ہیں۔ مجھے نہیں معلوم میں کب تک ان دونوں کی قبر پر بیٹھی رہی۔ جب مغرب کی
 اذان ہونے لگی اور رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تو مہری ڈولی میں بٹھا کر مجھے گھر لے آئی۔

اب مرزا صاحب آگے کی سنیے پانچویں دن میں نے محلے کی عورتوں کو جمع کر اپنے بابا
 کے پنجم کی مجلس کی لیکن اُن عورتوں کو یہ نہیں بتایا یہ مجلس کس کی ہے۔ اس مجلس میں میں نے بہت
 دیر تک سوز خوانی کی اور مرزا دبیر صاحب کے مرثیوں کے بہت سے بند الگ الگ راگ
 راگنیوں میں پڑھے۔ پہلے بھیرویں میں یہ بند پڑھا۔

مصیبتیں حرم شاہ پر کثیر ہوئیں
 غم حسین میں سیدانیاں فقیر ہوئیں
 علی کی بیٹیاں زنداں میں جب اسیر ہوئیں
 رسول زادیاں حاکم کی دستگیر ہوئیں

بہت دنوں سے میسر نہ آب و دانہ تھا
 اندھیری رات تھی ٹوٹا سا قیدخانہ تھا

مجلس میں خوب رقت ہوئی اور جب میں نے راگ سونی میں مرزا صاحب کے
 مرثیے 'بانو کے شیر خوار کو.....'
 مرزا:..... "ہفتم سے پیاس ہے۔"
 "جی۔ اس کا یہ بند پڑھا:

زینب پکاری آؤ گلے سے لگاؤں میں
 ماں نے دلہن بنایا تھا بیوہ بناؤں میں
 آؤ جبیں پہ خاک ملوں نتھ بڑھاؤں میں
 مانگو دعا زمین پھٹے اور سماؤں میں

ہے ہے نکھڑ کے گور کنارے گئے حسین
 جیتی ہوں اور یہ سنتی ہوں مارے گئے حسین

تو عورتیں پچھاڑیں کھانے لگیں۔ مجلس ختم ہونے پر عورتوں نے پوچھا بی بی تم کہاں کی
 ہو۔ ایسی پکی آواز اور راگ سر کا ایسا لحاظ تو اچھے اچھے سوز خوانوں میں نہیں دیکھا۔ کس کی
 سکھائی ہوئی ہو۔ مرزا رسوا صاحب راگ راگنیوں کو سمجھنے والی ان عورتوں نے شاید سمجھ لیا تھا
 کہ میں اشرف سے نہیں ہوں۔ دوسرے دن سے شریفوں کے اس محلے میں چہ میگوئیاں
 شروع ہو گئیں۔ آتے جاتے لوگ پھبتیاں کسے لگے۔ کوئی کہتا ان سے کہیے چوک میں جا کر
 رہیں وہاں گانے بجانے کی قدر زیادہ ہوگی۔ کوئی آوازہ کتایہ مصلوں والا محلہ ہے گاؤ تکیوں
 والا نہیں۔ غرض کہ میں نے وہ مجلہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن اس محلے سے نکلنے سے پہلے
 سوچا ایک بار اپنی حویلی کو اور دیکھ لوں۔ وہاں پہنچی تو دیکھا کچھ لوگ اس کے باہر کھڑے ہیں
 اور حویلی کا سامان باہر نکالا جا رہا ہے۔ میں نے سعیدن کو بلا کر پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے اس نے
 بتایا حویلی بک رہی ہے۔ نواب صاحب کے بھتیجے نواب قیصر شکوہ نے سامان اپنے قبضے میں
 کر لیا ہے اور اس کی نیلامی ہونے والی ہے۔ یہ سن کر ایک بار پھر میرے سینے میں ٹیس اٹھی۔
 میں نے سعیدن سے پوچھا تم کہاں جاؤ گی بولی جہاں اللہ لے جائے۔ میں نے کہا میرے
 ساتھ چلو وہ راضی ہو گئی۔ گھرا کر میں نے اسے بتایا جس بی بی کو تم گود میں کھلاتی تھیں اور
 جس کی انگلی پکڑ کر صحن اور دالان میں چلاتی تھیں وہ بی بی میں ہی ہوں۔ پھر اسے اپنے غائب

ہونے سے لے کر اس مکان میں رہنے تک کی پوری کہانی سنائی۔ وہ مجھ سے گلے لگ کر بہت روئی، روتے روتے بولی ایک نواب زادی اس حال کو پہنچے گی ہم نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ بی بی تمہیں اس حال میں دیکھنے سے پہلے میں مریوں نہ گئی۔ جب میں نے اس سے کہا تم چاہو تو میرے ساتھ چل کر چوک میں رہو تو مجھ سے الگ ہوتے ہوئے بولی: نا بی بی نا یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ اس عمر میں اپنی مٹی خراب نہیں کروں گی۔ ساری زندگی شریفوں میں گزری اب کوٹھے والیوں میں رہ کر اپنی ناک نہیں کٹاؤں گی۔ آپ کو اپنا دودھ پلایا ہے۔ قسمت نے جو کچھ آپ کے ساتھ کیا اس کا دکھ جیتے جی رہے گا اور خدا گواہ ہے یہی دکھ لے کر قبر میں جاؤں گی۔ بیگم صاحب کا دم نکلتے دیکھا، نواب صاحب کو مرتے دیکھا اور ان کی اولاد کو اس حال میں۔ اب زندہ رہ کر کیا کروں گی۔

مرزا صاحب! سعیدن تو روپیٹ کر چلی گئی۔ میں نے چوک جا کر مکان دیکھنا شروع کیا۔ بڑی مشکل سے سید حسین کے کڑے میں جو حیدر حسین کا پھانک ہے اس میں اونچے کرائے پر ایک مکان لیا۔ یہاں سے چار قدم پر شیخ امام بخش ناسخ کا مکان تھا اور دو قدم پر میرا نیس اعلیٰ اللہ مقامہ کا۔ اس طرف سے ایک راستہ فرنگی محل کو بھی نکلتا تھا۔ دوسرے تیسرے دن میں نے اس مکان میں اپنا سامان لا کر رکھا۔ ماما اور مہری کا انتظام کیا۔ اچھے سازندوں کو جمع کیا اور مجھے شروع کر دیے۔ ماں باپ کے غم میں کہاں تک پڑی رہتی۔ جوان ہوتی بیٹی اور اپنے بڑھاپے کا سامان کرنا بھی ضروری تھا۔“



اس کے بعد اس مسودے میں اکبر علی خاں، آبادی جان، خانم کی علالت کے موقع پر امراؤ جان کا وہاں جانا اور کانپور والی بیگم کے قصے کم و بیش وہی تھے جو پہلی والی کتاب میں تھے۔ بس جہاں جہاں امیرن کا نام تھا وہاں اسے نجم النساء کے نام سے بدل دیا گیا تھا۔ کتاب کے آخر میں وہ طول طویل تقریر بھی نہیں تھی جس میں نیک بختوں اور خراب عورتوں کا مقابلہ دکھایا گیا ہے۔ یہاں سید حسین کے کڑے میں جو مکان امراؤ جان نے لیا تھا، اس میں رئیسوں کے آنے جانے اور ناچ مجھے پر بسر اوقات کرنے کی بات بتائی گئی تھی پھر امراؤ جان کی زبانی کہلوایا گیا تھا:

”پھر وہ زمانہ آیا کہ میں رنڈی کے ذلیل پیشے کو عیب سمجھنے لگی اور اس سے دستبردار ہو گئی۔ ہر کس و ناکس سے ملنا چھوڑ دیا۔ صرف ناچ مجرے پر بسر اوقات رہ گئی۔ کسی رئیس نے نوکر رکھا تو نوکری کر لی۔ رفتہ رفتہ یہ بھی ترک کر دیا۔ مرزا صاحب! میں بہت دن ہوئے سچے دل سے توبہ کر چکی ہوں اور حتی الوسع روزہ نماز کی پابند ہوں۔ رہتی رنڈی کی طرح ہوں۔ خدا چاہے مارے چاہے جلانے مجھ سے پردے میں تو گھٹ کر نہ بیٹھا جائے گا۔ مگر پردہ والیوں کے لیے دل سے دعا گو ہوں۔ خدا ان کا راج سہاگ قائم رکھے اور رہتی دنیا تک ان کا پردہ رہے۔ میں نے اپنی بیٹی شمیمہ کو ایک مولوی رکھ کر عربی فارسی اچھی طرح پڑھوادی ہے۔ گلستاں بوستاں کے سارے سبق اس نے پڑھ لیے ہیں اور اخلاقِ ناصری جیسی مشکل کتاب کا بھی درس لے لیا ہے۔ نول کشور میں چھپی ہوئی جو قصے کہانیوں کی کتابیں میرے پاس تھیں وہ بھی اس نے پڑھ ڈالی ہیں۔ چھوٹی سی عمر میں اسے ہر بات کی سمجھ آ گئی ہے۔ ناچ گانے میں طاق ہے مگر میں نے اس سے کہہ رکھا ہے بیٹی اس پیشے سے دور رہنا اور میرے بعد کسی اور طرح زندگی بسر کرنا۔

تو مرزا صاحب! یہ ہے میری ساری روداد اب اسے آپ جس طرح چاہے لکھیے۔ میں اپنی تقریر اس شعر پر ختم کرتی ہوں:

مرنے کے دن قریب ہیں شاید کہ اے حیات
تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہو گئی

پس نوشت: مرزا صاحب! آپ نے میری سوانح عمری کا مسودہ مجھے نظر ثانی کرنے کے لئے دیا تھا اور فرمایا تھا ”جا بجا بناتی جانا۔“ اس کا ہوش کسے تھا۔ پڑھتے پڑھتے صبح ہو گئی۔ یہ مسودہ اس وقت آپ نے میرے پاس بھیجا ہے جب میری زندگی کے دن بہت تھوڑے رہ گئے ہیں۔ میں بہت سے عارضوں میں مبتلا ہوں۔ بہت جلد میری آنکھ بند ہونے والی ہے لیکن خدا را اپنی آنکھ کھلی رکھے گا اور گا ہے گا ہے میری بیٹی شمیمہ کی خیریت لیتے رہے گا۔ میں اسے ناچ گانے کے پیشے میں نہیں لانا چاہتی۔ میرے پاس اب بھی اس قدر اندوختہ ہے کہ وہ بہت دن آرام سے گزار لے گی۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔

ختم شد

نئے مسودے کو پڑھنے اور کاپی میں لکھی ہوئی شہبا کی عبارت اور چھپی ہوئی کتاب کے بیانات سے اسے ملانے میں مجھے چار پانچ دن لگ گئے۔ میں جلد سے جلد جہاندار بیگم کی حویلی پہنچ کر شہبا کو بتانا چاہتا تھا کہ اس نے کتنی محنت اور کتنا جی لگا کر دونوں کتابیں پڑھی ہیں اور کتنی احتیاط سے بدلی ہوئی عبارتیں کاپی میں نقل کی ہیں۔ مجھے رہ رہ کر جہاندار بیگم کا بھی خیال آ رہا تھا۔ کل ان کی دوا لانے کا دن تھا اس لیے میں دوسرے دن دھوپ نکلتے ہی حویلی پہنچ گیا۔ سلیمین مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھی پھر بجھے ہوئے لہجے میں بولی:

”اچھا ہوا آپ آگئے۔ بیگم صاحب کی طبیعت بگڑتی جا رہی ہے۔ دو دن سے بٹیا بستر پر کھانا کھلا رہی ہیں۔“ یہ بتا کر بولی: ”خود بٹیا کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔“ میں نے سلیمین سے کہا بٹیا کو بتا دو میں آ گیا ہوں، کتابوں والے کمرے میں ہوں۔ تھوڑی دیر بعد شہبا وہاں آ گئی۔ آتے ہی بولی: ”خالہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پہلے جا کر کچھ دیر ان کے پاس بیٹھیے۔ آپ کو دیکھ کر ان کی طبیعت سنبھلے گی۔“

جب میں نے اسے کتابوں کی عبارتوں کے بارے میں بتانا چاہا تو اس نے مجھے یہ کہہ کر روک دیا پہلے خالہ کی طرف جائیں۔ شہبا نے مجھ سے دو چار جملے بولے تھے لیکن اتنی دیر میں اسے کئی بار کھانسی آئی۔ میں جہاندار بیگم کی صحنی میں پہنچا تو وہ آنکھیں بند کیے بستر پر پڑی تھیں۔ میں نے ان کے بستر کے قریب بیٹھ کر بہت دھیمی آواز میں انہیں پکارا:

”خالہ!!“

میری آواز سنتے ہی انہوں نے تھوڑی سی آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا پھر بہت آہستہ سے کہا:

”بھیا تم آگئے۔“

”جی آ گیا۔“

”اب یہیں بیٹھو میرے پاس۔“

میں ان کے تخت سے لگ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے آہستہ سے اپنا داہنا ہاتھ میری طرف بڑھایا جس کا مطلب تھا اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دو۔ میں نے اپنا ہاتھ ان کے

ہاتھ میں دیا تو میری ہتھیلی سہلاتے ہوئے وہ بہت کمزور آواز میں بولیں:

”اچکن کب پہنو گے اور یہاں رہنے کب آؤ گے۔ بٹیا بہت اچھی ہے۔ جب سے میری طبیعت بگڑی ہے کھانا مجھے اپنے ہاتھ سے کھلا رہی ہے۔ جس کے ساتھ رہے گی اسے بہت خوش رکھے گی۔“

”خالہ آپ کو بولنے میں تکلیف ہو رہی ہے۔ زیادہ مت بولیے۔“ میں نے کہا۔

کچھ دیر چپ رہنے کے بعد جہاندار بیگم پھر بولیں: ”پہلے سوچا تھا اس حویلی کو وقف کر دوں گی۔ لیکن اب یہ تم دونوں کی ہے۔ مل جل کر رہنا۔“

”میں نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ کر انہیں بولنے سے منع کر دیا اور ان سے یہ کہہ کر چلا آیا کہ آپ کچھ دیر آرام کیجیے میں ابھی آتا ہوں۔“ جہاندار بیگم کی صحیحی سے نکل کر میں شہبا کے کمرے کی طرف گیا تو وہ اپنے چولہے پر چائے بنا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے پوچھا:

”مل آئے خالہ سے۔“

”مل آیا، آثار اچھے نہیں ہیں۔“

شہبا نے چائے کی پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

”پرسوں کچھ لوگ آئے تھے۔ سلیمان سے عجیب عجیب سوال کر رہے تھے۔“

”کیا پوچھ رہے تھے؟“

”حویلی میں کون کون لوگ رہتے ہیں۔ حکیم صاحب سے جو صاحب دوا لینے جاتے ہیں وہ کہاں ہیں۔ جب سلیمان نے میرے بارے میں بتایا تو انہوں نے مجھے بلانے کے لیے کہا۔ میں گئی تو وہ مجھ سے بھی طرح طرح کے سوال کرنے لگے۔ پوچھا آپ یہاں کیوں رہنے آئی ہیں۔ جب میں نے بتایا بیگم صاحب میری پھوپھی ہیں تو بولے کس طرف سے ہیں پھوپھی۔ میں نے ان سے الجھنا مناسب نہیں سمجھا اس لیے کچھ کہے بغیر اندر چلی آئی۔“

شہبا سے یہ باتیں سن کر میں کچھ پریشان ہوا لیکن اپنی پریشانی کو اس پر ظاہر نہیں کیا۔ بات کا رخ بدلنے کے لیے میں نے اس سے کہا:

”میں نے مسودہ اور جو کچھ تم نے کاپی میں لکھا تھا سب پڑھ ڈالا۔“ پھر کہا:

”تم نے جس محنت سے کتاب پڑھی اور جس طرح بدلی ہوئی عبارتوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر

نکالا وہ تمہیں کر سکتی تھیں۔“

یہ سن کر شہبا کے چہرے پر خوشی کی ہلکی سی لہر آئی۔
”چلیے محنت سوار ت ہوئی۔“

”بہت سی نئی باتیں سامنے آئی ہیں۔“ میں نے کہا: ”امراؤ جان کا نواب زادی ہونا،
خانم کے خاندان کا حال، فیض علی کا امراؤ جان کے ساتھ نکاح پڑھوانا، امراؤ کا اولاد والی
ہونا۔“ یہ کہہ کر میں نے شہبا سے کہا: ”آخر کو سردار جہاں کی بات سچ نکلی۔ میرا جی چاہتا ہے
ابھی جا کر اُن سے بتاؤں۔“

”ابھی خالہ کو سنبھالیے۔ یہ سب بعد میں کیجیے گا۔ مجھے نہیں لگتا اب وہ بستر سے اٹھ سکیں گی۔“
”شام کو حکیم صاحب کے پاس جاؤں گا۔ اگر ممکن ہو تو انہیں اپنے ساتھ لے آؤں گا
تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں مرض نے کیا صورت اختیار کی ہے۔“
”بالکل جائے اور انہیں اپنے ساتھ لے کر آئیے۔“

○

جب سے خالہ کی طبیعت بگڑی تھی شہبا اپنے باورچی خانے میں ان کا بھی کھانا پکانے
لگی تھی۔ کھانا کیا تھا کچھ ابلی ہوئی سبزیوں کا شوربہ اور ایک دو پھلکے۔ اس وقت بھی وہ یہی
پکا رہی تھی اور میرے لیے آلو مٹر کی تحری۔ وہ کھانا لے کر پہلے خالہ کی صفحہ میں گئی۔ انہیں
اٹھا کر ان کی پیٹھ تکیے سے لگائی پھر انہیں شوربے میں پھلکے ڈبو کر کھلائے، پانی پلایا، اُن کا
منہ پونچھا اور انہیں بستر پر لٹا کر واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ پھر اس نے ہرے دھنیے کی
چٹنی بنائی، چوکی کھسکا کر پٹنگیں بنانے والی چٹائی پر چھوٹا سادستر خوان بچھایا، اُس پر چٹنی کی
پلیٹیں لگائیں اور پھر ہم نے ہرے دھنیے کی چٹنی کے ساتھ وہ آلو مٹر کی تحری کھائی۔ کھانا
پکانے اور کھانا کھانے کے بیچ شہبا کو بار بار کھانسی آتی رہی۔

”کھانسی نے پھر زور پکڑ لیا ہے۔“ میں نے اس سے کہا۔ ”حکیم صاحب سے تمہاری بھی
دوا لاؤں گا۔ اور اگر وہ یہاں آگئے تو اُن سے کہوں گا تمہیں بھی دیکھ لیں۔“

کھانا کھاتے کھاتے سہ پہر کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے شہبا سے کہا میں کتابوں والے
کمرے میں کچھ دیر آرام کروں گا پھر دوا لینے چلا جاؤں گا۔

حکیم صاحب کے مطب پر جانے سے پہلے میں شہبا کو لے کر چنچی کی طرف گیا کہ دیکھ لوں خالہ کی حالت کیسی ہے اور وہی حالت حکیم صاحب سے جا کر بتادوں۔ وہاں پہنچ کر میں نے جب ان کی نبض پر ہاتھ رکھا تو وہ رک رک کر چل رہی تھی۔ اُن کا پنڈا تپ رہا تھا اور وہ نیم جان سی بستر پر پڑی تھیں۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر میں فوراً مطب کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچتے ہی میں نے مریضوں کا نام پکارنے والے شخص سے کہا:

”حکیم صاحب سے کہو جہاندار بیگم کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔ مجھے فوراً اندر بلا لیں۔“
حکیم صاحب نے جو مریض اندر گیا تھا اس کے نکلتے ہی مجھے بلا لیا۔ میں اندر پہنچا تو مجھے دیکھتے ہی وہ بولے:

”خیریت تو۔ آپ بہت گھبرائے ہوئے ہیں۔“

”بیگم صاحب کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔ نبض رک رک کر چل رہی ہے۔ غشی کا عالم ہے۔ پنڈا بہت تپ رہا ہے۔“ میں نے جہاندار بیگم کی جو حالت دیکھی تھی حکیم صاحب کو ایک ہی سانس میں بتادی۔ یہ سن کر حکیم صاحب نے افسوس کیا۔ پھر بولے:

”یہ دعا کا وقت ہے، دوا کا نہیں۔ آج رات وہیں رہیے گا بیگم صاحب کے پاس۔“

حکیم صاحب کی بات سن کر مجھے دھچکا لگا۔

”آج میں آپ سے کوئی بات نہیں کروں گا۔“ حکیم صاحب نے کہا: ”جائیے اور

بیگم صاحب کے سر ہانے بیٹھے رہیے۔“

”انہیں بھی کھانسی بہت آ رہی ہے۔“

”صہبا خانم کی بیٹی کو؟“

”جی۔“

”فہرست سال حکیم“

”میں ان کی دوا دے رہا ہوں لیکن اُن سے کہیے ہسپتال جا کر اچھی طرح اپنی جانچ

کرا لیں۔ جو ہم نہیں بتا سکتے وہ مشینیں بتا دیتی ہیں۔“ یہ کہہ کر حکیم صاحب بولے۔ ”کہیے گا اس

معاملے میں دیر نہ کریں۔ اب آپ جائیے۔“

چلتے چلتے میں نے حکیم صاحب سے کہا: ”آپ چل کر دیکھ لیتے تو.....“

”فضول ہے۔ اس کا وقت نکل چکا ہے۔“

میں بہت پریشان سا حکیم صاحب کے مطب سے نکلا اور ایک تیز رفتار سواری پر بیٹھ کر حویلی آ پہنچا۔ شہبانے مجھے دیکھتے ہی کہا:

”خالہ نے بولنا بند کر دیا ہے۔“ پھر پوچھا: ”حکیم صاحب نے کیا کہا۔ آئے نہیں۔“

”نہیں۔ کہا ہے یہ دعا کا وقت ہے۔“

○

جہاندار بیگم کی حویلی میں جگہ جگہ قمقمے روشن رہتے لیکن آج یہ حویلی مجھے تاریکی میں ڈوبی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ جن حجروں اور صحنوں میں چراغ جل رہے تھے ان کی زرد لویں تھر تھرا کر خاموش ہوئی جا رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے پوری حویلی پر اندھیرے کی چادر تان دی گئی ہو۔ آسمان پر ایک بھی ستارہ نہیں تھا۔ ہوار کی ہوئی تھی اور شام ہوتے چمن کے درختوں پر آ کر بیٹھنے والے پرندے اپنے پروں کو سمیٹے ہوئے تھے۔ کچھ کچھ دیر بعد سنائی دینے والی اُن کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ آج بالکل نہیں سنائی دے رہی تھی۔ حویلی کی چھتیں اور دیواریں سیاہ قباؤں میں لپی ہوئی تھیں اور جہاندار بیگم کے دالان اور پچنی میں وحشتوں نے اپنا ٹھکانہ بنا لیا تھا۔

میں شہبا کے ساتھ جہاندار بیگم کی پچنی میں گیا تو دیکھا وہ پسینے میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ شہبا نے انہیں دیکھتے ہی کہا: ”اماں بھی جب ان کا دم نکل رہا تھا اسی طرح پسینے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔“ پھر وہ پچنی سے باہر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد آئی تو اس کے ساتھ سلیمن بھی تھی۔ شہبا کے ہاتھوں میں قرآن تھا اور سلیمن کے ہاتھوں میں پانی کا ایک کٹورا اور چمچہ۔ شہبانے جہاندار بیگم کے سر ہانے بیٹھ کر قرآن پڑھنا شروع کیا اور سلیمن اُن کے حلق میں کچھ کچھ دیر بعد چمچے سے پانی کے ایک ایک دو دو قطرے ٹپکاتی رہی۔ حویلی کے حجروں میں رہنے والے دوسرے نوکر بھی پچنی میں آ کر جمع ہو گئے تھے۔ ایک نوکر نے لو بان دان میں لو بان جلا کر تخت کے پائے کے پاس رکھ دیا تھا۔ میں جہاندار بیگم کے پالکتی بیٹھ کر ایک کپڑے سے ان کے تلوے سہلانے لگا۔ شہبا بہت اچھی لحن کے ساتھ قرآن پڑھ رہی تھی۔ اس کی اچھی لحن سن کر جہاندار بیگم نے ایک لمحے کے لیے آنکھ کھولی اور رک رک کر پوچھا:

”کیا..... بیٹیا..... قرآن..... پڑھ رہی ہیں؟“

”جی، میں پڑھ رہی ہوں۔“ شہبانے اونچی آواز میں کہا۔

”بھیا..... کہاں ہیں؟“

”آپ کے پانکتی، آپ کے پاؤں سہلارہے ہیں۔“
”اور سلیمین؟“

”یہیں ہیں۔ میرے پہلو میں۔ آپ کو پانی پلارہی ہیں۔“

”بھیا سے..... کہو..... میرے سامنے آئیں۔“

میں اٹھ کر خالہ کے سرہانے آ گیا۔ انہوں نے تھوڑی سی آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔
پھر اسی لکنت کے ساتھ بولیں: ”تو شک کے..... نیچے..... ایک چھوٹی سی..... پوٹلی ہے۔ اس
میں..... جو کچھ ہے اسی سے..... میرا..... کفن دفن کرادینا۔ اور بعد کی..... ساری..... رسمیں
بھی۔“ پھر ڈوبتی ہوئی آواز میں اٹک اٹک کر بولیں:

”اسی پوٹلی..... میں وصیت..... وصیت ہے میری۔ پتہ نہیں پوری لکھی..... یا نہیں۔ یہ
حویلی..... اب تمہاری..... ہے..... اور بٹیا کی۔“

”خالہ کی زبان موٹی ہو گئی ہے۔“ شہبا نے دھیرے سے کہا۔

”دم نکلنے لگتا ہے تو زبان موٹی ہو جاتی ہے۔“ سلیمین بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ بولی۔
تھوڑی دیر چپ رہ کر جہاندار بیگم نے اپنے نیم مردہ ہاتھ کو ہلکا سا اوپر اٹھا کر صحنچی کے
پچھلے حصے کی طرف اشارہ کیا۔ سلیمین سمجھ گئی۔ بولی بیگم صاحب صندوق کے بارے میں کچھ
بتا رہی ہیں۔ جہاندار بیگم نے گردن کو خفیف سی جنبش دی جس کا مطلب تھا سلیمین جو کہہ رہی
ہے صحیح ہے۔ پھر انہوں نے بڑی مشکل سے بولنا شروع کیا: ”اُس میں..... بھیا کی..... اچکن
اور شیروانی..... رکھی ہے۔“ پھر شہبا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”اسے اپنے پاس رکھ لینا.....
شاید..... تمہارے کہنے سے..... پہن لیں..... میرے کہنے سے تو پہنی نہیں۔“

یہ کہہ کر جہاندار بیگم نے گردن ایک طرف ڈال دی۔ شہبا نے جو پارہ پڑھ رہی تھی اسے
ختم کرنے کے بعد قرآن رحل پر رکھ دیا۔ پھر جہاندار بیگم کی گردن سیدھی کر کے دھیرے
دھیرے اُن کے رخساروں کو سہلانے لگی۔ بیچ بیچ میں وہ اُن کی پیشانی بھی چومتی اور ان کے
بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگتی۔ اس کی آنکھوں میں بھرے ہوئے آنسو جہاندار بیگم کے
رخساروں پر ٹپکتے جارہے تھے جن کی گرمی شاید انہیں اچھی لگ رہی تھی۔

رات کا آخری پہر آ پہنچا تھا۔ جہاندار بیگم کی سانس اکھڑنے لگی تھی۔ شہبانے اپنے پاس بیٹھی ہوئی سلیمان سے بہت آہستہ سے کہا: ”بوا پڑوسیوں میں جنہیں آپ جانتی ہیں، انہیں بتادیجیے۔“ یہ کہہ کر اس نے رحل پر سے قرآن اٹھا کر یاسین پڑھنا شروع کر دی اور جیسے ہی اس نے سورہ ختم کیا قریب کی مسجد سے اذان کی آواز آئی۔ شہبانے قرآن رحل پر رکھ کر وضو کیا اور تخت کے پہلو میں مصلیٰ بچھا کر صبح کی نماز پڑھنا شروع کر دی۔ نماز کے بعد اس نے بہت سی دعائیں پڑھ کر جہاندار بیگم پر دم کیں۔ پھر جوں ہی جہاندار بیگم نے آخری سانس لینا شروع کیا، شہبانے مصلیٰ سمیٹ کر ان سوروں کو پڑھنا شروع کیا جو دم نکلتے وقت پڑھے جاتے ہیں۔ ان سوروں کے ختم ہونے سے پہلے ہی جہاندار بیگم نے آخری ہچکی لی اور اُن کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ شہبانے ان کی آنکھیں بند کیں، سلیمان نے اُن کے پاؤں سیدھے کیے اور میں نے وہ چادر جس سے اُن کا آدھا جسم ڈھکا ہوا تھا، پھیلا کر اُن کے منہ پر ڈال دی۔ پچھلی میں موجود سب لوگوں نے تخت کے پایوں سے لپٹ کر رونا شروع کر دیا۔

میں الگ ایک کونے میں کھڑا تخت پر مردہ جہاندار بیگم کو دیکھنے کے بجائے اس عورت کو دیکھ رہا تھا جس نے اس حویلی میں پہلی بار میرے آنے پر پچھلی میں پڑے ہوئے ریشمی پردے کے پیچھے سے پوچھا تھا:

”ذکن کے لڑکے ہو۔“

میں اب بھی دیکھ رہا تھا وہ عورت عمدہ نقش و نگار والے قالین پر زری کے نفیس کام والی ہلکے بزرنگ کی ساری پہنے بیٹھی ہے اور اپنے خاصدان سے پان نکال کر اپنے منہ میں رکھ رہی ہے۔ پھر میرے کانوں میں جہاندار بیگم کی آواز گونجی:

”ہم تینوں اکیلے ہیں۔ میں اس بہت بڑی حویلی میں اکیلی، تم اپنے ٹھکانے پر اکیلے اور بیاپہلے بھی اکیلی تھی اور اب بھی اکیلی۔“

”خالہ آپ کا اکیلا پن تو ختم ہوا۔“ میں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا اور میرے یہ کہنے پر روتی ہوئی شہبانے ٹھٹھک کر میری طرف دیکھا۔

جن پڑوسیوں کو سلیمان نے جا کر بتایا تھا انہوں نے جہاندار بیگم کے مرنے کی خبر ان کے عزیزوں کو بھی کر دی۔ دھوپ نکلتے نکلتے جہاندار بیگم کے دور اور نزدیک کے سارے عزیز جمع

ہو گئے۔ ان میں سے زیادہ تر ایسے تھے جو کچھ دیر جہاندار بیگم کے جنازے کے پاس بیٹھے پھر گھوم گھوم کر پوری حویلی کو دیکھنے لگے اور یہاں رہنے والوں کے بارے میں معلوم کرنے لگے۔ میں جہاں تھا، وہیں گم صم کھڑا رہا۔ سلیمین اور پڑوسیوں نے کسی طرح جنازہ اٹھنے کا انتظام کیا اور جب صندوق حویلی سے باہر نکلنے لگا تو شہبانے مجھ سے کہا:

”جنازہ اٹھ رہا ہے، خالہ کو اپنے کاندھوں پر لے جائیے۔“

اور تب میں خالہ کے صندوق کو کاندھا بدل بدل کر اُس کر بلا تک لایا جہاں ان کے خاندان کے بہت سے لوگ دفن تھے۔ خالہ کے وہ عزیز جو حویلی کو گھوم گھوم کر دیکھ رہے تھے، قبر میں جنازہ اتارے جانے کے وقت یوں رو رہے تھے جیسے وہ جہاندار بیگم کی گودیوں کے کھلائے ہوئے ہوں۔ میں ایک تازہ قبر کے پہلو میں جا کر بیٹھ گیا۔ پڑوسیوں میں ان لوگوں نے جنہیں معلوم تھا میں خالہ کے یہاں آتا جاتا ہوں اور وہ میرے سامنے آتی تھیں جب مجھ سے اُن کا چہرہ دیکھنے کے لیے کہا تو میں نے کہا:

”رات بھر انہیں کا تو چہرہ دیکھا ہے۔“

یہ سن کر وہ قبر کی طرف واپس چلے گئے اور جب پٹرے لگا کر مٹی دی جانے لگی تو پھر کسی نے میرے پاس آ کر قبر کی طرف اشارہ کیا لیکن میں اسی تازہ قبر پر بیٹھا رہا اور جب قبر کی مٹی برابر ہو چکی اور سو گواروں کا مجمع چھٹ گیا اور جب گور کن بھری ہوئی بالٹی لے کر قبر پر پانی چھڑکنے کے لئے آیا تو میں نے اس سے کہا: ”یہ کام میں کروں گا۔“ پھر گور کن سے کہا:

”ایک بالٹی پانی اور لے آؤ۔“ میں جہاندار بیگم کی قبر پر پانی چھڑکتا رہا اور جب وہ پوری طرح تر ہو گئی تو میں نے گور کن سے کہا:

”شام کو آؤں گا چراغ جلانے۔“

کر بلا سے نکل کر میں حویلی کی طرف جانے کے بجائے اپنے ٹھکانے پر چلا آیا۔



جہاندار بیگم کے عزیزوں نے دوسرے ہی دن سے حویلی میں آنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اُن کی مجلسوں کی تاریخیں بھی طے کرنے لگے تھے اور یہ بھی طے کرنے لگے تھے کہ یہ مجلسیں حویلی کے اندر ہوں گی یا حویلی کے باہر۔ میں دوسرے دن شام کو حویلی گیا تو سلیمین کہیں نکلی ہوئی

تھی۔ میں نے کچھ دیر اس کا انتظار کیا اور جب وہ نہیں آئی تو میں شہبا کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ مجھے دیکھ کر کچھ دیر تک اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ پھر اس نے کچھ بولے بغیر اٹھ کر میرے لیے چائے بنائی۔

”وہ لوگ شام سے کچھ پہلے یہاں سے گئے ہیں۔“ شہبا نے مجھے چائے کی پیالی دیتے ہوئے بتایا۔
”کون لوگ؟“

”خالہ کے عزیز۔ کہہ رہے تھے حویلی کے سارے کاغذات ہمارے پاس ہیں اور بیگم صاحبہ کی دوسری جائیدادوں پر بھی ہمارا ہی حق ہے۔“ یہ کہہ کر شہبا نے بتایا: ”ان لوگوں کو آپ کا یہاں آنا پسند نہیں ہے۔ مجھ سے کہا ہے جب تک آپ کا جی چاہے رہے۔ بوا اور دوسرے نوکروں سے بھی یہی کہا ہے۔“

میں خاموشی سے چائے پیتا رہا۔
”کل تیجے کی مجلس ہے، یہیں حویلی کے اندر۔“
”آؤں گا اور خالہ کی قبر پر بھی جاؤں گا۔“
”کس وقت؟“

”مجلس کے بعد۔“

”نہیں مغرب کے بعد جائیے۔ میں بھی بوا کو لے کر آؤں گی۔ ایک دو پارے ان کی قبر پر بیٹھ کر پڑھوں گی تو کچھ سکون ملے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ مغرب کے بعد میں وہیں ملوں گا۔“ یہ کہہ کر میں نے شہبا سے کہا:
”کتابوں والے کمرے سے جتنی کتابیں لاسکتی ہو لے آؤ ورنہ روڈی کے بھاؤ بک جائیں گی۔“

”کوشش کرتی ہوں۔ اب آپ جائیے۔ کل مغرب کے بعد ملیں گے۔“
دوسرے دن میں اجنبیوں کی طرح جہاندار بیگم کے تیجے کی مجلس میں شریک ہوا۔ جو شخص تبرک تقسیم کر رہا تھا اس نے تبرک میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا:

”چالیسویں میں ضرور آئیے گا، بھولے گا نہیں۔“

شام کو مغرب کے بعد میں جہاندار بیگم کی قبر پر گیا تو شہبا سلیمین کے ساتھ وہاں پہلے سے موجود تھی۔ اس نے پہلے قبر پر فاتحہ پڑھا پھر جو پارے اپنے ساتھ لائی تھی، انہیں پڑھنا شروع کیا۔ پارے پڑھنے کے بعد وہ دیر تک قبر کے پہلو میں گم صم بیٹھی رہی۔ بڑی دیر تک اسی طرح بیٹھے رہنے کے بعد اس نے کربلا کی ایک الگ تھلگ صحنی ڈھونڈ کر مجھ سے کہا: ”آئیے یہاں بیٹھتے ہیں۔“ پھر سلیمین سے بولی: ”بوا چھوٹی والی پوٹلی کھولے۔“ سلیمین نے پوٹلی کھولی تو اس میں تین چینی کی پلیٹیں تھیں اور ایک ڈبے میں گرم گرم پراٹھے اور ایک کٹوری میں جس کا منہ اچھی طرح بند کر دیا گیا تھا، گلاوٹ کے کباب۔ شہبا نے پوٹلی والے کپڑے کو صحنی کی ہموار زمین پر بچھایا، اس پر پلیٹیں لگائیں، میرے اور اپنے لیے اس میں کباب اور پراٹھے رکھے اور ایک پلیٹ میں یہی چیزیں نکال کر سلیمین کو دیتے ہوئے کہا: ”بوا یہ آپ کے لیے۔“ سلیمین پلیٹ لے کر صحنی کے باہر جا کر بیٹھ گئی۔

”شروع کیجیے۔“ شہبا نے کہا۔ ”کیا پتہ اب ایک ساتھ دسترخوان پر کب بیٹھیں۔ میں نے خالہ کا فاتحہ الگ سے کرایا تھا۔ سارا کھانا بوا کے ایک عزیز کو جو بہت غریب ہیں بھجوا دیا۔ یہ پراٹھے اور کباب آپ کے لیے پکا لیے۔“

میں نے شہبا کے ساتھ وہ پراٹھے اور کباب کھائے اور کھاتے وقت مجھے یوں محسوس ہوا جیسے جہاندار بیگم شہبا کے پہلو میں بیٹھی کہہ رہی ہوں: ”بٹیا کے ہاتھ میں بہت مزہ ہے۔ ان کی ماں بھی ایسا ہی لذیذ کھانا پکاتی تھیں۔“ اور تب مجھے صہبا خانم کا خیال آیا۔ کیسی ہوں گی شہبا کی ماں۔ اسی کی طرح خوش رو اور اسی کی طرح نیک دل۔

”کہاں کھو گئے۔“

”کہیں نہیں۔“ میں چونکا۔

”تو کھائیے اور خالہ کو یاد کیجیے، بہت ثواب ہوگا۔“

کھانا ختم ہونے کے بعد جب شہبا جھوٹے برتنوں کو پوٹلی میں باندھ رہی تھی اور جب سلیمین کربلا کے نل سے ہم کو پانی لا کر پلا رہی تھی، شہبا نے کہا:

”اب تو بتا دیجیے اپنا ٹھکانہ۔ اب حویلی میں آپ روز روز تو آئیں گے نہیں۔“

”جہاں رہتا ہوں وہ اچھی جگہ نہیں ہے۔ کل پرسوں میں دوسری جگہ تلاش کر لوں گا۔ تب بتا دوں گا۔“

”میں بھی اُس حویلی میں زیادہ دن نہیں رہنے والی۔“

”کیوں؟“

”خالہ کے جو عزیز آئے تھے ان کے تیور ٹھیک نہیں تھے۔ اور وہ جو مہدی گنج کی طرف سے آئے تھے وہ تو بہت الٹی سیدھی کہہ رہے تھے۔“

”اچھا پہلے اپنا ٹھکانہ ڈھونڈ لوں، پھر سوچتا ہوں تمہارے بارے میں۔“ میں نے کہا۔
”اسے اپنے ساتھ لے جائیے۔“ شہبانے کپڑے میں بندھا ہوا ایک بڑا ساناشتے دان مجھے دیتے ہوئے کہا۔

”اس میں یہی کباب پراٹھے ہیں جو ہم نے ابھی کھائے ہیں۔ دو تین دن تک چل جائیں گے۔“

میں نے وہ ناشتے دان لیتے ہوئے شہبا سے کہا:

”کل سے میں امراؤ جان کی بیٹی شملہ خانم کو ڈھونڈنے نکلوں گا اور اپنا ٹھکانہ بھی۔ اس میں کئی دن لگ سکتے ہیں۔ تم پریشان مت ہونا۔“ پھر اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا: ”اگر دن زیادہ لگے تو بیچ میں حویلی آ کر سلیمین سے تمہاری خیریت معلوم کر لوں گا۔“

باتیں کرتے ہوئے ہم کربلا سے باہر نکل آئے۔ میں چلنے لگا تو شہبانے آہستہ سے مجھے، جس سواری پر وہ بیٹھ کر آئی تھی، اس کے قریب بلایا۔ پھر میرے بازو پر ہاتھ رکھ کر کچھ ٹٹولا۔ پھر بولی:

”یہ امام ضامن اسی طرح باندھے رہے گا اور وہ تعویذ بھی گلے سے الگ نہ کیجیے گا۔“
میں خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھا تو اس نے مجھے پھر روکا۔ پھر جو سپارے اپنے ساتھ لائی تھی انہیں میرے سر پر رکھ کر زیر لب کچھ پڑھا اور جو کچھ پڑھا اسے میرے منہ پر پھونک کر کہا:
”اب جائیے۔ اپنا خیال رکھیے گا۔“

○

کربلا سے اپنے ٹھکانے پر آ کر مجھے نیند نہیں آئی۔ میں رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔

دوسرے دن میں گھر سے نہیں نکلا۔ جو کچھ شہبانے میرے ساتھ کیا تھا اسے تھوڑا تھوڑا دونوں وقت کھا کر لیٹ رہا۔ جب تیسرے دن کا سورج نکلا تو میں نے طے کیا کہ آج شمیلہ خانم کی تلاش پر نکلوں گا۔ لیکن میرا دل کسی کام میں لگ نہیں رہا تھا، اس لیے کل پرٹال دیا۔ پھر سوچا گھر میں پڑے رہنے سے اچھا ہے باہر نکلا جائے۔ باہر نکل کر میں نے یہ نہیں طے کیا مجھے کس طرف جانا ہے۔ قدم جس طرف اٹھ رہے تھے، میں اسی طرف بڑھ رہا تھا۔ بہت دیر بعد جب میں نے اپنے سامنے دھوپ میں چمکتی ہوئی ریت دیکھی اور پانی پر بہت سی کشتیاں تیرتی نظر آئیں تو میں نے جانا میں گوشتی کے کنارے آ پہنچا ہوں۔ میرے پاؤں اٹھتے رہے اور میں گوشتی کے کنارے کنارے چلتا رہا۔ چلتے چلتے میں نے سوچا اسی طرف سے نجم النساء عرف امراؤ جان کے بابا کا بجزا دلکشا کی طرف جاتا ہوگا۔ جہاں میں تھا اسی کے آگے بیگم کوٹھی تھی جس کے احاطے میں غدر سے کچھ پہلے شرف النساء نے ایک امام باڑہ اور اسی سے ملی ہوئی مسجد بنوائی تھی۔ شرف النساء نصیر الدین حیدر کی انگریز ملکہ ولایتی بیگم کی بڑی بہن تھیں۔ بیگم کوٹھی کے آگے دریا کے بالکل قریب سعادت علی خاں کی بنوائی ہوئی کوٹھی فرح بخش تھی۔ اسی نواح میں اُن انگریز افسروں کی قیام گاہیں بھی تھیں جنہوں نے اودھ کی حکومت کو ٹھیک سے چلنے نہیں دیا تھا۔ گوشتی کے کنارے کنارے چلتے ہوئے میں انگریز افسروں کے ٹھکانوں والی اس عمارت میں داخل ہوا جو ایک انگریز ریڈیڈنٹ کے یہاں رہنے کی وجہ سے ریڈیڈنسی کہلائی جانے لگی تھی۔ ریڈیڈنٹ نے جب اس تین منزلہ عمارت میں رہنا شروع کیا تھا تو یہاں سب کچھ موجود تھا۔ طعام خانے، چوکیاں، توپ خانے اور ہسپتال، ڈاک خانہ، گرجا گھر، جیل خانہ اور مطبخ، جانور خانہ، باغات، فوارے اور اسی کے ساتھ اور بہت کچھ۔ میں اُس زمانے کے اس فرنگی شہر میں گھوم گھوم کر کھنڈر بن جانے والے حصوں کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا غدر میں کیسا گھمسان کارن پڑا ہوگا یہاں۔

لوگ بھول گئے تھے یہاں کوئی مسجد اور امام باڑہ بھی ہے۔ یہاں آ کر میں ٹوٹی ہوئی عمارتوں پر گولیوں اور توپ کے گولوں کے چھوٹے بڑے نشان دیکھتا ہوا امام باڑے کے صحن میں آ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھ کر میں چھتوں سے محروم ہو جانے والے اس امام باڑے کے دروں اور محرابوں میں گردش کرنے لگا اور اس کے ستونوں کی اُن لکھوریوں کو چھو چھو کر دیکھنے لگا جن کا موٹی پرتوں والا پلاستر گولیوں کی بوچھاروں سے اکھڑ گیا تھا۔ امام باڑے

سے نکل کر میں اس سے متصل مسجد کی چوبلی سیڑھیاں چڑھ کر اس کے دالان میں آ کر بیٹھ گیا اور دیر تک اس کے ٹوٹے ہوئے گنبدوں اور میناروں کو دیکھتا رہا۔ میں نے سوچا کسی زمانے میں یہ جگہیں لوگوں سے بھری رہتی ہوں گی۔ امام باڑے میں عزاداروں کا ہجوم رہتا ہوگا اور مسجد بھی نمازیوں سے آباد رہتی ہوگی۔ لیکن اب امام باڑہ اور مسجد دونوں ویران پڑے تھے۔ مسجد کے صحن میں بیٹھ کر میں نے بہت دور پر نشیب میں بنی ان انگریز افسروں کی قبروں کو دیکھا جو حضرت محل کے سپاہیوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ میں ان قبروں کے قریب گیا تو ان پر عجیب عجیب عبارتیں لکھی تھیں:

لیفٹیننٹ والٹر ڈگلس بلی

۲۳ اگست ۱۸۵۸ء کو ۲۲ سال کی عمر میں

امام باڑہ آصف الدولہ میں لڑتے ہوئے اپنی جان دی۔

یہ نشان ان کے ہم پیشہ افسروں نے ان کی یاد میں تعمیر کرایا ہے۔

جوڈیشل کمشنر کولنگ وڈاومانی

۱۹ مارچ ۱۸۱۳ء کو پیدا ہوئے۔ ۸ جولائی ۱۸۵۷ء کو

انگریزی فوج کی طرف سے لڑتے ہوئے قتل ہوئے۔

پسماندگان میں ایک بیوہ اور چھ بچے ہیں۔

میں ایسے بہت سے کتبوں کو بہت دیر تک پڑھتا رہا۔

بھگدڑ کے بعد ویران ہو جانے والے اس بہت بڑے علاقے میں اب چاروں طرف ہرے بھرے درخت تھے اور دور تک خوبصورت پھولوں کی روشیں۔ باہر سے آنے والے سیاحوں اور اس شہر میں چھپ چھپ کر محبت کرنے والوں کے لیے اس جگہ کی خاص اہمیت تھی۔ یہ محبت کرنے والے جوڑے یہاں آتے اور کھنڈر بن جانے والی عمارتوں کے ستونوں کی آڑ میں اپنی ہیجانی حالتوں سے نجات پانے میں کامیاب ہو جاتے۔ میں بیگم کوٹھی کے احاطے میں چاروں طرف گھوم گھوم کر انگریز افسروں کے تباہ ہو جانے والے مکانوں کو دیکھتا رہا۔ اس کوٹھی

کے احاطے سے نکل کر میں کوٹھی فرح بخش کی طرف آیا اور اسی راستے سے شاہ نجف ہوتا ہوا سکندر باغ کی طرف آ نکلا۔ یہاں سے اندر اندر غیر آباد راستوں سے ہوتا ہوا دلکشا پہنچ گیا اور بہت دیر تک کچھ کچھ باقی رہ جانے والی اس ویران عمارت کی سیڑھیوں پر بیٹھا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا میں شہر میں اس طرح کیوں گھوم رہا ہوں۔ جب ماں مری تھی اس وقت بھی میں اسی طرح شہر کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا تھا۔ میں نے سوچا میں دلکشا کی پشت پر گومتی کے اس کنارے کو کیوں دیکھ رہا ہوں جس کے رمنے میں نواب علی نقی بہادر شکار کھیلنے جاتے تھے۔ اب یہ علاقہ پہلے کی طرح ویران نہیں تھا۔

جب دن کا تیسرا پہر ڈھلنے لگا تو میں اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ شام ہوتے ہوتے جن راستوں سے دلکشا تک گیا تھا، انہیں راستوں سے ہوتا ہوا واپس اپنے ٹھکانے پر آ گیا۔ بستر پر جانے سے پہلے میں نے طے کیا کل شملہ خانم کو ڈھونڈنے ضرور نکلوں گا۔



صبح اٹھ کر میں نے سوچا شملہ خانم کی تلاش کہاں سے شروع کروں۔ پہلے وہیں جاؤں تحسین کی مسجد سید نقی کے پاس۔ انہوں نے ہی سید حسین کے کڑے کے بارے میں بتایا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ اس کڑے کے اندر حیدر حسین کا پھانک تھا۔ سرفراز گنج سے امراؤ جان اسی حیدر حسین کے پھانک میں آئی تھیں اور بڑی خاموشی سے یہاں رہنے لگی تھیں۔ میں نے سوچا پہلے سید نقی کے پاس جاؤں اور انہیں بتاؤں امراؤ جان واقعی تھیں اور ڈھلتی ہوئی جوانی میں حیدر حسین کے پھانک میں آ کر رہی تھیں۔ سو میں سہ پہر سے کچھ پہلے تحسین کی مسجد جا پہنچا۔ سید نقی پہلے ہی کی طرح مسجد کے دالان میں منبر کے قریب چٹائی پر لیٹے تھے۔ میں نے ان کے قریب پہنچ کر انہیں سلام کیا تو انہوں نے مجھے غور سے دیکھا۔

”پہچانا؟“ میں نے کہا۔

”پہچان لیا۔ کوئی تین چار مہینے پہلے آئے تھے آپ۔“

”جی۔ میں سمجھا تھا شاید بھول گئے۔“

”بھولوں گا کیسے۔ آپ نے ایسی باتیں پوچھی تھیں کہ بھول ہی نہیں سکتا۔ یوں بھی اوپر

والے کی مہربانی سے نہ بصارت کمزور ہوئی ہے نہ حافظہ۔“ سید نقی نے پہلے ہی جیسے تیوروں کے

ساتھ کہا۔ ”ایک بار جس سے مل لیتا ہوں، اسے عمر بھر یاد رکھتا ہوں۔“ یہ کہہ کر بولے:

”فرمائیے! اب کس لیے آئے ہیں؟“

”امراؤ جان کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔“

”کس سے؟“

”مرزا رسوا کی کتاب سے۔“

”مرزا رسوا کی کتاب سے؟ میں سمجھا نہیں۔“

”مرزا رسوا نے ایک اور کتاب لکھی تھی اور اسی میں سچا قصہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اسے چھپوایا نہیں۔“

”اچھا!“

”اور وہ کتاب مجھے مل گئی ہے۔ اور اس میں..... امراؤ جان نے بتایا ہے وہ یہیں آ کر رہی تھیں..... سید حسین کے کٹرے میں۔“

”تو!“

”جس وقت وہ یہاں آ کر رہی تھیں، ایک جوان بیٹی بھی تھی ان کے ساتھ۔“

”خوب۔ تو؟“

”قصہ یہیں پر ختم ہو گیا۔ اب یہ نہیں معلوم ان کی وہ بیٹی کہاں ہیں۔ زندہ ہیں یا.....“

”اللہ کو پیاری ہو گئیں..... بھئی اس بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم۔ البتہ کچھ نمازی

میری ہی عمر کے یہاں آتے ہیں چھڑی ٹیکتے ہوئے۔“ سید نفی نے کہا۔ پھر بولے: ”جوانی ان

کی بہت رنگینیوں میں گزری اب اللہ والے ہو گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے انہیں کو معلوم ہو۔“

”کس وقت آتے ہیں؟“

”مغرب سے کچھ پہلے۔ دونوں نمازیں پڑھنے کے بعد دیر تک تلاوت کرتے ہیں۔“ یہ

کہہ کر سید نفی ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولے: ”یہ بھی عجیب بات ہے۔ جوانی میں بھرے

بھرے جسموں کی عورتیں دیکھنے آتے تھے اب اللہ سے لولگانے آتے ہیں۔“ پھر کہا:

”اب مغرب میں دیر ہی کتنی ہے۔ دو چار گھڑی بعد وہ سب یہاں ہوں گے۔ اُن سے

پوچھ لیجئے گا۔“ یہ کہہ کر تھوڑا سا مسکرائے پھر بولے:

”میاں یہ آپ امراؤ جان کے پیچھے کیوں پڑے ہیں؟“
 ”یہ بات مجھ سے اور بھی لوگوں نے کہی ہے۔ جو ان سے کہا ہے، وہی آپ سے کہہ رہا ہوں۔“
 ”ان سے کیا کہا ہے؟“
 ”سچ سامنے آنا چاہیے۔“

یہ کہہ کر میں مسجد کے چبوترے پر بیٹھ کر مغرب کے وقت کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد سورج کی روشنی کم ہونے لگی اور جب جھٹ پٹا ہوا تو مسجد کے گنبدوں اور میناروں کے موٹکوں میں جنگلی کبوتر آ آ کر بیٹھنے لگے۔ ایک کے بعد ایک پرا آتا اور ان موٹکوں میں غائب ہو جاتا۔ میں یہ منظر دیکھ ہی رہا تھا کہ نوے برس کے سیدنتی نے مسجد کے صحن میں اس کی سب سے چوڑی محراب کے سامنے کھڑے ہو کر بڑی خوش کنی کے ساتھ اذان دینا شروع کی۔ ان کی آواز مسجد کے بہت بڑے صحن اور اس کے وسیع دالان میں گونج رہی تھی۔ نمازیوں نے اپنی صفیں آراستہ کیں تو ایک صف میں میں بھی کھڑا ہو گیا۔ جب دونوں نمازیں ختم ہوئیں تو سیدنتی مجھے اپنی ہی عمر کے ایک بزرگ کے پاس لے گئے اور ان سے بولے:

”یہ صاحبزادے وہ جو امراؤ جان تھیں، مشہور طوائف، ان کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔“

”ان کے بارے میں کیا پوچھنا، انہیں تو سب جانتے ہیں۔“ انہوں نے کہا۔ ”جب اپنے پیٹھے میں ان کا اسم ہوا تو کوٹھا چھوڑ کر.....“
 ”کوٹھا چھوڑ کر.....؟“

”بھاگ نکلیں ایک ڈاکو کے ساتھ۔“

”پھر انہوں نے اسی ڈاکو سے نکاح کیا اور ان کے یہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی۔“ میں نے کہا۔

”جانتا ہوں، یہ بھی جانتا ہوں۔“

”تو وہ بیٹی اب کہاں ہے؟“

”میاں صاحبزادے میں تو کوٹھوں پر زیادہ گیا نہیں۔ میرے ایک دوست نواب سلیمان علی خاں ناچ گانے کے رسیا تھے۔“ وہ بولے۔ ”پھر کہا: ”حیدر گنج سے چھپ چھپا کر چوک آیا کرتے تھے۔ ایک دن ترنگ میں کہنے لگے امراؤ جان ناچ گانے سے تائب

ہو گئی ہیں۔ اس پٹھے کا بڑا نقصان ہوا ہے۔“ پھر اسی ترنگ میں بتایا: ”یہاں سید حسین کے کمرے میں رہتی ہیں۔ آج کل میں وہیں کسی دوسرے مکان میں جانے کو ہیں۔ مجھے اور جو ان کے پرانے آنے والے تھے، انہیں قسم دی ہے کہ یہ بات عام نہ ہونے پائے۔ ایک بیٹی بھی ہے ان کی آٹھ دس برس کی۔“

”جس مکان میں جانے کو تھیں، اس کے بارے میں بھی آپ کے دوست نے بتایا۔“ میں نے پوچھا۔

”بالکل بتایا۔“

”یہ جو ڈاکخانہ ہے، عطر والے کارخانے کے پہلو میں۔ اسی سے ملے ہوئے مکان میں گئی تھیں۔“

”یہ سن کر میں اچھل پڑا۔“

”یہی بتایا تھا انہوں نے؟“

”جی یہی بتایا تھا۔ ہو سکتا ہے ان کی بیٹی ابھی رہتی ہوں وہاں۔ میں تو اس گلی کی طرف جاتا نہیں۔“ وہ بزرگ بولے۔ پھر کہا: ”رہتی ہوں گی تو یہی کوئی ساٹھ پینسٹھ یا اس سے کچھ اوپر کی ہوں گی۔“

— لمبی دلی دلوں میں

اور تب مجھے یاد آیا کہ بہت پہلے اسی مکان کی ڈیوڑھی میں بہت شان سے بیٹھی ایک عورت نے مجھ سے نہاری کچے منگوائے تھے اور جب میں دوبارہ انہیں پوچھنے گیا تھا تو وہ مکان چھوڑ کر جا چکی تھیں اور وہی شمیلہ خانم تھیں۔

”نہیں، اس مکان میں اب نہیں رہتیں۔“ میں نے اُن بزرگ سے کہا۔

”یہ کیونکر معلوم ہوا آپ کو؟“

”بہت پہلے، جو مکان آپ بتا رہے ہیں، میں نے انہیں وہاں دیکھا تھا۔ جب دوبارہ ان کے بارے میں پوچھا تو وہ جا چکی تھیں وہاں سے۔“

”تو میاں ڈھونڈیے۔ پہچان تو گئے ہیں آپ انہیں۔“

”جی۔ جو کچھ آپ نے بتایا، اس کا شکریہ۔“ میں نے کہا۔ پھر سید نقی سے کہا: ”اور آپ کا بھی شکریہ۔“

مسجد سے باہر نکل کر میں نے سوچا کہاں ڈھونڈوں شمیلا خانم کو۔ میں انہیں دیکھ کر پہچان تو لوں گا لیکن یہ کیسے معلوم ہو کہ وہ دوسری کون سی جگہ رہنے لگی ہیں۔ پھر میں نے سوچا سردار جہاں کی طرف چلوں شاید اس دوران انہیں کچھ معلوم ہوا ہو۔ اور تب میرے پاؤں چڑیا بازار کی طرف بڑھنے لگے۔ وہاں پہنچ کر کئی زینے چڑھنے کے بعد جب میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو سردار جہاں کی بھانجی ہینگا نے تھوڑا سا دروازہ کھولا اور مجھے دیکھتے ہی ٹھٹھک کر بولی:

”آپ وہی ہیں جو تین چار مہینے پہلے آئے تھے؟“

”جی۔“

”اور وہی سب پوچھنے آئے ہیں جو پہلے پوچھ گئے تھے؟“

”میں چپ رہا۔“

”اُن باتوں کو بتانے والی اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔“ ہینگا نے کہا۔

”جی.....؟“

”ایک مہینہ ہوا ان کا انتقال ہو گیا۔ پانچ دن بعد ان کا چہلم ہے۔“ یہ بتا کر ہینگا نے پورا دروازہ کھول کر کہا: ”آئیے اندر آئیے۔“

میں اندر آ کر چھوٹے پایوں کے اسی تخت پر بیٹھ گیا جس پر بیٹھ کر میں نے دیر تک سردار جہاں سے باتیں کی تھیں۔

”کیا ہوا تھا انہیں، جب آیا تھا تو اچھی بھلی تھیں۔“

”اصل میں آپ نے کرید کرید کر اُن سے بہت سی باتیں پوچھی تھیں۔“ ہینگا نے ہلکی سی ناگواری کے ساتھ کہا۔ پھر بولیں: ”میں نے کئی بار چاہا آپ کو روک دوں لیکن خالہ کا منہ دیکھ کر خاموش رہی۔ خالہ پرانی باتیں بھول چکی تھیں۔ آپ نے انہیں پھر سے وہ باتیں یاد دلادیں۔ بس وہ انہیں کو لے کر بیٹھ گئیں۔ اُسی میں ان کی طبیعت بگڑ گئی۔“

”میں بہت شرمندہ ہوں۔“

”نہیں اس میں آپ کی کوئی غلطی نہیں۔ اُس وقت آپ کو معلوم تھوڑی تھا، ہمارا آگے پیچھا کیا ہے۔“ ہینگا نے کہا اور کہہ کر چائے بنانے چلی گئیں۔ چائے پینے کے دوران ہم ایک دوسرے سے زیادہ نہیں بولے۔ کچھ دیر بعد میں نے کہا: ”تو اب اس مکان میں.....“

”ہم دونوں اکیلے ہیں۔ میں اور کتو۔“

”بہت برے دن ہیں۔“

”جی۔ میں سمجھی نہیں۔“

”پچھلے ہفتے جہاندار بیگم، شاید آپ انہیں جانتی ہوں.....“

”وہ مشک گنج والی؟“

”جی۔ ان کا انتقال ہو گیا۔ ہماری ماں کو سگی بہن کی طرح چاہتی تھیں۔ اسی تعلق سے

انہوں نے مجھے اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔“

”خالہ بڑی محبت سے ذکر کرتی تھیں ان کا۔ بہت نیک عورت تھیں۔“ ہینگا نے کہا۔ ”ان

کی تو حویلی بہت بڑی ہے۔“

”اب دوسرے اس پر قابض ہیں۔“

”دوسرے کون؟“

”ان کے رشتے دار۔“

”ہمیں بھی یہی ڈر ہے۔“

”مطلب؟“

”کچھ دعویدار اس مکان کے بھی ہیں۔ ہم کچھری عدالت کے چکر میں نہیں پڑنا

چاہتے۔“ ہینگا نے کہا: پھر بولیں: ”ویسے بھی ہم خالہ کے سکے نہیں ہیں۔“ یہ کہہ کر پوچھا:

”اچھا یہ بتائیے آپ کس لیے آئے ہیں؟“

”خالہ آپ کی زندہ ہوتیں تو بتاتا کس لیے آیا ہوں۔“

”اب آئے ہیں تو کچھ بتائیے۔“

”آپ ناراض تو نہیں ہوں گی۔ کچھ ویسی ہی باتیں ہیں جیسی خالہ سے کر کے گیا تھا۔“

یہ سن کر ہینگا تھوڑی سی مسکرائیں۔ پھر بولیں:

”کہہ ڈالیں کیا کہنا ہے۔“

”امراؤ جان کی بیٹی کا پتہ چل گیا ہے۔“

”یہ تو خالہ نے آپ کو بتایا تھا۔“

”جی۔ اور یہ بھی پتہ چل گیا ہے وہ چوک میں کہاں رہتی تھیں۔“
”پھر؟“

”جہاں رہتی تھیں، بہت پہلے وہ مکان چھوڑ کر چلی گئیں۔“
”تو؟“

”یہ نہیں معلوم ہو پا رہا ہے اب کہاں رہنے گئی ہیں۔“
”دیکھیے پانچ دن بعد خالہ کا چہلم ہے۔ اس دن خالہ کی ایک بھانجی، سگی بھانجی اقبال بیگم، سب انہیں رجو کہتے ہیں، سوز پڑھنے آئیں گی۔“ ہینگا نے کہا۔ ”خالہ سے ان کی بنتی نہیں تھی۔ اس لیے وہ یہاں کم کم آتی ہیں۔ اور جب سے رجواڑے میں گئیں تب سے تو آئی ہی نہیں۔“

یہ بتانے کے بعد ہینگا نے کہا: ”اب مجلس ہے خالہ کی تو آئیں گی اور سوز بھی پڑھیں گی۔ میں ان سے معلوم کروں گی۔ شاید انہیں کچھ معلوم ہو۔“ پھر چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے بولیں:

”آپ مجلس کے دوسرے دن آئیے۔ کچھ معلوم ہوا تو بتاؤں گی۔“
میں نے ہینگا کا شکریہ ادا کیا اور جب چلنے لگا تو انہوں نے کہا:
”کبھی کبھی یوں بھی آ جایا کیجیے۔ آپ سے باتیں کر کے اچھا لگتا ہے۔“ پھر بولیں:
”دوسروں سے ہمارا ملنا جلنا بہت کم ہے۔ آپ کو ہم لوگوں کی بہت سی باتیں معلوم ہو گئی ہیں۔ آئیں گے تو اور بہت سی باتیں معلوم ہوں گی۔“
”ضرور آؤں گا۔“

”آئیں گے تو اچھا لگے گا۔ میں انتظار کروں گی۔“ یہ کہہ کر ہینگا نے دروازہ اس وقت تک کھلا رکھا جب تک میں آخری زینے تک نہیں پہنچ گیا۔

میں سردار جہاں کے مکان سے نکل کر مجلس کے دن کا انتظار کرنے لگا۔ اُن کی مجلس میں ابھی پانچ دن تھے۔ میں نے سوچا میں حویلی جا کر شہبا کی خیریت معلوم کر لوں۔ پھر سوچا جہاندار بیگم کے چالیسویں میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ اب اسی دن جاؤں گا، سلیمان سے شہبا کی خیریت معلوم کروں گا اور اگر سب کچھ ٹھیک رہا تو دوسرے دن اس سے مل بھی لوں گا۔

سردار جہاں کی مجلس کے دوسرے دن میں ہنگا سے ملنے پہنچ گیا۔ وہ شاید میرا انتظار ہی کر رہی تھیں۔ دروازہ کھولتے ہی بولیں:

”آئیے آئیے۔ کچھ کچھ معلوم ہوا ہے۔ بیٹھے بتاتی ہوں۔ پہلے آپ کے لیے چائے لے آؤں۔“

ہنگا چائے لے کر آئیں تو اس کے ساتھ شیرمال بھی تھی۔ چائے کی پیالی مجھے دیتے وقت انہوں نے شیرمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”یہ خالہ کی مجلس کا تبرک ہے، اسے بھی چکھ لیجیے۔“ پھر بولیں:

”خالہ کی طرح رتو آ پا کو بھی، ہم لوگ انہیں یہی کہتے ہیں، اس بارے میں بات کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔“ ہنگا نے چائے کا ایک گھونٹ لیا پھر کہا: ”لیکن میں آپ کو زبان دے چکی تھی اس لیے ان کے پیچھے پڑ گئی اور تب انہوں نے بڑی مشکل سے بتایا.....“

”کیا بتایا؟“ میں نے بے صبری سے پوچھا۔

”بتایا وہ جو عطر کے کارخانے کے پہلو والا مکان ہے اسے چھوڑ کر وہ عنبر گنج چلی گئیں۔“

”یہ کہاں ہے؟ نام تو سنا ہے۔“

”شاید تحسین گنج کے آگے۔ شمیلہ خانم، یہی نام ہے ان کا، آپ نے نام نہیں بتایا تھا۔ اپنی ماں کی طرح سوز بہن اچھا پڑھتی تھیں اس لیے آ پا اپنے یہاں کی بڑی مجلس میں انہیں کو سوز پڑھنے کے لئے بلاتی تھیں اور لوگ انہیں سوز خوان ہی سمجھتے تھے۔“ ہنگا بتاتی رہیں۔ ”آ پا کہہ رہی تھیں جب وہ سوز پڑھنے آتیں تو لوگ کہتے یہ کیسی میرا شن ہے جس کا رنگ اتنا صاف ہے۔“ یہ بتا کر میری پیالی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”آپ باتیں سن رہے ہیں، چائے نہیں پی رہے ہیں۔“

”پی رہا ہوں، پی رہا ہوں، آپ بتائیں۔“

”تو ان شمیلہ خانم نے آ پا سے بہت سی باتیں بتائیں۔ انہیں میں مکان چھوڑ کر عنبر گنج جانے کی بات بھی بتائی۔ آ پا جلدی میں تھیں۔ بہت کچھ تو بتایا نہیں بس یہ کہا کہ نجم النساء نے، شمیلہ خانم کی ماں کا اصلی نام یہی تھا، اپنی بیٹی کو اپنی راہ پر نہیں لگایا۔ بہت دنوں تک وہ ماں کی

جمع کی ہوئی رقم سے کام چلاتی رہیں لیکن جب پیسہ ختم ہونے لگا تو جو کچھ ماں سے سیکھا تھا اس سے پیسہ کمانے لگیں۔ اسی میں کسی آنے والے سے عشق کر بیٹھیں، اس سے نکاح کیا اور وہ جو کچھ دن کے لیے ناچ گانا شروع کیا تھا، چھوڑ دیا۔ جس سے شادی کی تھی اس نے طرح طرح کے بہانوں سے شمیلا خانم سے اچھی خاصی رقم اینٹھ لی۔ پھر ایک دن جب شمیلا خانم ماں بننے والی تھیں چلتا بنا۔ اُس وقت شمیلا خانم کے پاس دائی تک کو دینے کے پیسے نہیں تھے۔ شمیلا خانم نے جانے کیسے، اب یہ سب تو جب وہ آپ کو ملیں گی تو بتائیں گی اپنی بچی کو اسی مکان میں بڑا کیا، پڑھایا لکھایا اور جب اس جوان لڑکی پر آوازے کسے جانے لگے تو وہ مکان چھوڑ دیا۔“

رکے بغیر اتنا بتانے کے بعد ہنگا نے کہا:

”اب آپ عنبر گنج جا کر انہیں تلاش کیجیے۔“

”آپ نے اقبال بیگم سے، ان کے نہ چاہنے کے باوجود اتنا معلوم کر لیا، اس کا بہت

بہت شکریہ۔“ میں نے کہا: ”اب میں چلتا ہوں۔ کسی دن پھر آؤں گا۔“

”آج کھانا ہمارے ساتھ کھا لیجیے۔“ ہنگا نے مجھے روکا۔

”جی شکریہ۔ کسی دن اور۔“

”آج کھاتے تو ہمیں اچھا لگتا۔“

”اصل میں کام بہت ہیں۔ بہت سی جگہوں پر جانا ہے۔“

”ٹھیک ہے جیسی آپ کی مرضی۔ لیکن آپ کو بتادیں آپ دوبارہ آئیں اور ہم یہاں نہ

ملیں تو افسوس نہ کیجیے گا۔“

”کیا مکان.....؟“

”چھینا جا رہا ہے۔ آپ کو بتایا تھا سردار جہاں ہماری سگی خالہ نہیں ہیں۔ سگی خالہ وہ اقبال

بیگم کی تھیں۔ اور اقبال بیگم کب یہاں سے ہمارا سامان پھنکو ادیں، کچھ ٹھیک نہیں۔“

”تو میں دو دن بعد آؤں گا۔“

”اس دن کیا پکاؤں آپ کے لیے۔“

”کچھ بھی جو آپ شوق سے کھاتی ہوں۔“ میں نے کہا اور اس سے پہلے کہ ہنگا کچھ کہیں

میں تیزی سے زینے اترتا ہوا باہر نکل آیا۔

ساقی از باب حقوق

PDF BOOK COMPANY

مدد، مشاورت، تجاویز اور شکایات:

Muhammad Husnain Siyalvi

0305-6406067

Sidrah Tahir

0334-0120123

Muhammad Saqib Riyaz

0344-7227224



عنبر گنج تحسین گنج کے جنوب میں ہے۔ سرفراز گنج سے ترچھی سمت میں اور اس کا رقبہ بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔ وہاں پہنچ کر شملہ خانم کو ڈھونڈنا آسان نہیں تھا۔ میں نے سوچا پہلے کسی ایسے عزیز یا ملاقاتی کو ڈھونڈا جائے جو اس طرف کا ہو یا کبھی وہاں رہ چکا ہو یا کوئی ایسا ہو جو ایک آدھ بار وہاں جا چکا ہو اور اس طرف کے گلی کو چوں سے واقف ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا شملہ خانم نے اتنی دور کا محلہ کیوں آباد کیا۔ پھر خود ہی خیال آیا کہ اس طرح وہ اپنی ماں اور نانا کے محلوں سے قریب رہنا چاہتی ہوں گی۔ دور کا محلہ ہونے کی وجہ سے میں اس طرف کبھی نہیں گیا تھا، اسی لیے مجھے وہاں کے گلی کو چوں کا اندازہ نہیں تھا۔

”تو پہلے کسی ایسے کو ڈھونڈا جائے جو اس محلے سے مانوس ہو اور جب وہ مل جائے تو عنبر گنج کی طرف نکلا جائے۔“ میں نے سوچا اور یہی سوچتے ہوئے جب میں بستر پر لیٹنے گیا تو مجھے جہاندار بیگم کی حویلی کے منظر یاد آنے لگے۔ مجھے اُن سے اپنی پہلی ملاقات یاد آئی۔ کتابوں کے کمرے میں دیر دیر تک کتاب کا ڈھونڈنا یاد آیا۔ وہ لڑکی یاد آئی جو مجھے جہاندار بیگم کی چھٹی تک لے گئی تھی۔ مجھے یاد آیا جہاندار بیگم کس طرح میری پسند کے کھانے پکوا کر مجھے کھلاتی تھیں۔ کس طرح انہوں نے مجھے شہبا کے نور باڑی والے مکان میں بھیجا تھا۔ کس طرح شہبانے وہاں ہمارے لیے چائے بنائی تھی اور اپنی بغیا کے توڑے ہوئے امرودوں کے کچالو کھائے تھے۔ کس طرح اس نے حویلی میں آ کر الگ اپنا ٹھکانہ بنایا تھا اور کس طرح وہ چولہا تیار کیا تھا جس پر میرے لیے وہ چائے بنا کر لاتی تھی۔ مجھے یاد آیا کس طرح میں نے حکیم احمد رضا سے جہاندار بیگم کی بگڑی ہوئی حالت کے بارے میں بتایا تھا اور کس طرح انہوں نے افسوس کرتے ہوئے دوا کے بجائے دعا کے لیے کہا تھا۔ مجھے وہ ہولناک رات یاد آئی جب شہبا قرآن کھولے جہاندار بیگم کے سرہانے بیٹھی تھی اور کس طرح جہاندار بیگم سینے میں رکتی ہوئی سانسوں کے درمیان اپنی آبائی حویلی مجھے اور شہبا کو سونپ رہی تھیں۔

دوسرے دن میں نے آس پاس کے لوگوں سے عنبر گنج کے بارے میں پوچھنا شروع کیا۔ ”وہ تو یہاں سے بہت دور ہے۔“ ایک شناسا نے کہا۔ ”پہلے بہت کم آبادی تھی لیکن اب لوگ بہت بس گئے ہیں جا جا کر۔“

ایک دوسرے جاننے والے نے کہا: ”کبھی کبھار گیا ہوں اُس طرف۔ بہت پھیلا ہوا علاقہ ہے۔“

ایک تیسرا جو بہت بار اس محلے میں آیا گیا تھا بولا: ”دیکھا بھالا علاقہ ہے۔ میں چل سکتا ہوں تمہارے ساتھ لیکن کام کیا ہے وہاں۔“

”جاننے والوں میں کوئی وہاں رہتا ہے۔ اُسی کو ڈھونڈنے جانا ہے۔“

”تو چلے جاؤ۔ سب سے آسان طریقہ بتاتا ہوں۔ آس پاس کی دکانوں پر نام اور چہرہ مہرہ بتا کر معلوم کرنا پتہ چل جائے گا۔“

”یہی کروں گا۔“



میں جہاندار بیگم کے چالیسویں کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ ابھی اس میں دس بارہ دن باقی تھے۔ میں نے سوچا دس بارہ دن میں تو شمیلہ خانم کا ٹھکانہ معلوم ہو جائے گا۔ میں حویلی جاؤں گا تو شہبا کو بتاؤں گا جس کام میں ہم اتنے دن سے لگے ہوئے تھے اس میں کامیابی مل گئی ہے۔ میں نے شمیلہ خانم کا ٹھکانہ ڈھونڈ لیا ہے۔

میں نے سردار جہاں کی بھانجی سے دو دن بعد آنے کے لیے کہا تھا۔ اس لیے آج دوپہر سے کچھ پہلے میں ان کے مکان کی طرف چل پڑا۔ میرے وہاں پہنچنے پر انہوں نے دروازہ یوں کھولا جیسے وہ میرے انتظار میں ہوں اور انہیں یقین ہو کہ آنے والا میں ہی ہوں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بولیں:

”مجھے معلوم تھا آپ ہی ہیں۔ ہم صبح سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

میں اندر پہنچا تو سردار جہاں والے تخت پر دسترخوان بچھایا جا چکا تھا لیکن کھانا ابھی نہیں لگایا گیا تھا۔

”آپ بیٹھیے۔ کھانا تیار ہے میں لگاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر ہینگا نے کمو کو آواز دی اور تھوڑی ہی دیر بعد دسترخوان پر تین چار طرح کے کھانے لگا دیے گئے۔

”آپ نے کیوں اتنا تکلف کیا۔“

”نہیں تکلف کچھ نہیں کیا۔ جو چیزیں مجھے اچھی طرح پکانا آتی تھیں، پکالیں۔“

”کون سی چیزیں آپ اچھی طرح پکالیتی ہیں۔ کھانوں سے مجھے بھی دلچسپی ہے۔“
”رومالی کباب اور بادشاہ پسند دال۔“

”یہ تو خاص ہمارے خاندان کے کھانے ہیں۔“ میں نے کہا۔
”آپ شاید بزازے میں رہتے ہیں۔“
”جی۔“

”خالہ نے وہیں، ہو سکتا ہے آپ کے عزیزوں میں جا کر یہ چیزیں پکانا سیکھ لی ہوں۔“
ہینگا نے کہا۔ ”اور میں نے خالہ سے سیکھ لیا۔ شروع کیجیے۔“ ہینگا نے کمو کو اپنے ساتھ دسترخوان پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

میں نے پہلی بار اپنے خاندان کے باہر یہ کھانے کھائے تھے اور ان کے ذائقے میں کوئی فرق نہیں پایا تھا۔

”میری ماں اور ممائی ہی یہ کھانے اچھی طرح پکانا جانتی تھیں، اب تیسری آپ ہیں۔“
میں نے ہینگا سے کہا۔ ”ذائقہ بھی وہی ہے جو اُن دونوں کے ہاتھ میں تھا۔“
”شکریہ۔ مجھے بہت خوشی ہے آپ کو میرے ہاتھ کے کھانے اچھے لگے۔“

”میں نے پرانی باتیں چھیڑ کر آپ کی خالہ کو دکھ پہنچایا اور آپ کو بھی۔“ کھانا ختم ہوتے ہی میں نے ہینگا سے کہا۔ ”یہ سوچ کر مجھے بہت شرمندگی ہوتی ہے۔“
”اب جانے دیجیے ان باتوں کو۔ بتا چکی ہوں خالہ کو وہ باتیں کرنا جو آپ ان سے کر رہے تھے، پسند نہیں تھیں، وہ نہیں چاہتی تھیں خاندان کے باہر کے لوگ ان باتوں کو چھیڑیں۔“

”آپ نے بتایا تھا وہ آپ کی سگی خالہ نہیں تھیں۔“
”ہماری ماں اُن کی دور کی بہن تھیں۔ ماں کے مرنے کے بعد ہم خالہ کے ساتھ رہنے لگے۔“

”اور آپ کی ماں.....“
”اُن کے بارے میں ہم نے بتایا تو ہمیں دکھ ہوگا۔ بس یوں سمجھ لیجیے جس پیشے میں ہم لوگ آئے تھے اس میں ہمیں روٹی تو ملی لیکن.....“

”لیکن.....؟“

”عمر بھر کی ذلت بھی ملی۔ ہم شریفوں میں اٹھ بیٹھ نہیں سکتے۔“ ہینگا رنجیدہ ہوتی ہوئی بولیں۔ پھر کہا: ”لیکن یہ ہمارا سب سے بڑا دکھ نہیں ہے۔“

”سب سے بڑا دکھ کیا ہے؟“

”جو ہم تھے وہ نہیں رہے۔“

”میں سمجھا نہیں۔“

لکھنوی تہذیب

”ڈیڑھ دو سو برس پہلے آپ ہم سے ملنے آتے تو اس عام سے کوٹھے پر نہ آتے۔ پہلے ہماری ڈیوڑھی کا دربان آپ کو روکتا۔ پھر کسی مہری یا مغلانی سے اندر کھلوایا جاتا اور تب آپ کو دیوان خانے میں بٹھایا جاتا اور چاندی کی کشتیوں میں آپ کے سامنے پھل اور میوے رکھے جاتے اور ایک سنہری طشتری میں زعفران کا شربت۔ اور اگر آپ خاص مہمان ہوتے تو رات میں آپ کے لیے ایک مجرے کا اہتمام کیا جاتا جس میں ایک سے ایک ناچنے والیاں اپنا کمال دکھاتیں۔“

یہ بتا کر ہینگا نے کہا: ”اب سمجھے آپ۔“

”جی سمجھ گیا۔ اور ہم جیسے لوگ آپ کے ملازم ہوتے۔“

”شرمندہ نہ کیجیے۔ آپ نے ماں کے بارے میں جاننا چاہا تو یہ سب کہنا پڑا۔“ یہ کہہ کر ہینگا نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا: ”اور یہی قصہ ان کا بھی ہے جن کے بارے میں آپ ٹٹول ٹٹول کر خالہ سے پوچھ رہے تھے۔“ کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد وہ بولیں:

”اور قدرت کا ایک اور تماشہ دیکھیے۔“

”وہ کیا؟“

”اقبال بیگم، رجو آپا، اپنے حسن اور اپنے گلے کی وجہ سے رجواڑے میں گئیں لیکن.....“

”لیکن.....؟“

”محل والی نہیں کہلائیں۔ کسی کو نہیں بتا سکیں ہم بھی کبھی محل والے تھے۔ وہاں سب انہیں

کوٹھے والی ہی سمجھتے ہیں۔ اُن کی ڈیوڑھی رانی صاحبہ سے الگ ہے۔“

”یہ گڑیا بہت خوبصورت ہے۔“ بات بدلنے کے لیے میں نے سامنے طاق پر رکھی ہوئی

گڑیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

”ہم نے بنائی ہے۔ یہی بنا کر ہم روٹی کھاتے ہیں۔ لیکن محرم کے سوا دوسرے یہ کام نہیں کرتے۔“ ہینگا نے کہا: ”محرم میں ہم تعزیے بناتے ہیں، چھوٹے تعزیے۔ اُن کا ہدیہ بھی اچھا حاصل جاتا ہے۔“

”اور یہ گلدستہ، ریشم کے تاروں سے بنا ہوا۔“ میں نے دیوار پر فریم میں لگے ہوئے ایک خوبصورت سے گلدستے کو دیکھ کر پوچھا۔

”یہ کتو کا بنایا ہوا ہے۔ وہ ریشم کے تاروں سے طغریٰ بناتی ہے اور دیوار پر بجانے والی تصویریں۔ ان کے بھی مناسب دامن مل جاتے ہیں۔“ ہینگا نے کہا۔ پھر بولیں: ”چلیے یہ سب چیزیں آپ کو دکھاؤں۔“

ہینگا وہاں سے مجھے اس کمرے میں لائیں جہاں دونوں بہنوں کی بنائی ہوئی چیزیں اور ان چیزوں کے بنانے کا سامان موجود تھا۔ ان میں ایک طرف طرح طرح کی گڑیاں تھیں۔ کوئی دلہن بنی ہوئی، کوئی میم بنی ہوئی، کوئی اپنے پاندان اور خاصدان کے ساتھ تخت پر بیگم بنی بیٹھی ہوئی، کوئی ستار بجاتی ہوئی، لیکن ان سب میں سب سے زیادہ وہ گڑیاں تھیں جو ناچتے ہوئے دکھائی گئی تھیں۔ میں نے ہینگا سے اس کی وجہ نہیں پوچھی۔ دوسری طرف کئی طرح کے طغریٰ تھے۔ الگ الگ رنگ کے کپڑوں پر ریشم کے تاروں سے قرآن کی آیتیں کاڑھ کر انہیں طوطوں، موروں، ہرنوں اور شیروں کی شکل دی گئی تھی۔ گلدستوں اور تصویروں میں زرد اور اودے رنگوں کا استعمال زیادہ کیا گیا تھا۔ کچھ تصویروں میں باغوں کا منظر تھا لیکن ایسی ہر تصویر میں درختوں سے پتے گرتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ ایسی تصویروں کو دیکھ کر میں نے کتو سے کہا: |

”کچھ درختوں میں پتے لگے رہنے دیتیں۔“

”انہیں بناتے وقت ہاتھ ہمارے اختیار میں نہیں رہتا۔ ویسے بھی پیڑوں سے گرتے

ہوئے پتوں والی تصویریں لوگوں کو زیادہ پسند آتی ہیں۔“

”ایک تصویر میرے لیے بنادیں گی۔“

”کیسی؟ پیڑوں میں پتے لگی ہوئی؟“

”نہیں۔ آپ بنا سکیں گی یا نہیں۔“
”آپ بتائیے کیسی۔“ کتو کے بجائے ہینگا نے کہا۔ ”کتو رنگوں سے بھی بہت اچھی
تصویریں بناتی ہے۔“

”میرے خیال میں وہ رنگوں ہی میں اچھی معلوم ہوگی۔“ میں نے کہا۔
”لیکن کیسی۔ آپ خاکہ تو بتائیں۔“
”عجیب و غریب خاکہ ہے۔“
”بتائیں تو سہی۔“

”ایک چھوٹے سے دالان میں برابر سے دو چوکیاں۔ ایک چوکی پر لفافے بنانے کا
سامان اور دوسری پر پتنگیں بنانے کا۔ چوکیوں کے سامنے بیٹھی ہوئی ایک نوجوان لڑکی سر پر
ڈوپٹہ ڈالے۔ آپ اسے لفافے بناتے ہوئے دکھائیے یا پتنگیں بناتے ہوئے۔ جسے آپ
اچھی طرح دکھا سکتی ہوں۔“ یہ خاکہ بتا کر میں نے کتو سے پوچھا:
”بنا سکیں گی؟“

”کوشش کروں گی۔ بہت مشکل خاکہ ہے۔“ کتو نے کہا۔ پھر پوچھا: ”اور لڑکی کی
صورت شکل؟“

”کھلتا ہوا رنگ تیکھانا نقشہ۔“ جب میں کتو کو یہ بتا رہا تھا تو ہینگا کسی دوسری طرف
دیکھنے لگی تھیں۔

”لیکن تصویر بنانے میں ایک بات کا خیال رکھیں۔“
”وہ کیا؟“ کتو نے پوچھا۔

”لڑکی کی آنکھوں سے دکھ جھانکتے رہنا چاہئے۔“

”آپ کے بتانے کا طریقہ بہت شاعرانہ ہے۔“ ہینگا نے کہا۔ ”اگر ایسی کوئی لڑکی ہے تو
وہ ہماری ہی طرف کی ہوگی۔ پرانے لکھنؤ میں یا تو لڑکیاں کرتوں پر کام بناتی ہیں یا لفافے اور
پتنگیں۔“ یہ کہہ کر ہینگا نے میری طرف عجیب سی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا:

”ایسی کوئی لڑکی ہے آپ کے آس پاس یا آپ نے یہ خاکہ ایسے ہی بنالیا۔“
میں چپ رہا۔ ہینگا نے بھی اس سے آگے کچھ نہیں پوچھا۔

گڑیوں، طغروں اور گلدستوں کی خوب سی تعریفیں کرنے کے بعد میں نے دونوں بہنوں سے اجازت لی۔

”آتے رہیے گا۔“ ہنگا نے کہا۔ ”تصویر بننے میں تو دن لگیں گے۔ کیوں کتو؟“ ہنگا نے کتو کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”ایسی تصویر بنانا آسان نہیں ہے۔“

”لیکن ان کے لیے تمہیں بنانا ہے اور لگ کر بنانا ہے۔“ ہنگا نے اپنی بہن سے زور دے کر کہا۔ پھر پہلے ہی کی طرح مجھے زینے تک پہنچانے آئیں۔

○

جن لوگوں سے میں نے عنبر گنج کے بارے میں پوچھا تھا ان میں سے ایک نے بتایا تھا کہ اُس محلے کا ایک راستہ سعادت گنج کی طرف سے بھی ہے اور یہ چھوٹا راستہ ہے۔ میں صبح صبح سعادت گنج کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اس محلے کے راستے میں چھوٹے بڑے کئی محلے تھے۔ میں غلام حسین کے پل سے نکل کر کشمیری محلے کی طرف آیا پھر منصور نگر کی چڑھائی کی طرف۔ یہ چڑھائی چڑھتے وقت مجھے صوبیدار سلطان علی شاہ عرف قلی خاں کے بیٹے مرزا منصور یاد آئے۔ شاہجہانی عہد میں جس وقت انہوں نے اس شہر میں یہ محلہ آباد کیا ہوگا اُس وقت شاید یہ چڑھائی نہ رہی ہو۔ لیکن لکھنؤ تو بہت پہلے سے اونچے نیچے راستوں کے لیے مشہور ہے۔ یہ چڑھائی چڑھتے وقت مجھے میر حسن کا یہ شعر یاد آیا:

عجب یہ شہر ہے بیڑ پہ بستا
کہیں اونچا کہیں نیچا ہے رستا

منصور نگر کی چڑھائی چڑھ کر میں کاظمین کی طرف آیا اور دیانت الدولہ کی کربلا سے بائیں طرف مڑنے کے بجائے جدھر سے میں سعادت گنج جلدی پہنچ سکتا تھا، میں نے اس کے داہنی طرف کا راستہ اس لیے پکڑا کہ میں کربلا کی پشت والے محلے کے اُس مکان کو دیکھ لوں جہاں شہباز پیدا ہوئی تھی اور جہاں سے اسے نکالا گیا تھا۔ اس طرف آ کر جب میں اس کے مکان کے سامنے آیا تو دیکھا اس کی چھتیں اور دیواریں توڑی جا رہی ہیں۔ میں نے مکان کے قریب کھڑے ہوئے لوگوں سے پوچھا:

”یہاں نیا مکان بن رہا ہے؟“

”نیا مکان بنوانے کے پیسے کہاں ہیں اُن کے پاس۔“ اُن لوگوں میں سے ایک بولا۔
”کس کے پاس؟“

”چھوٹے نواب کے بھائی۔ جنہوں نے اس پر قبضہ کیا ہے۔“
”تو اسے توڑا کیوں جا رہا ہے؟“

”اس کا ملبہ بک رہا ہے۔ نواب کو پیسے کی ضرورت ہے۔“ دوسرا بولا۔ ”جب ملے والا پیسہ خرچ ہو جائے گا تو اس کا ایک حصہ بیچ دیں گے جیسے حصہ حصہ کر کے دوسرے مکان بیچے ہیں۔“
یہ سن کر میں آگے بڑھ گیا۔ نور باڑی سے سعادت گنج کی طرف آتے ہوئے میں نے سوچا میں شہباز سے نہیں بتاؤں گا جس مکان میں وہ بہت برسوں تک رہی ہے اسے توڑ دیا گیا ہے۔ سعادت گنج کی سڑک لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ ہر طرح کی دکانیں اور ان پر خریداروں کی بھیڑ۔ میں نے کہیں پڑھا تھا سعادت علی خاں نے شہر سے ہٹے ہوئے اس علاقے کو تاجروں اور دکانداروں کے لیے بڑے اہتمام سے آباد کیا تھا اور اُسی وقت سے یہ علاقہ طرح طرح کی چیزوں کو خریدنے اور بیچنے کی منڈی بن گیا تھا۔ اس وقت یہاں کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ سواریاں لوگوں کو ہٹا ہٹا کر آگے بڑھ رہی تھیں۔ میں اسی ہجوم کے درمیان سے جگہ بناتا ہوا کسی طرح عنبر گنج والے راستے پر آ گیا اور تھوڑی دیر بعد اس علاقے میں پہنچ گیا جہاں شمیمہ خانم اپنی بیٹی کے ساتھ بڑی رازداری سے رہ رہی تھیں۔ کچھ دیر تک میں اس علاقے میں ایسے ہی گھومتا رہا پھر کچھ ایسی دکانوں پر جا کر جہاں عام ضرورت کا کبھی سامان موجود تھا پوچھنا شروع کیا:

”ایک بی بی یہاں رہنے آئی ہیں، میری عزیز ہیں، ستر چھتر برس کی۔“ میں نے کہا۔
”یہاں اُن کا گھر کہاں ہے مجھے نہیں معلوم۔ سامان وغیرہ لینے آپ کی دکان پر تو نہیں آتیں۔“
”نہیں ایسی تو کوئی عورت نہیں آتیں۔ انہوں نے پتہ بتایا نہیں آپ کو۔“
”اتنا بتایا تھا یہاں عنبر گنج میں رہتی ہیں لیکن وہ جگہ ٹھیک ٹھیک نہیں بتائی جہاں رہتی ہیں۔“
”دوسری دکانوں پر پوچھ لیجیے۔ ہماری دکان پر تو نہیں آتیں۔“

بہت سی دکانوں پر پوچھنے کے بعد جب شمیمہ خانم کا کوئی پتہ نہیں چلا تو میں نے سوچا اب گھر چلا جائے اور کسی اور دن آ کر ڈھونڈا جائے۔ واپسی کے لیے میں نے سرفراز گنج والا راستہ اختیار کیا۔ اس راستے پر آنے کی وجہ یہ تھی کہ نجم النساء عرف امراؤ جان چوٹیوں سے یہیں آ کر

کسی مکان میں رہی تھیں۔ اور یہیں سے آگے تحسین گنج میں ان کے باپ کی حویلی تھی۔ مجھے امر او جان کا سرفراز گنج والا مکان معلوم تھا نہ یہ معلوم تھا کہ تحسین گنج میں ان کے باپ کی حویلی کہاں ہے۔ میں تو ان راستوں سے ہو کر اس لیے آنا چاہتا تھا کہ یہاں سے گزرتے ہوئے وہ سارے منظر میری آنکھوں میں آجائیں گے جو امر او جان کی اس کہانی میں جو انہوں نے مرزا رسوا کو سنائی تھی، موجود تھے۔ میں جیسے جیسے اُن راستوں پر بڑھتا گیا وہ سارے منظر میری آنکھوں میں گھومتے گئے۔ سرفراز گنج سے نکل کر تحسین گنج کی طرف آتے وقت مجھے یاد آیا میری ماں کے ایک عزیز ناصر آغا یہیں رہا کرتے تھے۔ ایک بار ان کے مکان میں نقب لگی اور جب اس کی خبر ماں کو معلوم ہوئی تو میں نے ماں سے پوچھا یہ نقب کیا ہوتی ہے۔ ”چور جب مکان کے پیچھے والی دیوار توڑ کر اندر داخل ہوتے ہیں تو اسے نقب لگانا کہتے ہیں۔“ ماں نے بتایا تھا۔ اور جب وہ ناصر آغا کے یہاں جانے کے لیے تیار ہوئی تو میں نے کہا میں بھی دیکھوں گا نقب کیسی ہوتی ہے، مجھے بھی وہاں لے چلو۔ مجھے کچھ کچھ یاد تھا کہ وہ مکان کہاں پر ہے۔ تحسین گنج میں آکر میں نے وہاں جہاں اس مکان کو ہونا چاہئے تھا جب لوگوں سے ناصر آغا کے بارے میں پوچھا تو ان میں سے ایک نے ہنس کر کہا:

”یہاں کب سے نہیں آئے؟“

”بچپن میں آیا کرتا تھا۔“

پرانے مکانوں میں اکادکارہ گئے ہیں۔ ناصر آغا کا مکان زمانہ ہوا بک چکا۔“

”یہیں کہیں ایک حویلی ہوا کرتی تھی، نواب علی نقی بہادر کی۔“

”میاں کب کی بات کر رہے ہیں۔“ ایک بزرگ بولے۔ کوئی سو برس پہلے وہ حویلی تھی

یہاں۔“ پھر بہت سے مکانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”یہ سارے مکان اُسی حویلی کے احاطے میں بنے ہیں۔ لیکن اس حویلی کو پوچھا کیوں آپ نے؟“

میں خاموش رہا۔

پھر اُن بزرگ نے خود ہی کہنا شروع کیا:

”والد میرے بتاتے تھے نواب نے بیٹی کیا کھوئی قیامت ٹوٹ پڑی اُن پر۔ پہلے دنیا

سے منہ موڑا پھر زندگی نے ساتھ چھوڑا۔ بیوی اُن سے پہلے اللہ کو پیاری ہوئیں۔“ یہ کہنے

کے بعد بولے: ”جو لوگ ان مکانوں میں رہتے ہیں، ان میں کوئی نہیں جانتا ہوگا کہ وہ آفتاب الدولہ نواب خورشید بہادر کے پوتے کی زمین پر رہ رہے ہیں۔“ وہ بزرگ کچھ اور بھی بتاتے مگر میں وہاں سے آگے بڑھ گیا اور ملکہ جہاں کے امام باڑے کے سامنے سے ہوتا ہوا گول دروازے پہنچ کر اپنے ٹھکانے پر چلا آیا۔



جہاندار بیگم کے چالیسویں میں دو چار دن رہ گئے تھے۔ میں عنبر گنج کی طرف دوبارہ اتنی جلدی نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا کیوں نہ چڑیا بازار چلا جائے ہینگا کی طرف۔ یہ سوچتے ہی میں اس طرف چل دیا۔ وہاں پہنچ کر میں دیر تک سردار جہاں کے مکان کا دروازہ کھٹکھٹاتا رہا اور دیر بعد جب ہینگا دروازے پر آئیں تو ان کے ایک ہاتھ میں بہت سی موٹی موٹی تیلیاں تھیں اور دوسرے ہاتھ میں رنگ رنگ کے کاغذ۔

”بہت دیر سے کھڑا ہوں۔“ میں نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔

”کام میں لگی ہوئی تھی۔ معاف کیجیے گا۔“

میں اندر پہنچا تو صحن میں ایک بڑی سی دری پر ایک سفید چادر بچھی تھی جس پر ایک بڑی سی چوکی رکھی تھی۔ اس چوکی پر چھوٹی چھوٹی ضریحوں اور تعزیوں کے تیار کیے ہوئے ڈھانچے رکھے تھے اور ان ڈھانچوں کے آس پاس موٹی موٹی تیلیاں اور بہت سی کچھیاں رکھی تھیں۔ ہینگا کی بہن کتوان تیار کیے ہوئے ڈھانچوں کو آخری شکل دے رہی تھی اور ہینگا بھی اسی کام میں لگی ہوئی تھیں، اسی لیے انہیں دروازے تک آنے میں دیر لگی۔

”محرم میں کچھ ہی دن رہ گئے ہیں، اس لیے ہم نے یہ کام شروع کر دیا ہے۔“ ہینگا نے کہا۔ پھر ہاتھوں میں لگے ہوئے گوند کو چھڑاتے ہوئے بولیں: ”بیٹھے میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔“ پھر بولیں:

”کتوانے، جو تصویر آپ نے بنانے کو کہی تھی، بنالی ہے۔“ پھر کتوانے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

”لا کر دکھاؤ۔“

اور جب کتوانے تصویر لے کر آئی تو میں حیران رہ گیا۔ یہ تصویر ویسی ہی تھی جیسی میں چاہتا تھا۔

والا ان، برابر سے رکھی ہوئی دو چوکیاں، لفافے اور پتنگیں بنانے کا سامان، دوزانو بیٹھی پتنگیں بناتی ہوئی لڑکی، لڑکی کے سر پر ڈوپٹہ اور اس کی آنکھوں سے ہمیشہ جھانکتے رہنے والا دکھ۔
”کمال کی تصویر ہے۔“ میں نے کہا۔

”کچھ چیزیں آپ نے نہیں بتائی تھیں وہ میں نے شامل کر دیں، ان کے بغیر تصویر ادھوری رہتی۔“ کتو نے بتایا۔ پھر بولی: ”ہم جب طغرے اور تعزیے بناتے ہیں تو تھوڑی تھوڑی دیر بعد چائے پیتے رہتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ کچھ منہ میں بھی ڈالتے رہتے ہیں۔“
یہ بتا کر کہا: ”میں نے چوکی پر چائے کا پیالہ رکھ دیا اور طشتری میں نمک پارے۔“
”آپ نے تو چائے کے پیالے سے بھاپ بھی اٹھتی ہوئی دکھا دی۔ کیا کہنا۔“
”ڈوپٹہ ایک آدھ جگہ سے پھٹا ہوا ہے۔ لفافے اور پتنگیں بنانے والی لڑکی کا دوپٹہ بہت اچھی حالت میں نہیں رہ سکتا۔“

”یہ کام، تصویریں بنانے والا، آپ نے کہیں سیکھا ہے؟“
”ہماری گڑیاں، یہ طغرے اور تصویریں جو بھی دیکھتا ہے، یہی پوچھتا ہے۔ ہم دونوں کو بچپن سے یہی شوق تھا۔ پھر اسی کو ہم نے پیشہ بنالیا۔“
”تصویر واقعی بہت عمدہ ہے۔ آنکھوں کے اندر اتری جا رہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کل چوک جا کر اسے فریم کراؤں گا۔“

”چوک جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ کام بھی ہم کر لیتے ہیں۔“ ہینگا نے کہا۔ ”اور آپ کے لیے تو اور اچھی طرح کریں گے۔“ کل آ کر لے لیجیے گا۔“ یہ کہہ کر بولیں: ”میں چائے بنانا بھول ہی گئی۔“ پھر وہ چائے بنانے چلی گئیں اور جب چائے بنا کر لائیں تو بولیں:
”کتو بھی آپ کے آنے سے خوش ہو جاتی ہے۔ کہہ رہی تھی اب کی وہ آئے تو کھانا میں پکاؤں گی۔“

”نہیں کھانا کل کھلائے گا جب میں تصویر لینے آؤں۔“ میرے یہ کہتے ہی ہینگا نے کتو کو جو باورچی خانے میں کھانا پکانے کی تیاری شروع کر چکی تھی، منع کر دیا۔ وہ باورچی خانے سے باہر نکل آئی اور بڑی خاموشی سے میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔
ہینگا سے کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے کہا:

”ایک بات پوچھوں؟“

”پوچھیے۔“

”یہ آپ کی رجو آ پار جواڑے کیسے پہنچیں۔“

”گلا اچھا تھا۔ راجہ صاحب کو پسند آ گئیں۔ ناک نقشے کی بھی ٹھیک تھیں۔ ناچ گانا چھڑوا کر راجہ صاحب نے الگ ایک کوٹھی رہنے کے لیے دے دی۔“ یہ بتا کر کہا: ”اب ان کا درجہ ہم لوگوں سے اونچا ہے۔ اسی لیے خاص خاص موقعوں پر ادھر آتی ہیں۔ لیکن اب مکان پر قبضہ جمانا ہے تو برابر آتی رہیں گی۔“ پھر بولیں:

”دیکھیے ہم لوگوں کا کیا ہوتا ہے۔“

”سب ٹھیک ہوگا۔“ میں نے کہا اور کہنے کر چلنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”کچھ دیر اور

بیٹھے۔“ ہنگا نے مجھے روکا۔

”نہیں موقع ملا تو کل ورنہ کسی دن اور۔“

ہنگا سے یہ کہہ کر میں سردار جہاں کے گھر سے نکل آیا۔

اب اس کے راتے کی یاد میں لڑا۔
میں نے جسے جیسے بار بار جھٹکا

1 آج جہاندار بیگم کے چالیسویں کی مجلس تھی۔ سورج نکلتے ہی میں نے اپنا سیاہ کرتا نکالا اور جب دھوپ پوری طرح پھیل گئی تو اسے پہن کر جہاندار بیگم کی حویلی کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر میں نے دیکھا حویلی کے بہت بڑے صحن میں شامیانے لگے ہیں اور زمین پر موٹی دریوں کے اوپر سفید چاندنیاں بچھی ہیں۔ صحن میں اس طرف جہاں سے چمن شروع ہوتا تھا ایک چوڑی سی میز پر ہرے پتوں پر رکھے ہوئے آنجوروں میں مجلس میں آنے والوں کے لیے پانی بھرا جارہا تھا۔ میں نے ایک آنجورہ اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا اور اس کا پانی پیتے وقت مجھے نیل کا وہ شربت یاد آیا جو اس حویلی میں پہلی بار آنے پر جہاندار بیگم نے مجھے پلوایا تھا۔ میں نے اس میز کے پاس کھڑے ہو کر چمن سے متصل اس کمرے کو دیر تک دیکھا جہاں مہینوں کی محنت کے بعد مجھے وہ کتاب ملی تھی جس کی تلاش میں میں یہاں آیا تھا۔ پھر میں نے اس چبوترے پر نگاہ کی جس پر سے ہو کر میں جہاندار بیگم کی صحنی میں جایا کرتا تھا۔ اس وقت اس چبوترے پر مجلس پڑھنے کے لیے سیاہ پوشش والا منبر رکھا ہوا تھا۔ صحن اور چبوترہ لوگوں سے بھر چکا تھا۔

چبوترے کے بعد والے دالان میں عورتوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ مجلس شروع ہونے والی تھی۔ میری نگاہیں چاروں طرف سلیمان کو ڈھونڈ رہی تھیں لیکن وہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ مجلس کا انتظام ان لوگوں کے ہاتھ میں تھا جن میں سے میں کسی کو نہیں پہچانتا تھا۔ وہ سب کے سب بہت قیمتی سیاہ کرتے پہنے ادھر سے ادھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد مجلس کے شروع ہونے کا اعلان ہوا۔ ذاکر نے منبر پر بیٹھتے ہی مرنے والی کی شخصیت کی مناسبت سے کچھ آیتوں کو پڑھا اور جو کچھ انہیں جہاندار بیگم کے بارے میں بتایا گیا تھا، اسے انہیں آیتوں کی روشنی میں بیان کیا۔ میں فرش کے آخری کونے پر بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا اگر میں اس منبر پر بیٹھا ہوتا تو جہاندار بیگم کے بارے میں ایسا بہت کچھ بتاتا جو بہت سوں کے علم میں نہیں تھا۔ منبر پر بیٹھے ہوئے ذاکر نے جب مصائب پڑھنا شروع کیے تو سب سے زیادہ گریہ انہیں مہدی گنج والے صاحب نے کیا جنہوں نے جہاندار بیگم کی جائداد پر سب سے زیادہ حق جتایا تھا۔ مجلس ختم ہونے کے بعد دالان میں بیٹھی عورتیں بہت دیر تک روتی رہیں۔ میں نے سوچا ان میں سب سے زیادہ شہبارور ہی ہوگی اور ان عورتوں میں اسے کوئی سنبھالنے والا بھی نہیں ہوگا۔ مجمع دھیرے دھیرے چھٹ رہا تھا لیکن سلیمان مجھے کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاید اسے یہاں کے انتظامات سے الگ رکھا گیا تھا۔ جب بہت کم لوگ رہ گئے اور سلیمان مجھے نہیں دکھائی دی تو میں تبرک لیے بغیر حویلی سے باہر نکل آیا۔ باہر نکلتے ہی مجھے کسی نے پکارا:

”بھئی!“ میں مڑا تو دیکھا سلیمان سر پر سیاہ چادر ڈالے حویلی کی باہری دیوار سے لگی کھڑی ہے۔ میں اس کے قریب پہنچا تو بولی:

”میں آپ ہی کے نکلنے کا انتظار کر رہی تھی۔ بٹیا.....“ وہ کہتے کہتے رکی۔

”وہیں دالان میں ہوں گی عورتوں کے بیچ۔“ میں نے کہا۔

”نہیں وہ حویلی چھوڑ کر چلی گئیں۔“ یہ سن کر مجھے دھچکا لگا۔

”کہاں؟“

”بتا کر نہیں گئیں۔ جاتے وقت بس اتنا کہا: ”کہیں رہنے کی ٹھیک ٹھاک جگہ مل جائے گی تو

بتاؤں گی آ کر۔“ سلیمان نے کہا۔ پھر بتایا: ”جب میں نے کہا جہاں جا رہی ہیں وہاں آپ کا

سامان پہنچا دوں تو بولیں نہیں میں اپنا بوجھ ڈھولوں گی۔“ یہ بتا کر سلیمان نے آگے بتایا: ”اور

بھیا ہم نے بھی اس حویلی کو چھوڑ دیا ہے۔ آج ہم اندر نہیں گئے۔ یہیں کھڑے کھڑے مجلس بن لی، رویے۔ شام کو بیگم صاحب کی قبر پر ہوا آئیں گے۔“

”کہاں جاسکتی ہیں بیٹیا.....“

”کاشمیر کی طرف تو بالکل نہیں گئی ہوں گی۔“ سلیمین نے کہا۔ پھر بولی: ”شام کو شاید

چراغ جلانے جائیں بیگم صاحب کی قبر پر۔“

”ٹھیک ہے شام کو میں کر بلا جاؤں گا۔ اگر بیٹیا وہاں آئیں اور مجھے دیر ہو جائے تو انہیں

روکے رکھنا۔“ یہ کہہ کر میں نے سلیمین سے پوچھا:

”تم کہاں رہ رہی ہو؟“

”اپنی بیٹی کے پاس۔ خیرات خانے میں۔ اس کا آدمی زردوزی کا کام کرتا ہے۔ دس

روپے نفری مل جاتی ہے۔“ سلیمین نے بتایا۔ پھر بولی: ”بیٹیا کو جب ہم نے یہاں کی باتیں

بتائیں تو بولی: ”یہیں آ کر رہو ہمارے پاس جو روکھا سوکھا ہم کھاتے ہیں وہی تم بھی کھاؤ۔“

”تو شام کو پہنچ کر بلا۔“ میں نے آنسو پونچھتی ہوئی سلیمین سے کہا اور مشک گنج کے علاقے

سے باہر نکل آیا۔



شام کو میں کر بلا پہنچا تو دیکھا سلیمین جہاندار بیگم کی قبر کے پاس کھڑی کسی سے باتیں

کر رہی ہے۔ میں نے قریب پہنچ کر سلیمین سے شہبا کے بارے میں پوچھا تو اس نے اس شخص

کی طرف جس سے وہ کھڑی باتیں کر رہی تھی، اشارہ کرتے ہوئے کہا:

”یہ بتا رہے ہیں دوپہر میں ایک بی بی آئی تھیں۔“

میں نے اس شخص کی طرف دیکھا تو وہ بولا:

”دوپہر میں آئی تھیں۔ شام تک اسی قبر پر بیٹھ کر روتی رہیں۔ سورج ڈوبنے سے

پہلے چلی گئیں۔“

”آپ.....؟“

”اس کر بلا کا متولی ہوں۔ بہت زمانے سے یہاں ہوں لیکن کسی بی بی کو کسی قبر پر اس

طرح روتے نہیں دیکھا۔“ متولی نے کہا۔ پھر بولا: ”ان کا رونا سن کر یہاں رہنے والی عورتیں

اپنے حجروں سے باہر نکل آئیں۔“ یہ کہہ کر پوچھا:

”مرنے والی سے کیا رشتہ تھا ان کا۔“

”خالہ تھیں ان کی۔“

”لوگ آتے ہیں فاتحہ پڑھ کر چلے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ ایک آدھ پارہ بھی پڑھ لیتے ہیں، لیکن یہ بی بی شام سے پہلے تک بیٹھی رہیں اور مرنے والی کو یاد کر کے روتی رہیں۔“

”یہاں کی عورتوں کو بتایا کچھ۔“

”کس بارے میں؟“

”کہاں سے آئی تھیں، کہاں گئی ہیں۔“

”نہیں، اس بارے میں کچھ نہیں بتایا، بس یہ بتایا میری ایک ماں بہت پہلے مر گئی تھیں، ایک یہ ہیں جنہیں مرے ہوئے ایک مہینہ ہوا ہے۔“

میں اور سلیمین خاموشی سے متولی کی باتیں سنتے رہے۔ جب وہ یہ سب بتا کر چلا گیا تو میں نے قبر پر فاتحہ پڑھا، کچھ دیر ایسے ہی بیٹھا رہا اور جب وہاں سے چلنے لگا تو سلیمین سے کہا:

”خیرات خانے آیا کروں گا کبھی کبھی۔ بیٹا کا پتہ لگائے رکھنا۔“

”مجھے خود بڑی فکر ہے۔ اُن سے بیٹی جیسی محبت ہو گئی ہے۔ بہت خیال رکھتی تھیں میرا۔“

یہ کہہ کر سلیمین چپ ہو گئی۔

کربلا سے نکل کر میں پیدل ہی گھر کی طرف چل دیا۔ راستے بھر میں شہبا کے بارے میں سوچتا رہا۔ کہاں ہوگی، کس حال میں ہوگی۔ میرے لیے مشکل یہ تھی کہ میں شمیمہ خانم کی تلاش پر نکلوں یا شہبا کو ڈھونڈوں۔ سوچتے سوچتے میں نے طے کیا پہلے میں شمیمہ خانم کو ڈھونڈ لوں۔ شہبا کو تو سلیمین بھی ڈھونڈ رہی ہے۔ بہت سے علاقوں میں وہ بہت آئی گئی ہے اور وہاں کے لوگوں کو جانتی بھی خوب ہے۔ اسے مجھ سے پہلے شہبا کا ٹھکانہ معلوم ہو سکتا ہے۔

کربلا سے میرے گھر کا راستہ بہت لمبا تھا۔ اپنے ٹھکانے پر پہنچتے پہنچتے مجھے بہت دیر ہو گئی۔ پیدل چلتے چلتے میں بہت تھک گیا تھا اس لیے بستر پر لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی۔

صبح میں جلدی اٹھ گیا۔ شہبا کے حویلی چھوڑ کر چلے جانے کی وجہ سے اب مجھے شمیلہ خانم کو ڈھونڈنے کی جلدی اس لیے تھی کہ وہ مل جائیں تو میں شہبا کی تلاش پر نکلوں۔ سورج نکلتے ہی میں عنبر گنج کی طرف چل دیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے طے کیا ادھر ادھر پوچھنے کے بجائے دروازے دروازے دستک دی جائے اور شمیلہ خانم کا حلیہ بتا کر ان کے بارے میں معلوم کیا جائے۔ سو میں نے یہی کیا۔ بہت دیر تک بہت سے دروازوں پر دستک دینے کے بعد جب میں اس علاقے کے بالکل آخر میں، جس کے بعد بہت دور تک کوئی گھر نہیں تھا، بنے ہوئے کچھ مکانوں میں سے ایک پر دستک دے کر پوچھ رہا تھا تو ادھر سے گزرتی ہوئی اٹھائیس تیس برس کی ایک بہت خوبصورت خاتون میری بات سن کر ہلکی سی آنکھیں کھلیں۔ انہوں نے رک کر میری طرف دیکھا پھر سر پر ڈوپٹہ ڈال کر میرے قریب آ کر پوچھا:

”کے پوچھ رہے ہیں؟“

”ایک خاتون سید حسین کے کٹڑے میں رہتی تھیں، اب یہاں آ کر رہنے لگی ہیں۔ ستر سے اوپر کی ہیں.....“

”کیوں پوچھ رہے ہیں؟“ ان خاتون نے مجھے بیچ میں روک کر مجھ سے پوچھا۔

”ملنا ہے اُن سے۔“

”کیوں ملنا ہے؟“

”انہیں کو بتاؤں گا۔ آپ کو اُن کا گھر معلوم ہو تو بتا دیں۔ یہیں رہتی ہیں، اسی علاقے میں۔“

وہ خاتون کچھ دیر تک عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھتی رہیں پھر بولیں:

”آئیے میرے ساتھ۔“

میں ان کے ساتھ ہولیا۔ کچھ دور چل کر انہوں نے ایک پرانے سے مکان پر دستک دے

کر کہا: ”اماں دروازہ کھولیے۔“

1 فوراً ہی ایک سن رسیدہ عورت نے جن کا سر چادر سے ڈھکا ہوا تھا دروازہ کھولا تو میں انہیں

دیکھتا رہ گیا۔ یہ وہی عورت تھیں جنہوں نے مجھ سے کلچے نہاری منگوائے تھے۔ انہوں نے

دروازے سے لگے لگے مجھے سر سے پیر تک غور سے دیکھا پھر جو خاتون مجھے اپنے ساتھ لائی

تھیں انہیں یوں دیکھا جیسے پوچھ رہی ہوں کیا ماجرا ہے۔

”اماں یہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں، کیوں ملنا چاہتے ہیں یہ آپ ہی کو بتائیں گے۔“ اور اس سے پہلے کہ وہ بوڑھی عورت کچھ کہیں وہ خوبصورت خاتون مجھے دروازے پر کھڑا رکھ کر اندر داخل ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد انہوں نے ایک دوسرا دروازہ کھول کر مجھے اندر بلایا:

”تشریف لائیں۔“

میں جس کمرے میں داخل ہوا، پہلی نظر میں وہ مجھے ایک تصویر خانہ معلوم ہوا۔ دیواروں پر بہت مناسب دوریوں پر کچھ پینل سے اور کچھ الگ الگ رنگوں سے بنی ہوئی تصویریں آویزاں تھیں۔ ان تصویروں کے بیچ ایک بہت بڑی تصویر میں اچھے قد و قامت اور سڈول جسم کی بہت تیکھے ناک نقشے والی ایک عورت کو رقص کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ یہ رقاصہ گھٹنوں سے نیچے تک آئی ہوئی بہت سی کلیوں والی اودے رنگ کی پشتواز پہنے ہوئے تھی جو اوپر سے تنگ اور نیچے سے گھیردار تھی۔ اودے رنگ کی اس پشتواز کے نیچے اس نے سفید چوڑی دار پانچامہ پہن رکھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں جڑاؤ کنگنوں کے ساتھ ہلکے سبز رنگ کی آٹھ آٹھ چوڑیاں تھیں۔ عورت اپنے بچوں پر کھڑی تھی۔ اس کے داہنے ہاتھ کا انگوٹھا اس کے سینے پر تھا اور بائیں ہاتھ کا پنجہ ہوا میں لہراتا ہوا کسی پھول کی تصویر بنا رہا تھا۔ اس شکل میں اسے دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی بھاؤ بتا رہی ہو۔ عورت کے پیروں میں گھنگھڑا اس طرح پہنائے گئے تھے کہ اگر انہیں دیر تک دیکھا جائے تو وہ بچتے ہوئے معلوم ہونے لگیں۔ رقص کرتی ہوئی عورت کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں کاجل کی لکیریں کھنچی ہوئی تھیں اور ان میں دیدے یوں گردش کرتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے جیسے سازندوں کے سُر تال پر حرکت میں ہوں۔ عورت کی سیاہ زلفوں میں سیدھی مانگ نکلی ہوئی تھی اور مانگ کے بیچ میں پڑی ہوئی ڈوری میں لگا ہوا سنہرا ٹیکا اس کی چوڑی پیشانی پر چمک رہا تھا اور ایک بہت خوبصورت چھپکاسر کے داہنی طرف افقی زاویے کی صورت میں سجا ہوا تھا۔ ناک میں سنہری کیل تھی اور کانوں میں باریک کام والے عمدہ شکلوں کے دہرے آویزے۔ گلے میں پیازی رنگ کے موتیوں کی مالا تھی اور ہلکے اودے رنگ کے اس ڈوپٹے کے ساتھ جس نے رقاصہ کے سینے کو پوری طرح ڈھک رکھا تھا، بہت کھل رہی تھی۔

کچھ جگہ چھوڑ کر اس تصویر کے اوپر ایک اور تصویر میں بھرے بھرے بدن والا کھلتے ہوئے رنگ کا ایک بہت وجیہ شخص جس کی آنکھوں میں اس کی پوری مردانگی سمٹ آئی تھی، سر پر سرخ رنگ کا صاف باندھے اور شانوں پر پڑے ہوئے ریشمی دو شالے کے دونوں پلوں کو سینے پر ڈالے ایک سفید عربی گھوڑے پر اس طرح بیٹھا تھا جیسے کسی فوجی مہم پر نکل رہا ہو۔ اس کے جسم پر ایک لمبا کرتا تھا جس کا چاک بائیں شانے کی طرف سے کھلا ہوا تھا۔ اس کرتے پر آگے کی طرف سے کھلی ہوئی ایک ڈھیلی ڈھالی قبا تھی۔ یہ شخص دبیز گوٹوں والا چوڑے پانچوں کا پانجامہ پہنے تھا اور اس کی کمر میں کٹار بندھی تھی۔ اس کی آنکھیں اس طرح بنائی گئی تھیں کہ ایک طرف سے دیکھنے پر وہ شعلے برساتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں اور دوسری طرف سے دیکھنے پر محبت سے لبریز نظر آ رہی تھیں۔ یہ آنکھیں دیکھتے وقت مجھے لکھنؤ کے شاہ نجف میں لگی ہوئی نوابوں کی وہ تصویریں یاد آنے لگیں جنہیں دکھاتے وقت وہاں کے گائیڈ دیکھنے والوں کو یہ بتانا نہیں بھولتے تھے کہ ان تصویروں کی آنکھوں کو جس جس رخ سے دیکھیے اُس اُس رخ سے ان میں نئے تیور نظر آئیں گے۔

اس شخص کی گھنی مونچھوں نے اس کے مردانہ حسن کو اور بڑھا دیا تھا۔ اس کے دونوں پیرجن میں ذرا ذرا سی نکلی ہوئی نوکوں والے چمڑے کے جوتے تھے، گھوڑے کی زین کے دونوں طرف لٹکی ہوئی رکابوں میں تھے۔ یہ شخص گھوڑے کی باگ کو یوں تھامے ہوئے تھا جیسے اسے ایڑ دینے کے لیے تیار ہو۔

جو خاتون مجھے کرسی پر بٹھا کر اندر چلی گئی تھیں تھوڑی دیر بعد وہ ایک چھوٹی سی کشتی میں پانی سے بھرا گلاس رکھ کر لائیں اور کشتی میری طرف بڑھاتے ہوئے مجھ سے پوچھا:

”کیسے زحمت فرمائی، ہم لوگوں کے یہاں کوئی آتا نہیں ہے۔“

”میں اُن سے، وہ آپ کی والدہ ہیں نا.....“

”جی۔ شمیلہ خانم نام ہے ان کا۔“

”مجھے اُن سے کچھ پوچھنا ہے۔“

”کیا پوچھنا ہے، یہی تو میں پوچھ رہی تھی آپ سے۔“

”انہیں آ لینے دیجیے، انہیں کے سامنے بتاؤں گا۔“

میں یہ کہہ ہی رہا تھا کہ وہ بوڑھی عورت ایک اجلی ساری پہنے کمرے میں داخل ہوئیں۔
”بتائیے صاحبزادے کیسے تکلیف کی۔“ انہوں نے پوچھا۔

جب انہوں نے مجھ سے کلچے نہاری منگوائے تھے اس وقت بھی انہوں نے مجھے صاحبزادے ہی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

”آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ بہت پہلے دیکھا تھا۔“

”یاد نہیں آ رہا کب دیکھا تھا، کچھ بتائیں تو یاد آئے۔“

”پچیس تیس برس پہلے جب میں بہت چھوٹا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”آپ نے مجھ سے

کلچے نہاری منگوائے تھے۔ چوک میں حنا بلڈنگ سے ملا ہوا مکان تھا آپ کا۔“

”آپ رہتے کہاں ہیں میاں۔“

”اس زمانے میں بزازے میں رہتا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”ریحانہ کے مکان سے ملا ہوا

مکان تھا ہمارا، آپ کو بتایا تھا۔ اس وقت ایک اور خاتون بھی رہتی تھیں آپ کے ساتھ۔“

”مرچکیں بہت سال پہلے۔ وہی میری دیکھ بھال کرتی تھیں۔“ یہ کہہ کر شمیلہ خانم بولیں:

قدرت کا بھی عجب کھیل ہے۔ وہ اس دنیا سے چلی گئیں میں زندہ ہوں۔“ پھر بولیں:

”میاں..... کچھ اور یاد دلائیے۔“

”میں نے سکندر سوز خوان کے بارے میں بھی بتایا تھا آپ کو اور ریحانہ کی ماں شاہجہاں

کے بارے میں بھی۔“

”کچھ کچھ یاد آ رہا ہے۔ جن کے مرجانے کا ابھی میں نے ذکر کیا ہے آپ کے جانے

کے بعد وہ ریحانہ اور شاہجہاں کو بہت دیر تک یاد کرتی رہی تھیں۔ اور ایک جملہ انہوں نے آپ

کے بارے میں بھی کہا تھا، مجھے ابھی تک یاد ہے۔“

”کیا کہا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”بہت بھولا بچہ ہے۔ کیسی شرافت ہے چہرے پر۔“ یہ کہہ کر شمیلہ خانم بولیں:

”اب یاد آ گیا۔ دو تین بار اور بھی کلچے نہاری منگوائے تھے میں نے۔“ پھر کہا: ”آپ کی

شکل بالکل نہیں بدلی، بس قد بڑھ گیا ہے۔“

جب وہ یہ کہہ رہی تھیں تو وہ خاتون نظر بچا بچا کر مجھے دیکھ رہی تھیں۔

”اچھا یہ بتائیے، چائے پیس گے یا شربت شمیمہ خانم کی بیٹی نے مجھ سے پوچھا۔“
”نہیں کوئی تکلف نہ کیجیے۔“

”تکلف تو کرنا پڑے گا۔ ہمارے یہاں کوئی آتا ہی کہاں ہے۔ بتائیے چائے یا شربت؟“
”چائے۔“

”اماں بھی چائے شوق سے پیتی ہیں اور میں بھی۔“
”یہ میری بیٹی ہے۔ اکلوتی بیٹی سبیلہ۔ بہت خیال رکھتی ہے میرا۔“ شمیمہ خانم نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر بولیں:
”تو بتائیے میاں۔ کیوں آئے ہیں ملنے۔“

”کچھ پوچھنا ہے۔“

”کیا پوچھنا ہے؟“

”مجھے..... بہت دنوں سے ایک کتاب کی تلاش تھی.....“

”کس کتاب کی؟“

”مرزا رسوا کی۔ وہ جوانہوں نے امراؤ جان کے بارے میں لکھی تھی۔“

یہ سن کر شمیمہ خانم ہلکی۔ کچھ دیر خاموش رہ کر انہوں نے پوچھا:

”تو ملی وہ کتاب؟“

”جی مل گئی۔ بہت ڈھونڈنے کے بعد۔“

”نام کیا ہے اس کتاب کا؟“

”امراؤ جان۔“

”لیکن اس نام کی کتاب تو چھپ چکی ہے، بہت پہلے۔“

”اُس میں امراؤ جان کا اصل قصہ نہیں ہے۔“

”جو آپ کو ملی ہے، اس میں ہے۔“

”جی۔ اسی میں ہے۔“ لیکن مرزا صاحب نے قصہ لکھ کر یہ بھی لکھ دیا کہ اسے چھپوایا نہ جائے۔

”تو صاحبزادے مجھ سے کیا چاہتے ہیں آپ۔“

”اس قصے میں لکھا ہے امراؤ جان فیض علی کے ساتھ کانپور گئیں، وہیں ان سے نکاح کیا

اور وہ فیض علی سے ان کے یہاں ایک اولاد ہوئی۔“
”آگے؟“

”فیض علی کے پکڑے جانے کے بعد وہ اس اولاد کو لے کر لکھنؤ آ گئیں۔“
”پھر.....؟“

”یہاں پہلے کچھ دن تحسین گنج کے آگے سرفراز گنج میں رہیں، پھر سید حسین کے کٹرے
چلی گئیں.....“
”پھر.....؟“

”اُن کے مرجانے کے بعد اُن کی اولاد اُسی سید حسین کے کٹرے میں رہی اور.....“
”اور.....؟“

”اور وہ اولاد آپ ہیں۔“
یہ سن کر وہ خاتون اُچھل پڑیں۔ کچھ دیر تک ناگواری کے سے انداز میں مجھے گھورتی
رہیں۔ پھر بولیں:

”تم یقین سے کہہ سکتے ہو وہ اولاد میں ہی ہوں۔“ شمیلا خانم غصے میں آپ سے تم
پر آ گئی تھیں۔

”پورے یقین سے۔“

اتنی دیر میں سبیلہ چائے لے کر آ گئیں۔ کمرے میں آتے ہی انہوں نے پوچھا:

”اماں یہ اولاد دو اولاد کی کیا باتیں ہو رہی ہیں؟“

”کچھ نہیں۔ یہ صاحبزادے خبر لائے ہیں کہ میں امراؤ صاحبہ، رسوا والی امراؤ صاحبہ

کی اولاد ہوں۔“

”وہ تو آپ ہیں۔“ سبیلہ نے کہا۔

”بیٹیا.....“

”اماں یہ چھپانے کا نہیں بتانے کا وقت ہے۔“ پھر میری طرف منہ کر کے بولیں:

”میں ان کی بیٹی ہوں اور مجھے اس کا دکھ بالکل نہیں کہ میں چوک کی مشہور طوائف

امراؤ جان کی نواسی ہوں۔“

”بٹیا..... یہ تم کیا.....“

”کیوں؟ کیا یہ سچ نہیں ہے۔ فیض علی ڈاکو تھے، امراؤ جان ناچنے والی۔ آپ اُن دونوں کی بیٹی ہیں، میں اُن دونوں کی نواسی۔“ یہ کہہ کر سبیلہ بولیں:

”اوگ یہ جان لیں گے تو ہمارا کیا نقصان ہوگا۔“ پھر مجھ سے پوچھا:

”آپ جانتے ہیں فیض علی کون تھے؟“

”جی کسی نے بتایا۔“

”اور آپ یہ بھی جانتے ہیں امراؤ جان کیا تھیں؟“

”جی اصل قصے میں ان کی اصل موجود ہے۔“

”کون سا اصل قصہ؟“

”جسے مرزا رسوا نے لکھا لیکن چھپوایا نہیں۔ ابھی اسی کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔“

یہ کہہ کر میں نے سبیلہ کو بھی مختصر اُسب کچھ بتایا۔ سب کچھ سن کر انہوں نے کہا:

”اب یہ بتائیے اصل پر ہماری کوئی یقین کرے گا۔“

”شاید نہیں۔“

”بس تو جو اصل نہیں ہے اب وہی ہماری اصل ہے اور اُمتاں اسے نہیں مانتیں۔“ یہ کہہ کر

سبیلہ نے پہلے چائے کی پیالی مجھے دی پھر اپنی ماں کو۔ پھر بولیں:

”لیکن میں..... کیا نام ہے آپ کا..... خیر کچھ بھی ہو..... میں اس سچ کو جھٹلاتی نہیں۔“

یہ کہتے کہتے سبیلہ کی آواز تیز ہونے لگی۔

”چائے پیجئے۔ معافی چاہتا ہوں میری وجہ سے آپ کو غصہ آ گیا۔“ پھر بات بدلنے کے

لیے کمرے میں لگی ہوئی تصویروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”آپ کو مصوری کا بھی شوق ہے؟“

”ہاتھ صاف کرنے کے لیے تھوڑی بہت مشق کر لیتی ہوں۔ انہیں میں جو اچھی لگتی ہیں

انہیں دیواروں پر سجا دیتی ہوں۔“

”بٹیا نے ہماری بہت آگے تک پڑھ لیا ہے۔“ شمیلہ خانم بولیں: ”کوئی کتاب و کتاب

بھی لکھنے والی ہیں۔“

”کون سی کتاب لکھ رہی ہیں؟“ میں نے سبیلہ سے پوچھا۔

اس سے گفتگو کرنے والی عورتیں ہی سب

”ارے کچھ دن پہلے اخبار میں ایک خبر پڑھی تھی۔“

”کیسی خبر؟“

”بازار کی ان عورتوں کے بارے میں جن کے بچے.....“ سبیلہ کہتے کہتے رکیں۔

”جن کے بچے..... آگے کہیے۔“

”نہیں جانتے ان کے پیدا کرنے والے کون ہیں؟“ یہ کہہ کر سبیلہ نے آگے کہا:

”خبر سے معلوم ہوا انہیں میں ایک عورت نے جو ولایت میں ہیں ایک خیراتی ادارہ کھولا ہے۔“

”کس لیے؟“

”ان عورتوں کے بچوں کی دیکھ بھال کے لئے جو.....“

”جو.....؟“

”بازار کی عورت بن کر اپنا گھر چلاتی ہیں اور.....“

”اور.....؟“

”اس پیشے کی بیماریاں انہیں آگھیرتی ہیں اور..... اسی میں وہ مر جاتی ہیں۔“

”تو؟“

”خبر پڑھ کر میں اس عورت کے بارے میں بہت دیر تک سوچتی رہی۔“ سبیلہ نے کہا۔

”اور ان عورتوں کے بارے میں بھی جن کے بچوں کو اپنے پیدا کرنے والوں کے نام نہیں

معلوم۔ بس خیال آیا یہاں بھی ایسی بہت سی عورتیں ہیں، ان کے بارے میں جو کچھ معلوم

ہو سکے، اسے جمع کیا جائے، اُسی کو اماں سمجھتی ہیں میں کتاب لکھنے والی ہوں۔“

”کتاب تو بن جائے گی پوری، اور بہت کام کی۔“

”میں کچھ زیادہ بول گئی۔ اب آپ پوچھیے لتاں سے جو کچھ پوچھنا ہے۔“ سبیلہ نے کہا۔

”پوچھو صاف جزا دے کیا پوچھنا ہے۔“ شمیلہ خانم نے کہا۔

”پہلے بتادوں اصل قصے میں کیا ہے۔“ میں نے کہا۔ پھر جو کتاب جہاندار بیگم کے

یہاں ملی تھی، اس میں لکھا ہوا پورا قصہ شمیلہ خانم کو بتایا۔ قصہ سن کر وہ بولیں: ”سچ تو یہ ہے، یہی

ہماری ماں کا اصل قصہ ہے۔“ پھر بولیں: ”اماں نے جب ہمیں کچھ کچھ سمجھانے لگی تھی، بتایا تھا

انہوں نے کسی کو جو ان سے ملنے آیا کرتے تھے، اپنے بارے میں سب کچھ سچ بتا دیا ہے۔“

اور یہ بھی بتایا تھا کہ ان صاحب نے اس قصے کو بہت کچھ لکھ بھی ڈالا ہے۔“ یہ بتا کر شمیلہ خانم نے بتایا: ”لیکن وہ قصہ اماں کی زندگی میں نہیں چھپا۔ اور اچھا ہوا نہیں چھپا۔ اماں نے ان صاحب کو منع کیا تھا کہ اس قصے کو عام نہ کیا جائے۔“ شمیلہ خانم یہ بتا کر بولیں: ”اماں کے مرنے کے بہت دن بعد یہ قصہ چھپا اور مرزا رسوا نے اماں ہی کے نام پر اس قصے کا نام رکھا۔“ شمیلہ خانم رکیں پھر بولیں: ”قصہ پڑھنے کے بعد مجھے غصہ اس لیے نہیں آیا کہ اس میں جو کچھ اماں نے بتایا تھا اسے بہت کچھ بدل دیا گیا تھا۔ لیکن اب.....؟“

”اب.....؟“

”اصل قصہ تمہارے ہاتھ لگ گیا ہے، مجھے نہیں معلوم تم اس کا کیا کرو گے۔“

”چھپوائیں گے اور یہ نہیں چھپوائیں گے تو میں چھپواؤں گی۔“ سبیلہ نے کہا۔ ”ہم بہت دن چھپ چھپ کر جی لیے۔“ یہ کہہ کر مجھ سے پوچھا:

”چھپوائیں گے آپ اسے؟“

”آپ کی والدہ چاہیں گی تب۔“

”اماں تو کبھی نہ چاہیں گی، لیکن میں چاہتی ہوں یہ قصہ چھپے۔“

”لیکن ابھی تو اس قصے کو آپ تک آنا ہے۔“ میں نے کہا:

”آنے دیجیے، بالکل آنے دیجیے۔ مجھے نہیں معلوم جو کتاب آپ کو ملی ہے اس میں قصہ کہاں پر ختم ہوا ہے۔“ سبیلہ نے کہا۔ پھر بولیں: ”اُسی کے آگے اماں بتائیں نہ بتائیں لیکن میں نانی کے مرنے کے بعد کی ساری باتیں بتاؤں گی۔“ یہ کہہ کر اپنی ماں شمیلہ خانم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”کیوں اماں؟“

”میں نے تمہیں بہت کچھ بتایا ہے لیکن بہت کچھ ایسا ہے جو نہیں بتایا ہے۔“

شمیلہ خانم نے کہا۔ ”اُسی اور راز چھپے والی سرزنش اگر اندر سے۔“

”جو نہیں بتایا ہے وہ انہیں بتائیے اور بتاتے وقت یہ بھی بتائیے میرا باپ جس کا نام آج تک آپ نے مجھے نہیں بتایا، میرے پیدا ہونے سے پہلے آپ کو چھوڑ کر کیوں چلا گیا۔“

”بیٹا! آج تمہیں کچھ زیادہ غصہ آ رہا ہے۔“ شمیلہ خانم نے بڑے نرم لہجے میں سبیلہ سے کہا۔

”غصہ تو آئے گا لتاں۔ نانی نے بہت کچھ آپ سے چھپایا، آپ نے بہت کچھ مجھ سے

چھپایا لیکن میں کسی سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔“ سبیلہ نے اسی تیز لہجے میں کہا۔ پھر کہا: ”میں کسی سے نہیں بتاؤں گی میں لکھنؤ کے ایک بڑے رئیس نواب علی نقی بہادر کی پر نواسی ہوں۔ میں سب سے یہی بتاؤں گی میں امراؤ جان کی نواسی اور شمیمہ خانم جو چوک کے ایک مکان میں رہتی تھیں، ان کی بیٹی ہوں۔“

”میں پھر کسی دن آؤں گا۔“ میں نے سبیلہ کا غصہ بڑھتے دیکھ کر کہا۔ آج تو بس آپ کا ٹھکانہ معلوم کرنے نکلا تھا۔“

”آپ نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“ سبیلہ نے پوچھا۔

”میں..... جہاں آپ کی والدہ رہتی تھیں، اسی سے کچھ فاصلے پر ایک محلہ ہے بزازہ، وہیں رہتا تھا۔ اب کہیں اور رہتا ہوں۔“

”اب کہاں رہتے ہیں؟“

”ٹھکانے بدلتا رہتا ہوں۔ آج رہنے کی جگہ آپ کو بتاؤں گا، کل آؤں گا تو ہو سکتا ہے وہ ٹھکانہ بدل جائے۔“

”کوئی اور نہیں رہتا آپ کے ساتھ؟“

”اکیلا ہوں۔ ماں تھی اب نہیں رہی۔“

”نانی کے قصے میں آپ کو دلچسپی کیوں پیدا ہوئی؟“

”بچپن سے سنا کرتا تھا اس کے بارے میں۔ یہ بھی سنا کرتا تھا جو چھپا ہے وہ اصل قصہ نہیں ہے۔“ میں نے کہا: ”بتانے والے بتاتے تھے اصل قصہ کہیں موجود ہے بس میں اس کی تلاش میں نکل پڑا اور ایک دن وہ مجھے مل گیا۔“

”صاحبزادے کھانے پینے کی بڑی دشواری ہوتی ہوگی تمہیں۔“ شمیمہ خانم بولیں:

”نہیں، کبھی گھر میں پکا لیتا ہوں۔ کبھی باہر کھا لیتا ہوں۔“

”وطن تمہارا؟“

”اسی شہر کا ہوں۔ آباؤ اجداد بھی یہیں کے تھے۔“ میں نے کہا۔ ”دادا میر شوکت علی بہت

بڑے جاگیردار تھے، پوتا ان کا کرائے کے مکانوں میں رہ رہا ہے۔“

”ہم سب کے قصے ایک جیسے ہیں۔“

”شہبا بھی یہی کہتی تھی۔“

”کون شہبا؟“

اور اس سے پہلے کہ میں شہبا کے بارے میں کچھ بتاتا، شمیلہ خانم نے پوچھا:

”ماں کا انتقال کب ہوا؟“

”جب آپ نے مجھ سے کلچے نہاری منگوائے تھے، اس وقت وہ زندہ تھیں، اسی کے

کچھ دن بعد.....“

”انتقال کیسے ہوا؟“

”پھیپھڑے خراب تھے۔ رات رات بھر کھانستی تھیں، بس اُسی میں ایک دن

آنکھ بند ہو گئی۔“

”افسوس ہوا۔ دکھ بہت ہوتا ہے ماں کے مرنے کا۔“ سبیلہ نے کہا۔

”بہت۔ جب وہ مریں تو.....“

”تو.....؟“

”مشک گنج والی جہاندار بیگم، شاید آپ لوگوں نے سنا ہو ان کا نام، بتاتی تھیں کئی گھنٹے

مجھے ہوش نہیں آیا۔“

جہاندار بیگم کا نام سن کر شمیلہ خانم ٹھٹھکیں۔ مجھے غور سے دیکھا پھر پوچھا:

”یہ جہاندار بیگم عزیز تھیں تمہاری؟“

”عزیز بھی تھیں، ماں کی دوست بھی۔ بہت آتی جاتی تھیں ہمارے یہاں۔ ایک مہینہ

پہلے اُن کا بھی انتقال ہو گیا۔“

یہ سن کر شمیلہ خانم کے چہرے پر افسردگی کی ایک لہر آئی۔

”تو وہ کتاب جس میں اصل قصہ ہے آپ کو ملی کیسے؟“ سبیلہ نے پوچھا۔

میں نے، کتاب ڈھونڈنے کے سلسلے میں جہاں جہاں میں گیا تھا اور جن جن سے ملا تھا،

اس کی تفصیل ان دونوں کو بتائی۔ اور اس بتانے میں جب جب جہاندار بیگم، سردار جہاں، ان

کی بھانجی رتو، حکیم احمد رضا اور شہبا کے نام آتے، شمیلہ خانم چونک جاتیں۔ جب میری بات

ختم ہوئی تو شمیلہ خانم نے پوچھا:

”تم کو یہاں ہمارے رہنے کے بارے میں کس نے بتایا؟“
”سردار جہاں کی بھانجی اقبال بیگم نے۔ رجو عرفیت ہے ان کی۔“
”تم اُن سے ملے تھے؟“

”نہیں، ان کی ایک بہن، سگی نہیں، ہنگا جو سردار جہاں کے مکان میں رہتی ہیں،
انہوں نے بتایا۔“ میں نے کہا۔ ”اور یہ بھی بتایا اقبال بیگم کے یہاں کی بڑی مجلس میں آپ
ہی سوز پڑھتی تھیں۔“

میرے یہ کہنے پر دونوں ماں بیٹیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔
”سردار جہاں ابھی.....“

”ڈیڑھ مہینہ پہلے ان کا بھی انتقال ہو گیا۔“

یہ سن کر شمیلہ خانم کو دھچکا لگا۔

”خدا انہیں جنت نصیب کرے۔“ وہ بولیں۔

”ان کی نانی اور سردار جہاں کی ماں کو ایک دوسرے سے بڑی محبت تھی۔“ میں نے
سبیلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن ایک دوسرے سے ملیں نہیں کبھی۔“ شمیلہ خانم بیچ ہی میں بول پڑیں۔ یہ بول کر
بولیں: ”خیر..... چھوڑیے میاں یہ قصے بہت طولانی ہیں۔“

”لماں! آپ نے یہ سب ہمیں نہیں بتایا۔“ سبیلہ نے کہا۔

”بٹیا ابھی ہم نے کہا تھا بہت کچھ ایسا ہے جو ہم نے تمہیں نہیں بتایا۔“

”اچھا میاں یہ بتاؤ سردار جہاں کی بھانجیاں..... دو تھیں شاید؟“ شمیلہ خانم نے پوچھا۔
”جی۔ ہنگا اور کمو۔“

”وہیں رہتی ہیں، اُسی مکان میں؟“

”جی۔ لیکن سردار جہاں کے مرنے کے بعد اقبال بیگم اس مکان پر اپنا حق جتا رہی

ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”دونوں بہت پریشان ہیں۔“

”گزارا کیسے ہوتا ہے دونوں کا۔“

”محرم میں تعزیے بناتی ہیں، عام دنوں میں گڑیاں اور دیواروں پر لگانے والی تصویریں۔“

اُسی میں اچھا حاصل جاتا ہے۔“
”اچھا تو یہ جہاندار بیگم..... اماں کبھی کبھی ان کی ماں کا ذکر کرتی تھیں، مرزا صاحب کی عزیزوں میں تھیں؟“

”جی۔ مجھ سے بہت محبت کرنے لگی تھیں۔ جب تک میں ان کے یہاں جاتا رہا، ماں کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔“ میں نے کہا۔ ”بہت خیال رکھتی تھیں میرا۔“
”تو اب ان کی حویلی؟“

”دوسروں کے قبضے میں ہے۔“

”دفن کہاں ہوئیں۔“

”ٹالکٹورے کی کربلا میں۔“

”میاں ہمیں لے چلو کسی دن۔ فاتحہ پڑھ آؤں ان کی قبر پر۔“ یہ کہہ کر شمیمہ خانم نے پوچھا: ”اور سردار جہاں کی قبر کہاں ہے؟“

”شاید ملکہ جہاں میں۔ ٹھیک سے معلوم نہیں۔ ان کی بھانجیوں سے پوچھ کر بتا دوں گا۔“

”پوچھ لو۔ اس سے پہلے کہ لوگ میری قبر پر فاتحہ پڑھنے آئیں، وہاں بھی ہو آؤں۔“
”امتاں کیوں ایسی باتیں کرتی ہیں۔“ سبیلہ نے اپنی ماں کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

”تو جہاندار بیگم کی حویلی پر کس کا قبضہ ہے؟“

”انہیں کے عزیزوں کا۔ اولاد کوئی نہیں تھی۔“ میں نے کہا۔ پھر انہیں بتایا:

”اتنی بڑی حویلی میں اکیلی تھیں۔ ایک بو اتھی سلمین وہی ان کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ ان کے مرنے کے بعد اس نے بھی حویلی چھوڑ دی۔ اور شہباز.....“
”وہی جن کے بارے میں ابھی تم نے بتایا تھا؟“

”جی وہی۔ وہ بھی وہاں سے کہیں اور چلی گئیں۔ جب تک حویلی میں رہیں، بیگم صاحب

کا بہت خیال رکھا۔“

”کہاں چلی گئیں؟“ سبیلہ نے پوچھا۔

”کسی کو بتایا نہیں، سلمین کو بھی نہیں۔“

”پہلے بھی بڑی تکلیفوں میں تھی۔“ شمیلہ خانم نے کہا۔
”آپ کو کیسے معلوم؟“

”جب صہبا خانم نے اپنا پہلا مجرا کیا تھا، اماں اُسی وقت سے انہیں جانتی تھیں اور ان کی ماں کو بھی۔“ شمیلہ خانم بولیں۔ پھر کہا: ”اماں جب تک زندہ رہیں سب کے حال احوال معلوم کرتی رہیں۔ مرتے مرتے بھی نام لے لے کر سب کو یاد کیا۔“ یہ کہہ کر شمیلہ خانم نے بتایا: ”آخری سانس لیتے وقت جو کچھ انہوں نے کہا تھا، مجھے اب تک یاد ہے۔“

”شمیلہ بیٹیا! تمہاری ماں کو ٹھٹھے پر بیٹھنے والی امراؤ جان..... جارہی ہے اپنی امراؤ بیگم کے پاس۔“ اتنا کہہ کر شمیلہ خانم نے اپنے آنسو پونچھے پھر اپنی ماں کے آگے کے جملے بتاتے ہوئے بولیں: ”یہ کہہ کر اماں نے کہا: ”یہاں تو میں اُن سے مل نہیں سکی، اب وہیں ملوں گی۔ ہوا دو قرآن کی۔ اور..... اسی کے بعد ان کا دم نکل گیا۔“

”لوگ کہتے ہیں ان کے جنازے میں بہت لوگ تھے۔“

”غلط کہتے ہیں۔ اماں کا انتقال دن کے تیسرے پہر میں ہوا تھا۔ جنازہ رات کی تاریکی میں خاموشی سے اٹھا دیا گیا۔ مشکل سے دس بارہ لوگ رہے ہوں گے۔“ شمیلہ خانم نے کہا۔

”کچھ پرانے سازندے، کچھ خانم صاحب کے کوٹھے پر کام کرنے والے جوائتاں سے ملنے آتے رہتے تھے، ایک دو لوگ پڑوس کے اور بس۔“

”دفن تو منشی فضل حسین خاں کی کربلا میں ہوئیں۔“

”ہاں وہیں ہوئیں۔ لیکن پتھر مٹ چکا ہے اُن کی قبر کا۔“ شمیلہ خانم نے کہا۔ ”اب تو میں اندازے سے جا کر فاتحہ پڑھ آتی ہوں۔“ یہ بتا کر مجھ سے پوچھا:

”اچھا یہ بھی بتاؤ حکیم احمد رضا زندہ ہیں۔“

”زندہ ہیں۔ پورے ہوش و حواس کے ساتھ مطب میں بیٹھتے ہیں۔“ میں نے انہیں بتایا۔

”جہاندار بیگم کو بہت دن تک اپنی دواؤں سے زندہ رکھا اور شہبا کی کھانسی بھی انہیں کی دوا سے ختم ہوئی۔“ یہ بتا کر میں نے کہا: ”پتہ نہیں اب وہ کس حال میں ہے۔ جہاندار بیگم کی طبیعت بگڑنے کے ساتھ ساتھ اس کی طبیعت بھی بگڑنے لگی تھی۔ حویلی چھوڑنے سے پہلے بہت کھانسی آرہی تھی اسے۔“

جب میں یہ بتا رہا تھا سبیلہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔
 ”میں بھی حکیم صاحب سے اکثر اپنی دوالائی ہوں۔“ شمیمہ خانم نے کہا۔ ”لیکن
 انہیں یہ کبھی نہیں بتایا میں کس کی بیٹی ہوں۔ جب بھی انہوں نے میرا آگاہیچھا معلوم کرنے
 کی کوشش کی میں ٹال گئی۔“

”اتناں سے اسی بات پر میرا جھگڑا ہوتا ہے۔“ سبیلہ بیچ میں بولیں: ”چھپاتے رہنے
 سے کیا فائدہ۔ جو کچھ ہم ہیں، وہ بتا کر بھی زندہ رہ سکتے ہیں۔“
 ”صحیح کہا آپ نے۔“ میں نے کہا۔ ”لکھنؤ میں بہت سے لوگ وہ نہیں رہے جو وہ تھے
 اور بہت سے لوگ وہ ہو گئے جو وہ نہیں تھے۔“ پھر شمیمہ خانم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:
 ”رجب علی بیگ سرور کا نام سنا ہوگا آپ نے۔“

”نام ہی نہیں سنا ہے ان کی کتاب ’فسانہ عجائب‘ حرفاً حرفاً پڑھی بھی ہے۔ اس قسم کی
 کتابیں اماں نے بچپن ہی میں پڑھوا دی تھیں۔“
 ”تو انہوں نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے.....“

”کیا لکھا ہے؟“ سبیلہ نے بیچ ہی میں روک کر مجھ سے پوچھا۔
 ”سفلی چھپورے کس طرح صاحب عزت ہو گئے اور نسب والے کیسے بے نسب۔“
 ”’فسانہ عبرت‘ میں صاحبزادے ’فسانہ عبرت‘ میں۔ اتناں ہماری بار بار اس کتاب
 میں لکھی ہوئی باتیں بتاتی تھیں۔“ شمیمہ خانم نے آواز تیز کرتے ہوئے کہا۔ ان کی بات پوری
 ہوتے ہی میں نے ان سے پوچھا:

”یہ بتائیے آپ عنبر گنج میں آکر کیوں رہیں؟“
 ”دو وجہوں سے۔ ایک تو شہر سے دور یہ شرفاء کا علاقہ تھا۔ لکھنؤ کے نامی حکیم پہلے یہیں آکر
 بے تھے۔ یہیں سے جھوٹی ٹولے اور جوہری محلے کی طرف گئے۔“ شمیمہ خانم نے کہا۔ ”میں
 نے سوچا یہاں ہماری صورت پہچاننے والا کوئی نہ ہوگا۔ دوسری وجہ یہ تھی یہ علاقہ رفیق الدولہ کی
 کربلا سے قریب ہے، جہاں ہمارے نانا دفن ہیں۔“
 ”لیکن اب تو یہاں.....“

”.....سب ایسے ویسے آکر بس گئے ہیں۔“

میں غنبر گنج سویرے سویرے پہنچ گیا تھا۔ اب دوپہر ہو چکی تھی۔ باتوں میں وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔ میں نے سوچا اب مجھے اٹھنا چاہیے۔ یہ سوچتے ہی میں نے شمیلہ خانم سے کہا: ”اب اجازت دیجیے۔ بہت دیر بیٹھ گیا آپ کے پاس۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں دوبارہ آ جاؤں۔ بہت سی باتیں پوچھنا ہیں آپ سے۔“

اور اس سے پہلے کہ شمیلہ خانم کوئی جواب دیتیں سبیلہ بولیں: ”ضرور آئیے۔ آپ کا آنا ہمیں اچھا لگا۔“

میں نے کرسی سے اٹھ کر شمیلہ خانم کو سلام کیا۔ سبیلہ مجھے دروازے تک پہنچانے آئیں اور جب میں ان سے رخصت ہونے لگا تو انہوں نے پوچھا:

”آپ شہبا کے لیے بہت پریشان ہیں؟“
 ”جی پریشان تو ہوں۔ اکیلی ہیں۔ پتہ نہیں کس حال میں ہیں۔“
 ”تو پہلے آپ انہیں ڈھونڈیے، نہ ملیں تو مجھے بتائیے میں انہیں ڈھونڈنے میں آپ کی مدد کروں گی۔“

جی شکریہ۔ یہ کہہ کر میں شمیلہ خانم کے گھر سے باہر نکل آیا۔



دوسرے دن میں صبح صبح ٹوریا گنج سے آگے تالکٹورے والی کربلا کے راستے پر بائیں طرف بادشاہ نصیر الدین حیدر کے بنوائے ہوئے اس شاہی خیرات خانے میں پہنچ گیا جہاں سلیمن اپنی بیٹی کے پاس رہنے کے لئے آئی تھی۔ بہت بڑے حصے میں بنے ہوئے اس خیرات خانے میں چاروں طرف معذوروں اور بے وارثوں کے رہنے کے لیے چھوٹے چھوٹے حجرے بنوا دیے گئے تھے۔ اب ان حجروں کی دیواریں جگہ جگہ سے چٹخنی ہوئی تھیں اور ان کی چھتوں پر جنگلی پودے اُگے ہوئے تھے۔ اس کے بہت بڑے صحن میں کچھ کچھ فاصلے پر گھنے درخت تھے اور بیچ میں ایک فوارہ تھا جو سوکھا پڑا تھا اور پانی کی نکاسی والے اس کے تاج پر زنگ لگ چکا تھا۔ اتنے بہت سے حجروں میں یہ پتہ لگانا مشکل تھا کہ سلیمن کی بیٹی کس حجرے میں رہتی ہے۔ میں نے سلیمن سے نہ اس کی بیٹی کا نام پوچھا تھا نہ بیٹی کے شوہر کا۔ دیر تک ادھر ادھر دیکھنے کے بعد میں نے ایک بزرگ سے جو فوارے سے لگے کھڑے تھے پوچھا:

”ان حجروں میں کوئی زردوزی کا کام کرنے والا بھی رہتا ہے؟“

”یہاں تو سبھی یہی کام کرتے ہیں میاں۔ یا زردوزی یا کادانی۔“ یہ کہہ کر وہ بزرگ بولے:

”نام بتائیے کس سے ملنا ہے۔“

”نام ہی تو نہیں معلوم بس اتنا معلوم ہے کہ زردوز ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اُن کی بیوی کی ماں ابھی حال ہی میں یہاں رہنے آئی ہیں، اپنی بیٹی کے پاس۔“

”آپ سلیمان بی بی کی بات کر رہے ہیں۔“

”جی جی۔ سلیمان ہی نام ہے ان کا؟“

”جہاندار بیگم کی حویلی والی؟“

”جی جی۔ وہی۔“

”وقت بھی کیا چیز ہے میاں۔“ اُن بزرگ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ”حویلی سے حجرے میں آ گئیں۔ ہر طرح کا آرام تھا بیگم صاحب کے پاس۔“

”لیکن بیگم صاحب.....“

”مرچکیں۔ معلوم ہے۔“

”آپ؟“

”عزیز ہوں انہیں جہاندار بیگم کا، آپ یقین کریں گے۔“

میری سمجھ میں نہیں آیا انہیں کیا جواب دوں اور اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا انہوں نے کہنا شروع کیا: ”وہ جو مہدی گنج والے ہیں عمدة الملک ذوالفقار جنگ کے پوتے، جنہوں نے حویلی پر قبضہ کیا ہے، ان کا بھی عزیز ہوں۔ ہم سب ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں۔“

”تو آپ یہاں.....“

”اس کنارے والے حجرے میں رہتا ہوں، اکیلا۔“ انہوں نے بالکل آخر میں بنے ہوئے حجرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر بولے: ”بھوانی گنج والا میرا بہت بڑا مکان بھی انہیں صاحب نے ہڑپ لیا اور اسے اونے پونے بیچ دیا۔“ یہ بتا کر بولے: ”اب جو حویلی ہتھیائی ہے، دیکھیے اس کا کیا کرتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ مجھے اس حجرے کی طرف لے چلے جہاں سلیمان رہنے آئی تھی۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے بہت آہستہ سے آواز دی:

”نسیم بیٹی، تمہاری ماں سے کوئی ملنے آیا ہے۔“
اور جیسے ہی دروازہ کھلا چالیس کی عمر کی ایک عورت نے مجھ سے پوچھا:
”کس سے ملنا ہے؟“

”بواہیں۔ کہہ دیجیے بھیا آئے ہیں۔“
میری آواز سلیمن نے سن لی تھی۔ وہ فوراً باہر نکل آئی۔
”بھیا آپ۔“ اسے یقین نہیں آ رہا تھا میں اس کی بیٹی کے دروازے پر کھڑا ہوں۔
”جاپنگ پر چادر بچھا اور جلدی سے چائے کا پانی چڑھا۔“ سلیمن نے اپنی بیٹی سے کہا۔
”اچھا میاں میں چلتا ہوں۔“ اُن بزرگ نے جو مجھے یہاں تک لے کر آئے تھے، مجھ
سے کہا اور بالکل آخر میں بنے ہوئے اپنے حجرے کی طرف قدم بڑھا دیے۔
سلیمن نے مجھے اندر لے جا کر اس کھٹولے پر بٹھا دیا جس پر جلدی جلدی میں بچھائی گئی
ایک سفید چادر پر جگہ جگہ تیل کے دھبے لگے تھے۔ اس ایک دروازے کے داخلی
دروازے کے داہنی طرف کونے میں ایک نیچا ساٹل لگا ہوا تھا جس کے نیچے جھوٹے برتنوں کا
ڈھیر تھا اور جس پر ٹکیاں بھنک رہی تھیں۔

کھٹولے پر بیٹھتے ہی میں نے سلیمن کی خیریت معلوم کی، پھر پوچھا:
”بٹیا کے بارے میں کچھ معلوم ہوا؟“
”نہیں ابھی میں نکلی نہیں۔“ اس نے کہا۔ پھر بولی: ”بھیا مشکل یہ ہے کس سے پوچھیں
بٹیا کسی سے ملتی جلتی نہیں تھیں۔“ یہ کہہ کر بولی: ”ایک بات میری سمجھ میں آئی ہے۔“
”وہ کیا؟“

”کاظمین میں پرچون کی دکانوں پر یا جہاں پتنگیں بکتی ہیں، وہاں جا کر پوچھوں۔“
سلیمن نے کہا۔ ”بٹیا لفافے اور پتنگیں دینے وہاں جاتی ہوں گی۔ شاید وہ لوگ کچھ بتا سکیں۔“
”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“

”آپ سے زیادہ میں پریشان ہوں ان کے لیے۔“ سلیمن نے کہا۔ ”بٹیا مجھ سے اپنی
بہت سی باتیں بتاتی تھیں اور بہت سی باتیں آپ کے بارے میں پوچھتی تھیں۔“
”کیا پوچھتی تھیں؟“

”کہاں رہتے ہیں، کھانے میں کیا پسند ہے۔ کپڑے کیسے پہنتے ہیں؟“
”اور.....؟“

”بیگم صاحب سے کیا رشتہ ہے۔ جس دن آپ حویلی نہ آتے اس دن بہت پریشان رہتیں۔ کہتیں، بوا کہیں بیمار تو نہیں پڑ گئے۔ اکیلے ہیں کوئی ان کا خیال رکھنے والا بھی نہیں ہے۔“ یہ بتا کر سلیمین نے آگے بتایا: ”ایک دن کہنے لگیں اماں ہماری زندہ ہوتیں تو آپ کے بھیا ان کو بہت اچھے لگتے۔“ میں نے پوچھا کیوں بولیں: ”اماں کو ایسے ہی لوگ اچھے لگتے تھے۔“ میں نے کہا: ”بیگم صاحب کے دل میں بھی اتر گئے ہیں، اس پر بہت خوش ہوئیں بولیں وہ تو میں دیکھ رہی ہوں خالہ اب ان کے بغیر نہیں رہ سکتیں۔“ سلیمین بتاتی رہی۔ ایک دن مجھ سے بہت ڈرتے ڈرتے بولیں۔

”کیا بولیں؟“

”بوا کسی دن آپ چپکے سے ان کے رہنے کی جگہ دیکھ آئیے، پھر میں آپ کے ساتھ چلوں۔ دیکھوں کس طرح رہتے ہیں۔ بہت لاابالی ہیں۔ اُن کے رہنے کی جگہ ٹھیک کردوں اور جن جن چیزوں کی انہیں ضرورت ہے وہ خرید کر لے آؤں۔“ کچھ دیر ٹھہر کر سلیمین نے آگے بتایا: ”جس دن آپ کو تعویذ پہنایا اور جس دن آپ کے بازو پر امام ضامن باندھا اُس دن بہت خوش تھیں اور چہرے پر بڑا اطمینان تھا۔“

میں سلیمین کی باتیں سنتا رہا۔ میری آنکھوں میں کبھی شہبا کے نور باڑی والے گھر کا منظر گھومنے لگتا کبھی حویلی والے اس کمرے کا جسے شہبا نے اپنا ٹھکانہ بنایا تھا۔

”تو بوا کل جائیے کاظمین کی طرف۔ میں دو تین دن میں پھر آؤں گا۔“

”کل نکلوں گی اور دکان دکان جا کر معلوم کروں گی۔“

چلنے سے پہلے میں نے کرائے کے نام پر سلیمین کو کچھ پیسے دیے جسے لینے پر وہ بہت مشکل سے راضی ہوئی۔

○

جہاندار بیگم کی موت، حویلی پر مہدی گنج والوں کا قبضہ، سردار جہاں کا انتقال، شہبا کا حویلی سے کسی نامعلوم جگہ پر چلا جانا۔۔۔ ان سب قصوں نے مجھے بہت آزرہ کر رکھا تھا۔

وصیت اور مکیسوں کا ذکر مس آریا مکیس لہ مر

میں صرف کھانے پینے کی چیزیں لانے کے لیے ہی باہر نکلتا اور نہ دن دن بھر اپنے بستر پر پڑا رہتا اور جب بھی ان قصوں سے متعلق کوئی بات ذہن میں آتی، فوراً جھٹک دیتا۔ میں نے طے کیا کہ اب دو تین دن بعد گھر سے نکلوں گا۔ پہلے چڑیا بازار سردار جہاں کے مکان جا کر ہینگا اور کتوں کی خیریت معلوم کروں گا پھر خیرات خانے سلیمین کے پاس جاؤں گا یہ دونوں جگہیں سڑک کے ایک ہی طرف ایک دوسرے سے بہت کم فاصلے پر واقع تھیں۔

تین دن بعد جب بستر پر پڑے پڑے میں اکتا گیا، گھر سے باہر نکل کر میں نے پہلے چڑیا بازار کا رخ کیا اور سیڑھیاں چڑھ کر سردار جہاں کے دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر بعد اندر سے ایک ہٹا کٹا نو جوان نکلا اور مجھے تیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا:

”کیسے؟“

”ہینگا صاحبہ سے ملنا ہے۔ کہہ دیجیے کچھ دن پہلے جو صاحب آئے تھے وہی آئے ہیں۔“

یہ سن کر وہ نو جوان اندر گیا۔ کچھ دیر بعد آ کر اس نے مجھے ایک بڑا سا تھیلا دیتے ہوئے کہا:

”وہ دونوں اب یہاں نہیں رہتیں۔ یہ تھیلا آپ کے لیے چھوڑ گئی ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے مجھ سے پوچھا: ”آپ نے اُن لوگوں سے کچھ بنانے ونانے کو کہا تھا۔“

”جی۔“

”ہاں تو وہی سب کچھ ہے اس میں۔“

”بتا سکتے ہیں کہاں گئی ہیں؟“

”ہمیں بتا کر جاتیں تو ضرور بتا دیتے۔“

میں تھیلا ہاتھ میں لے کر زینے سے اتر آیا۔ آخری زینے پر آ کر میں نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا تو وہ نو جوان اب بھی دروازہ کھولے مجھے مشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

سڑک پر آ کر میرے ذہن میں ہینگا کا جملہ کوندے کی طرح لپکا:

”دیکھیے ہم لوگوں کا کیا ہوتا ہے۔“

”اس کا مطلب اقبال بیگم نے سردار جہاں کا مکان اپنے قبضے میں کر لیا،“ میں نے سوچا اور خیرات خانے کی طرف یوں قدم بڑھانے لگا جیسے مجھ پر منوں کا بوجھ ہو۔ سردار جہاں کے مکان سے خیرات خانہ بہت دور نہیں تھا لیکن یہ فاصلہ میں نے بہت دیر میں طے کیا۔ کچھ کچھ

دیر بعد میں کسی دکان کے پڑے سے لگ کر کھڑا ہو جاتا اور مڑ کر آنکھوں سے اوجھل ہو جانے والے سردار جہاں کے مکان کی طرف دیکھنے لگتا۔ اسی طرح تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رک رک کر میں خیرات خانے پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے سلیمین کی بیٹی کا دروازہ کھٹکھٹایا تو دروازہ سلیمین ہی نے کھولا اور مجھے دیکھتے ہی بولی:

”آئیے بھئی میں آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی۔“ پھر میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”کیا بات ہے آپ بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہیں۔“

”ہاں۔ وہ رات میں ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔“

”سلیمین! بھئی آئے ہیں۔ پانی لا پھر چائے بنا۔“ اپنی بیٹی سے یہ کہہ کر سلیمین مجھے اندر لے گئی اور پلنگ پر بٹھا دیا۔ جب سلیمین کا لایا ہوا پانی میں نے پی لیا تو بولی:

”میں کاظمین اور اس کے آس پاس کے محلوں میں گئی تھی معلوم کرنے۔ بہت سی دکانوں پر پوچھنے پر ایک دکاندار نے بتایا: ”آتی تو تھیں لیکن جب سے یہ محلہ چھوڑا، ادھر نہیں آئیں۔ پھر خود ہی بولا حیدر گنج چلی جاؤ۔ وہاں گھر گھر پتنگیں بنتی ہیں اور لفافے بھی۔ وہیں کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔“ یہ بتا کر بولی: ”میں حیدر گنج گئی۔ وہیں ایک جگہ معلوم ہوا کہ بہت سی پتنگیں اور لفافے بنا کر لائی تھیں۔ بتانے والے نے بتایا بہت کھانس رہی تھیں، کسی ہسپتال میں بھرتی ہونے کی بات کر رہی تھیں۔ اُسی کے لیے کچھ پیشگی رقم بھی لے گئی ہیں۔ کہہ گئی ہیں ٹھیک ہو کر آؤں گی تو اس کے عوض کا کام بنا کر دے جاؤں گی۔“

”ہسپتال کا نام نہیں بتایا؟“

”میں نے پوچھا تو بولا: پوچھا میں نے بھی تھا کہنے لگیں جہاں کھانسی کا اچھا علاج ہوتا ہے وہیں جاؤں گی۔“ یہ بتا کر سلیمین بولی: ”ایک سرکاری ہسپتال تو اسی سڑک پر ہے۔ پٹن صاحب کی کربلا کے سامنے۔“

”نہیں وہاں کھانسی کا اچھا علاج نہیں ہوتا۔“ میں نے کہا۔ ”کل جو دو بڑے ہسپتال ہیں وہاں جا کر دیکھوں گا۔“

”ضرور جائیے پتہ چلتے ہی مجھے بتائیے۔ جب تک وہ بھرتی رہیں گی، میں ان کے ساتھ رہوں گی۔“

نہیں میرے لیے چائے بنا کر لے آئی تھی۔ میں نے جلدی جلدی چائے پی اور
 سلمیٰ سے کہا: ”جیسے ہی بٹیا کے بارے میں پتہ چلا تمہیں آ کر بتاؤں گا۔“ یہ کہہ کر میں
 خیرات خانے سے باہر نکل آیا۔

○

جو تھیلا سردار جہاں والے مکان پر مجھے اس نوجوان نے دیا تھا، گھرا کر میں نے اسے
 کھولا تو اس میں کاغذ اور کپڑوں کی دہری تہری تھوں میں بہت اچھی طرح لپٹی ہوئی کئی چیزیں
 تھیں۔ میں نے سب سے پہلے وہ چیز باہر نکالی جسے دیکھ کر میں نے سمجھ لیا تھا یہ وہی تصویر ہے
 جسے فریم کرنے کے لیے ہینگا اور کتو نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ میں نے ایک کے بعد ایک اس
 کی جہیں کھولیں تو وہ تصویر بہت خوبصورت فریم میں لگی ہوئی تھی۔ اس فریم میں اس تصویر کا
 حسن دیکھ کر میں حیران رہ گیا اور اسے بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ میرا جی چاہا میں اسی وقت شہباز کو
 ڈھونڈ کر یہ تصویر اسے دکھاؤں۔ فریم کی ہوئی اس تصویر کو بہت دیر تک دیکھتے رہنے کے بعد
 میں نے دوسری چیزوں کی جہیں کھولنا شروع کیں۔ ان میں کتو کے ہاتھ کی بنائی ہوئی دو بہت
 عمدہ تصویریں تھیں۔ ایک میں تخت پر بیٹھی ہوئی سیاہ ساری میں ملبوس افسردہ چہرے والی
 سردار جہاں کو بیڑی پیتے ہوئے دکھایا گیا تھا اور دوسری میں ہینگا اور کتو کو تعزیے بناتے ہوئے۔
 دوسری لپٹی ہوئی چیزوں میں کچھ گڑیاں الگ الگ انداز میں دکھائی گئی تھیں، کچھ طغریٰ تھے
 اور بہت خوبصورت لکڑی کی ایک چھوٹی سی ضرت۔ تھیلے کی تہہ میں ایک بند لفافہ تھا۔ میں نے
 اسے کھولا تو ایک چھوٹے سے پرچے پر لکھا تھا:

”یہ سب آپ کے لیے ہماری طرف سے۔ ہم یہ گھر چھوڑ رہے ہیں۔ شہر
 بہت چھوٹا ہے۔ کہیں نہ کہیں پھر ملیں گے۔ جس لڑکی کی تصویر آپ نے بنوائی ہے
 اگر اصلیت میں وہ ہے تو اسے یہ تصویر ضرور دکھائیے گا اور اس سے ضرور پوچھئے گا،
 کیسی بنی ہے۔ حالہ کی تصویر احتیاط سے رکھیے گا۔ مرتے وقت انہوں نے آپ کو
 یاد کیا تھا۔ کہا تھا: بہت دن سے وہ نہیں آئے جو مجھ سے پرانی باتیں پوچھتے تھے۔ کبھی
 آئیں تو ان سے اچھی طرح ملنا۔ باتیں اچھی نہیں پوچھتے لیکن آدمی اچھے ہیں۔“

دعاؤں کی طالب

ہینگا اور کتو

تھیلے والی چیزوں کو اپنی میز پر رکھ کر میں نے خط کو بار بار پڑھا۔ پھر نہ جانے کب مجھے نیند آ گئی۔ شام سے کچھ پہلے جب میری آنکھ کھلی اور جب میں نے کمرے کی کھڑکی ذرا سی کھولی تو باہر بہت گرم ہوا چل رہی تھی۔ میں پھر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ بستر پر لیٹ کر کبھی مجھے شہبا کا خیال آتا، کبھی میں ہنگا اور کتو کے بارے میں سوچنے لگتا اور کبھی مجھے سبیلہ کا یہ پوچھنا یاد آتا: ”آپ شہبا کے لیے بہت پریشان ہیں۔“

جب لیٹے لیٹے مجھے بہت زیادہ وحشت ہونے لگی تو میں نے سوچا حکیم احمد رضا کی طرف چلا جائے۔ جہاندار بیگم کے انتقال کے بعد حالات اتنی تیزی سے بدلے کہ مجھے اُن کی طرف جانے کا موقع نہیں مل سکا۔ یوں بھی اب اُن کی طرف جانے کی ضرورت اس لیے نہیں تھی کہ جن لوگوں کی دوا میں ان سے لاتا تھا، اُن میں سے ایک اس دنیا سے اٹھ چکی تھیں اور دوسری حویلی چھوڑ کر کسی نامعلوم جگہ پر چلی گئی تھیں۔ مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ مسجدوں سے اذان کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ میں نے طے کیا میں حکیم صاحب کے مطب اس وقت پہنچوں گا جب وہ اپنے سارے مریضوں کو دیکھ چکیں گے۔ اُس وقت ان سے اطمینان سے بات ہو سکے گی۔ وقت گزرنے کے لیے میں ہنگا اور کتو کی دی ہوئی چیزوں کو پھر سے دیکھنے لگا۔ اُن میں سب سے زیادہ میں نے وہ تصویر دیکھی جس میں سر پر ڈوپٹہ ڈالے دو زانو بیٹھی لڑکی کو پتنگیں بناتے دکھایا گیا تھا۔ تصویر دیکھ کر میں شہبا کے نور باڑی والے گھر میں پہنچ گیا اور وہاں اُسے ہاتھوں میں لگی لٹی کو چھڑاتے، چائے بناتے، امرودوں کے کچالوؤں میں شکر، نمک اور کالی مرچ ڈالتے اور صحن میں لگے درختوں سے پھل توڑتے دیکھتا رہا۔ ”کتو کے ہاتھ میں واقعی کمال ہے۔“ میں نے سوچا اور تصویر کو میز پر ایسے زاویے سے رکھا کہ اُس پر ہر وقت میری نگاہ پڑتی رہے۔ عشاء کا وقت گزر جانے کے بعد میں اٹھ کر تیار ہوا اور گھسیاری منڈی کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچتے پہنچتے رات کے نو بج چکے تھے۔ مطب میں ایک دو مریض ہی موجود تھے۔ مریضوں کا نام پکارنے والے شخص نے مجھے وہاں دیکھ کر یوں دیکھا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہا ہو ”بہت دن بعد آئے۔“

”حکیم صاحب کو بتادوں۔“ اس نے میری طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

”ابھی نہیں، سب مریضوں کے بعد۔“

جب حکیم صاحب بچے ہوئے مریضوں کو دیکھ چکے تو نام پکارنے والے نے اندر جا کر انہیں میرے آنے کی اطلاع دی۔ میں ان کے کمرے میں داخل ہوا تو مجھے دیکھتے ہی انہوں نے کہا: ”آئیے آئیے۔ اتنے دن آپ کے نہ آنے کی وجہ مجھے معلوم ہے۔“ پھر پوچھا: ”کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہوں۔ بیگم صاحبہ.....“

”نہیں رہیں۔ مجھے معلوم ہے اور یہ بھی معلوم ہے حویلی پر دوسروں کا قبضہ ہو گیا۔“

”میں نے تو پہلے ہی خبردار کیا تھا۔“ حکیم صاحب نے کہا۔ پھر پوچھا: ”اچھا بتائیے جن خاتون کی دوا لے جاتے تھے آپ، وہ.....“

”حویلی چھوڑ کر چلی گئیں، کسی نامعلوم جگہ پر۔“

”بتا کر نہیں گئیں۔“

”نہیں، بوا سلیمان کو بھی نہیں بتایا۔“

”آپ نے تلاش نہیں کیا۔“

”بوا سے، اب وہ خیرات خانے میں اپنی بیٹی کے ساتھ رہنے لگی ہیں، کہا تھا پتہ لگانے کے لیے۔“

”تو.....؟“

کسی نے، جہاں شہباز پتنگیں دینے جاتی تھیں، بوا کو بتایا جب پتنگیں لے کر آئی تھیں تو بہت کھانس رہی تھیں، کسی ہسپتال میں بھرتی ہونے کی بات کر رہی تھیں۔“

”میڈیکل کالج جائے اور کل ہی جائے۔ سینے کے امراض کا علاج وہیں سب سے اچھا ہوتا ہے اور مفت ہوتا ہے۔“ حکیم صاحب نے کہا۔

”جی کل ہی جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر میں نے حکیم صاحب کو شملہ خانم کے ملنے، ہنگامہ اور کتو کے سردار جہاں کے مکان سے نکلنے، جہاندار بیگم کے ایک قریبی عزیز کے خیرات خانے میں رہنے کی باتیں تفصیل سے بتائیں۔ سب کچھ سننے کے بعد حکیم صاحب نے پوچھا:

”تو یہ شملہ خانم، امراؤ جان کی بیٹی کہاں ملیں آپ کو؟“

جب حکیم صاحب بچے ہوئے مریضوں کو دیکھ چکے تو نام پکارنے والے نے اندر جا کر انہیں میرے آنے کی اطلاع دی۔ میں ان کے کمرے میں داخل ہوا تو مجھے دیکھتے ہی انہوں نے کہا: ”آئیے آئیے۔ اتنے دن آپ کے نہ آنے کی وجہ مجھے معلوم ہے۔“ پھر پوچھا: ”کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہوں۔ بیگم صاحبہ.....“

”نہیں رہیں۔ مجھے معلوم ہے اور یہ بھی معلوم ہے حویلی پر دوسروں کا قبضہ ہو گیا۔“

”میں نے تو پہلے ہی خبردار کیا تھا۔“ حکیم صاحب نے کہا۔ پھر پوچھا: ”اچھا بتائیے جن خاتون کی دوا لے جاتے تھے آپ، وہ.....“

”حویلی چھوڑ کر چلی گئیں، کسی نامعلوم جگہ پر۔“

”بتا کر نہیں گئیں۔“

”نہیں، بوا سلیمین کو بھی نہیں بتایا۔“

”آپ نے تلاش نہیں کیا۔“

”بوا سے، اب وہ خیرات خانے میں اپنی بیٹی کے ساتھ رہنے لگی ہیں، کہا تھا پتہ لگانے کے لیے۔“

”تو.....؟“

کسی نے، جہاں شہبا پتنگیں دینے جاتی تھیں، بوا کو بتایا جب پتنگیں لے کر آئی تھیں تو بہت کھانس رہی تھیں، کسی ہسپتال میں بھرتی ہونے کی بات کر رہی تھیں۔“

”میڈیکل کالج جائیے اور کل ہی جائیے۔ سینے کے امراض کا علاج وہیں سب سے اچھا ہوتا ہے اور مفت ہوتا ہے۔“ حکیم صاحب نے کہا۔

”جی کل ہی جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر میں نے حکیم صاحب کو شملہ خانم کے ملنے، ہنگا اور کتو کے سردار جہاں کے مکان سے نکلنے، جہاندار بیگم کے ایک قریبی عزیز کے خیرات خانے میں رہنے کی باتیں تفصیل سے بتائیں۔ سب کچھ سننے کے بعد حکیم صاحب نے پوچھا:

”تو یہ شملہ خانم، امراؤ جان کی بیٹی کہاں ملیں آپ کو؟“

”عزیز گنج میں، سرائے معالیٰ خاں کی طرف سے جائیں تو سرفراز گنج کے آگے پڑتا ہے اور کاظمین کی طرف سے.....“

”جانتا ہوں، لکھنؤ کے ایک ایک محلے سے واقف ہوں، آصف الدولہ نے بسایا تھا۔ یہ گنج والے محلے زیادہ تر انہیں کے بسائے ہوئے ہیں۔ آگے بتائیں۔“

”وہاں بڑی خاموشی سے رہتی ہیں۔ آس پاس کے لوگ نہ انہیں جانتے ہیں نہ ان کی بیٹی کو۔“ میں نے انہیں بتایا: ”آپ کے پاس آتی رہی ہیں اپنا علاج کرانے۔“

”ہاں۔ ایک خاتون آتی تو تھیں لیکن پرچے پر کوئی اور نام لکھواتی تھیں۔“ حکیم صاحب نے کہا۔ پھر بولے:

”گفتگو بہت عمدہ کرتی تھیں بالکل اودھ کی بیگموں جیسی۔ مٹلوں اور محاوروں کا بے تکلف استعمال کرتیں۔“

یہ بتا کر حکیم صاحب نے پوچھا: ”تو اپنی بیٹی کے ساتھ رہتی ہیں وہاں۔“

”جی۔“

”کیا عمر ہوگی اُن کی۔“

”تیس کے آس پاس یا اس سے کچھ زیادہ۔“

”ہوں۔ کچھ پڑھ لکھ گئی ہیں۔“

”بہت۔ ایک کتاب لکھ رہی ہیں ایسی عورتوں پر.....“

”جو پیشہ کرتی ہیں۔“ حکیم صاحب نے بیچ ہی میں بول کر جملہ پورا کر دیا۔

”جی اور اسی پیشے کی بیماریوں میں مر جاتی ہیں۔ لیکن آپ نے کیسے جانا۔“

”وہ حکیم ہی کیا جس کا قیاس درست نہ ہو۔ ہم قیاس کو درست جان کر علاج کرتے

ہیں۔“ یہ کہہ کر بولے: ”اور وہ علاج درست ہوتا ہے۔“

”شمیلہ خانم انہیں بھی جانتی ہیں۔“

”کنہیں؟“

”شہبا کی ماں صہبا خانم کو۔“

”ضرور جانتی ہوں گی۔ میں نے بتایا تھا آپ کو۔۔۔ امراؤ جان، سردار جہاں، صہبا خانم

سب ایک ہی گھر سے باہر نکلے ہیں۔ اور وہ گھر ہے الم نصیبوں کا۔“ یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئے۔
”کل سے مجھے عجیب سا لگ رہا ہے۔“ حکیم صاحب کے دیر تک چپ رہنے کے بعد میں نے کہا۔

”کیسا لگ رہا ہے؟“

”جی کرتا ہے کسی ویرانے کی طرف نکل جاؤں۔“

”رہیے اب ایسی جگہ.....“ حکیم صاحب نے غالب کا مصرعہ پڑھا پھر بولے:
”میں سمجھ سکتا ہوں آپ کی حالت۔ جہاندار بیگم کا مرجانا، صہبا خانم کی بیٹی کا چلا جانا،
اور..... سردار جہاں کی بھانجیاں..... کیا نام بتائے تھے آپ نے ان کے.....“
”ہینگا اور کتو۔“

”جی۔ اُن کا گھر سے نکالا جانا..... ان سب کا بہت اثر ہے آپ پر۔“

”صحیح کہا آپ نے۔ اسی لیے آپ کی طرف چلا آیا۔“

”جی ہلکا کرنے۔ اچھا کیا۔ دوا دے رہا ہوں آپ کو اور ان کی دوا بھی لیتے
جائیے..... شہبازی بی کی.....“
”وہ تو.....“

”ہسپتال میں ہیں تو کیا ہوا۔ حکیمی اور ڈاکٹری دوائیں ایک دوسرے کی دشمن نہیں۔“ یہ
کہہ کر حکیم صاحب نے اپنے معاون سے الگ الگ دوائیں بنانے کو کہا۔ دوائیں بن جانے
کے بعد انہوں نے اپنی شیروانی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ روپے نکالے اور مجھے دیتے
ہوئے بولے:

”یہ رکھ لیجیے۔ ہسپتال میں شہبا خانم کے علاج میں اوپر سے بہت خرچ ہوگا۔“

”نہیں۔ یہ میں نہیں لوں گا۔ تھوڑا بہت میرے پاس ہے اسی سے.....“

”میاں آپ لکھنؤ کے حکیموں کو نہیں جانتے۔ وہ جھوٹی ٹولے۔ کہ ہوں یا جوہری
ٹکے کے، اپنے مریضوں کے لیے تہجد میں آہ وزاری کے ساتھ دعائے صحت کرتے
ہیں۔“ حکیم صاحب نے کہا۔ پھر بولے: ”اور نادار مریضوں کو نسخوں کے ساتھ چھپا کر
”پیہ پیہ دیتے ہیں۔ اسے رکھ لیجیے۔“

مھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر پڑی تو آپ سے آ کر لے لوں گا۔“ میں نے کہا۔ حکیم صاحب یہ سن کر خاموش ہو گئے پھر دوائیں مجھے دیتے ہوئے بولے:

”بی بی کا پتہ لگ جائے تو ان کی حالت ضرور بتائیں اور جب تک وہ ہسپتال میں رہیں ان کے پاس رہیں۔“ پھر بولے: ”دل مضبوط رکھیے گا اور میرا نہیں کا یہ مصرعہ بھی یاد رکھیے گا:

ع ”خاک ہونے کو یہ مشتِ استخوان پیدا ہوئے..... اب جائے شہابی بی کے لئے دوا بھی اور دعا بھی۔“

○

سہا سنبھل س

دوسرے دن دھوپ نکلتے ہی میں لکھنؤ کے سب سے بڑے ہسپتال کی طرف جسے عرفِ عام میں میڈیکل کالج کہا جاتا ہے چل دیا۔ یہ ہسپتال جو کنگ جارج پنجم کے نام سے منسوب ہے میرے ٹھکانے سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اسی ہسپتال کی پشت پر آصف الدولہ کا امام باڑہ ہے۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ہسپتال پہنچ کر سیدھے اُس وارڈ کی طرف گیا جہاں سینے کی شکایت والے مریض رکھے جاتے ہیں۔ وارڈ میں داخل ہو کر میں نرسوں والے کمرے میں گیا اور شہبا کا نام لے کر مریضوں کی فائل رکھنے والی نرس سے پوچھا:

”اس نام کا کوئی مریض آج کل میں بھرتی ہوا ہے۔“

نرس نے میری طرف غور سے دیکھا۔ پھر فائل کھولی۔ دو چار پتے پلٹ کر اس نے

مجھ سے پوچھا:

”کیا نام بتایا آپ نے سہبا.....“

”شہبا۔ شہبا خانم۔“

”ہاں پرسوں بھرتی ہوئی ہیں۔ اوپر زنانہ وارڈ نمبر ایک میں ہیں۔“

یہ سن کر میری جان میں جان آئی۔

”میں اُن سے مل سکتا ہوں۔“

”نہیں۔ زنانہ وارڈ میں ایسے نہیں جاسکتے۔ چار سے چھ کا وقت ہے ملنے کا۔“ نرس نے

کہا۔ پھر بولی: ”یوں بھی مریض کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ کچھ دیر پہلے ہی انہیں جنرل وارڈ

میں لایا گیا ہے۔ گلوکوز چڑھ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے خون کی بھی ضرورت پڑے۔“

یہ سنتے ہی میرے بدن میں تھر تھری پیدا ہوئی۔

”ایک نظر باہر سے دیکھ سکتا ہوں۔“

”آپ کون ہیں ان کے؟“

”رشتے دار۔“

”جب وہ بھرتی ہونے آئیں تو آپ ان کے ساتھ نہیں تھے۔“

”شہر سے باہر تھا۔“ میں نے جھوٹ بولا۔

”جب دکھانے آئی تھیں، بالکل اکیلی تھیں۔ میں ہی تھی ڈیوٹی پر۔“ نرس نے

کہا۔ ”کھانتے کھانتے دہری ہوئی جا رہی تھیں۔ ایکس۔ رے میں آدھے سے زیادہ پھیپھڑے خراب نکلے۔“

”آپ اجازت دیں تو وارڈ کے باہر ہی سے دیکھ لوں۔“ اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا۔

میرے یہ کہنے پر نرس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ پھر بولی:

”دیکھ لیجیے۔ مگر ڈاکٹر بستر کے پاس ہوں تو چلے آئیے گا۔ وارڈ کے دروازے سے

لگا ہوا ہے اُن کا بستر۔“

نرس کی اجازت ملتے ہی میں تیزی سے زینے چڑھتا ہوا زانہ وارڈ کے دروازے پر

جا پہنچا اور جب اندر جھانک کر دیکھا تو بستروں پر مریض بڑی قابلِ رحم حالتوں میں نظر آئے۔

کسی کے جسم سے گوشت بالکل غائب تھا تو کسی کا چہرہ بالکل زرد، کوئی بری طرح کھانس رہا تھا

تو کسی کی سانسیں بہت تیز چل رہی تھیں، کسی کی پیٹھ سہلائی جا رہی تھی تو کوئی سر کو تولیے سے

ڈھک کر بھپا رالے رہا تھا۔ کسی کی ناک میں نلی لگی ہوئی تھی تو کسی کو خون چڑھایا جا رہا تھا۔ کوئی

تکیے پر سر نیوڑھائے پڑا تھا تو کسی کو خون کی قے ہو رہی تھی۔ ان سب کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا

جیسے یہ سب چند دن کے مہمان ہوں۔ اُن سب پر نگاہ دوڑانے کے بعد میری نگاہ دروازے

سے لگے ہوئے بستر پر گئی۔ میں نے دیکھا شہباز لال رنگ کا کمبل اوڑھے آنکھیں بند کیے پڑی

ہے۔ بستر کے پہلو میں اسٹینڈ پر گلوکوز کی بوتل لگی تھی اور اُس کے بائیں ہاتھ میں گلوکوز

چڑھانے والی سوئی۔ ایک نرس سر ہانے کھڑی پارہ دیکھ رہی تھی اور کاغذ پر کچھ لکھ رہی تھی۔ میں

نے یہ دیکھنے کے لیے کہ شہباز آنکھ کھولتی ہے یا نہیں کئی بار اندر جھانک کر دیکھا لیکن ہر بار اس کی

آنکھ بند نظر آئی۔ میرے بار بار جھانکنے پر سرہانے کھڑی ہوئی نرس نے جب مجھے گھور کر دیکھا تو میں نیچے اتر آیا اور جس نرس سے اجازت لی تھی جب اس کا شکریہ ادا کرنے گیا تو وہ بولی:

”کوئی عورت نہیں ہے ان کے گھر میں۔“

”بتائیے۔“

”یہاں رہنا پڑے گا ان کے ساتھ۔ حالت ٹھیک نہیں ہے ان کی۔“ نرس نے کہا۔ پھر کہا:

”رات بارات طبیعت بگڑے تو کوئی بتانے والا تو ہو۔“

”کوشش کروں گا شام تک لے آؤں کسی کو۔“ میں نے کہا اور وارڈ سے باہر نکل آیا۔

باہر نکل کر میں وارڈ کے اس چھوٹے سے عقبی دروازے کی طرف آیا جو تھوڑی ہی دو سو پر تھا اور آصف الدولہ کے امام باڑے کی پشت پر کھلتا تھا۔ دروازے سے باہر آ کر میں امام باڑے کے پچھلے دروازے سے اُس کے اندر داخل ہوا اور سیڑھیاں اتر کر اس کے دونوں صحنوں میں ایسے ہی گھومتا رہا۔ پھر اس کے بہت چوڑے چبوترے کی اُن سیڑھیوں پر بیٹھ کر جن تک دھوپ ابھی نہیں پہنچی تھی سلیمن کو ہسپتال لانے کے بارے میں سوچنے لگا۔ کچھ دیر بعد جب سیڑھیوں کے اُس حصے میں دھوپ آ پہنچی تو میں اٹھ کر امام باڑے کی بہت بڑی مسجد کے دالان میں جا کر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے نیند آ گئی اور آنکھ اس وقت کھلی جب ظہر کی اذان دینے سے پہلے موزن نے میرا شانہ ہلا کر مجھے جگایا۔ میں اٹھ کر مسجد کے دالان سے باہر آیا اور اس کی سیڑھیوں کے نیچے بنے حوض پر بیٹھ کر منہ دھویا۔ پھر امام باڑے سے نکلا اور خیرات خانے جا کر سلیمن کو سب کچھ بتا کر اسے اپنے ساتھ ہسپتال لے آیا۔ ہسپتال کے باہر کی دکانوں سے بہت سے پھل خرید کر جب میں سلیمن کے ساتھ وارڈ کے اندر پہنچا تو دیکھا گلو کو اسی طرح چڑھ رہا ہے اور شہبا کی آنکھیں اسی طرح بند ہیں۔ شہبا کو اس حالت میں دیکھ کر سلیمن نے رونا شروع کر دیا۔ میں نے تسلی دے کر اسے چپ کرایا۔ پھر بستر کے پہلو میں رکھی ہوئی الماری کے خانوں کو صاف کیا اور ان میں خرید کر لائے ہوئے پھلوں کو رکھا۔ دوسرے بستروں کے مریضوں اور تیمارداروں نے ہمیں یوں دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں اتنی دیر میں خبر لی۔ الماری کے اوپری حصے پر پانی کی ایک بوتل اور طشتی میں گلاس رکھا تھا جسے شاید کسی مریض کا تیماردار لے آیا تھا۔ سلیمن نے سرہانے کھڑے ہو کر بہت ہلکے سے شہبا کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو اس

نے تھوڑی سی آنکھیں کھولیں لیکن وہ ہم دونوں میں سے کسی کو پہچان نہیں سکی۔ نرس اس وقت بھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد آ کر یہ دیکھ رہی تھی کہ گلوکوز صحیح چڑھ رہا ہے یا نہیں اور اسکی مقدار کتنی ہے۔ اسی بار بار کے آنے میں اس نے ہم سے پوچھا:

”آپ لوگ ان کے ساتھ ہیں؟“

”جی۔“

”تین دن سے کہاں تھے۔“

”شہر کے باہر، آج ہی پتہ چلا۔“

”آپ ان کے کون ہیں؟“ اس نے مجھ سے پوچھا۔

”رشتے دار۔“

”قریبی؟“

میں چپ رہا۔

”ان کے اپنے بھائی بہن ہیں؟“

”نہیں۔ کیوں؟“

”خون کی ضرورت پڑے گی۔“

”میں دے سکتا ہوں۔“

”پہلے معلوم کرنا پڑے گا آپ کا خون ان کے خون سے ملتا ہے یا نہیں۔“

”گلوکوز اور کتنا چڑھے گا؟“

”چڑھتا رہے گا جب تک انہیں ہوش نہ آ جائے۔“

میں اور سلیمین شہبا کے بستر سے لگے بیٹھے رہے۔ جب شام ہو گئی اور اندھیرا پھیلنے لگا اور جب نرس نے آ کر عیادت کرنے والوں سے باہر جانے کو کہا تو میں اور سلیمین وارڈ سے باہر نکل آئے۔ باہر نکل کر سلیمین نے مجھ سے کہا: ”بھیا آپ جا کر نسیمین کو بتا دیجئے میں رات میں یہیں رہوں گی۔ مجھے ایک تکیہ اور چادر دے جائے اور میرے اور آپ کے لیے رات کا کھانا بھی لیتی آئے۔“

میں نے ویسا ہی کیا جیسا سلیمین نے کہا تھا۔ رات ہوتے ہوتے نسیمین کھانے کے ساتھ

ضرورت کی دوسری چیزیں بھی لے آئی۔ میں بھی اپنے ٹھکانے سے رات کے رہنے کا سامان لے آیا۔ سلیمان نے وارڈ کے اندر شہبا کے بستر کے پہلو میں اپنی چادر بچھالی اور میں نے وارڈ کے باہر اپنے لیٹنے کا سامان کر لیا۔ مجھے بھوک بالکل نہیں تھی اس لیے میں نے سلیمان کا لایا ہوا کھانا نہیں کھایا۔ نرس ہر ایک گھنٹے پر آ کر شہبا کو دیکھ رہی تھی۔ جب رات زیادہ ہونے لگی تو سلیمان اور میں سونے کے لیے لیٹ گئے۔ آدھی رات گزر جانے کے بعد سلیمان نے آ کر مجھے جگایا:

”بھیا۔ بٹیا نے آنکھ کھولی تھی لیکن مجھے پہچانا نہیں۔ صرف دو لفظ بولے۔ پہلے اماں کہا پھر خالہ۔ پھر آنکھ بند کر لی۔“

یہ سن کر میں نیچے نرسوں والے کمرے میں گیا اور جو نرس شہبا کو دیکھنے بار بار آ رہی تھی اس سے کہا: ”اُنہیں ہوش آیا ہے۔ آنکھ کھول کر کچھ بولا بھی ہے۔“

”اماں۔ خالہ۔۔۔۔۔ یہی کہا ہوگا۔“

”یہی کہا ہے۔“

”وہ تو جب بھی ان کی آنکھ کھلتی ہے یہی بولتی ہیں۔“ نرس نے کہا۔ پھر بولی: ”جو عورت ان کے پاس ہیں، اُن سے کہیے اٹھ اٹھ کر دیکھتی رہیں۔“

دوسرے دن دوپہر تک شہبا پر غنودگی کا عالم رہا لیکن سہ پہر ہوتے ہوتے اسے ہوش آنے لگا اور اس ہوش آنے میں اس نے سلیمان کو پہچان بھی لیا۔ اس نے فوراً باہر آ کر مجھ کو بتایا بٹیا کو ہوش آ گیا ہے اور انہوں نے مجھ کو پہچان بھی لیا ہے۔ چار بجنے سے کچھ پہلے جب نرس نے گلو کو زکی تازہ بوتل چڑھائی تو شہبا بہت کمزور آواز میں اِکا دُکا جملے بولنے لگی۔ بوا کو پہچان کر اس نے سلیمان سے پوچھا:

”آپ کب آئیں۔ بھیا کو..... معلوم..... ہے۔“

”معلوم ہے۔ وارڈ کے باہر بیٹھے ہیں۔“ سلیمان نے شہبا کو بتایا۔

میں چار بجتے ہی وارڈ میں داخل ہوا۔ مجھ سے آنکھیں چار ہوتے ہی شہبا ہلکا سا مسکرائی پھر اس کے چہرے پر کچھ ایسا تاثر آیا جیسے حویلی سے بغیر بتائے چلے جانے پر شرمندہ ہو۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا ٹھیک ہیں۔ میں ہلکا سا مسکرایا لیکن یہ مسکراہٹ شہبا کے چہرے کی زردی دیکھ کر فوراً ہی میرے ہونٹوں سے غائب ہو گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے خون اس

کے جسم میں بچا ہی نہ ہو۔ وارڈ کے اندر دو گھنٹے کبھی ہم نے خاموش رہ کر اور کبھی اشاروں میں ایک دوسرے سے باتیں کر کے گزارے۔ سلیمان بیچ بیچ میں شہبا کی پیشانی پر ہاتھ رکھتی اور ہتھیلی کی پشت سے اس کے رخساروں کو سہلاتی۔ چھ بجنے والے تھے۔ آنے والوں کو باہر جانے کی اطلاع دینے کے لیے گھنٹی بجائی جا رہی تھی۔ میں اٹھنے لگا تو شہبا نے اشارے سے مجھ سے بیٹھ جانے کو کہا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا میں کچھ دیر اور اس کے پاس بیٹھوں۔ جب نرس اس کا پارہ دیکھنے آئی تو میں کھڑے ہو کر باہر جانے لگا۔ اسی وقت شہبا نے اشارے سے مجھے اپنے قریب بلایا اور کسی طرح اپنا کمزور ہاتھ میرے بازو تک پہنچا کر کچھ ٹٹولا۔ میں سمجھ گیا اور اس کا ہاتھ بہت آہستہ سے ہٹاتے ہوئے کہا:

”بندھا ہے۔ امام ضامن بندھا ہے۔ اور یہ دیکھو تعویذ بھی پہنے ہوئے ہوں۔“ میں نے گلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ شہبا کے چہرے پر اطمینان اور خوشی کی ایک لہر آئی۔ میں اس لہر کو دیکھتا ہوا وارڈ سے باہر نکل آیا۔



دو تین دن بعد شہبا کی طبیعت سنبھلنے لگی لیکن ابھی وہ اٹھ کر پوری طرح بیٹھ نہیں سکتی تھی۔ میں ہسپتال کے باہر کی دکانوں سے پھلوں کا رس لا کر اسے دن میں کئی بار پلاتا۔ سلیمان اسے نسیم کے ہاتھ کی پکائی ہوئی کھجوری کھلاتی۔ صبح شام معائنے کے لیے آنے والے ڈاکٹروں سے پوچھنے پر معلوم ہوا طبیعت تھوڑی اور سنبھل جانے پر خون، پیشاب اور بلغم وغیرہ کی جانچ ہوگی اور تب صحیح دوا دی جائے گی۔ ابھی تو اس کو وہ انجکشن لگائے جا رہے تھے جن سے کھانسی کم ہو اور سانس قابو میں آئے۔ ایک دو روز بعد جب شہبا اٹھ کر بیٹھنے کے قابل ہو گئی تو اس کی وہ سب چیزیں جانچ کے لیے بھیجی گئیں جن کی رپورٹ آنے پر اصل دوا دی جانا تھی۔ رپورٹ اطمینان بخش نہیں تھی۔ بہت دن تک علاج کے بغیر رہنے کی وجہ سے حالت بہت بگڑ چکی تھی۔ پھر بھی علاج شروع ہونے اور ہسپتال میں اچھی غذا ملنے کی وجہ سے شہبا سہارے سے اٹھنے بیٹھنے لگی اور سانس کے قابو میں آ جانے کی وجہ سے بات بھی ٹھیک سے کرنے لگی۔ جب وہ کچھ کچھ بولنے لگی تو اس وقت جب میں اسے موسمی کارس پلا رہا تھا، وہ مجھ سے بولی:

”آپ مجھ سے بہت ناراض ہوں گے۔ بغیر بتائے چلی گئی۔“

”ناراض تو نہیں ہوں لیکن.....“

”لیکن؟“

”یہ فکر ضرور تھی پتہ نہیں تم کس حال میں ہو۔“ میں نے کہا پھر پوچھا: ”کہاں رہیں

اتنے دن؟“

”ایک اسکول میں بچوں کی دیکھ بھال کرنے والی نوکری مل گئی اور رہنے کی جگہ بھی۔“

اس نے کہا۔ پھر بولی:

”پتنگیں اور لفافے بھی بناتی رہی۔ جب حالت زیادہ بگڑنے لگی تو یہاں آ کر بھرتی ہو گئی۔“

”لیکن ہم لوگوں کو بتائے بغیر کیوں چلی گئیں۔“

”میں نہیں چاہتی تھی آپ میرے ٹھکانے کے لیے پریشان ہوں۔“ شہبا نے کہا اور کہہ

کر میری طرف اس طرح دیکھا جیسے اپنے کیے کی معافی مانگ رہی ہو۔

”لیکن ہم لوگ تمہارے لیے پریشان بہت رہے۔“ یہ بتا کر میں نے شہبا کو بتایا کس

طرح سلیمین کاظمین اور کاظمین سے حیدر گنج گئی اور بھرتی ہونے کی بات معلوم کی۔ پھر اس

سے کہا: ”ایک اچھی خبر ہے۔“

”وہ کیا؟“

”امراؤ جان کی بیٹی کا پتہ چل گیا ہے۔ شمیلا خانم نام ہے ان کا۔“ میں نے اسے بتایا۔

”عزیز گنج میں رہتی ہیں اپنی بیٹی سبیلہ کے ساتھ۔ وہ تمہاری ہی عمر کی ہیں۔“

یہ سن کر شہبا کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

”تو ملے آپ ان سے؟“

”ملا اور بہت دیر تک ان کے پاس بیٹھا۔ وہ تمہاری ماں کو بھی جانتی ہیں اور تمہارے

بارے میں بھی انہیں معلوم ہے۔“

”جی چاہ رہا ہے اسی وقت اُن سے جا کر ملوں۔ لیکن.....“

”انہیں جیسے ہی معلوم ہوگا فوراً آئیں گی۔ میں نے سبیلہ کو سب بتایا ہے، بتایا ہے کہ تم

ہم لوگوں کو بتائے بغیر کہیں چلی گئی ہو۔“ میں نے کہا: ”کہہ رہی تھیں جیسے ہی پتہ چلے بتائیے گا

اور یہ بھی کہا انہیں ڈھونڈنے میں میں آپ کی مدد کروں گی۔“

”تو کل جا کر انہیں بتا دیجیے۔“

○

اگلے دن میں سلیمن کو شہبا کا خیال رکھنے کی ہدایتیں دے کر عزیٰ کی طرف اکل پڑا۔ وہاں پہنچ کر جیسے ہی میں نے شمیلہ خانم کے دروازے پر دستک دی، اندر سے سبیلہ کی آواز آئی: ”کون؟“

”میں۔“ سبیلہ نے میری آواز پہچان کر فوراً ہی دروازہ کھولا اور مجھے دیکھتے ہی پوچھا:

”کچھ پتہ چلا۔ شہبا خانم کا؟“

”وہی بتانے آیا ہوں۔“

سبیلہ نے جلدی سے برابر والے کمرے کا دروازہ کھول کر مجھے بٹھایا پھر پانی کا گلاس لا کر بڑی بے صبری سے پوچھا: ”کہاں ملیں؟“

”ہسپتال میں۔ میڈیکل کالج۔“ میں نے کہا۔ ”جب کھانسی بہت آنے لگی تو خود ہی جا کر بھرتی ہو گئیں۔“

”وہاں کوئی ہے ان کے ساتھ؟“

”ہوا۔ ہوا سلیمن۔ شہبا سے بہت لگاؤ ہے ان کو۔“

میں یہ بتا ہی رہا تھا کہ شمیلہ خانم کمرے میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے شہبا کے ہسپتال میں بھرتی ہونے کی بات سن لی تھی۔ آتے ہی بولیں: ”وہی ماں والا مرض۔ صہبا خانم کو، جیسے ہی جوانی ڈھلی اس مرض نے پکڑ لیا۔ پھر اسی میں جان گئی۔“

”طبیعت کیسی ہے؟“ سبیلہ نے پوچھا۔

”بہت کمزور ہو گئی ہیں۔ دو چار دن کی اور دیر ہو جاتی تو.....“

”خدا نہ کرے۔“ شمیلہ خانم بیچ میں بولیں۔

”ہسپتال پہنچتے پہنچتے کھانسی نے بہت زور پکڑ لیا۔“ میں نے کہا۔ پھر بتایا: ”انجکشن دیے گئے۔ گلوکوز چڑھایا گیا۔ دو دن تک بیہوشی کی حالت میں رہیں۔“

یہ سن کر سبیلہ کو بہت افسوس ہوا۔ اسی افسوس کے عالم میں وہ بولیں:

”میں آج ہی شام کو آؤں گی۔ اگر رات میں رہنا پڑا تو رہ بھی لوں گی۔“ پھر مجھ سے وارڈ کا نمبر پوچھ کر اپنی ماں کی طرف دیکھ کر کہا: ”اماں آپ پریشان نہ ہوئے گا۔“

”میں بھی چلوں گی تمہارے ساتھ۔“ شملہ خانم نے کہا پھر بہت دیر تک شہبا کی ماں کی باتیں کرتی رہیں۔ میں آج شملہ خانم کے گھر بہت دیر تک نہیں بیٹھنا چاہتا تھا اس لیے میں نے چلنے کی اجازت چاہی۔

”رکے۔“ سبیلہ نے کہا پھر اندر چلی گئیں۔ کافی دیر بعد باہر آئیں اور ایک جگہ کو تھیلے میں رکھ کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولیں: ”اس میں رس ہے موٹی کا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد پلاتے رہیے گا۔ میں شام کو آؤں گی تو ضرورت کی ساری چیزیں لیتی آؤں گی۔“ میں وہ تھیلا لے کر چلنے لگا تو دروازے پر آ کر سبیلہ نے بہت چپکے سے مجھ سے کہا: ”شہبا کے آس پاس ہی رہیے گا اور گھبرائیے گا بالکل نہیں۔“

○

ہسپتال واپس آ کر جب میں وارڈ کے دروازے پر پہنچا تو دیکھا سلیمین شہبا کو تکیے کے سہارے سے بٹھا کر اس کے سر میں تیل لگا رہی ہے۔ شہبا کو اس سے بہت آرام مل رہا تھا۔ گلو کو زچڑھانا بند کر دیا گیا تھا۔ میں نے سلیمین کو اشارے سے باہر بلا کر کہا: ”بیٹیا سے بتا دو شام کو سبیلہ بی بی آئیں گی۔“

”کون بی بی؟“

”سبیلہ بی بی۔“

اور جب سلیمین نے یہ بات شہبا کو بتائی تو اس کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔

سبیلہ اور ان کی ماں شملہ خانم چار بجنے سے پہلے ہی ہسپتال پہنچ گئیں۔ سبیلہ کے ہاتھ میں دو بڑے بڑے تھیلے تھے۔ انہوں نے سہارا دے کر اپنی ماں کو زینوں پر چڑھایا۔ اوپر پہنچتے پہنچتے اُن کی سانس پھولنے لگی۔ شہبا اپنے بستر پر آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ وارڈ میں داخل ہو کر وہ دونوں دیر تک شہبا کو اسی حالت میں دیکھتی رہیں پھر سبیلہ نے آہستہ سے کھنکھارا تو شہبا نے آنکھ کھولی اور انہیں دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کی۔ سبیلہ نے اسے اشارے سے منع کیا۔ لیٹے لیٹے شہبا نے سلیمین کی طرف یوں دیکھا جیسے کہنا چاہ رہی ہو انہیں اچھی طرح بٹھا دیجیے۔ سلیمین نے جو اسٹول بستر کے پاس رکھا تھا پہلے اس پر شملہ خانم کو بٹھایا پھر برابر والے بستر سے ایک خالی اسٹول کھینچ کر اس پر سبیلہ سے بیٹھنے کو کہا۔

میں شہبا کے پاکتی بیٹھ گیا اور سلیمان اس کے سر ہانے کھڑی ہو گئی۔

”یہ سبیلہ ہیں اور یہ ان کی ماں۔“ میں نے شہبا سے ان دونوں کا تعارف کرایا۔
شہبا نے ان دونوں کو سلام کر کے میری طرف دیکھ کر بہت کمزوری آواز میں کہا:
”آپ لوگوں کے آنے کے بارے میں انہوں نے بتایا تھا۔“
”کیسی ہیں؟“ سبیلہ نے پوچھا۔

”آپ دیکھ ہی رہی ہیں کیسی ہوں۔“ پھر بولی: ”مرض بہت بگڑ گیا ہے۔ دیکھیے
ٹھیک ہوتا ہے یا نہیں۔“

”ٹھیک ہو جائے گا۔“

”دل کے بہلانے کو.....“ شہبا نے اتنا پڑھ کر باقی الفاظ ہاتھ کے اشارے سے ادا
کیے۔ پھر تھوڑا سا مسکرا کر بولی: ”اماں، جب اُن کی طبیعت بگڑنے لگی تھی کہا کرتی تھیں..... بڑا
موت جسم کے دروازے تک آ پہنچی ہے، دستک دینا باقی ہے۔“ یہ کہہ کر تیز تیز سانس لیتے
ہوئے کہا: ”یہی حال اپنا بھی ہے۔“

”ایسا مت کہو بی بی۔“ اب کے شمیلہ خانم بولیں۔ ”انشاء اللہ شفا ہوگی ضرور ہوگی۔“
”خالہ..... خالہ ہی ہوئیں آپ ہماری..... یہ سب تسکینِ قلب والی باتیں ہیں۔“ شہبا
نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے یہاں سے جانے کے دو چار دن بعد آپ کو اچھی خبر نہ ملے۔“
”بی بی۔ ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالتے۔ اور تم بولو نہیں آرام کرو۔ ہم تمہیں دیکھنے
آئے تھے، باتیں کرنے نہیں۔“ یہ کہتے کہتے شمیلہ خانم کی آنکھ نم ہو گئی۔ رندھی ہوئی آواز
میں انہوں نے کہا:

”صہبا خانم، تمہاری ماں کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس بی بی نے بہت دکھ اٹھائے
اور دکھ ہم نے بھی بہت اٹھائے۔“ شمیلہ خانم اسی گلوگیر آواز میں کہتی رہیں: ”یہی دکھ ہمیں
ایک دوسرے کے قریب لے آیا تھا۔ میں تمہاری ماں کی طرح ہوں اور یہ سبیلہ تمہاری بہن کی
طرح۔ اب سے تم ہماری بیٹی ہو اور یہ تمہاری بہن۔“

شمیلہ خانم کا یہ جملہ جیسے ہی ختم ہوا سبیلہ شہبا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولیں:
”سمجھیں۔ ہمیں اپنے سے الگ مت سمجھئے۔“

شہبانے سرہانے کھڑی ہوئی سلیمین کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا:
 ”بواتکے کے نیچے کچھ پیسے ہیں لے لیجیے اور باہر سے ان لوگوں کے لیے کچھ لے آئیے۔“
 اور اس سے پہلے کہ سلیمین تکیہ اٹھا کر دیکھتی میں نے کہا:
 ”میں لاتا ہوں۔“

”نہیں ہم انہیں دیکھنے آئے ہیں، کھانے پینے نہیں۔“ شمیمہ خانم بولیں۔ پھر بہت
 پیار سے شہبا کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا: ”میری ماں اور تمہاری نانی بھی ایک دوسرے کو
 اچھی طرح جانتی تھیں۔“

”مرنے سے کچھ دن پہلے.....“ شہبانے ٹھہر ٹھہر کر کہا: ”..... اماں نے ایک ایک بات
 مجھے بتائی تھی۔ بتاتی تو وہ پہلے بھی تھیں لیکن اب کی یہ کہہ کر بتایا انہیں لکھ لو۔ اُسی میں یہ سب
 قصے بھی تھے جو آپ بتا رہی ہیں۔“ پھر اپنی سانسیں ٹھیک کرتے ہوئے بولی: ”اُس وقت میں
 نے نہیں لکھا۔ اب زندگی رہی تو سب سے پہلے یہی کام کروں گی۔“

”بڑی بوڑھیوں کی سی باتیں مت کرو۔ تم بالکل اپنی ماں کی طرح بول رہی ہو۔“
 ”اچھا یہ بتائیے خالہ.....“ شمیمہ خانم کی بات ختم ہوتے ہی شہبا بولی: ”آپ کی بیٹی مجھ
 سے بڑی ہوں گی یا چھوٹی۔“

”برابر ہی کی لگتی ہو دونوں۔“
 ”تو میں تمہیں سبّو پکاروں گی۔“ شہبانے سبیلہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”اماں کو بھی ان
 کے قریب کے لوگ صوّ ہی کہتے تھے۔ اس طرح مجھے اپنی ماں یاد آتی رہیں گی۔“
 ”اور میں تمہیں شوّ کہوں گی۔ اتنا مت بولو۔“ سبیلہ نے شہبا کو بولنے سے
 روکا پھر پوچھا:

”رات میں یہاں کون رہتا ہے؟“

”یہ.....“ میں نے سلیمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بتایا تھا آپ کو۔“
 ”بوا! آپ کئی راتوں سے رہ رہی ہیں، کل سے میں رہوں گی۔“ سبیلہ نے سلیمین سے
 کہا پھر اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں: ”ٹھیک ہے اماں؟“
 ”بالکل رہو۔ اچھا ہے ان کا دل پہلے گا اور دیکھ بھال بھی ہوگی۔“

چھ بجنے والے تھے۔ سبیلہ نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”ملنے کا وقت ختم ہو رہا ہے۔ اب ہم لوگ چلتے ہیں۔“ یہ کہہ کر جو تھیلے وہ اپنے ساتھ لائی تھیں انہیں الماری کے پہلو میں رکھتے ہوئے بولیں:

”اس میں کھانے پینے کی بہت سی چیزیں ہیں اور کچھ برتن بھی۔ کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بتادیجیے، کل لیتی آؤں گی۔“

”نہیں۔ ضرورت تو اس کی بھی نہیں تھی۔ آپ لے آئیں، شکریہ۔“ یہ کہہ کر شہبا نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”یہ ہمارا بہت خیال رکھتے ہیں۔ بہت کیا ہے انہوں نے ہمارے ساتھ۔“ پھر دعا کے سے انداز میں دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا: ”خدا انہیں اس کا صلہ دے۔“ شہبا کے یہ کہتے وقت سبیلہ نے ہم دونوں کو بڑی اپنائیت کی نگاہ سے دیکھا پھر شہبا کا ہاتھ چوم کر اپنی ماں کے ساتھ وارڈ سے باہر نکل آئیں۔ باہر نکلتے ہی مجھ سے بولیں:

”انہیں دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ چہرے پر بہت زردی ہے اور سوجن بھی۔“ پھر بولیں:

”بہت خیال رکھنے کی ضرورت ہے۔ رس برابر پلاتے رہیے اور طاقت کی دوائیں جو جو بتائی ہوں ڈاکٹر نے، دیتے رہیے۔ کل سے میں سنبھال لوں گی۔“ یہ کہہ کر ڈرتے ڈرتے بولیں: ”برانہ مانیں تو دواؤں کے لیے.....“

”جی۔ شکریہ۔ زیادہ تر دوائیں یہاں سے مل رہی ہیں۔ جو باہر سے لانا ہوتی ہیں لے آتا ہوں۔“

جب میں ان دونوں کو ہسپتال کے دروازے تک پہنچانے آیا اور جب وہ لوگ سواری پر بیٹھ گئے تو ایک بار پھر سبیلہ نے مجھ سے کہا:

”خیال رکھیے گا ہماری بہن کا اور اپنا بھی۔“



شہبا کی مستقل تیمارداری کے لیے دوسرے دن سبیلہ اپنا مختصر سا ساز و سامان لے کر آگئیں۔ اس میں وہ ساری چیزیں تھیں جن کی یہاں ضرورت پڑ سکتی تھی۔ سبیلہ کے آجانے سے شہبا بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ جب سبیلہ نے وارڈ کے اندر سارا سامان ٹھیک

سے رکھ لیا تو شہبانے اُن سے کہا:
”یہاں میرے ساتھ رہنے میں تمہیں تکلیف بہت ہوگی لیکن.....“
”لیکن.....؟“

”سچ بات یہ ہے..... اماں انیس کا ایک مرثیہ بہت پڑھا کرتی تھیں۔“
”جب قطع کی.....“
”نہیں۔“

”پھر کون سا؟“
”جب نو جواں پسر.....“

”مرثیہ دیں سے جدا ہوا۔“ سبیلہ نے آگے کا حصہ پڑھا۔
”ہاں۔ یہ مرثیہ انہیں بہت پسند تھا۔ اس کا ایک بندوہ بہت پڑھا کرتی تھیں۔ اسی
میں یہ شعر تھا۔“
”کون سا شعر؟“

”میں تھوڑا بدل کر پڑھوں گی۔“ خواہر یہ سچ ہے.....“
ع ”ہاں بھائی سچ ہے صدمہ غربت ہے جاں گسل۔“ سبیلہ نے مصرعہ مکمل کیا۔
”میں نے کہا تھا میں بدل کر پڑھوں گی۔“
”اچھا پڑھیے۔“

خواہر یہ سچ ہے صدمہ غربت ہے جاں گسل
اس دم بہل گیا ترے آنے سے میرا دل
شعر سن کر سبیلہ کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔ انہوں نے شہبا کو بہت آہستہ سے گلے لگا کر کہا:
”یہ مرثیہ، مسافر کی کہانی والا، اماں کو بھی پورا یاد ہے اور مجھے بھی۔“
”فرما سکے نہ یہ کہ مرثیہ مشرقین.....“

”مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں“

شہبانے بیت پوری کی۔

پھر اس مرثیے کے جو جو بندوں کو یاد آتے گئے، ایک دوسرے کو سناتے گئے۔ اور آخر

میں شہبانے یہ بند کٹی بار پڑھا اور ہر بار پڑھ کر میری طرف دیکھا:

شہزادیاں غلام کی ہوتی ہیں بے پدر
کچھ غم نہیں، یتیم وہ لونڈی ہوئی اگر
میں کیا مکان کیا مرا یا شاہ بحر و بر
جب بے سبب جہاں میں لے فاطمہ کا گھر

گیتی ہو آج درہم و برہم تو خوب ہے
الے تمام دفتر عالم تو خوب ہے

”تم پھر زیادہ بول رہی ہو، آرام کرو۔“ سبیلہ نے شہبا کو مزید بولنے سے روکتے ہوئے
کہا۔ پھر میری طرف منہ کر کے بولیں: ”رات میں جب ڈاکٹر انہیں دیکھنے آئیں گے تو میں
اُن سے مرض کے بارے میں پوچھوں گی۔“

”ملنے کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ میں اور سلیمین وارڈ سے باہر آ گئے۔ میں نے سلیمین کو
خیرات خانے یہ کہہ کر بھیج دیا کہ تم دن میں کسی وقت آ جایا کرنا، رات میں رہنے کے لیے
سبیلہ آ گئی ہیں۔ رات میں جب ڈاکٹر ایک ایک مریض کا حال پوچھتے ہوئے شہبا کے
بستر کے قریب آئے اور حال پوچھ کر جب رپورٹیں دیکھنا شروع کیں تو سبیلہ نے اُن
سے شہبا کی تکلیف کے بارے میں پوچھا:

”آپ ان کی کون ہیں؟“ ڈاکٹر نے پلٹ کر اُن سے پوچھا۔
”بہن۔“

”ادھر آئیے۔“

سبیلہ کو وارڈ سے باہر لا کر ڈاکٹر نے کہا: ”ان کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ پھیپھڑے پوری
طرح خراب ہو چکے ہیں۔ آپ ان کی بہن ہیں اس لیے بتانا ضروری ہے۔“ یہ بتا کر اُس نے
کہا: ”بس یوں سمجھئے دیوار جب چٹخ جاتی ہے تو پلاستراسے بہت دن تک سنبھال نہیں سکتا۔ ابھی
تک تو اس مرض کا علاج ہی نہیں تھا۔“ اتنا بتا کر وہ بولا: ”اب کچھ نئے انجکشن نکلے ہیں لیکن ان
پر وہ کتنا اثر کرتے ہیں، کہہ نہیں سکتے۔“

میں ذرا دور پر کھڑا تھا لیکن سبیلہ کے چہرے پر آتے جاتے رنگ سے صاف سمجھ سکتا تھا

کہ حالات امید افزا نہیں ہیں۔ ڈاکٹروں کے جاتے ہی میں نے سبیلہ سے پوچھا:

”کیا بتایا؟“

”مرض بگڑ چکا ہے۔ لیکن دل چھوٹا مت کیجیے۔ جو انجکشن دیے جا رہے ہیں اس سے فائدہ ہو سکتا ہے۔“ سبیلہ نے میرا دل رکھنے کے لیے کہا۔

○

مرض کے پوری طرح بگڑ جانے کے باوجود شہبا کی حالت تیزی سے سنبھلنے لگی تھی۔ وہ اپنے بستر سے اتر کر وارڈ میں ادھر ادھر ٹہل کر دوسرے مریضوں سے بات چیت بھی کرنے لگی تھی اور جو مریض اپنے بستر سے نہیں اتر سکتے تھے ان کے تیمارداروں کی غیر موجودگی میں ان کی مدد بھی کرنے لگی تھی اور دوسرے زنانہ وارڈ میں جا کر وہاں کے مریضوں سے بھی گھل مل گئی تھی۔ شہبا کی طبیعت کے سنبھل جانے میں دواؤں سے زیادہ سبیلہ کی تیمارداری کا ہاتھ تھا۔ انہوں نے کئی راتیں جاگ کر شہبا کی دوا اور غذا کا خیال رکھا تھا۔ لیکن ڈاکٹر اس کی طبیعت کے سنبھل جانے کے بعد بھی مطمئن نہیں تھے۔ اُن سے جب بھی پوچھا جاتا وہ یہی کہتے: ”کچھ کہا نہیں جاسکتا۔“ اور جب اُن سے یہ کہا جاتا کہ اب تو صحت بہت اچھی ہو گئی ہے تو وہ کہتے: ”اس پر نہ جائیں۔ یہ بہت دھوکے کا مرض ہے۔ چڑھایا ہوا پلاسٹر کسی بھی وقت اُکھڑ سکتا ہے۔“ ڈاکٹروں سے یہ سب سننے کے بعد بھی سبیلہ ہمت نہیں ہار رہی تھیں۔ وہ پوری تندہی سے شہبا کی تیمارداری میں لگی تھیں اور ہر طرح سے اس کی دلجوئی کر رہی تھیں۔ شہبا اپنے مرض کی سنگینی کو سمجھ گئی تھی اور یہ بھی سمجھ گئی تھی کہ اُس کی علالت کا ہم لوگوں کو بہت دکھ ہے۔ ہمارے اس دکھ کو کم کرنے کے لیے اس نے خوش رہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ دوسرے مریضوں کے پاس دیر دیر تک بیٹھتی، اُن سے اچھی اچھی باتیں کرتی۔ کسی کے بالوں میں کنگھی کرتی کسی کا سر سہلاتی اور کسی کسی کو اپنے ہاتھ سے دوا بھی پلاتی۔

ایک دن ہسپتال میں بیٹھے بیٹھے مجھے خیال آیا میں نے اب تک شہبا کو وہ چیزیں نہیں دکھائی ہیں جو ہنگامہ اور کتوں نے اپنی خالہ کا مکان چھوڑتے وقت میرے لیے چھوڑی تھیں۔ اصل میں شہبا کی طبیعت کی خرابی نے جو حالات پیدا کیے ان میں مجھے اس کی مہلت ہی نہیں ملی۔ سو میں ہسپتال سے نکل کر اپنے ٹھکانے پر آیا۔ اُن سب چیزوں کو بڑی احتیاط سے تھیلے میں رکھا

اور ہسپتال لے آیا۔ سبیلہ معمول کے مطابق آچکی تھیں اور شہبا سے بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ وارڈ میں داخل ہو کر میں نے دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ”آپ لوگوں کو کچھ چیزیں دکھاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے ساری چیزیں تھیلے سے نکال کر سب سے پہلے اُن دونوں کو وہ تصویر دکھائی جس میں دوزانو بیٹھی لڑکی پتنگیں بنا رہی تھی۔

”یہ تو میں ہوں۔“ تصویر دیکھ کر شہبا کے منہ سے بیساختہ نکلا۔ ”صورت میری ہو یا نہ ہو لیکن پورا نقشہ ہمارے دالان کا ہے۔ اسی طرح بیٹھ کر میں لفافے اور پتنگیں بناتی تھی اپنے نور باڑی والے گھر میں“ پھر بولی: ”اور یہ چائے کا پیالہ اور طشتری میں نمک پارے یہ بھی اسی طرح رکھتی تھی میں اپنی چوکی پر۔“

”تصویر بہت عمدہ ہے۔“ سبیلہ نے تعریفی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ شہبا تصویر کو بہت دیر تک دیکھتی رہی اور دیکھتے دیکھتے رنجیدہ ہو گئی۔ پھر بڑے افسردہ لہجے میں بولی:

”کئی برس گزارے ہم نے اس دالان میں۔ بڑی اچھی ہوا آتی تھی بغیا کی طرف سے۔“ پھر بولی: ”پتہ نہیں ہمارے بعد اس گھر کا کیا ہوا۔“

عزیز گنج جاتے وقت جب میں نے کاظمین والا راستہ اختیار کیا تھا تو نور باڑی سے گزرتے وقت میں نے اس مکان پر بیچے اور کدالیں چلتی ہوئی دیکھی تھیں لیکن یہ بات میں نے شہبا کو بتائی نہیں تھی اور اس وقت بھی نہیں بتائی۔

”تصویر کس نے بنائی ہے؟“ سبیلہ نے پوچھا۔

”کمنو نے۔“ یہ کہہ کر میں نے اُن دونوں کو سردار جہاں والی تصویر دکھائی اور وہ تصویر بھی جس میں ہنگا اور کمنو کو تعزیے بناتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ دونوں تصویریں دیکھ کر سبیلہ نے پوچھا:

”یہ صاحبہ کون ہیں؟“

”سردار جہاں۔“

”اور یہ تعزیے بناتی ہوئی لڑکیاں۔“

”ہنگا اور کمنو۔“

”سردار جہاں کی بھانجیاں؟ آپ جب آئے تھے ہمارے یہاں انہیں لوگوں کا

ذکر کر رہے تھے؟“

”جی۔“

”یہ بھی بتا رہے تھے سردار جہاں کی بھانجی، سگی بھانجی، اس مکان پر اپنا قبضہ چاہتی ہیں۔“

”جی۔ اقبال بیگم۔“

”تو یہ ہینگا اور کتوا بھی اسی مکان میں ہیں یا.....“

”چلی گئیں۔“

”کہاں؟“

”بتا کر نہیں گئیں۔“

اور اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہتا شہبامیری طرف دیکھتے ہوئے بولی:

”کوئی جاتا ہے تو پتہ بتا کر نہیں جاتا۔“ پھر بولی: ”دوسروں کو اپنے دکھ سے بچائے رکھنے

کا یہی طریقہ ہے۔“ پھر کہا:

”آپ نے پہلے کبھی بتایا نہیں ان دونوں کے بارے میں۔“

”میں بتاتا لیکن تم حویلی چھوڑ کر جا چکی تھیں۔“

”سردار جہاں کا ذکر تو اماں بھی کیا کرتی تھیں۔“ یہ کہہ کر شہبانا نے سبیلہ کی طرف اس

طرح دیکھا جیسے اسے بتا رہی ہو، ہم سب ایک ہی ڈور سے بندھے ہیں۔

سبیلہ اور شہبانا نے دوسری چیزوں کو بھی بہت پسند کیا اور سبیلہ کو وہ گڑیاں زیادہ پسند آئیں

جنہیں ناچتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ دونوں نے ہینگا اور کتو کے ہنر کی خوب تعریف کی۔ انہیں باتوں

کے بیچ شہبانا نے بتایا کہ برابر والے وارڈ میں آج ایک لڑکی نگرانی والے وارڈ سے لائی گئی ہے۔

عمر زیادہ نہیں ہے۔ بہت اچھی شکل کی ہے۔ رنگ بہت گورا ہے۔ پنجاب کی ہے لیکن رہتی لکھنؤ

میں ہے۔ تین دن پہلے بھرتی ہوئی تھی۔ اب طبیعت کچھ سنبھلی ہے۔ بہت پیاری باتیں کرتی

ہے۔ میری ہی طرح اس کے پھیپھڑوں میں بھی خرابی ہے۔ میں آج بہت دیر تک اس کے پاس

بیٹھی۔ کنچن نام ہے اس کا۔ شہبانا نے رُک رُک کر اس کے بارے میں ساری باتیں بتا ڈالیں۔

ایک ہی جیسا مرض اور ایک ہی جیسی طبیعت ہونے کی وجہ سے کنچن اور شہبانا میں خوب چھٹنے لگی

تھی۔ دن کا بیشتر وقت دونوں ایک ساتھ گزارتے۔ کبھی شہبانا کنچن کے بستر پر چلی جاتی اور کبھی کنچن

شہبا کی طرف آ جاتی۔ دونوں، جن مریضوں کے تیماردار نہیں تھے یا کم کم آتے تھے، ان کے بستروں پر جا کر ان کی ضرورتیں معلوم کرتے اور ان میں سے کسی کسی کو اٹھاتے بٹھاتے بھی رہتے۔

شہبا کی صحت میں تیزی سے سدھار ہو رہا تھا اور جانچیں بھی وقفے وقفے سے ہو رہی تھیں۔ ایک دن دوپہر کے وقت جب وہ اپنے بستر پر بیٹھی کنچن سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی، اچانک اسے بہت زور کی کھانسی آنے لگی۔ کنچن نے اس کی پیٹھ سہلانا شروع کی لیکن جب کھانسی نہیں رکی تو وہ ڈاکٹر کو بلانے دوڑی اور جب تک ڈاکٹر آئے آئے شہبا کو خون کی بہت بڑی الٹی ہوئی اور وہ بستر پر گر کر بیہوش ہو گئی۔ ڈاکٹر نے اسے انجکشن دیے پھر مجھے بلا کر بتایا:

”شام تک خون کا انتظام کیجئے۔“ پھر شہبا کی جانچ والا پرچہ دکھا کر بتایا: *شہبا کو الٹی* ”یہ والا خون چڑھے گا۔“

شام کو جب سبیلہ آئیں اور شہبا کو بستر پر نڈھال پڑا دیکھ کر پریشان ہوئیں تو میں نے انہیں بتایا: ”خون کی بہت بڑی الٹی ہوئی ہے۔“ پھر انہیں وہی پرچہ جو ڈاکٹر نے مجھے دکھایا تھا، دکھا کر کہا:

”یہ والا خون چڑھے گا۔“

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہی والا خون میرا بھی ہے۔“ سبیلہ نے کہا۔ پھر انہوں نے ڈاکٹر سے بات کی، ہسپتال کے خون والے بینک میں ان کا خون لیا گیا اور جب تک شہبا کو خون چڑھانے کی تیاری کی جاتی اسے ایک اور الٹی ہوئی۔ یہ الٹی دیکھ کر میں بہت گھبرا گیا، سبیلہ بھی ڈر گئیں۔ اس الٹی کے بعد خون چڑھانا شروع کیا گیا۔ سبیلہ رات بھر شہبا کے بستر سے لگی بیٹھی رہیں۔ خون چڑھائے جانے کے بعد صبح جب شہبا کو ہوش آیا تو اس نے سبیلہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بہت زور سے دبایا اور مسکرا کر سبیلہ کی طرف دیکھا۔ سبیلہ نے بہت پیار سے اس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا سب ٹھیک ہے۔ خون کی ان دو الٹیوں نے شہبا کو پھر بہت کمزور کر دیا لیکن ایک دو دن بعد وہ پہلے ہی کی طرح اٹھنے بیٹھنے لگی۔ اس دوران کنچن اس کے پاس ہی بیٹھی رہتی۔ اس بیچ ایک آدھ بار شملہ خانم بھی بہت مشکل سے زینے چڑھ کر اسے دیکھنے آئیں اور اس پر بہت سی دعائیں پڑھ کر دم کیں۔

جب شہبا کی طبیعت ذرا اور سنبھلی تو اس نے سبیلہ سے باتیں کرتے کرتے میری

طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

”انہوں نے یہ تو بتایا ہے تم عنبر گنج میں رہتی ہو لیکن مجھے ٹھیک بتاؤ کہاں پر رہتی ہو۔“
سبیلہ نے اسے اچھی طرح اپنا پتہ سمجھا کر اور اپنے مکان کے آس پاس کی کچھ

نشانیوں بتا کر کہا:

”کوئی بھی آسانی سے پہنچ جائے گا۔“

جب سبیلہ شہبا کو اچھی طرح اپنا پتہ سمجھا چکی تو شہبا میری طرف دیکھتے ہوئے بولی:
”انہوں نے آج تک نہیں بتایا کہاں رہتے ہیں اور آج تک یہ بھی نہیں بتایا ان کا نام کیا ہے۔“
”میں نے بھی پوچھا تو ٹال گئے۔“ سبیلہ نے کہا۔

”نام علی حیدر ہے۔ ٹھکانہ..... اپنا ہو جائے گا تو بتا دوں گا۔ ابھی تو آج یہاں کل
وہاں والی بات ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے شہبا سے کہا: ”جیسے ہی تمہیں یہاں سے چھٹی ملے
گی، تمہیں اپنے ٹھکانے پر لے چلوں گا۔“
”اور مجھے بھی۔“ سبیلہ بولی۔

ہم یہ باتیں کر رہی رہے تھے کہ نرس نے آ کر شہبا کا حال پوچھنا شروع کر دیا۔ اس کے
جاتے ہی شہبا نے ہم دونوں سے کہا: ”کل میں کنچن کے ساتھ کچھ دیر کے لیے بازار جاؤں
گی۔ ہم دونوں کو اپنے لیے کچھ چیزیں خریدنا ہیں۔ ایک دو گھنٹے میں واپس آ جاؤں گی۔“ پھر
میری طرف دیکھ کر بولی: ”شب تو شام کو آتی ہیں۔ آپ کمرے پر جا کر آرام کیجیے گا۔ بہت دن
سے آپ اچھی طرح سوئے نہیں ہیں۔“ یہ کہہ کر بولی: ”اور ہاں یہ سب چیزیں جو آپ نے مجھے
دکھائی ہیں شب تو کے پاس احتیاط سے رکھوا دیجیے۔ جب رہنے کا ٹھکانہ ہوگا تو انہیں اپنے ساتھ
رکھوں گی۔“ میں نے ان چیزوں کو واپس تھیلے میں رکھا اور شہبا جو کچھ کہتی گئی بغیر بولے سنتا رہا۔



دوسرے دن ہم ہسپتال پہنچے تو ہمیں بتایا گیا شہبا آج دن میں اپنی مرضی سے
ہسپتال چھوڑ کر چلی گئی۔ نرسوں اور ڈاکٹروں نے جب مرض کی سنگینی کے بارے میں
اسے بتایا تو کہا ہمارا دل یہاں بہت گھبرا رہا ہے، ہم گھر پر رہ کر اپنا علاج کرا لیں گے۔
یہ سب سن کر سبیلہ سکتے میں آ گئیں اور میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ جب میں نے بڑی والی

نرس سے اس بارے میں پوچھا تو وہ غصے سے بولی:
”آپ لوگوں کو نہیں بتایا کچھ۔ آپ سب تو ان کے گھر والے ہیں۔“
میں چپ رہا تو اس نے کہا:

”ہم نہیں چاہتے تھے وہ یہاں سے جائیں لیکن ہمیں مجبوراً راضی ہونا پڑا۔“ پھر کہا:
”وہ جو برابر والے وارڈ میں گوری لڑکی ہے اس سے کچھ کہہ کر گئی ہیں۔“
میں اور سبیلہ جب کنجن کے پاس پہنچے تو اس نے ہمیں دیکھتے ہی کہا:
”میں آپ لوگوں کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ چلی گئیں۔ میں نے بہت روکا لیکن نہیں مانیں۔“
یہ کہہ کر اس نے سبیلہ کو ایک لفافہ اور بہت کس کر بندھا ہوا ایک چھوٹا سا بوہ
دیتے ہوئے کہا:

”یہ آپ کے لیے دے گئی ہیں۔“
سبیلہ نے فوراً لفافہ کھولا اور اس کے اندر رکھا ہوا پرچہ نکالا۔ اس میں لکھا تھا:
”پیاری سیدو!“

میں بہت دن زندہ نہیں رہوں گی۔ مرض میرا پوری طرح بگڑ چکا
ہے۔ تمہاری تیمارداری اور ان کی دیکھ بھال نے مجھے بہت دن زندہ رکھا۔
اس کا شکریہ۔ میں ہسپتال میں نہیں مرنا چاہتی اور ان کے سامنے تو بالکل
بھی نہیں۔ خالہ کا غم انہوں نے سہہ لیا لیکن..... میں جہاں بھی مروں گی
خدا کے بندے قبرستان پہنچا دیں گے۔ ہم جیسے بے وارثوں کو دفن کے لئے
زمین مفت مل جاتی ہے۔ کچھ پیسے محنت مزدوری کے بچا کے رکھے ہیں وہ
دیے جا رہی ہوں۔ ان سے ہمارا نتیجہ چالیسواں کرا دینا۔ جس دن میری
آنکھ بند ہوگی تمہیں خبر مل جائے گی۔ اماں کی بتائی ہوئی بہت سی باتیں
خالہ، تمہاری ماں کو نہیں بتا سکی، اس کا مجھے دکھ ہے اور اس کا بھی دکھ ہے کہ
یہاں سے جاتے وقت تم سے نہیں مل سکی۔

ان کا خیال رکھنا۔ میری طرح ان کا بھی اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔

تمہاری

شیدو

خط پڑھ کر سبیلہ کے جسم میں تھر تھری پیدا ہو گئی اور میں فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ بہت دیر خاموش رہنے کے بعد سبیلہ نے مجھ سے کہا: ”اُٹھیے دل مضبوط کیجیے۔ اس حالت میں انہیں اکیلا نہیں چھوڑا جاسکتا۔ ہم دونوں الگ الگ نکلتے ہیں ڈھونڈنے۔“

ایک ہفتے تک میں اور سبیلہ شہر کے مختلف محلوں میں شہبا کی پہچان بتا کر اسے ڈھونڈتے رہے۔ سلیمن بھی جہاں جہاں جاسکتی تھی گئی۔ لیکن شہبا کا پتہ کہیں نہیں چلا۔ ساتویں دن جب میں سبیلہ کے یہاں یہ معلوم کرنے گیا کہ انہیں کہیں سے کوئی خبر ملی تو جھٹ پٹے کے وقت کوئی شخص سبیلہ کے مکان کے آس پاس کچھ نشانیاں بتا کر ان کا پتہ پوچھتا نظر آیا۔ تھوڑی دیر بعد سبیلہ کے دروازے پر دستک ہوئی اور دروازہ کھلنے پر اس شخص نے سبیلہ سے پوچھا:

”سبیلہ خانم آپ ہی ہیں۔“

”میں ہی ہوں۔ بتائیں۔“

”میں دیانت الدولہ کی کربلا سے آیا ہوں۔ اماں نے ہماری یہ پرچہ بھیجا ہے آپ کے لئے۔ یہ کہہ کر وہ رکے بغیر وہاں سے چل دیا۔ سبیلہ نے پرچہ کھولا اور عبارت پڑھنا شروع کی:

”بی بی! بہت بری خبر ہے۔ آپ کی منہ بولی بہن شہبا گزری شب اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ صبح انہیں اُسی کربلا میں جہاں ان کی ماں دفن تھیں، دفن کر دیا گیا۔ ہسپتال سے ٹھیک حالت میں آئی تھیں لیکن یہاں آتے ہی طبیعت بگڑنے لگی۔ ہم سب کو قسم دی یہاں آنے کی بات کسی کو نہ بتائیں۔ ہم نے، جتنا ہم سے ہوسکا ان کی دیکھ بھال کی لیکن طبیعت اُن کی سنبھلی نہیں۔ کل اول شب انہیں خون کی بہت بڑی انٹی ہوئی اور اسی کے بعد وہ بے دم ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد ان کا دم نکل گیا۔ جب یہاں آئی تھیں اُسی وقت آپ کا نام اور آپ کے گھر کا پتہ بتا کر کہا تھا: اگر مجھے کچھ ہو جائے تو آپ تک خبر پہنچوادوں۔“

بی بی! میں وہی بد نصیب بی بی ہوں جس نے اُن کی ماں کے سرہانے قرآن پڑھا تھا اور کل جب ان کا دم نکل رہا تھا میں ہی ان کے سرہانے قرآن کھولے بیٹھی تھی۔ صہبا خانم وہاں اپنی بیٹی کے بغیر چین سے نہ ہوں گی۔ اللہ نے بیٹی کو ان کے پاس بلا لیا۔“

پرچہ پڑھ کر سبیلہ بہت دیر تک دروازے سے لگی کھڑی رہیں۔ جب شمیلہ خانم نے اندر سے پکار کر پوچھا:

”کون تھا؟“ تب وہ تھوڑی سی ہلیں اور ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا: ”اماں شہبا.....“ اس سے آگے ان کے مونہہ سے لفظ نہیں نکل سکے۔

”کیا شہبا..... آگے کہو۔“

”ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔“ یہ سن کر شمیلہ خانم جس تخت پر بیٹھی تھیں، اسی پر ڈھے گئیں۔ میں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے دروازے تک آیا اور سبیلہ سے پوچھا:

”کیا یہ سچ ہے؟“ جواب میں سبیلہ نے وہ پرچہ جو انہیں کوئی دے کر گیا تھا میری طرف بڑھا دیا۔ عبارت پڑھتے وقت مجھے ایسا لگا جیسے میں اپنی بینائی سے محروم ہو رہا ہوں۔ سبیلہ نے مجھے سنبھال کر تخت پر بٹھایا اور بیٹھتے ہی میں ایک طرف ڈھلک گیا۔ پھر مجھے کچھ یاد نہیں رہا۔ وہ رات سبیلہ اور شمیلہ خانم نے صبح کے انتظار میں جاگ کر گزاری۔ سبیلہ رات بھر میرے پہلو میں بیٹھی اپنی ماں سے شہبا کی باتیں کرتی رہیں۔ ایک دو بار انہوں نے مجھے کوئی دوا بھی دی۔ صبح ہوتے ہی دونوں اُس کر بلا کی طرف چل پڑیں جہاں شہبا نے آخری سانس لی تھی۔ میں بھی انہیں کے ساتھ ان کے گھر سے نکل آیا اور جب سبیلہ نے مجھ سے کر بلا چلنے کے لئے کہا تو میں نے کہا میں لوگوں کو روتے ہوئے نہیں دیکھ سکوں گا۔ پھر کہا:

”شہبا کو کبھی نہیں بتا سکا کہاں رہتا ہوں۔ آپ کو بتا رہا ہوں بزازے والی گلی میں کنوئیں کے پاس آ کر کسی سے پوچھ لیجیے گا وہ جو صبح کو نکلتا ہے اور رات گئے گھر آتا ہے، کہاں رہتا ہے۔ پتہ چل جائے گا۔“

کر بلا پہنچ کر سبیلہ اور شمیلہ خانم نے اُن بی بی سے مل کر جن کا خط آیا تھا، اُن دنوں کا حال معلوم کیا جو شہبا نے ہسپتال سے آ کر اس کر بلا میں گزارے تھے۔ تیسرے دن سبیلہ نے کر بلا میں رہنے والوں کی مدد سے شہبا کی مردانی اور زنانی مجلس کرائی۔ عورتوں کی مجلس میں دونوں ماں بیٹیوں نے الگ الگ راگوں میں سوز پڑھے اور جب شمیلہ خانم نے راگ درباری میں یہ سوز پڑھا:

ع ”قید ہو شام سے جب عابد بیمار چلے“ تو آس پاس کے محلوں کی وہ ساری عورتیں جو اس مجلس کے لئے کر بلا میں جمع ہوئی تھیں ڈھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔

شہبا کی موت کے بعد میں دن دن بھر بے وجہ شہر میں ادھر ادھر گھومتا رہتا۔ ایک آدھ بار عنبر گنج والے راستے کی طرف میرے قدم بڑھے بھی تو میں نے فوراً راستہ بدل لیا۔ میں ایسی کسی جگہ نہیں جانا چاہتا تھا جہاں بات چیت میں وہ باتیں نکلیں جن میں حویلی، ہسپتال یا کاظمین والی کربلا کا ذکر آئے۔ لیکن ذہن کو تصویروں اور منظروں سے خالی رکھنا میرے اختیار میں نہیں تھا۔ شہبا کا نور باڑی والا گھر، جہاندار بیگم کی حویلی، اُن کی پینچی، کتابوں والا کمرہ، حویلی میں شہبا کے رہنے کا ٹھکانہ، ہسپتال میں وارڈ کے دروازے سے لگا ہوا شہبا کا بستر۔ سب ایک کے بعد ایک میری آنکھوں کے سامنے آتے رہتے۔ میں شہر میں ہر وقت اس لئے بھی گھومتا رہتا کہ دوسرے منظر نگاہ کے سامنے آئیں گے تو وہ منظر جنہیں میں نہیں دیکھنا چاہتا، آنکھوں سے اوجھل رہیں گے۔ لیکن ایسا ہونہ پاتا۔ وہ منظر جو شہر میں گھومتے وقت میری نگاہ میں آتے بہت جلد اپنی شکلیں بدل لیتے اور مجھے ان میں بھی وہی سب کچھ دکھائی دینے لگتا جو میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ شہر میں پیدل چلتے چلتے میرے پیروں پر سو جن آگئی تھی۔ ایک دن جب میں انہیں سوچے ہوئے پیروں سے اپنے ٹھکانے کی طرف لوٹ رہا تھا تو وہ بی بی جو میری گلی کے منہ پر شام کے وقت ایک چھوٹی سی چٹائی پر لائین جلا کر بیٹھتیں اور اپنی بد حالی کا حال بتا کر آنے جانے والوں سے مدد کی طالب ہوتیں، مجھے روک کر بولیں:

”بھیا آپ کہاں رہتے ہیں۔ ایک بی بی بہت دور سے کئی بار آپ کو پوچھنے آئیں۔ ایک دو بار بہت دیر بیٹھ کر آپ کا انتظار بھی کیا۔“ یہ بتا کر بولیں: ”سبیلہ نام بتایا تھا اپنا۔ بہت نیک بی بی ہیں۔ مجھے بہت سے پیسے دے کر گئی ہیں۔ یہ بھی کہا کہ اماں آپ چاہیں تو میرے ساتھ چل کر رہیں۔ کل پھر آئیں گی عصر کے وقت۔“

دوسرے دن جب بار بار آنکھوں میں آنے والی تصویروں اور منظروں نے مجھے بہت بے چین کیا تو میں گھر سے نکل کر جہاندار بیگم کی حویلی کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر دیکھا حویلی کے چاروں طرف پاڑ بندھی ہے اور بہت سے کاریگر اور مزدور کام میں لگے ہیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا حویلی کی مرمت ہو رہی ہے اور اسے نئی شکل دی جا رہی ہے۔ یہ سن کر مجھے دھچکا لگا۔ میں نے سوچا اب جہاندار بیگم کی پینچی اور کتابوں والا وہ کمرہ جس میں

مرزا رسوا آ کر رہے تھے، توڑ دیا جائے گا۔ میں حویلی کے باہر باہر اندازے سے وہاں آ کر رکا جہاں کتابوں والا کمرہ تھا اور وہاں رک کر سوچا:

”پتہ نہیں ان کتابوں کا کیا ہوا جن کے ڈھیر سے ہم نے امراؤ جان کا اصل قصہ نکالا تھا۔“ مجھے یاد آیا میں نے شہبا سے کہا تھا جتنی کتابیں نکال سکتی ہوں نکال لو لیکن یہاں سے وہ ایسی بدحواسی میں نکلی کہ ایک بھی کتاب اپنے ساتھ نہیں لے جاسکی۔ کتابوں والے کمرے سے آگے بڑھ کر میں اس کمرے کی پشت پر آیا جس میں شہبا آ کر رہی تھی۔ یہاں کھڑے ہو کر مجھے شہبا کا بنایا ہوا چکنی مٹی کا وہ چولہا یاد آیا جسے اس نے بہت دل لگا کر بڑی صفائی سے بنایا تھا۔

”وہ تو ایک ہی ٹھوکر میں ٹوٹ گیا ہوگا۔“ میں نے سوچا اور آگے بڑھ گیا۔

مشک گنج سے نکل کر میں باہر باہر رکاب گنج ہوتے ہوئے نخاس آیا، یہاں سے کاظمین۔ پھر کر بلا دیانت الدولہ کے پہلو والی گلی سے ہوتا ہوا اس جگہ آ پہنچا جہاں وہ مکان تھا جسے چھوڑ کر شہبا جہاندار بیگم کی حویلی میں آئی تھی۔ لیکن اب وہاں مکان کے بجائے میدان تھا۔ ابھی میں اُس میدان کو دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک دو لوگ میرے قریب آ کر بولے:

”زمین کا یہ ٹکڑا بک چکا ہے۔ اب ڈیوڑھی قیمت پر پھر بک رہا ہے۔“ مجھے یہ بتا کر اُن میں سے ایک بولا: ”آپ کہیں تو جس نے خریدا ہے اس سے بات کراؤں آپ کی؟“

”نہیں میں تو راہ گیر ہوں۔ سعادت گنج اسی طرف سے جاتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اب کے بہت دن بعد آیا۔ اس سے پہلے آیا تھا تو اس زمین پر ایک مکان تھا۔ اُسے نہیں دیکھا تو یہ میدان دیکھنے لگا۔“ یہ کہہ کر میں آگے بڑھ گیا۔

اپنے ٹھکانے کی طرف لوٹتے وقت میں نے سوچا:

”کیسے گھنے پیڑ تھے شہبا کی بغیا میں اور کتنی پھل دار تھیں ان کی شاخیں۔“

کاظمین سے اپنے ٹھکانے تک آتے آتے مجھے خاصی دیر ہو گئی۔ دن کا تیسرا پہر ختم ہو رہا تھا۔ بہت دور سے آنے کی وجہ سے میرے پیروں میں درد ہونے لگا تھا اس لئے بستر پر لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی۔ شام سے کچھ پہلے میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا سامنے سبیلہ کھڑی ہیں۔ میں شپٹا گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا اپنے بہت بے ترتیب کمرے کو میں کس طرح ٹھیک کروں اور سبیلہ کو کہاں بٹھاؤں۔

”پریشان نہ ہوں۔“ سبیلہ نے وہ کرسی جس پر میرے ابھی ابھی اتارے ہوئے کپڑے پڑے تھے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ پھر کرسی پر سے ان کپڑوں کو اٹھا کر ایک طرف رکھتے ہوئے بولیں:

”کئی بار آئی۔ لیکن آپ ملے نہیں۔ کہاں رہتے ہیں؟“

”صبح نکلتا ہوں، رات گئے لوٹتا ہوں۔ آپ کو بتایا تھا۔“

”اچھا بتائیے کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہوں۔“

”ہماری طرف نہیں آئے۔ اماں روز آپ کی راہ دیکھتی ہیں۔“

”میں آپ کی طرف نہیں آنا چاہتا تھا۔“

”کیوں؟ مجھ سے کوئی.....“

”نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ آتا تو اُن واقعوں کا ذکر ضرور ہوتا جو ابھی ابھی ہوئے ہیں۔“

”میں اُن کا ذکر کرتی تو آپ منع کر دیتے لیکن آتے تو۔“

”والدہ آپ کی.....“

”ٹھیک ہیں۔ آپ کے لئے بہت پریشان ہیں۔“ یہ کہہ کر سبیلہ نے میرے پیروں کی

طرف دیکھتے ہوئے کہا:

”آپ کے پیروں پر بہت سو جن ہے۔“

”پیدل بہت گھوما ہوں۔“

یہ سن کر سبیلہ نے کمرے کے اس کونے کی طرف دیکھا جہاں اسٹوور رکھا تھا اور اسی کے

ساتھ دو چار برتن۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھیں، اُن برتنوں میں سے ایک برتن اٹھا کر کمرے کے باہر

لگے ہوئے نل سے اس میں پانی بھرا، اسٹوور جلایا پھر اس برتن میں دو تین چمچے نمک ڈال کر اسے

اسٹوور پر چڑھا دیا۔

”یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟“

”وہی جو میری ماں اپنی ماں کے لئے کیا کرتی تھیں۔“

”مطلب؟“

”اماں ہماری بتاتی تھیں بہت ناچنے کے بعد جب ہماری نانی کے پیروں پر درم آ جاتا تو وہ اماں سے اسی طرح پانی گرم کراتیں اور اسے ایک تسلیے میں ڈلوا کر دیر تک اس میں اپنے پاؤں ڈالے رہتیں، اس کے بعد پیروں کی سوجن اتر جاتی۔“ سبیلہ نے کہا۔ پھر کہا: ”تسلہ تو یہاں ہے نہیں۔ میں اسی برتن میں تولیہ ڈال کر اسے نچوڑوں گی۔ آپ بستر پر بیٹھ کر پیر نیچے لٹکا لیجیے گا میں تولیہ آپ کے پیروں پر ڈال دوں گی۔“ یہ بتا کر بولیں: ”کئی بار ایسا کرنے سے آپ کو آرام بھی ملے گا اور سوجن بھی کم ہو جائے گی۔“

”لیکن میں آپ کو یہ نہیں کرنے دوں گا۔“

”کیوں؟ میں کہیں کی شہزادی ہوں جو میری شان میں بٹہ لگ جائے گا۔“

پانی اسٹوو پر گرم ہو چکا تھا۔ سبیلہ نے پانی میں تولیہ ڈالا پھر اسے چٹکی سے نکال کر اس وقت تک اٹھائے رکھا جب تک اس کا سارا پانی برتن میں ٹپک نہیں گیا۔ پھر اسے ہلکا سا نچوڑ کر مجھ سے کہا: ”بستر پر بیٹھیے اور پیر نیچے لٹکائیے۔“ میں نے ایسا ہی کیا۔ سبیلہ نے کئی بار اسی طرح تولیہ پانی میں ڈال کر اور اسے نچوڑ کر میرے پیروں پر ڈالا اور آخری بار ایسا کرنے کے بعد کہا:

”اب لیٹ جائیے اور کل سے پیدل مت گھومیے گا۔“

مجھے اُن کے سامنے لیٹنے میں تامل ہوا تو وہ بولیں ”شرمائیے نہیں“ اور میرے شانے پکڑ کر آہستہ سے مجھے بستر پر لٹا دیا۔ مجھے اس سنگائی سے واقعی بہت آرام ملا۔ بستر پر میرے لیٹ جانے کے بعد سبیلہ نے کہا:

”ایک دو روز میں ہماری طرف نکل آئیے۔ اماں سے باتیں کر کے آپ کا جی ہلکا ہوگا۔“

پھر بولیں: ”جو کچھ ہوا اگر وہ ہمارے اختیار میں ہوتا تو نہ ہوا ہوتا۔“ یہ کہہ کر انہوں نے مجھ سے پوچھے بغیر چائے بنانے کا سامان ڈھونڈا، چائے بنائی پھر میری پیٹھ کے نیچے تکیے لگا کر چائے مجھے دیتے ہوئے کہا:

”اماں نے ہماری وہ کھویا جو وہ نہیں کھونا چاہتی تھیں۔ بہت دن انہوں نے اس دکھ کی دوا ڈھونڈی لیکن.....“

”لیکن.....؟“

”وہ دوا نہیں ملی۔ جو گیا وہ لوٹ کر نہیں آیا۔ پھر.....“

”پھر.....؟“

”وقت نے ہمارے سب زخموں پر مرہم رکھ دیا۔ یہ علاج نہ حکیم کر سکتا ہے نہ ڈاکٹر۔“
سبیلہ نے کہا۔ یہ کہنے کے بعد بولیں: ”جس دن ہم کربلا کے لئے نکلے تھے، اماں اسی دن سے
آپ کے لیے پریشان ہیں۔ اسی لیے میں دو تین بار آپ کو ڈھونڈتی ہوئی یہاں آئی۔“ پھر
بولیں: ”اگر پیروں کی سو جن کم ہو جائے تو کل سواری کر کے ہماری طرف آ جائیے۔ اماں آپ
کو دیکھ کر خوش ہوں گی اور آپ کو بھی اچھا لگے گا۔“

”کوشش کروں گا۔ مجھے اُن سے بہت سی باتیں کرنا تھیں لیکن حالات یوں کروٹ لیں
گے، اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔“

”تو نکل آئیے کل ہماری طرف۔ اماں سے آپ جو باتیں کریں گے سو کریں گے، مجھے
بھی آپ سے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔ وقت زیادہ ہو گیا ہے اب میں چلتی ہوں۔“
میں اٹھنے لگا تو وہ بولیں: ”بیٹھے رہیے میں چلی جاؤں گی۔“ چلتے چلتے انہوں نے کہا:
”وہاں سنکائی اور اچھی طرح کروں گی۔“



صبح اٹھ کر میں نے پیروں پر نگاہ ڈالی تو سو جن قریب قریب ختم ہو چکی تھی۔ میں نے سوچا
اب عنبر گنج کی طرف جایا جاسکتا ہے۔ میں تیار ہوا اور اُس بہت لمبے راستے میں دو سواریاں بدل
کر عنبر گنج پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے جیسے ہی سبیلہ خانم کا دروازہ کھٹکھٹایا اندر سے آواز آئی:
”آ جائیے دروازہ کھلا ہے۔“

میں اندر پہنچا تو سبیلہ سامنے کھڑی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی پوچھا: ”پیروں کی سو جن.....؟“
”کم ہو گئی۔ اسی لیے چلا آیا۔“ میں نے کہا۔ پھر کہا: ”آپ نے کیسے جانا دروازے
پر میں ہی ہوں۔“

”بتایا تھا آپ سے، یہاں کوئی نہیں آتا، وہی آئے گا جو آچکا ہو۔“ سبیلہ نے کہا۔ یہ کہہ
کر وہ مجھے اُس کمرے میں لے گئیں جہاں میں اس سے پہلے آ کر بیٹھا تھا۔

”اب طبیعت بالکل ٹھیک ہے؟“

”بالکل تو نہیں، ہاں ٹھیک ہے۔“

”گھر سے نکلنا آپ کے لیے ضروری تھا۔ دوسروں سے باتیں کر کے جی بہلے گا۔ میں نے اماں سے کہہ دیا ہے جو کچھ پچھلے دنوں ہوا ہے اس کے بارے میں کوئی بات نہ کریں۔“

یہ کہہ کر سبیلہ چائے بنانے چلی گئیں اور جب چائے بنا کر لائیں تو ان کے ساتھ شمیلہ خانم بھی چلی آئیں۔ میں نے انہیں سلام کیا تو جواب دے کر وہ بہت دیر تک مجھے خاموش نگاہوں سے دیکھتی رہیں پھر اپنی بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں:

”یہ بتا رہی تھیں تمہارے پیروں پر سوجن آگئی تھی۔“

”اب نہیں ہے۔ اسی لئے آپ کی طرف نکل آیا۔“

”اچھا کیا سبیلہ تمہارے لئے بہت پریشان تھی اور میں بھی۔“

”لیجیے چائے پیجئے۔“ سبیلہ نے ایک پیالی مجھے اور ایک اپنی ماں کو دیتے ہوئے کہا:

”یہ تصویریں کس کی ہیں۔ جب میں پہلی بار آیا تھا سب سے پہلے انہیں پر میری نگاہ ٹھہری تھی۔“ میں نے کمرے کی دیوار پر لگی ہوئی اُن دو تصویروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جن میں سے ایک ناچتی ہوئی عورت کی تھی اور دوسری کسرتی بدن اور اچھی صورت والے مرد کی۔

”یہ ہمارے نانا اور نانی ہیں۔“ سبیلہ نے کہا۔

”بہت اچھی ہیں۔ بڑی باریکی سے بنائی ہیں آپ نے۔“

”ہم نے نانی کو دیکھا نہ نانا کو اور نانا کو تو اماں نے بھی نہیں دیکھا۔“ سبیلہ بولیں۔ ”نانی کا ناک نقشہ جیسا اماں نے بتایا تھا، ہم نے ویسا بنا دیا۔ اماں کہتی ہیں اصل سے بالکل ملا دیا ہے۔“ یہ کہہ کر سبیلہ نے آگے کہا: ”اور نانا کی شکل و صورت جو نانی نے اماں کو بتائی تھی وہی انہوں نے ہم کو بتائی۔ نانا کی تصویر ہم نے اُسی سے ملتی جلتی بنادی۔“

”بہت سدھا ہوا ہاتھ ہے آپ کا۔“

”پاؤں بھی بہت سدھے ہوئے ہیں لیکن نانی اور اماں کے ہنر میں نہ جی لگانہ اماں نے اسے اپنانے دیا۔“ سبیلہ نے کہا۔ پھر بولیں: ”ناچنا تو ایک ہنر ہے اس لیے میں نے سیکھ لیا۔“

”رنگوں کا استعمال بھی خوب کیا ہے۔“ میں نے تصویروں کی طرف دوبارہ دیکھتے ہوئے کہا۔

”شکر یہ۔ آپ کچھ زیادہ تعریف کر رہے ہیں۔ میں جیسا بنا سکتی تھی، بنا دیا۔ لیکن اب

میں سمجھتی ہوں نانی اور نانا ایسے ہی تھے۔“

”صاحبزادے!“ ہماری بات ختم ہوئی تو شمیلہ خانم بولیں۔ ”ہمارا تو جی چاہتا ہے تم یہیں آ کر رہو لیکن کیا کروں جو ان لڑکی ساتھ میں ہے لوگ طرح طرح کی باتیں کریں گے۔“

”اماں یہ نئے ٹھکانے کی تلاش میں ہیں۔“ سبیلہ بیچ میں بول پڑیں۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولیں:

”آپ یہیں عنبر گنج میں کوئی مکان کیوں نہیں ڈھونڈ لیتے۔“

”ڈھونڈ لوں گا۔ کل پرسوں میں اسی کام پر نکلوں گا۔“

”اسی محلے میں آ جائیں گے تو کھانے پینے کی تکلیف نہیں ہوگی۔ آپ کا ناشتہ کھانا سب

ہمارے ساتھ رہے گا۔“

”میاں یہ بتاؤ پچھلی بار تم نے اپنی ماں کے بارے میں بتایا اور.....“

”باپ؟“

”اماں آپ یہ سب کیوں.....“

”پوچھنے دیجئے۔“ میں نے سبیلہ کی بات پوری ہونے سے پہلے کہا۔ ”باپ کے ساتھ ماں کی زندگی اچھی نہیں گزری۔ ماں بتاتی تھیں میں، ان کا سب سے چھوٹا بیٹا، جب تین سال کا تھا باپ تین روپے کی ریزگاری دے کر چلے گئے۔“ میں نے شمیلہ خانم کو بتایا۔ ”اس دن سے لوٹ کر نہیں آئے۔ پہلے بھی کم کم ہی رہتے تھے گھر پر۔ ماں اپنی ہی کمائی سے گھر چلاتی تھیں۔“

یہ سن کر سبیلہ نے مجھے دکھ بھری نگاہوں سے دیکھا۔ کچھ دیر اسی طرح دیکھتے رہنے کے بعد کہا: ”اب آپ اکیلے نہیں ہیں۔“

”آج تم یہیں رہو۔ دن کا کھانا ہمارے ساتھ کھاؤ اور رات کا بھی۔ کل سے نکلو مکان ڈھونڈنے۔“ شمیلہ خانم بولیں۔ پھر سبیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا تم بھی معلوم کرو، یہاں قریب میں کوئی جگہ ہے کرائے پر اٹھنے کے لئے۔“

”ضرور ہوگی۔ میں ایک دو دن میں ڈھونڈ لوں گی۔“

”اچھا وہ جو آپ کچھ عورتوں پر کچھ جمع کر رہی تھیں..... ادھر تو وہ کام ہوا نہیں ہوگا۔“ میں

نے سبیلہ سے کہا۔

”ان دنوں جو کچھ ہوا اس میں بھلا وہ کیسے ہو سکتا تھا۔ خیر چھوڑیے۔“ سبیلہ نے کہا۔

”میں جو بات نہیں کرنا چاہتی تھی، بات اسی طرف اٹکی۔“ یہ کہہ کر بولیں: ”پہلے میں آپ کو اپنے کمرے میں لے چلتی ہوں۔“ پھر اپنی ماں کی طرف یوں دیکھا جیسے اُن سے اجازت چاہ رہی ہوں۔

”جاؤ جاؤ۔ وہاں تو بہت سی چیزیں ہیں ان کے دیکھنے کی۔“ شمیمہ خانم بولیں: ”کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا میں پہنچا دوں گی۔“ مائیکل ہارمونیم کو کچھ اور فضول لیتے تھے۔ میں سبیلہ کے ساتھ ان کے کمرے میں آیا تو اس میں طرح طرح کی چیزیں موجود تھیں۔ کمرے میں ایک طرف ایک بڑی سی چوکی پر بڑی خوش ترتیبی سے سارنگی، ستار، تان پورے اور طلبے رکھے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر میں نے پوچھا: ”ہارمونیم غائب ہے؟“

”ہارمونیم کا چلن ہمارے یہاں نہیں ہے۔“ سبیلہ نے کہا۔ ”نانی اور اماں دونوں کے سازندے سارنگی کا استعمال کرتے تھے۔“ اور بھی صدہ لکھڑا کی آپ بہی صہی کیوں؟“

”سارنگی سے بائیس سُر نکلتے ہیں۔ ہارمونیم سے بارہ۔“ سازوں کے پہلو میں تلے اوپر کچھ کاپیاں رکھی تھیں۔

”یہ کاپیاں.....؟“

”ان میں سارے راگ راگنیاں ہیں۔ انہیں روز کھول کر دیکھتی ہوں تاکہ جو کچھ سیکھا ہے بھول نہ جاؤں۔ صبح نماز کے بعد دو گھنٹے ریاض کرتی ہوں۔“

اس چوکی سے میری نگاہ ہٹی تو میں نے دیکھا کمرے کی دیواروں پر پھولوں، پرندوں، پہاڑوں اور آبشاروں کی خوبصورت رنگوں سے بنی ہوئی بہت سی تصویریں آویزاں ہیں۔ انہیں کے بیچ میں پنسل سے بنی ہوئی شمیمہ خانم کی ایک بڑی سی تصویر تھی۔ یہ تصویر دیکھ کر میں کچھ دیر کے لئے اداس ہو گیا۔ میں کیا کوئی بھی اسے دیکھتا تو اداس ہو جاتا۔ پوری عورت کی اس تصویر کو سامنے کے رخ سے بنایا گیا تھا اور اس کے چہرے پر ایسی کیفیت دکھائی گئی تھی جیسے کوئی برسوں کی دکھ جھیلی ہوئی عورت خوش ہونے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس تصویر کو میرے بہت دیر تک دیکھتے رہنے پر سبیلہ نے پوچھا:

”اچھی بنی ہے؟“

”بہت۔ لیکن اسے دیکھ کر میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔“

”کیا سوچ رہے ہیں؟“

”دوالگ الگ ہاتھوں نے دوالگ الگ ہنر دکھائے ہیں۔“

”میں سمجھی نہیں۔“

”آپ کو شہبا کی وہ تصویر یاد ہے جو کتو نے بنائی تھی..... جسے میں نے ہسپتال میں دکھایا تھا۔“

”یاد ہے لیکن اُن باتوں پر ہمیں بات نہیں کرنا چاہیے۔“

”صحیح کہا۔ لیکن اس وقت یہ تصویر دیکھ کر مجھے وہ تصویر یاد آ گئی اور..... میں خود کو

روک نہیں سکا۔“

”ایسی کون سی بات ہے اس تصویر میں۔“

”اس میں بھی وہی دکھ ہے جو شہبا کی آنکھوں میں کتو نے دکھایا تھا، لیکن یہاں

تھوڑا سا فرق ہے۔“

”وہ کیا؟“

”بڑی حیران کرنے والی بات ہے۔“

”لیکن وہ بات ہے کیا۔“

”دکھ میں خوشی اور خوشی میں دکھ۔ ایسے جذبے تصویروں میں آسانی سے قید نہیں ہوتے۔“

”صحیح کہا آپ نے یہ کیفیت لانے کے لئے مجھے بہت محنت کرنا پڑی۔ اصل میں.....“

سبیلہ کہتے کہتے رکیں۔

”اصل میں.....؟“

”اماں بھی بہت دن جینے والی نہیں۔“

”کیوں؟“

”جان لیو امراض ہے۔“

”دمہ؟“

”نہیں دل میں چھید ہے۔ جب تک چل رہی ہیں، چل رہی ہیں۔“ یہ کہہ کر سبیلہ

تھوڑی دیر کے لیے رکیں پھر بولیں: ”کسی بھی دن آنکھ بند ہو سکتی ہے۔ لیکن ہر دکھ کی طرح وہ

اس دکھ کو بھی چھپائے ہوئے ہیں۔“

”افسوس ہوا۔“

”کبھی کبھی ایسا لگتا ہے.....“

”کیسا لگتا ہے؟“

”ہم سب ایک دوسرے پر افسوس کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ اچھا ان باتوں کو چھوڑیے۔“ سبیلہ نے کہا۔ ”آپ کو پتہ ہے میں آپ کو یہاں کیوں لائی ہوں۔“

”کمرہ دکھانے۔“

”وہ تو ہے ہی۔ لیکن مجھے آپ سے بہت سی ایسی باتیں کرنا ہیں جو میں یہیں کر سکتی ہوں، اماں کے سامنے نہیں۔ لیکن آج نہیں کروں گی۔ دو چار دن بعد، جب آپ کی طبیعت ذرا سنبھل جائے۔“

اپنے کمرے میں سبیلہ نے کتابیں بھی بہت جمع کر رکھی تھیں۔ ان میں سے چند انہوں نے مجھے دکھائیں۔ ان چند میں کچھ تو رقص اور موسیقی سے متعلق تھیں اور کچھ مصوری اور تاریخ سے۔ یہ کتابیں دکھانے کے بعد وہ ایک موٹا سا رجسٹر اٹھا کر اسے کھولتے ہوئے بولیں:

”ان میں ان بہت سی عورتوں کا ذکر ہے جو اپنے بچوں کو.....“

”آگے کہیے رک کیوں گئیں۔“

”اُن کے باپ کے نام نہیں بتا سکیں۔ اور ایسی عورتوں کا بھی ذکر ہے جنہیں..... اس پیشے کی بیماریاں آ لگیں اور وہ مر گئیں۔“ یہ کہہ کر سبیلہ نے کہا: ”اور بہت سی ایسی عورتیں بھی ہیں جو.....“

”جو.....؟“

”جوانی میں کوٹھوں کی زینت بنیں، بڑھا پاگم نامی میں گزرا، مریں تو کاںدھا دینے والے تک نہیں ملے۔“

”لیکن یہ سب باتیں آپ نے معلوم کیسے کیں؟“

”بہت سوں کے بارے میں تو اماں نے بتایا اور بہت سوں کے بارے میں اُس علاقے

میں جہاں یہ عورتیں رہتی تھیں، گھوم گھوم کر معلوم کیا۔“

”ایک اچھی کتاب بن جائے گی۔“

”مجھے کتاب نہیں بنانا ہے۔“

”پھر؟“

”یہ کام میں اپنے لیے کر رہی ہوں۔ جاننا چاہتی ہوں یہ سب کیونکر ہوا۔“

”اچھا یہ بتائیے ناچ گانا آپ نے سیکھا کس سے؟“

”کچھ اماں سے کچھ آپ کے محلے کے استادوں سے۔“

”وہاں تو کئی خاندان ہیں جو ناچ گانا سکھاتے ہیں۔ ان کے بزرگوں کا دربار سے بھی

تعلق رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ پھر کہا: ”برانہ مانیں تو ایک بات پوچھوں۔“

”پوچھیے۔“

”یہ سب سیکھ کر آپ کیا کریں گی۔“

”جو ہنر آپ سیکھ سکتے ہیں، اسے سیکھنا چاہیے۔ آپ تو بہت پڑھے لکھے ہیں اتنا بھی

نہیں سمجھتے۔“ سبیلہ نے تھوڑی سی ناگواری کے ساتھ کہا۔ ”جب کوئی سُر گلے سے ٹھیک ٹھیک

نکلتا ہے اور جب تہائی کے سَم پر صحیح پاؤں پڑتا ہے اور جب آپ راگوں کا صحیح بھاؤ بتاتے ہیں تو

آپ سمجھ نہیں سکتے کتنی خوشی ہوتی ہے۔“

”تو ہمارے محلے کے استادوں سے آپ نے کیا سیکھا؟“

”سچ پوچھیے تو سب کے سب راگ اور چھتیس کی چھتیس راگنیاں۔“

”کس کس سے؟“

”استاد رحمت خلیفہ اور آفاق حسین سے۔“

”رحمت خلیفہ تو بڑے استاد ہیں۔ اُن سے کیا سیکھا؟“

سارے مشکل راگ..... توڑی، کھمناج، پیلو، ماروا، کافی اور پُریا۔

”اور آفاق حسین سے؟“

”سونی، یمن، درگا، درباری، شورنجنی، پہاگ اور کچھ اور۔“ یہ بتا کر سبیلہ بولیں:

”اور صبح کے سب راگ رحمت خلیفہ سے سیکھے۔“

”کون کون سے؟“

سبیلہ کی اس بات پر
دلجوئی ہوئی

”الھیا بلاول، بسنت مکھری، شدھ توڑی اور بھیرو۔۔۔۔۔ بھٹیاریلت، رام کلی، اہر بھیرو،
 بلاس کھانی، توڑی..... یہ اماں نے سکھا دیے۔“
 ”یہ بہت مشکل راگ ہیں۔“
 ”ہاں لیکن اماں نے آسانی سے سکھا دیے۔“
 ”اور خیال؟“

”آپ تو بہت جانتے ہیں موسیقی کے بارے میں پھر یہ کیوں پوچھ رہے ہیں۔“ سبیلہ
 نے کہا۔ ”خیال تو دھرو پد اور ٹھمری سے مل کر بنا ہے۔ یہ بھی اماں نے سکھا دیا اور اس کی الاپ
 چاری بھی جو دھرو پد سے نکلی ہے۔“
 ”کون کون سے خیال سیکھے؟“

”سبھی سیکھے۔ درت، ولہیت اور مدھیہ لے۔“
 ”آپ نے تو بہت کچھ سیکھ لیا۔“

”جی۔ ٹھمریوں پر بھی بھاؤ بتا لیتی ہوں اور ٹھمری کی آٹھوں قسمیں بھی سیکھ لی ہیں۔“
 ”تو آپ نے.....“

”پیشہ نہیں بنایا اسے، نہ بناؤں گی۔ اماں بتاتی ہیں.....“
 ”کیا بتاتی ہیں؟“

”نانی جب کوئی اچھا شعر کہتی تھیں تو بے اختیار اپنے کمرے سے باہر نکل آتیں اور بار بار
 اسے اونچی آواز میں پڑھتیں۔ ایسا وہ کیوں کرتی تھیں، بتائیے۔“
 ”اچھا شعر کہہ لینے کی خوشی میں۔“

”جی۔ یہی اماں بھی کرتی ہیں۔ جب کوئی اچھا شعر کہتی ہیں، سارے کام چھڑوا کر فوراً
 مجھے بلاتی ہیں اور وہ شعر کئی کئی بار سناتی ہیں۔“
 ”شاعری کرتی ہیں؟“

”خوب۔ سرہانے جا کر دیکھیے کئی بیاضیں رکھی ہیں۔ نانی کا تو ایک شعر، اُن کے
 صہب حال والا بہت مشہور ہوا.....“
 ”کون سا؟“

”کس کو سنائیں حال.....“

”دل زار اے ادا آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی“
”جی۔ اماں کے ایسے بہت سے شعر ہیں۔ وہ جو بیاضیں ان کے سر ہانے رکھی
ہیں، ان میں اُن کی زندگی کا پورا ماجرا ہے۔“ سبیلہ نے کہا۔ ”میرے سوا کسی اور کو نہیں
سنائیں۔ لیکن.....“

”لیکن؟“

”اب شاید دوسرے سننے والے آپ ہوں۔ آپ کو ضرور سنائیں گی۔“
”کیوں؟“

”انہوں نے سمجھ لیا ہے، آپ ان کا دکھا چھی طرح سمجھ لیں گے۔“
”چائے تو نہیں پینا ہے۔“ ہماری گفتگو کے بیچ شمیمہ خانم کی آواز آئی۔
”چائے پیئیں گے۔“ سبیلہ نے پوچھا۔

”پی لوں گا۔“

”بنالچیجے۔“ سبیلہ نے اپنی ماں سے کہا۔

تھوڑی دیر بعد شمیمہ خانم ایک کشتی میں چائے کی دو پیالیاں اور دو تین طرح کے بسکٹ
لے کر آگئیں اور کشتی ہماری طرف بڑھاتے ہوئے مسکرا کر مجھ سے بولیں:
”کمرہ دیکھا بٹیا کا۔“

”جی۔“

”بہت سے روگ لگا رکھے ہیں بٹیا نے۔“

”لیکن یہ روگ انہیں بہت دن زندہ رکھیں گے۔“

”میرے یہ کہنے پر سبیلہ نے مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھا۔ اُنہیں نگاہوں سے جن
سے کبھی کبھی شہباز مجھے دیکھا کرتی تھی۔ سبیلہ سے یہ معلوم ہونے کے بعد کہ شمیمہ خانم کے دل
میں چھید ہے میں نے اس وقت اُنہیں دوسری نگاہوں سے دیکھا۔ وہ ہم دونوں کے لیے
چائے لا کر بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔ ہمیں چائے پیتا دیکھ کر انہوں نے سبیلہ کی طرف یوں
دیکھا جیسے سوچ رہی ہوں میں اپنی بیٹی کی خوشی دیکھنے کے لیے بہت دن زندہ نہیں رہوں گی۔“

ان نگاہوں سے اپنی بیٹی کو دیکھتے دیکھتے انہوں نے کہا:
”بہت اچھی ہے ہماری بیٹی۔ جب سے ہوش سنبھالا، مجھے کسی بات کی تکلیف
نہیں ہونے دی۔“

”ابھی آپ ہی کی باتیں کر رہی تھیں۔ بتا رہی تھیں اپنی ماں کی طرح آپ بھی
شاعری کرتی ہیں۔“

”شاعری کیا جو خود پہ گزرتی ہے، اُسی کو بیان کر دیتی ہوں۔ ایسا کرنے سے جی
ہلکا ہو جاتا ہے۔“

”کسی دن جو کچھ آپ نے کہا ہے، دیر تک بیٹھ کر سنوں گا۔“

”ضرور۔“ یہ کہہ کر شمیلہ خانم سبیلہ سے بولیں:

”اب انہیں کھانا وانا بھی کھلاؤ گی یا بھوکا ہی رکھو گی۔ میں نے سب تیار کر دیا ہے تم
دستر خوان بچھالو۔ جلدی جلدی میں جو کچھ پکا سکتی تھی پکا لیا، گوشت شام کو کھلاؤں گی۔“ سبیلہ
نے دسترخوان لگایا اور شمیلہ خانم نے جو چیزیں پکائی تھیں تھوڑی تھوڑی میرے سامنے رکھی
ہوئی طشتری میں نکال لیں پھر گرم گرم روٹی اس کے پہلو میں رکھتے ہوئے کہا: ”شروع کیجیے۔“
دو تین نوالے کھانے کے بعد میں نے کھانے کی تعریف کی تو شمیلہ خانم بولیں:

”ناچنے گانے کے ساتھ ساتھ اماں نے ہمیں یہ سب بھی سکھا دیا۔ طرح طرح کے
کھانے پکائی تھیں اور کہتی تھیں یہ سب خانم صاحب سے سیکھے ہیں۔“

کھانا کھاتے کھاتے میں کہیں کھو گیا تو سبیلہ نے پوچھا: ”کہاں کھو گئے کچھ یاد آ گیا۔“
”جہاندار بیگم کا دسترخوان۔ ایسے ہی بیٹھ کر اُن کے ساتھ کھاتا تھا اور اسی طرح وہ میری
طشتری میں چیزیں نکالتی تھیں۔ اور.....“



”اور.....؟“

”دسترخوان پر شہبائی پکائی ہوئی چیزیں بھی لے آتی تھی۔“

یہ سن کر سبیلہ چپ ہو گئیں۔ میرے کھانا ختم کرنے تک بڑی مشکل سے انہوں نے دو
تین نوالے منہ میں ڈالے۔ جب دسترخوان بڑھا دیا گیا اور جب ہم پھر سبیلہ کے کمرے میں
آئے تو وہ مجھ سے بولیں:

”جن چیزوں کو ہم جتنا بھلانا چاہتے ہیں وہ اتنی ہی یاد آنے لگتی ہیں۔“ پھر بولیں:

”خوب یاد آیا۔ جن بی بی کا خط آیا تھا، کربلا میں شہبا کی مجلس والے دن انہوں نے بتایا تھا شہبا نے کچھ چیزیں رکھوائی ہیں ان کے پاس۔ کہہ رہی تھیں کسی وقت آکر لے لیجیے گا۔“

پھر کہا: ”میں کل جا کر لے آؤں گی۔ چاہیں تو آپ بھی چلیں میرے ساتھ۔“

”نہیں میں نہیں جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر میں نے سبیلہ سے چلنے کی اجازت چاہی تو وہ بولیں:

”اماں نے آپ کو شام تک کے لیے روکا ہے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد.....“

”نہیں طبیعت کچھ الجھ رہی ہے۔ گھر جانا چاہتا ہوں۔“

”میرے پاس بیٹھنا اچھا نہیں لگ رہا ہے۔“

”آپ کے پاس بیٹھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ وقت کا پتہ نہیں چلتا لیکن اس وقت.....“

”ٹھیک ہے جائیے۔ میں کل شام کو کربلا والی بی بی کے پاس جاؤں گی اور جو چیزیں شہبا نے اُن کے پاس رکھوائی ہیں، لے آؤں گی۔“

”اُن بی بی سے یہ بھی پوچھ لیجیے گا جس کربلا میں شہبا کی ماں دفن ہیں، اس میں شہبا کی قبر کہاں پر ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ضروری نہیں کہ انہیں اپنی ماں کے پہلو میں جگہ ملی ہو۔“

”اُن سے پوچھنے کی ضرورت نہیں، میں بتائے دیتی ہوں۔ میں ہو آئی ہوں اس کی قبر پر۔“ سبیلہ نے کہا۔ ”آپ کو اس لیے نہیں بتایا آپ ایسی باتیں سننے کی حالت میں نہیں تھے۔“

”کہاں پر ہے بتائیے۔“

”آپ کربلا میں جیسے ہی داخل ہوں گے تو وہ جو بائیں طرف کا میدان ہے، اس کی دیوار سے کچھ پہلے نیم کا ایک گھنا درخت ہے۔ اس کے نیچے شاید تین قبریں ہیں۔ بیچ والی انہیں کی ہے۔“

شہبا کی قبر کی جگہ معلوم کر کے میں شمیلہ خانم کے آرام میں خلل ڈالے بغیر ان کے گھر سے باہر نکل آیا۔



اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر میں بہت دیر تک اپنے بستر پر خاموش پڑا رہا۔ کئی بار جی چاہا کہ حکیم صاحب کی طرف چلا جاؤں۔ اُن کے پاس بیٹھ کر اور ان کی باتیں سن کر بڑا سکون ملتا ہے۔ لیکن بستر سے اٹھنے کو جی نہیں چاہا۔ کروٹیں بدلنے کے دوران میں نے آستین الٹ کر

بازو پر بندھا ہوا امام ضامن کھولا اور اسے اپنی آنکھوں پر رکھ لیا پھر گلے کے تعویذ کو اپنے
 ہونٹوں پر۔ کروٹ بدلے بغیر بہت دیر تک میں اسی حالت میں پڑا رہا پھر نہ جانے کب مجھے
 نیند آ گئی۔ جھٹ پٹے کے وقت کچھ دیر کے لیے میری آنکھ کھلی اور جب اذان کی آواز میرے
 کان میں آئی تو میں نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن نیند کے ایک تیز جھونکے نے مجھے پھر
 لیٹنے پر مجبور کر دیا۔ پھر مجھے اتنی گہری نیند آئی کہ صبح ڈوبتے ہوئے تاروں کی روشنی میں جب
 میری آنکھ کھلی تو مجھے رات کا دیکھا ہوا کوئی خواب یاد نہیں رہا۔ میں نے اٹھ کر وہ امام ضامن جو
 سوتے وقت میری آنکھوں سے ڈھلک کر میرے سر کے نیچے آ گیا تھا بازو پر باندھا اور وہ
 تعویذ جو ہونٹوں سے پھسل کر گلے پر آ گیا تھا، گلے میں پہنا اور منہ پر ایک چلو پانی ڈال کر کر بلا
 ملکہ جہاں کی طرف نکل پڑا۔ صبح کی اذان ابھی ابھی ختم ہوئی تھی۔ لوگ مسجدوں کے لیے گھروں
 سے نکل رہے تھے اور مندروں کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔ میں نے کر بلا کے لیے پتلے راستوں
 کے بجائے کھلے ہوئے راستے کو چنا اور اپنے محلے سے نکل کر نخاس کی طرف آیا پھر ٹوریا گنج ہوتا
 ہوا حیدر گنج کے تراہے پر آ گیا۔ یہاں سے مجھے عیش باغ کے لیے جہاں وہ کر بلا موجود تھی،
 مڑنا تھا۔ اس تراہے پر رک کر میں نے اُس سے کچھ آگے داہنی طرف بنی ہوئی اُس کر بلا کو
 دیکھا جہاں شمیلہ خانم کی ماں نجم النساء عرف امراؤ جان دفن تھیں۔ منشی فضل حسین خاں کی اس
 کر بلا کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے یاد آیا شمیلہ خانم نے کیسی تکلیف سے اپنی ماں کے جنازے
 کا ذکر کیا تھا۔ میرے یہ کہنے پر کہ ان کے جنازے میں بہت لوگ تھے انہوں نے کہا تھا:
 ”مشکل سے دس بارہ لوگ۔“ کاندھا بدل بدل کر وہی دس بارہ لوگ اُس امراؤ جان کو اس
 کر بلا تک لائے تھے جس کے مجرے میں رئیس و امیر دور دور سے آتے تھے اور جس کی ایک
 جھلک دیکھنے کے لیے لوگ جتھوں کی شکل میں اس کے کوٹھے کے سامنے کھڑے رہتے تھے۔
 ایک لمحے کے لیے میرا جی چاہا میں اس طرف جاؤں لیکن میں عیش باغ والے راستے کی طرف
 مڑ گیا اور کچھ ہی دیر بعد کر بلا پہنچ گیا۔ گھر سے نکلتے وقت آسمان پر اچھے خاصے تارے دکھائی
 دے رہے تھے، کر بلا کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے وہ سب غروب ہو چکے تھے اور صبح کی
 پو پھٹ چکی تھی۔ میں کر بلا میں داخل ہوا تو میرے پیچھے پیچھے برقع پہنے اور ایک بڑا سا تھیلا ہاتھ
 میں لیے ایک بہت سن رسیدہ خاتون بھی داخل ہوئیں۔ ان کا چہرہ پوری طرح گھلا ہوا تھا۔ اس

سرخ و سپید چہرے کو دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے میں رات کے بہت گہرے اندھیرے میں چاند کو طلوع ہوتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ اُن سے آنکھیں چار ہوتے ہی میں نے اُنہیں سلام کیا۔
”جیتے رہو۔ نماز کے لیے آئے ہو۔“ انہوں نے پوچھا۔

”جی۔“ میں نے سوچا اور کیا کہوں۔
”اچھی بات ہے۔ پہلے تو صبح کو یہاں کی مسجد ویران رہتی تھی۔ اب کچھ کچھ لوگ آنے لگے ہیں۔“

”اور آپ؟“ میں نے پوچھا۔
”اس کربلا میں پہلی بار آئے ہو۔“
”نہیں آتا ہوں کبھی کبھی۔ ماں ہماری یہیں دفن ہیں اور بڑے بھائی بھی۔“
”تو مجھے ضرور دیکھا ہوگا۔ تقیہ بیگم ہے میرا نام۔“
”میں رات کو آتا ہوں۔ عشاء کے بعد۔“

”اور میں مغرب سے پہلے چلی جاتی ہوں۔ یہ جو داہنی طرف کا روضہ ہے اس میں داخل ہوتے ہی جو پہلی برجی ہے اسی میں بیٹھ کر دن بھر قرآن پڑھا کرتی ہوں۔“ انہوں نے کہا۔
”دن کے وقت کسی تدفین میں آئے ہوتے تو مجھ پر نگاہ ضرور پڑی ہوتی۔ نماز اور مجلس کے لیے میت اسی روضے میں لائی جاتی ہے۔“
”آیا تو، اتفاق ہے نگاہ آپ پر نہیں پڑی۔“
”اچھا جاؤ نماز میں دیر ہو رہی ہے۔“

اب میرے لیے مسجد کی طرف جانے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ شہبا کی قبر کی طرف جاتا تو جھوٹا بن جاتا۔ مسجد میں کچھ دیر رہنے کے بعد میں اس میدان کی طرف آ گیا جس کی دیوار سے کچھ پہلے نیم کے گھنے درخت کے نیچے بنی ہوئی تین قبروں میں سے بیچ کی قبر شہبا کی تھی۔ اس قبر پر ابھی تک پتھر تو کیا کوئی نشانی بھی نہیں لگائی گئی تھی۔ مجھے یاد آ یا شہبا نے سبیلہ کے نام اپنے خط میں لکھا تھا: ”ہم جیسے بے وارثوں کو دفن کے لیے زمین مفت مل جاتی ہے۔“ یہ بات یاد آتے ہی میں نے سوچا: ”مفت کی زمین دینے والوں نے نشانی اس لیے نہیں لگائی ہوگی کہ اس قبر پر کون آئے گا۔“ میں اس کچی قبر کے پہلو میں دو تین اینٹیں رکھ کر اُن پر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے

ہی مجھے محسوس ہوا کوئی ہاتھ اس قبر کے اندر سے نکل کر میرے بازو کو ٹٹول رہا ہے اور میری گردن پر ریگ کر کسی چیز کے ہونے کا یقین کر رہا ہے۔ پھر میری آنکھوں کے سامنے کی اصل چیزوں نے اپنی شکلیں بدل کر دوسری شکلیں اختیار کر لیں۔ میں نے دیکھا ایک پرانے دالان کے آخری حصے میں بنے مٹی کے چولہے میں کوئی لکڑیاں جلا رہا ہے اور وہاں تھ بڑی صفائی سے پکے ہوئے امرودوں کے قتلے بنا رہے ہیں اور ایک کمرے میں میرے سر سے سر ملا کر کوئی کتابوں کے ڈھیر پر جھکا ہوا ہے اور ایک بیمار لڑکی اپنی ہی تصویر کو دکھ بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ یہ دوسرا موقع تھا جب میری آنکھ اصل منظروں کے اندر دوسرے منظر دیکھ رہی تھی۔ بیٹھے بیٹھے میں نے بہت سے محلوں، اُن محلوں کے اندر بنے ہوئے چھوٹے بڑے مکانوں، اُن مکانوں کے اندر بنے ہوئے دالانوں اور صحیحیوں اور اُن دالانوں اور صحیحیوں کے اندر بیٹھی ہوئی بوڑھی اور جوان ہوتی ہوئی عورتوں کو بہت دیر تک دیکھا۔

آنکھ کو دھوکا دینے والے ان منظروں سے میں اس وقت باہر نکلا جب نوے برس کی وہ بوڑھی عورت جو میرے ساتھ کربلا میں داخل ہوئی تھیں چائے کا گلاس لے کر میرے سامنے آکھڑی ہوئیں۔

”سورج نکلنے سے پہلے تم اس کربلا میں داخل ہوئے تھے، دھوپ پورے میدان میں آچکی ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”لیکن تم اتنی دیر سے ایک ہی حالت میں اس قبر کے پہلو میں بیٹھے ہو۔ مرنے والا تمہارا کون تھا۔“

میں چپ رہا۔

”میں صبح سے پانچ چھ پارے ختم کر چکی ہوں۔ روضے کی برجی سے نیم کا یہ درخت صاف نظر آتا ہے۔“ وہ خاتون بولیں۔ ”ہر پارہ ختم کرنے کے بعد میں نظر اٹھا کر دیکھتی ہوں اسی طرح بیٹھے نظر آتے۔ آخر کیا رشتہ ہے مرنے والے سے تمہارا۔“ یہ کہہ کر چائے کا گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

”لو یہ چائے پیو۔ ہوٹل سے منگائی ہے، اپنے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی۔“

”آپ کہاں رہتی ہیں؟“

”رستم نگر میں۔“

”کہاں پر۔“

”جہاں پرانا چبوترہ ختم ہوتا ہے.....“

”نور باڑی کے آگے والا محلہ؟“

”ہاں وہی۔“

”نواب سلطان بہادر کو جانتی ہیں؟“

”انہیں کون نہیں جانتا۔ حکمت الدولہ حکیم مرزا مہدی کی اولاد میں تھے۔ کسی زمانے میں وہ پورا علاقہ انہیں حکیم مرزا مہدی کا تھا۔“ اُن بوڑھی خاتون نے کہا۔ پھر بولیں: ”اور حکمت الدولہ کی ایک شاخ سے ہم بھی ہیں۔“

”یہ قبر نواب سلطان بہادر کی بیٹی کی ہے۔“

”کیا کہہ رہے ہو۔ صہبا خانم کی جوان جہان بیٹی اتنی جلدی اس دنیا سے اٹھ گئی۔“ یہ کہہ کر وہ خاتون سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

”ان کی ماں سے ملنا جلنا تھا آپ کا۔“

”تھا، لیکن کم کم۔ خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے ہم ادھر جاتے نہیں تھے۔ مجلس ماتم میں آنا سا منا ہو جاتا۔“ تقیہ بیگم بولیں۔ پھر آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا: ”خدا بخشنے بڑی نیک عورت تھی صہبا خانم۔ اور یہ بچی جس کی یہ قبر ہے اسے تو میں نے چھوٹے سے بڑا ہوتے دیکھا۔“ وہ کہتی رہیں۔ ”صہبا خانم کے انتقال کے بعد میں نور باڑی کی طرف نہیں گئی۔“ پھر پشیمانی کے سے انداز میں بولیں: ”جانا چاہیے تھا۔ بن ماں باپ کی بچی کی خبر لینی چاہیے تھی۔ خدا مجھے معاف نہیں کرے گا۔“ یہ کہنے کے بعد تقیہ بیگم نے کہا:

”لیکن تم اس کے کون ہو؟ صہبا خانم کے عزیز، وہ بتاتی تھیں، تھے ہی نہیں۔“

میں کچھ نہیں بولا۔

”نسبت لگی تھی اس کے ساتھ؟“

”نہیں۔“

”پھر اتنی دیر سے یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ دھوپ شاخوں سے چھن کر سر پر آنے لگی ہے۔“

”میری ایک عزیز کے یہاں رہنے آئی تھیں، وہیں ملاقات ہوئی تھی۔“ میں نے کہا۔

”جب انہیں معلوم ہوا، انہیں کی طرح میرا بھی کوئی نہیں ہے تو میرا بہت خیال رکھنے لگیں۔ میری عزیزہ انہیں بہت عزیز رکھتی تھیں۔ جس دن اُن کی حویلی نہ جاتا کہتیں جس دن تم نہیں آتے ہوشہا کا دل کسی کام میں نہیں لگتا۔ بار بار تمہیں کو پوچھتی ہے۔“

”یاد آیا، شہبا ہی نام تھا اس کا۔ انتقال کیسے ہوا؟“

”دق، مرض بہت دن سے پل رہا تھا۔ کھانسی بہت آنے لگی تھی۔ جب طبیعت بہت بگڑی تو ہسپتال جا کر بھرتی ہو گئیں اور جب سمجھ لیا مرض اچھا نہیں ہوگا تو ہسپتال سے خود ہی چھٹی لے کر چلی آئیں۔ دو چار دن بعد خبر ملی اس دنیا میں نہیں رہیں۔“ میں نے انہیں بتایا پھر اپنی آستین الٹ کر انہیں اپنا بازو دکھاتے ہوئے کہا:

”یہ امام ضامن انہیں کا باندھا ہوا ہے اور گلے میں یہ جو تعویذ ہے یہ بھی انہوں نے ہی پہنایا تھا۔“ سب کچھ سننے کے بعد تقیہ بیگم بولیں:

”تم کہو نہ کہو میں تمہارا دکھ سمجھ سکتی ہوں۔ چالیس برسوں سے آندھی پانی کی پروا کیے بغیر اس کربلا میں روز آ رہی ہوں۔ بہت سوں کو اپنے عزیزوں کی موت پر روتے پیٹتے دیکھا لیکن جو دکھ تمہاری آنکھوں میں ہے، یاد نہیں آتا ایسا کسی اور کی آنکھ میں دیکھا ہو۔“ تقیہ بیگم کہتی چلی گئیں..... ”کیسی پھول سی بچی تھی۔ آواز میں اپنی ماں سے زیادہ اثر تھا۔ نوحہ پڑھتی تو پہلا ہی بول سن کر سب رونے لگتے۔ صہبا خانم زندہ ہوتیں اور اس بچی کی جان سلامت رہتی تو..... اُن کی اور تمہاری دونوں کی مرادیں پوری ہوتیں۔“ پھر ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں: ”لیکن ویسا ہوتا کہاں ہے جیسا ہم سوچتے ہیں۔“

ع ”من در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال“ پھر کہا: ”یوں تو میں اُس برجی سے باہر نہیں نکلتی۔ آنے والے مرنے والوں کے نام بتا دیتے ہیں۔ پارے پڑھ پڑھ کر انہیں کے نام بخش دیتی ہوں لیکن کل سب سے پہلے اس قبر پر ایک پارہ پڑھوں گی پھر اپنی برجی میں جاؤں گی۔“ یہ کہہ کر بولیں: ”تم ابھی یہاں سے اٹھنا نہیں چاہتے۔ بیٹھو۔ جتنی دیر بیٹھو گے سکون ملے گا اور اسے بھی خوشی ہوگی جو اس قبر کے اندر ہے۔“ ر کے بغیر وہ کہتی رہیں: ”تمہیں شاید یقین نہ آئے لیکن چالیس سال دن دن بھر اس برجی میں بیٹھ کر یقین آ گیا ہے قبریں بولتی ہیں۔ یقین نہ آئے تو میرے جانے کے بعد اُس سے جو اس قبر کے اندر ہے، اس کا حال پوچھنا وہ بتائے گی.....“ تقیہ بیگم کہتے کہتے رکیں۔

”کیا بتائے گی۔“

”تمہارے بغیر اُس دنیا میں اُس کا جی نہیں لگتا۔ لیکن.....“

”لیکن.....؟“

”اپنی خوشی کے لیے..... وہ تم سے اس دنیا کی زندگی نہیں چھینے گی۔ اُس کا حال ضرور پوچھنا اور کل مجھے بتانا اس سے کیا باتیں ہوئیں۔“ یہ کہہ کر تقیہ بیگم وہاں سے اپنی برجی کی طرف چل دیں۔

اُن کے جانے کے بعد میں یہ سوچ کر کہ جو کچھ تقیہ بیگم نے کہا ہے وہ اُن کا وہم ہے، اُس قبر کے پاس اُسی طرح خاموش بیٹھا رہا جیسے پہلے بیٹھا تھا اور کچھ دیر بعد جب وہاں سے اٹھ کر چلنے لگا تو ایک آواز میرے کانوں میں آئی:

”جو کچھ اُن بوڑھی عورت نے کہا ہے، صحیح ہے۔ ایسا پہلی بار ہوا ہے جب آپ مجھ سے کوئی بات کیے بغیر جا رہے ہیں۔ آپ نے پوچھا نہیں میں کس حال میں ہوں۔ پوچھتے تو بتاتی بڑی تکلیف میں ہوں۔ کہنے کو میرے اور آپ کے بیچ فاصلہ زیادہ نہیں لیکن ہم دو الگ الگ دنیاؤں میں ہیں۔ جب ہم ایک ہی دنیا میں تھے، میں آپ کو بہت کچھ بتانا چاہتی تھی، بہت کچھ آپ سے سنا چاہتی تھی لیکن اس سے پہلے کہ میں آپ کو بہت کچھ بتاتی، بہت کچھ آپ سے سنتی، قسمت نے مجھے یہاں پہنچا دیا۔ ایک نہ ایک دن تو مجھے یہاں آنا ہی تھا، لیکن اتنی جلدی آنا ہوگا یہ نہیں معلوم تھا۔ ایک بات جو میں نے آپ کو اُس دنیا میں نہیں بتائی، اب بتاتی ہوں۔ پوچھیے کیا۔ لیکن آپ نہیں پوچھیں گے، آپ تو چپ رہنے کے لیے آئے ہیں۔ وہ بات جو میں نے آپ کو وہاں نہیں بتائی یہ تھی کہ خالہ کے گھر سے ہسپتال کے بستر تک میری خوشی اسی میں تھی کہ آپ خوش رہیں۔ اب پوچھیے کہ میں ہسپتال سے آپ کو بتائے بغیر کیوں چلی گئی۔ لیکن آپ یہ بھی نہیں پوچھیں گے۔ اچھا تو سنیے میں وہاں سے اس لیے چلی گئی کہ مجھے اپنے دکھ سے زیادہ آپ کا دکھ پریشان کر رہا تھا۔ جب مجھے خون کی بڑی الٹی ہوئی تو بستر پر گرتے گرتے میں نے آپ کی طرف دیکھا تھا، آپ کا پورا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا اور آنکھیں بجھ گئی تھیں۔ میں اپنا خون دیکھ کر نہیں، آپ کا چہرہ اور آپ کی آنکھیں دیکھ کر سمجھ

گئی تھی اب سانس میرے جسم میں بہت دن رکنے والی نہیں۔ اب جائیے۔ صبح سے یہاں بیٹھے ہیں۔ دھوپ تیز ہو رہی ہے۔ آپ سے پہلے سبیلہ یہاں آ چکی ہے لیکن یہاں آنے کی بات اُس نے آپ کو نہیں بتائی ہوگی۔ وہ جانتی تھی بتانے سے آپ کو دکھ ہوگا۔ اور آپ بھی یہاں آنے، اتنی دیر تک میرے پاس بیٹھنے اور میری باتیں سننے کی بات اسے مت بتائیے گا۔ میری ہی طرح وہ بھی آپ کا دکھ نہیں دیکھ سکتی۔ اب آئیے گا تو حویلی والی خالہ کی قبر پر ہوتے ہوئے آئیے گا۔“

شہبا کی آواز میں یہ ساری باتیں سن کر میں نے سوچا جو کچھ میں نے سنا ہے وہ میرا وہم ہے۔ یہ میری ہی سوچی ہوئی باتیں ہیں جو مجھے اپنے آپ سنائی دینے لگی ہیں۔ میں قبر پر سے اٹھا اور اُس حجرے میں آیا جہاں کر بلا کے متولی موجود تھے۔ میں نے ان سے میدان میں بنی ہوئی کیاریوں میں لگے ہوئے پھولوں میں سے کچھ پھول توڑنے کی اجازت مانگی، اجازت مل جانے کے بعد وہ پھول توڑ کر انہیں اپنے رومال میں رکھا پھر اس قبر پر گری ہوئی نیم کی پتیوں کو ہٹایا اور قبر کے بالکل نیچوں نیچے وہ پھول رکھ دیے۔ اُسی وقت مجھے شہبا کی بغیا کے وہ پھول یاد آئے جن کی خوشبو شہبا کے مکان میں داخل ہونے سے پہلے میری ناک میں پہنچ گئی تھی۔

شہبا کی قبر سے ہٹنے کے بعد میں نے سوچا روضے کی برجی میں جا کر تقیہ بیگم کو بتاؤں کہ آپ نے ٹھیک کہا تھا قبریں واقعی بولتی ہیں۔ لیکن میں اُن سے ملے بغیر کر بلا سے باہر نکل آیا۔



دوسرے دن میں شملہ خانم کے گھر پہنچا تو سبیلہ نے دروازہ کھولتے ہی بتایا کہ ان کے علاقے میں کرائے پر رہنے کے لیے ایک دو جگہیں خالی ہیں۔ آج کل میں وہاں بات کر لی جائے گی۔ پھر وہ مجھے باہری کمرے میں بٹھا کر اندر گئیں اور ایک تھیلا لا کر میرے سامنے رکھتے ہوئے بولیں:

”اس میں آپ کی اچکن اور شیردانی ہے۔ کل میں کر بلا والی بی بی کے یہاں گئی تھی جو کچھ سامان شہبا نے اُن کے پاس رکھوایا تھا لے آئی۔ اسی کے ساتھ میرے نام ایک پرچہ بھی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کے لیے رکیں پھر کہا: ”اس میں لکھا ہے:

”پیاری سہو!“

میرے پاس تھا ہی کیا جسے سامان کہا جائے۔ پھر بھی اماں کے زمانے کی جو دو چار چیزیں ہیں اور دو ایک چیزیں جو میں نے اپنی کمائی سے خریدی تھیں کسی اور کے بجائے انہیں کے پاس جو انہیں میری ہی طرح عزیز رکھیں، رہیں تو اچھا ہے۔ اور ان میں تم ہو یا وہ جو میرا سامان تانگے پر لدوا کر حویلی والی خالہ کے ہاں لے گئے تھے۔ اُن سے کہنا میں خالہ کے صندوق سے اُن کی شہروانی اور اچکن نکال لائی تھی اور اپنے سامان سے زیادہ ان کی حفاظت کی۔ کوئی موقع ان دونوں کے پہننے کا آئے تو اُن سے کہنا ضرور پہنیں اور جب پہنیں تو دیکھنا کیسے لگتے ہیں۔ خالہ کہتی تھیں دونوں چیزیں ان پر بہت اچھی لگیں گی۔

تمہاری شہو“

”خط سنانے کے بعد سبیلہ نے کہا: ”سارا سامان کسی طرح جگہ بنا کر میں نے اپنے ہی کمرے میں رکھ لیا ہے۔ اور یہ شہروانی اور اچکن آپ کہیں تو میں اپنے کپڑوں کی الماری میں رکھ لوں۔ جب پہننا ہو تو لے لیجیے گا۔“ یہ کہہ کر بولیں: ”بہت احتیاط سے رکھوں گی۔ اپنے ہی کپڑوں کی طرح۔“

اور اس سے پہلے کہ میں سبیلہ کی بات کا ہاں یا نا میں جواب دیتا شمیمہ خانم چائے کی کشتی لے کر آگئیں اور چائے کی پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے بولیں:

”تم آئے تو میں نے سوچا پہلے چائے بنالوں تمہارے لیے، پھر بیٹھوں تمہارے پاس۔ کیسے ہو؟“

”ایک دن کی خیریت کیا بتاؤں۔ اچھا ہوں۔“ میں نے کہا۔ پھر کہا: ”کئی بار آچکا ہوں یہاں لیکن وہ باتیں اب تک آپ سے نہیں پوچھ سکا جو پوچھنا ہیں۔“

”جب تم پہلی بار یہاں آئے تھے، اسی وقت سے تم پر مصیبت آ پڑی۔ ہمارے لیے بھی وہ پریشانی کے دن تھے۔ شہبا.....“ وہ بتاتے بتاتے رکیں پھر بولیں: ”ہمیں بھی بہت عزیز تھی۔ اس کا مرنا بڑا دکھ دے گیا ہم کو۔“

”وہ بھی اکثر ذکر کرتی تھیں آپ کا اور آپ کی ماں کا بھی۔ کہتی تھیں اماں ہماری اُن لوگوں کے بارے میں ایسے باتیں کرتی تھیں جیسے اُن کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”بتاتی تھیں اماں روز انہیں، آپ کی ماں کو، یاد کرتی تھیں اور ان کی بیٹی کو بھی۔“
 انہیں یہ بتا کر میں نے آگے کہا: ”اور حکیم احمد رضا بتاتے تھے کوٹھے پر صہبا خانم کے پہنچنے کا حال
 کسی کو نہیں معلوم لیکن..... کسی کسی کو یہ ضرور معلوم ہے وہ ایک اونچے خاندان کی عورت تھیں۔“
 ”صحیح بتاتے تھے۔ اصل میں صہبا خانم نواب قیصر شکوہ کی، جن سے ہماری ماں کی منگنی
 ہوئی تھی، نانہال سے تعلق رکھتی تھیں۔ قیصر شکوہ کی ماں محمد علی شاہ کے عہد میں وزارت کے
 عہدے پر فائز نواب ظہیر الدولہ غلام یحییٰ خاں بہادر نجستہ صفات، یہ القاب جیسے اماں بتاتی
 تھیں ویسے ہی ہمیں یاد ہیں، کے خاندان سے تھیں۔ صہبا خانم کا تعلق بھی اسی خاندان سے
 تھا۔ اماں بتاتی تھیں ظہیر الدولہ غلام یحییٰ خاں کو بہت دن وزارت کے ٹھانڈھ نصیب نہیں
 ہوئے اور اُن کے بعد جب یہ عہدہ احمد علی خاں کی طرف آیا تو باہم رنجشیں اور چشمکیں شروع
 ہو گئیں اور غلام یحییٰ خاں کی اولاد کا سکھ چین جاتا رہا۔ دوسری طرف کچھ رنڈی ذات، ذلیل
 اوقات، معاف کرنا ان لفظوں کے لیے، پری چہرہ عورتیں بادشاہ نصیر الدین حیدر کے زمانے
 میں اپنی اصل چھپا کر کسی طرح محل میں داخل ہو گئیں۔ بادشاہ کا سایہ ملتے ہی انہوں نے
 اپنے اصلی رنگ دکھانا شروع کر دیے۔ بازار سے محل میں آنے والی یہ عورتیں بے حجابیوں اور
 نظر بازیوں میں بہت آگے نکل گئیں اور جب ان پر بندشیں لگائی گئیں تو انہوں نے ماں باپ
 کو دیکھنے کا بہانہ بنا کر عرضداشتیں لکھیں کہ ہم اپنے گھر جائیں گے اور جب بادشاہ نے کہا جو
 باہر جائے گا ایک جوڑے کے سوا کچھ نہ پائے گا تو ان بد بختوں نے کپڑے لٹے وہیں
 چھوڑے، سب کی سب وہاں سے نکلیں، کچھ چوک میں آ کر بیٹھ گئیں اور کچھ اُن کی ہور ہیں
 جن سے اُن کی نظر بازیاں تھیں۔ یہی بد بختیں وہاں سے نکلتے وقت دھوکے سے کچھ شریف
 زاد یوں کو بھی اپنے ساتھ نکال لائیں اور جب ان پر باہر نکلنے کا بھید کھلا تو دوبارہ انہیں محل میں
 آنے کا پروانہ نہیں ملا۔ وہ مصیبت کی ماری کیا کرتیں۔ ناچار انہوں نے سر چھپانے اور اپنی
 روزی کمانے کے راستے نکالے، جو سرتال، راگ راگیاں ان بد مستوں سے سیکھی تھیں انہیں
 پر پاؤں تھرکانا شروع کیے اور غضب خدا کا جو پاؤں بادشاہ کی مجلس اسے باہر کسی نے دیکھے نہ
 تھے، اب انہیں دیکھنے کو ٹھوں پر ہر ایرا غیر آنے لگا۔ تو صہبا خانم کی نانہال بہکاوے میں
 آجانے والی انہیں عورتوں کی تھی۔“

شمیلہ خانم داستانی انداز میں سب کچھ بتا کر بولیں:

”سچ پوچھو تو بادشاہوں پر یہاں کے دو طرفہ مار ہوئی۔ ایک طرف تو انگریزوں نے سازشیں کر کر کے انہیں اپنے بیٹوں سے نکلنے نہیں دیا۔ دوسری طرف یہ ناچنے گانے والیاں ہنر کے ان قدردانوں کو ہنر دکھانے کے بہانے اُن سے قریب ہوئیں اور انہیں ایسا شیشے میں اتارا کہ وہ بھول گئے ان میں کون نیک ہے کون بد۔ ان میں جو بُری تھیں انہوں نے دہرے فائدے اٹھائے۔ ایک طرف بادشاہ سے انعام پائے دوسری طرف محل کے راز انگریزوں تک پہنچائے۔“ یہ کہہ کر شمیلہ خانم نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا: ”اور ایک دن وہ آیا:

بیک گردشِ چرخِ نیلوفر

نہ نادر بجا ماند نے نادری

پھر بتایا: ”اماں بتاتی تھیں ان عورتوں کی ذات کا پتہ تھا نہ قریے کا۔ خواجہ سراؤں سے ساز باز کر محل کے اندر پہنچیں اور انہیں سے مل کر اسیلوں کو باہر نکال لائیں۔ اب حال یہ ہے کہ ہم جو اسیلوں میں ہیں، اکیلے نہیں اور وہ جو بد اعمال اور کم اصل تھیں رئیس زادیاں بن گئیں لیکن آخر ان کا بھی اچھا نہیں رہا۔“ یہ کہہ کر شمیلہ خانم کچھ دیر تک کچھ نہیں بولیں: پھر سبیلہ سے پانی منگوایا اور دو چار گھونٹ پینے کے بعد کہا:

”تو یہ جو شہابی بی تھی، اس میں سب خصلتیں اپنی ماں کی آئیں اور اس کی ماں بھی ہماری ماں کی طرح اکیلے تھیں اس لیے اس پیشے میں آنے کے بعد بھی نیکی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ دنیا جنہیں نجم النساء نہیں، خانم صاحب کے رکھے ہوئے نام امراؤں سے جانتی تھی وہ یہ قسم کھا کر کہ مرتے دم تک آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں گی، میرے باپ کے ساتھ رہیں۔ شوہر کو عمر بھر کی قید ہو جانے کے باوجود دوسرے مرد کے عقد میں آنا تو دور انہوں نے اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ اور ہم نے بھی سبیلہ کے باپ کو خدا کا نیک بندہ جان کر ان کے ساتھ اپنا نکاح پڑھوایا اور جب وہ ہمیں بتائے بغیر ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تو ہم نے بھی کسی اور کو اپنی زندگی میں لائے بغیر بٹیا کو بڑا کیا۔ اور بٹیا ہماری اتنی بڑی ہو جانے کے بعد بھی کسی کی آنکھ دیکھنے سے پہلے ہماری آنکھ دیکھتی ہے۔“ شمیلہ خانم سب کچھ ر کے بغیر بتا کر بولیں:

”تم سے نہ جانے کیوں گھل مل گئی ہے۔ اچھا ہے اتنے دن اکیلے رہتے رہتے

”مٹھی جا رہی تھی۔“

”اماں آپ اپنی باتیں کیجیے۔“ سبیلہ بیچ میں بولیں:

”کل میں شہبا جہاں دفن ہے، وہاں گیا تھا۔ بہت دیر رہا۔“ میں نے بات بدلنے کے لیے کہا۔

”اچھا کیا۔ اُس کی روح کو سکون ملا ہوگا۔“ سبیلہ نے کہا۔

”یہی تقیہ بیگم بھی کہہ رہی تھیں۔“

”کون تقیہ بیگم؟“

”اُسی کربلا میں ملی تھیں۔ صبح سویرے آ جاتی ہیں۔ دن بھر روضے کی برجی میں بیٹھ کر قرآن پڑھتی ہیں۔ مغرب سے پہلے چلی جاتی ہیں۔“

”رہتی کہاں ہیں؟“

”جہاں شہبا رہتی تھی، اسی سے کچھ آگے رستم نگر میں۔“

”سمجھ گئی۔“ اب کے شمیلہ خانم بولیں: ”پرانے چبوترے سے نکلتے ہی مکان ہے ان

کا۔ مکان کیا اب تو زمین ہی زمین ہے۔ چھتیں، دیواریں سب گر چکی ہیں۔ ایک طرف چھپر ڈال کر رہتی ہیں۔“

”آپ جا چکی ہیں ان کے گھر۔“

”نہیں۔ ہم دونوں ہر جمعرات کو درگاہ جاتے ہیں۔ وہیں کسی نے ان کا مکان دکھایا۔“

”بتا رہی تھیں حکمت الدولہ حکیم مرزا مہدی جو شہبا کے دادیہالی بزرگ تھے ان کی ایک

شوخ سے ہم بھی ہیں۔“

”صحیح کہہ رہی تھیں۔ بہت کچھ تھا ان کے پاس۔ لیکن.....“

”لیکن.....؟“

”اولادیں سب ناخلف نکلیں۔ سب اڑا دیا۔“ شمیلہ خانم نے کہا۔ ”اب کربلا میں صبح

سے شام تک بیٹھ کر قرآن پڑھتی ہیں۔ کچھ ماہانہ کربلا کے متولی سے مل جاتا ہے کچھ آنے

جانے والے اپنے مرنے والوں کے نام سورے پڑھوا کر دے دیتے ہیں۔“ ان کی بات ختم

ہوئی تو میں نے کہا:

”یہ بھی کہہ رہی تھیں میں نے شہبا کو چھوٹے سے بڑا ہوتے دیکھا ہے۔ صہبا خانم سے بھی کبھی کبھی کی ملاقات تھی۔“

”روز کی ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ حکمت الدولہ کے خاندان میں جھگڑے بہت تھے۔“

”یہی وہ بھی بتا رہی تھیں۔“

”زمین جائداد کے جھگڑوں نے ایک ایک صحن میں کئی کئی دیواریں اٹھوا دیں۔“

”اچھا یہ بتائیے خانم، سرفراز بیگم کو آپ نے دیکھا تھا؟“ میں نے بات کا رخ بدلا۔

”نہیں۔ میرے بڑے ہوتے ہوتے وہ اس دنیا سے اٹھ چکی تھیں۔“ شمیمہ خانم نے کہا۔ ”اماں بتاتی تھیں کوٹھے سے میرے چلے جانے کے بعد کھوئی کھوئی سی رہنے لگی تھیں۔ اسی قلق میں ایک دن اللہ کو پیاری ہو گئیں۔“ پھر کہا: ”ادھر کے لوگ بتاتے تھے کوٹھا سونا ہو جانے کے بعد یا تو مصلے پر بیٹھی رہتیں یا درگا ہوں اور کربلاؤں کے دالانوں میں پڑی رہتیں۔ زیارت کے لیے آنے والے لوگ انہیں لاوارث سمجھ کر دو چار پیسے اُن کے سرہانے رکھ دیتے۔“

”اور کوٹھے کی دوسری عورتیں؟“ چوک کے مشہور کباب فروش ٹنڈے جن کی عمر تو بچے کے آس پاس ہے انہوں نے مجھے بتایا خانم صاحب کے بعد سب ادھر ادھر ہو گئیں۔

”صحیح بتایا۔ اماں بتاتی تھیں حشر اُن سب کا اچھا نہیں ہوا۔ امیر جان، خورشید اور بیگا جان سب ایسے ویسوں کے ساتھ ہو لیں اور بسم اللہ کو خانم صاحب کے ایک ملازم نے اپنے گھر ڈال لیا۔“ یہ بتانے کے بعد شمیمہ خانم ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولیں:

”اس ملازم نے بسم اللہ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ جب دانے دانے کو محتاج ہوئیں تو دیوانی ہو گئیں۔ چوک کی گلیوں میں اماں اماں پکارتی پھرتیں اور گھنٹوں خانم صاحب کے اجڑے ہوئے کوٹھے کے سامنے بیٹھ کر اسے ٹکا کرتیں۔“

”آپ کبھی اس طرف گئیں؟“

”نہیں۔ دو قدم کی دوری پر تھا اُن کا کوٹھا لیکن اماں نے جب وہ حیدر حسین کے پھانگ میں آ کر رہیں، پھانگ سے باہر نہیں نکلنے دیا۔“ شمیمہ خانم نے کہا۔ پھر بولیں: ”لیکن ایک حسرت ہمیشہ دل میں رہی۔“

”وہ کیا؟“

”بوا حسینی کو دیکھنے کی۔ اماں جب کانپور سے لکھنؤ آئیں اور جب میں کچھ بڑی ہوئی تو روز مجھے بوا حسینی کے قصے سناتیں اور انہیں یاد کر کے روتیں۔“ شمیلہ خانم ہنراتی ہوئی آواز میں بولیں۔ ”اور اسی وقت میرا جی چاہتا میں بوا حسینی کی گود میں جا کر بیٹھ جاؤں اور ان سے بہت سی کہانیاں سنوں اور کہانیاں سنتے سنتے انہیں کی تھکیوں سے ان کی گود میں سو جاؤں۔“

”کوٹھے سے اماں کے نکلتے ہی ڈھے گئیں اور خانم صاحب کے انتقال کے بعد کچھ دن زندہ رہ کر وہ بھی چل بسیں۔ اماں بتاتی تھیں ان کے مرنے کی خبر سن کر وہ پہروں روتی رہیں اور یہ سوچ سوچ کر اور بھی روتی رہیں کہ کسی سے اُن کی قبر کا پتہ بھی نہیں چلا۔“

”بوا حسینی سے تو بڑی محبت تھی انہیں۔“

”بہت۔ کہتی تھیں شمیلہ جب مجھے رونا ہوتا میں انہیں کی گود میں چلی جاتی اور مجھے روتا دیکھ کر وہ بھی رونے لگتیں۔ کہتیں بٹیا امراؤ قسمت کے لکھے کو کوئی نہیں کاٹ سکتا اور اماں یہ بھی کہتیں کہ بوا حسینی نہ ہوتیں تو ناچ گانا شروع ہونے سے پہلے وہ کوٹھا مجھے نکل لیتا۔“

”ایک بوا اور تھیں اس چوک میں۔ بوازینب اور وہ.....“

”امراؤ بیگم کے یہاں تھیں، اسی طرح جیسے بوا حسینی خانم صاحب کے یہاں تھیں۔“

شمیلہ خانم بولیں، پھر بولیں: ”امراؤ بیگم، یہ بھی اماں ہی بتاتی تھیں، عام کوٹھوں سے الگ ذرا دور پر ایک مکان میں رہتی تھیں۔ کسی سے ملتی جلتی نہیں تھیں۔ مجرے بھی بہت کم کرتی تھیں۔“

”جی ان کی بیٹی سردار جہاں نے، ذکر کر چکا ہوں آپ سے اُن کا، بہت کچھ بتایا ان کے بارے میں۔“ میں نے کہا۔ پھر پوچھا: ”یہ بوا حسینی اتنی اللہ والی کیوں تھیں۔“

”اللہ والی تو بوازینب بھی تھیں۔“ شمیلہ خانم بولیں۔ ”جوانی میں دونوں کے دن اچھے تھے دونوں اچھے گھروں کی تھیں۔ اماں تو یہ بھی کہتی تھیں دونوں کا خاندان بھی ایک ہی تھا۔“ وہ بتاتی رہیں: ”دونوں کے بزرگ شاہی محل میں ملازم تھے۔ مرد اس خاندان کے سلطان عالم کی حفاظت میں مارے گئے جو بچے اُن کا بھگدڑ میں پتہ نہیں چلا۔ بہت دنوں تک بے مردوں کی یہ عورتیں بچے کھچے سے اپنا کام چلاتی رہیں۔ ڈھلتی عمر میں جب کھانے پینے کے لالے پڑے تو ایک کو امراؤ بیگم نے خدا ترسی میں اور دوسری کو خانم صاحب نے اپنی سنگت کے لیے اپنے

یہاں رکھ لیا۔“ شمیلہ خانم نے آگے کہا: ”خانم صاحب یہ بھی سوچتی تھیں بوا یہاں رہیں گی تو نوچیاں اٹھتے بیٹھتے اچھی زبان اور ڈھنگ کے بول سنتی رہیں گی۔“

”اور وہ مولوی صاحب۔ بوا حسینی.....“

”ہاں دونوں ایک دوسرے کی طرف مائل تھے۔“

”آپ کی ماں اُن مولوی کو بہت مانتی تھیں۔ اپنے قصے میں کہا ہے جو کچھ آج میں ہوں، انہیں کی بدولت ہوں۔“

”اصل میں اُن مولوی صاحب نے سمجھ لیا تھا کہ اماں اسیلوں میں ہیں۔ جو تعلیم وہ دیں گے اسے وہ اچھی طرح حاصل کریں گی۔“ شمیلہ خانم نے کہا۔ ”اور وہی ہوا۔ انہوں نے جی لگا کر پڑھایا، اماں نے جی لگا کر پڑھا۔ سات۔ آٹھ برسوں میں عربی، فارسی میں پکی ہو گئیں اور لکھنے بولنے میں طاق۔ مرتے مرتے بھی غلط بولنے پر ٹوکنے سے باز نہ آئیں۔“

”مولوی صاحب آئے کہاں سے تھے؟“

”اس زمانے کا قاعدہ تھا اچھی ناچنے والیوں کو پڑھا لکھا کر پکا کیا جائے۔“ شمیلہ خانم بولیں۔ پھر بولیں: ”کوٹھے کے علاوہ اعلیٰ درجے کی بیگمات میں بھی اُن کا گزر تھا۔ بے تمیزی اور بد آموزی کی جھلک بھی وہاں ناگوار خاطر تھی۔ جو لوچ اور نرمی بیگموں کی زبان میں تھی، وہی انہیں بھی چاہیے تھی۔ وہاں صرف ناچنا نہیں بیگمات سے کلام بھی کرنا ہوتا تھا۔ اس لیے اس بات کا خیال رکھا جاتا کہ زبان بھونڈی اور انداز عامیانہ نہ ہو۔“ یہ بتا کر بولیں: ”تو یہ سب سکھانے والے ہر کوٹھے پر آتے تھے۔ خانم صاحب چونکہ ہر چیز میں خوبی کا خیال رکھتی تھیں اس لیے ایسا مولوی ڈھونڈ کر لائیں جن کا علم پختہ ہو۔ وہ زبان یا املا کی تعلیم دینے والا ہو یا ناچ گانا سکھانے والا، پہلے خود پرکھتی تھیں پھر رکھتی تھیں۔“

”مولوی صاحب کو تو انہوں نے ٹھونک بجا کر رکھا لیکن وہ جو استاد آپ کی ماں کو ناچ گانے کی تعلیم دیتے تھے، ان کے معاملے میں ان سے چوک ہو گئی۔“ میں نے کہا۔

”کیسے؟“

”جب آپ کی ماں، جیسا قصے میں لکھا ہے، رام کلی گارہی تھیں تو استاد نے انہیں غلط سر لگانے پر ٹوکا نہیں۔ اور نہ ٹوکنے پر خانم نے استاد کو ٹوکا۔“

”کیا ٹوکا؟“

”ان سے پوچھا رام کلی میں دھیوت کوئل ہے یا سدھ۔“

”ہاں یاد آیا۔ اس میں لکھا ہے کوئل کی جگہ اماں سدھ لگا گئیں۔“

”اسی طرح جب آپ کی ماں نے سوہرگایا تب بھی استاد سے چوک ہو گئی۔“

”کیا؟“

”آپ کی ماں نے استاد سے پوچھا گندھار اس میں کوئل ہے یا ات کوئل۔ استاد نے

اسے ات کوئل بتا دیا۔“

”اس میں تو گندھار کوئل ہے۔“

”جی۔ اسی لیے خانم صاحب نے انہیں ٹوکا۔“

”یہ جو گانے بجانے کی تعلیم والا قصہ ہے اس میں ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“

”وہ کیا؟“

آپ کی ماں نے بیگا جان سے جنہیں خانم کی نوچیوں میں موسیقی کا بہت علم تھا، بہت

معمولی باتیں پوچھی ہیں۔“

”ہاں وہ سرگم والی؟“

”جی۔ سرگم تو سب جانتے ہیں اور ان کی شریاں بھی۔ یہ تو موسیقی کا پہلا سبق ہے۔ چار۔

نہن۔ دو۔ چار۔..... میں نے کہا۔“ اور یہ بھی جانتے ہیں کہ سروں میں ’سا‘ اور ’پا‘ اچل ہیں۔“

”یہ سب مرزا صاحب کا گڑھا ہوا ہے۔ انہیں موسیقی کا زیادہ علم نہیں تھا۔“

”صحیح کہہ رہی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ جو آپ کی ماں نے بیگا جان سے دھروپد کی

فرمائش کی تھی، اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔“

”ہاں دھروپد تو بانکپن والا راگ ہے جس میں دیوتاؤں کی شان میں قصیدے

پڑھے جاتے ہیں۔“

”اسی لیے نزاکت اور نفاست والے اودھ میں دھروپد بہت مقبول نہیں ہوا۔“

”صحیح کہہ رہے ہو۔ یہاں ٹپہ، ٹھمری، دادر، چیتی، گھاٹو اور سوہراور کجری بہت گائے

جاتے ہیں۔“ شملہ خانم بولیں۔ پھر بولیں: ”مرزا صاحب نے اماں کی زبانی دھروپد کی

فرمائش شاید اس لیے کرائی ہو کہ اسی بہانے پر جان کا امتحان ہو جائے۔“

”ہاں یہ ہو سکتا ہے۔“

”یہ موسیقی والی باتیں بہت ہو گئیں یہ بتائیے مولوی صاحب آئے کہاں سے تھے۔“
”یہیں کے تھے۔ خانم صاحب کے مکان سے کچھ دور وہ جو تحسین کی مسجد ہے، اسی کے
آس پاس کہیں رہتے تھے۔“ شمیلہ خانم نے بتایا۔ ”اجداد ان کے بڑے عالموں میں تھے، سرکار
سے اُن کے وظیفے تھے لیکن..... حکومت گئی تو ان کے ہاتھ خالی ہو گئے۔ جو کچھ پاس تھا جاتا رہا۔
بوا حسینی سے کبھی کی صاحب سلامت تھی۔ جب خانم صاحب کو استاد کی تلاش ہوئی تو بوا حسینی یہ
سمجھ کر کہ یہ خانم صاحب کی نظر میں پورے اتریں گے انہیں اُن کے پاس لے آئیں۔“

”اور بوا حسینی اُن پر.....“

”جان چھڑکنے لگیں میں یہ تو نہ کہوں گی لیکن ان کے بغیر چین نہ آتا تھا انہیں۔“

”اور وہ گوہر مرزا.....“

”مجھے معلوم تھا تم ضرور پوچھو گے ان کے بارے میں، اچھا کیا پوچھ لیا۔“ شمیلہ خانم
نے کہا۔ ”جو قصہ تمہارے ہاتھ لگا ہے، اس میں کیا ہے یہ تو تم ہی بتاؤ گے لیکن چھپی ہوئی
کتاب میں تو.....“

”جو چھپی ہوئی کتاب میں ہے وہی اس میں بھی ہے۔“

”تو مرزا صاحب نے گوہر مرزا کے قصے میں چاشنی پیدا کرنے کے لیے وہ سب بڑھادیا
جو حقیقت میں نہیں تھا۔“

”یعنی؟“

”میرے منہ سے نہ کہلاؤ تم خود سمجھ لو۔ یہ صحیح ہے وہ ڈومنی کے پیٹ سے تھے، یہ بھی صحیح ہے
ماں ان کی باغ قاضی کی رہنے والی تھیں اور بوا حسینی انہیں خانم صاحب کے پاس لائی تھیں۔“
”جی۔“ قاضی کے باغ میں کچھ مکان تھے ڈومنیوں کے اور باغ مگا میں کچھ میراثین
بھی رہتی تھیں۔“

”تم تو زیادہ جانتے ہو گے۔ تمہارے محلے کے پچھواڑے ہی تو ہیں یہ محلے۔“

”جی۔“

”تو اُن گوہر مرزا کے مزاج میں زنا نہ پن تھا کیوں تھا یہ بھی سن لو۔ ڈونیاں بیاہ براتوں میں گالیاں گاتی تھیں، وہ بھی عورتوں میں۔“

”جی۔“ میں نے اپنے بچپن میں دیکھا ہے گالیاں گاتے لیکن ڈونیوں کو نہیں سدھنوں کو۔“
 ”ہاں۔ عام گھروں میں سدھنیں ایک دوسرے کے پول کھولتی تھیں۔ تو یہ ڈونیاں اپنی گالیوں میں زنا نے الفاظ استعمال کرتی تھیں۔ ووئی، نوج، اے ہے، موئی..... اور وہ جو خاص زانی گالیاں ہیں وہ میری زبان سے نہیں نکل سکتیں۔“

”آپ بتائیں نہ بتائیں وہ آچکی ہیں میرے کانوں تک۔ اُن میں سے کچھ مجھے یاد ہیں۔“
 یہ کہہ کر میں نے انہیں تک بندی والی کچھ گالیاں ڈرتے ڈرتے سنائیں:

اے بنے تری اماں گھر بھر سے بری نکلی
 اماں کو تری چوک میں حلوائی نے پکڑا تھا
 جب جامہ تلاشی لی برنی کی ڈلی نکلی
 خالہ کو تری چوک میں اک درزی نے پکڑا تھا
 جب جامہ تلاشی لی گرتے کی کلی نکلی
 چچیوں کو تری چوک میں اک موچی نے پکڑا تھا
 جب جامہ تلاشی لی، جوتے کی تلی نکلی
 ”اب تم نے سادی تو ایک مجھ سے بھی سن لو۔“ شمیلا خانم بولیں:
 ”گا کر سنائیے۔“

”گا کر سنائے دیتی ہوں:

سدھن آئی ہیں بن ٹھن کے کر کے سنگھار
 ایسی سدھن پہ عاشق ہوئے ہیں کہار
 کہدو سدھن سے اپنی حفاظت کریں
 سدھی صاحب بھی دیکھیں گے پورا سنگھار
 ساتھ سدھن کے آئے ہیں لونڈے بہت
 ان کی ساری کو کر دیں گے سب تار تار“

اس کسر سے رجسٹر سون کا وقت آج صبح کی اس گلی میں صبر دل ملا
 ندرارہ سنا کچھ جو دم آند دل سے جڑے آج بے جا رہے گا

(سورج نام)

”ڈھولک ہوتی تو اور مزہ آتا۔“ شمیلہ خانم کی گالیاں ختم ہوئیں تو میں نے کہا۔
 ”تو یہ گالیاں ڈونیاں خود بناتی تھیں اور ان کے گانے کی مشق گھروں میں کرتی تھیں۔“
 شمیلہ خانم نے بتایا۔ ”گوہر مرزا اسی ماحول میں پلے بڑھے تو مزاج میں زنا نہ پن پیدا ہو گیا اور
 اسی زنا نہ پن کی وجہ سے وہ کوٹھے پر نوچیوں کے لیے کھلونا بن گئے۔ لیکن..... اماں کی طرف
 بڑھنے کی ہمت ان میں نہیں تھی۔“
 ”برانہ مانیں تو ایک بات کہوں۔“

”کہو۔“

”ہو سکتا ہے آپ کی ماں نے چھپائی ہو آپ سے یہ بات۔“
 ”نہیں ایسا نہیں ہے۔ اماں اشاروں کنایوں میں وہ بھی بتا دیتیں۔“ پھر ذرا غصے سے
 بولیں: ”گوہر مرزا ڈومنی زادے، طبیعت میں چھچھورا پن، حرکتیں سفلوں جیسی۔ خانم کو ایک
 آنکھ نہ بھاتے۔ وہ بوا حسینی کے مونہہ سے کچھ کہتی بولتی نہ تھیں اور طرح اس لیے دیے ہوئے
 تھیں کہ اپنی اُچھل کود کے باوجود یہ رنڈیوں کے سارے کام دوڑ دوڑ کر کرتے۔ پھر یہ کہ
 بوا حسینی جب سے انہیں خانم صاحب کے یہاں لائی تھیں، اُسی وقت سے ان پر دم دیتی
 تھیں۔ اُن کا دلار دیکھ کر اماں بھی اُن کی دمسازی کرنے لگیں اور جب گوہر مرزا کے باپ
 کا انتقال ہوا تو بوا، گوہر مرزا کی ماں کا بڑھاپا دیکھ کر سارا خرچ اپنے ذمے لے لیا۔ اس قصے
 میں بات بس اتنی تھی اور یہی اماں نے مرزا رسوا کو بتائی ہوگی لیکن انہوں نے اسے پڑھنے
 والوں کے لیے چٹ پٹا کر دیا۔“

”لیکن مرزا صاحب نے تو قصہ انہیں دکھایا تھا۔“ میں نے کہا۔

”دکھایا تھا۔ لیکن جب لوٹایا ہوگا اس وقت اس جز کو بڑھادیا ہوگا۔“ یہ کہہ کر
 شمیلہ خانم بولیں: ”اب اس قصہ کو یہیں ختم کرو۔“ یہ کہہ کر کچھ دیر چپ رہیں پھر
 بولیں: ”اور ایک بات تمہیں بتاؤں۔“
 ”بتائیں۔“

”جیسے اماں امراؤ بیگم کو بہت چاہنے لگی تھیں ویسے میں بھی سردار جہاں کو، انہیں
 دیکھے بغیر چاہنے لگی۔ لیکن.....“

”لیکن.....؟“

”اماں نے کہہ رکھا تھا، میری ہی طرح میرے بعد تم بھی ایسی کسی عورت سے جو اس پیشے میں رہی ہو، تعلق نہ رکھنا۔“ شمیلہ خانم نے کہا۔ پھر بولیں: ”رہو کی بڑی مجلس میں سوز پڑھنے اس لیے چلی جاتی تھی کہ مولا کی خدمت سے منہ موڑا تو وہاں کیا جواب دوں گی۔ لیکن مجلس ختم ہوتے ہی وہاں سے چل پڑتی۔ باہر نکل کر بہت جی چاہتا پلٹ کر جاؤں اور سردار جہاں کو گلے لگا کر خوب روؤں اور خالہ، امراؤ بیگم کی بہت سی باتیں ان سے پوچھوں۔ لیکن اُسی وقت اماں یاد آتیں اور دل سے یہ خیال نکال دیتی۔“

”اماں کتنی باتیں کیجیے گا۔“ سبیلہ جو اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی تھیں، آ کر بولیں: ”آپ نے تو انہیں پوری تاریخ بتا ڈالی۔“ یہ کہہ کر میری طرف اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں۔ ”میں نے بتایا تھا ان کے دل میں چھید ہے۔ بہت دیر تک بولنا ان کے لیے ٹھیک نہیں۔“ مجھے اس طرح دیکھنے کے بعد انہوں نے اپنی ماں سے کہا: ”میں نے اتنی دیر میں پورا کھانا تیار کر لیا۔“

”ارے واہ۔ یہ تو بیٹیاں ہماری بہت اچھا کیا۔“

”اب کچھ دیر آپ لیٹیں۔“ سبیلہ نے اپنی ماں سے کہا۔ ”ایک آدھ ہنڈیادم پر ہے۔ پھر ہم تینوں ساتھ کھانا کھائیں گے۔“

شمیلہ خانم کے جانے کے بعد سبیلہ مجھ سے بولیں: ”میں نے سنا اماں سردار جہاں کے بارے میں کیا کہہ رہی تھیں۔“

”بڑی محبت سے ذکر کر رہی تھیں ان کا۔“

”جی۔ اُن کا ایک دکھ یہ بھی ہے کہ امراؤ بیگم جنہیں ہماری نانی بہت چاہتی تھیں اماں.....“

”اماں.....؟“

اُن کی بیٹی سردار جہاں کو چاہنے کے باوجود اُن سے نہیں مل سکیں۔ جب ان کو یہ دکھ بہت ستانے لگتا تو ایک دکھ مجھے بھی ہونے لگتا۔

”وہ کیا؟“

”ہنگا اور کتو سے نہ ملنے کا اور.....“

”اور.....؟“

”شہبا کونہ دیکھ پانے کا، دیکھا بھی تو موت کے بستر پر۔“ یہ کہہ کر سبیلہ کچھ دیر خاموش رہیں۔ پھر بولیں: ”آپ کیا سمجھتے ہیں، کیا ہمیں آپ ہی سے ان سب کے بارے میں معلوم ہوا ہے۔ اماں ان سب کی باتیں روز کرتیں اور جب جب ان کی باتیں ہوتیں، ان سے ملنے کو دل بیقرار ہونے لگتا۔“

”یہی حال شہبا کا بھی تھا۔ وہ بھی سب کو یاد کیا کرتیں۔ مجھ سے کہتی تھیں ہماری اماں ہمیں سب کے بارے میں بتاتی تھیں۔ میں وہ سب باتیں آپ کو بتاؤں گی لیکن.....“

”لیکن.....؟“

”بتانے سے پہلے انہیں بیماری نے جکڑ لیا اور وہ سب باتیں ان کے سینے میں رہ گئیں۔“

میں نے کہا۔ پھر کہا: ”یہ بھی عجیب بات ہے۔“

”کیا.....؟“

”سب ایک دوسرے سے واقف لیکن سب ایک دوسرے سے دور۔“

”ایک بات بتاؤں۔“ سبیلہ نے کہا۔

”بتائیے۔“

”سب کی باتیں ایک جیسی تھیں۔ دکھ بھری۔ سب ملتیں تو سب کے مونہہ سے یہی دکھ بھری باتیں نکلتیں۔ اس لئے.....“

”اس لیے.....؟“

”سب ایک دوسرے سے الگ رہے۔ کوئی دکھ بھری باتیں بار بار سننا نہیں چاہتا.....“

سبیلہ کہتے کہتے رکیں۔ پھر بولیں:

”بھرے ہوئے زخموں کا پھر سے کھل جانا کسی کو اچھا نہیں لگتا۔“ پھر کہا:

”باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ اماں نے آرام کر لیا۔ اب کھانا کھایا جائے۔“

”تھوڑی دیر بعد ہم تینوں دسترخوان پر بیٹھ کر سبیلہ کا پکایا ہوا خوش ذائقہ کھانا کھانے لگے۔ کھانا کھاتے وقت ہم تینوں نے بہت کم بات کی۔ میں نے ایک دو جملے کھانے کی تعریف

میں کہے۔ اُن ماں بیٹی نے کچھ باتیں موسم کے بارے میں کیں پھر دسترخوان بڑھا دیا گیا۔
 سبیلہ خانم اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ اُن کے جاتے ہی سبیلہ نے مجھ سے کہا:
 ”آپ کچھ دیر آرام کر لیجیے، باہر والے کمرے میں۔ میں سہ پہر کے بعد آؤں گی
 چائے لے کر۔“

○

سہ پہر کے بعد جب سبیلہ چائے لے کر آئیں تو میں گہری نیند میں تھا۔
 ”اٹھیے۔“ انہوں نے بہت آہستہ سے کہا۔ میں ایک دو کروٹیں بدل کر اٹھا تو انہوں نے پوچھا:
 ”اچھی طرح سوئے۔“
 ”بہت گہری نیند آئی۔“
 ”لیجیے چائے پیجئے۔“ اور جب میں نے ایک دو گھونٹ چائے کے پی لیے تو وہ بولیں:
 ”اماں سے بہت سی باتیں ہوئیں؟“
 ”بہت سی۔“

”نانی کی طرح وہ بھی پرانی باتوں میں کھوئی رہتی ہیں۔ اب تک یہ باتیں مجھ سے بتاتی
 تھیں، اب آپ کو بتانے لگی ہیں۔“
 ”لیکن یہ سب دکھ بھری باتیں ہیں۔“ میں نے کہا۔
 ”جی۔“

”اور دکھ بھری باتیں، آپ نے کہا تھا، ان لوگوں کو دہرانا اچھا نہیں لگتا۔“
 ”کہا تھا لیکن یہ اُن سے نہیں دہراتے جن کے قصے انہیں کے جیسے ہوں۔“ سبیلہ نے
 کہا۔ ”آپ اُن سے الگ ہیں۔ اماں سمجھتی ہیں آپ کو یہ سب بتا کر اُن کے جی کا بوجھ ہلکا
 ہوگا۔ اور میں بھی جب آپ سے کچھ کہہ لیتی ہوں تو بہت دیر تک خوش رہتی ہوں۔“ یہ کہہ کر
 سبیلہ نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا: ”کچھ سمجھے آپ؟“
 ”نہیں۔“

”دکھ اُن سے بانٹا جاتا ہے جو آپ کا دکھ سن کر اس کی دوا کریں۔ اُن سے نہیں جو آپ کا
 دکھ سن کر اپنا دکھ بیان کرنے لگیں۔“ سبیلہ نے کہا۔ ”ہم یہی کرتے ہیں دوسرے کا دکھ سن کر اپنا

دکھ بیان کرنے لگتے ہیں۔ مگر آپ ایسے نہیں ہیں۔ میں اتنے دن سے آپ کو دیکھ رہی ہوں۔ آپ نے ہمارا دکھ بہت سنا لیکن اپنا دکھ نہیں بیان کیا۔“ یہ بتانے کے بعد بولیں: ”اماں کو آپ کی یہی بات پسند ہے۔ جب وہ آپ سے اپنا دکھ بیان کرتی ہیں، انہیں لگتا ہے آپ اس کی دوا بھی ڈھونڈتے جا رہے ہیں۔ اور یہی سوچ کر انہیں سکون ملتا ہے۔“ یہ کہہ کر سبیلہ نے کہا: ”ایک آدھ دن میں آپ سے وہ بات بھی بتا دیں گی۔“

”کون سی؟“

”دل میں چھید والی اور یہ بتانے کے بعد کیا کہیں گی وہ بھی مجھے معلوم ہے۔“

”کیا کہیں گی؟“

”میرے بعد میری بیٹی کا خیال رکھنا۔“ انہیں ہر وقت یہ خیال ستا رہا تھا ہے میرے بعد میری بیٹی کا کیا ہوگا۔“ سبیلہ دکھ بھرے لہجے میں بولیں۔ پھر کہا: ”آپ کو بہت عزیز رکھنے لگی ہیں، بہت سی باتیں مجھے نہیں بتائیں، شاید آپ کو بتا دیں۔“

”کون سی باتیں؟“

”یہی کہ میں جن کی بیٹی ہوں وہ کون تھے۔ جب پوچھا ٹال گئیں۔ اور یہ بھی نہیں بتایا کہ یہ دل والی بیماری کیسے ہوئی۔ لیکن آپ پوچھیں گے تو آپ کو بتا دیں گی۔“ یہ کہہ کر سبیلہ بہت دیر تک چپ رہیں اور جب مغرب کی اذان ہونے لگی تو یہ کہہ کر اندر چلی گئیں کہ نماز پڑھ کر آتی ہوں۔ بہت دیر بعد وہ نماز پڑھ کر آئیں تو میں نے ان سے کہا:

”بہت دیر مصلے پر بیٹھیں۔“

”دعائیں بہت مانگتی ہوں۔ سب سے زیادہ اماں کے لیے۔ اُن کا سایہ سر پر سلامت رہے۔“

”علاج کس کا ہو رہا ہے؟“

”کسی کا نہیں۔ الگ سے کسی ڈاکٹر کو دکھانے میں پیسہ بہت خرچ ہوگا۔ اتنا پیسہ اب ہمارے پاس نہیں ہے۔“ سبیلہ نے کہا پھر بولیں: ”اماں نے جتنا پیسہ جمع کیا تھا اس میں سے بہت خرچ ہو گیا۔ اچھا خاصا تو میری پڑھائی میں نکل گیا۔ پھر جو میرے شوق تھے اُن پر خرچ ہوا۔“ یہ بتا کر بولیں: ”نوکری مجھے کرنے نہیں دی۔ جب بھی کہا کسی اسکول میں پڑھا کر کچھ کمالوں گی، بولیں ابھی نہیں، میری آنکھ بند ہونے کے بعد۔ الگ سے علاج کے لیے جتنا پیسہ

چاہیے اتنا ہمارے پاس ہے نہیں۔ ہفتے ہفتے اُسی ہسپتال میں جہاں شہبا بھرتی تھیں جا کر دکھا آتے ہیں۔ منصور نام کے ایک ڈاکٹر ہیں۔ دل کی بیماریوں کا بہت اچھا علاج کرتے ہیں۔“ سبیلہ نے بتایا۔ ”وہی دیکھتے ہیں اور سب سے پہلے دیکھتے ہیں اور سب کی سب دوائیں ہسپتال سے مفت دلوا دیتے ہیں۔ اشاروں اشاروں میں مجھے بتا دیا ہے ماں آپ کی بہت دن زندہ نہیں رہیں گی۔“

”گھبرائیے نہیں۔ کبھی کبھی جان لیوا بیماریوں میں بھی لوگ برسوں زندہ رہتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”آپ کی یہی بات اچھی لگتی ہے، دوسروں کو حوصلہ دینے کی۔ شہبا، جب آپ ان کے پاس نہیں ہوتے تھے، کہتی تھیں.....“

”کیا کہتی تھیں؟“

”یہ جو ہیں یہ نہ اپنی تکلیف بتاتے ہیں نہ دوسروں کی تکلیف بڑھاتے ہیں۔“

”میں سمجھا نہیں۔“

”کہتی تھیں جب کسی کی تکلیف سنتے ہیں، بہت اچھی باتیں کرنے لگتے ہیں، ایسی جن سے تکلیف خود بخود کم ہو جائے۔“

”یہی صفت تو آپ میں بھی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ جس مریض کے پاس بیٹھیں، بغیر دوا کے اُس کا مرض اچھا ہو جائے۔ اسی لیے کہتا ہوں ایسی دیکھ بھال کرنے والی بیٹی بہت دن زندہ رکھے گی اپنی ماں کو۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔ اچھا ایک بات بتائیے۔“

”کہیے۔“

”یہ ہینگا اور کمو اپنی بنائی ہوئی چیزیں کہاں فروخت کرتی تھیں۔“

”یہ کیوں پوچھ رہی ہیں؟“

”اماں نوکری تو کرنے نہیں دیں گی، سوچتی ہوں تصویریں بنا کر اپنا خرچ نکالوں۔“

سبیلہ نے کہا: ”شوق بھی پورا ہوگا، پیسے بھی ملیں گے۔“

”چڑیا بازار والا مکان چھوڑ کر وہ لوگ کہاں رہنے گئے ہیں مجھے نہیں معلوم۔ جو لوگ

اس مکان میں آ کر رہے تھے، انہیں بھی کچھ بتا کر نہیں گئے۔ پتہ لگانے کی کوشش کروں گا۔
یہ کہہ کر میں نے کہا:

”ویسے ماں کے علاج کے لیے آپ پریشان نہ ہوں۔“
”کیوں؟“

”کچھ پیسہ میں نے بھی جوڑ رکھا ہے، وقت آنے پر کام آئے گا۔“
”یہ کہنے کا شکریہ۔ لیکن بات صرف ماں کے علاج کی نہیں ہے۔ آپ سے کیا چھپانا۔
مکان کا کرایہ بڑی مشکل سے نکل پاتا ہے۔ تنگی ہوئی تو رہنے کا ٹھکانہ بھی جائے گا۔“
”پریشان مت ہوں۔ اللہ راستے نکالے گا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن آگے کی فکر ضروری ہے۔ کہنے پاتے اور نانی کے زمانے کا دوسرا
قیمتی سامان اماں مجھے بتائے بغیر نکال رہی ہیں۔“ سبیلہ نے کہا۔ ”جب کچھ نہیں رہے گا تو کیا
ہوگا۔“ پھر کہا: ”اماں آپ کو بہت مانتی ہیں، انہیں راضی کیجیے۔“
”کس چیز کے لیے۔“

”مجھے نوکری کر لینے دیں۔ لڑکیوں کے بہت سے اسکول ہیں۔ کہیں نہ کہیں مل جائے
گی، تنخواہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔“

”اتنی پریشان مت ہوں۔ کہانا کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔“
”اچھا چھوڑیے ان باتوں کو۔ کل جمعرات ہے۔“
”جی۔“

”کل میں درگاہ جاؤں گی۔ آپ بھی وہاں آجائیے۔“
”کیوں؟“

”آجائیے۔ پہلے ہر جمعرات ہم اور اماں ساتھ جاتے تھے، اب وہ تھک جاتی ہیں۔“
”کس وقت آؤں۔“

”مغرب بعد۔ بھینٹ وہاں بہت ہوتی ہے۔ آپ حوض کے پاس جہاں سبیل لگتی ہے وہاں
کھڑے ہو جائیے گا۔ میں خود آ جاؤں گی آپ کے پاس۔“
”ٹھیک ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔“

”اماں سے مل کر جائیے۔“ یہ کہہ کر سبیلہ نے وہیں سے اپنی ماں کو آواز دی: ”یہ جارہے ہیں۔“
 سبیلہ کی آواز سن کر شمیمہ خانم کمرے میں آئیں اور آتے ہی بولیں:
 ”بیٹا روز آتے رہو۔ شمیمہ خانم چراغ سحری ہیں۔ کیا جانے کب یہ لو خاموش ہو جائے۔“
 ”اماں..... پھر وہی..... میں ان کے لیے یہیں مکان ڈھونڈ رہی ہوں۔ رہیں گے الگ
 لیکن کھانا پینا ہمارے ساتھ رہے گا۔“

”تو اجازت دیجیے۔“ یہ کہہ کر میں ان کے مکان سے باہر نکل آیا۔



دوسرے دن مغرب کی اذان ہوتے ہی میں درگاہ کی طرف چل پڑا اور کشمیری محلے
 والے راستے کے بجائے کاظمین والا راستہ اختیار کیا۔ ادھر سے درگاہ کی دوری زیادہ تھی لیکن
 میں جان بوجھ کر اس طرف سے اس لیے آیا کہ ادھر کے راستے میں وہ محلے پڑیں گے جن سے
 میں بہت مانوس ہو چکا تھا۔ پہلے تو نور باڑی سے میرا گزر ہوگا جہاں شہبا کا مکان میدان بن
 چکا تھا۔ پھر پرانا چبوترہ آئے گا اور اسی سے نکلتے ہی رستم نگر جہاں چھتیں اور دیواریں گر جانے
 کے بعد تقیہ بیگم اپنی بہت بڑی زمین پر ایک چھپر ڈال کر رہ رہی تھیں۔

نخاس سے کاظمین کی طرف آ کر جب میں نور باڑی کی طرف بڑھا اور جب وہاں پہنچا
 جہاں اس سے پہلے شہبا کے مکان کی جگہ پر میدان دیکھا تھا تو دیکھا وہاں ایک تین منزلہ
 عمارت بن چکی ہے اور آس پاس کے مکان بھی اپنی صورتیں بدل چکے ہیں۔ وہاں ایک لمحے
 کے لیے ٹھہرا تو بہت سے منظر میری نگاہوں میں گھوم گئے۔ وہاں سے آگے نکل کر میں پرانے
 چبوترے ہوتا ہوا رستم نگر کی طرف نکل آیا اور دیکھنا شروع کیا کہ بغیر دیواروں والی بہت بڑی
 زمین پر چھپر کہاں پڑا ہے۔ جلد ہی مجھے وہ زمین بھی نظر آ گئی اور اس پر پڑا ہوا چھپر بھی اور چھپر
 کے اندر اس کے بانس میں تار سے لٹکی ہوئی مدھم لو والی لالٹین بھی۔ تقیہ بیگم کی زمین کے
 چاروں طرف، گر جانے والی دیواروں اور چھتوں کی اینٹوں کو یہ بتانے کے لیے رکھ دیا گیا تھا
 کہ اینٹوں سے گھری یہ زمین ہماری ہے۔ یہ اینٹیں بہت اونچی نہیں تھیں اور میری نگاہ بہت
 آسانی سے تقیہ بیگم کے چھپر تک جاسکتی تھی۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں چھپر کے اندر مجھے ایک
 تخت نظر آیا اور اسی تخت کے آس پاس ریگتا ہوا ایک سایہ۔ میں نے دیکھا وہ سایہ چھپر کے

بانسوں سے لٹکے ہوئے دو چار چھینکوں تک جاتا اس میں سے کچھ نکالتا پھر تخت پر آ کر بیٹھ جاتا۔ میں نے سوچا ہونہ ہو یہ تقیہ بیگم ہی ہیں۔ اس زمین اور چھتر کو دیکھتے ہوئے میں درگاہ کے اندر داخل ہوا اور حوض سے ملی ہوئی سبیل کے پہلو میں کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد سر سے پیر تک سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی سبیلہ میرے پاس آ کر بولیں:

”چلیے روضے کے اندر۔“

اُن کے ایک ہاتھ میں حاضریاں تھیں اور دوسرے میں شمعیں اور اگر بتیاں۔ سیاہ چادر میں اُن کا چہرہ پورے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ روضے میں داخل ہو کر پہلے انہوں نے داہنی طرف کے فرش پر میرے ہاتھوں سے چھوا کر شمعیں اور اگر بتیاں روشن کیں پھر بائیں طرف جہاں مرادوں والا علم نصب تھا وہاں پہنچ کر اپنے رومال سے ناڑا نکالا اور اس علم سے مس کر کے میرے داہنے ہاتھ میں باندھا پھر دوسرے ناڑے کو میری پیشانی سے لگا کر اسی علم میں چلہ باندھا۔ پھر وہ اُس طرف آئیں جہاں بہت اونچی سی جگہ پر بیٹھا ایک شخص آئے والوں سے حاضریاں لے کر آدھی روضے پر چڑھا رہا تھا آدھی روضے سے مس کر کے واپس کر رہا تھا۔ یہاں آ کر سبیلہ نے اس شخص کو میرے ہاتھوں سے حاضریاں دلوائیں اور واپس ملی ہوئی حاضریوں کو چکھنے کے لیے کہا۔ پھر انہوں نے مرادوں والے علم کے سامنے کھڑے ہو کر بہت دیر تک دعا مانگی۔ پھر وہ اُس گوشے میں گئیں جہاں بہت سی عورتیں جمع تھیں اور کچھ کچھ دیر بعد کوئی نوحہ یا سلام پڑھ رہی تھیں۔ میں روضے کے دالان سے باہر نکل آیا۔ باہر نکلتے ہی میرے کانوں میں سبیلہ کے نوحہ پڑھنے کی آواز آئی اور جیسے ہی یہ آواز بلند ہوئی درگاہ کے صحن میں ادھر ادھر موجود عورتیں یہ دیکھنے کے لیے اُس گوشے کی طرف دوڑی چلی آئیں کہ ایسی درد بھری آواز کس کی ہے۔ وہ عورتیں سبیلہ کے چاروں طرف جمع ہو کر اُن کی آواز سے آواز ملا کر نوحہ پڑھنے لگیں۔ میں نے دیکھا اُن سب کی آنکھوں سے باران جاری تھے اور وہ سب اُس نوحے کے ایک ایک بول پر اپنا سر پیٹ رہی تھیں۔

نوحہ ختم ہونے کے بعد سبیلہ آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں کے ساتھ دالان سے باہر آئیں پھر میرے ہاتھ پر بہت سے گھلے ہوئے پیسے رکھ کر بولیں:

”یہ اُن فقیروں کو دے دیجیے گا جو باہر بیٹھے ہیں۔“ پھر بولیں: ”آج میں بہت

سکون سے سوؤں گی۔“

”کیوں؟“

”میں نے آپ کو مولا کے پاس گروی کر دیا۔ اب آپ پر کوئی آفت نہیں آئے گی۔“ یہ کہہ کر بولیں: ”اب میں چلتی ہوں۔ وزیر باغ سے ہو کر عنبر گنج کی طرف نکل جاؤں گی۔ ادھر سے بہت قریب ہے۔ خدا حافظ۔“

پھر دو قدم چل کر واپس لوٹیں اور بہت آہستہ سے مجھے آواز دی: ”سنئے۔“ پھر میرے قریب آ کر بولیں: ”اماں سے یہ مت بتائیے گا یہاں آپ بھی میرے ساتھ تھے۔“

○

آج میں گھر سے یہ طے کر کے نکلا تھا کہ شمیلہ خانم سے جو کچھ نہیں پوچھ سکا ہوں ضرور پوچھوں گا۔ جب سے میں نے اُن کے دل میں چھید ہونے کی بات سنی تھی مجھے یہ ڈر ستانے لگا تھا کہ مجھے سب کچھ بتانے سے پہلے خدا نخواستہ اُن کی آنکھ نہ بند ہو جائے۔ اس لیے میں نے ان کے گھر پہنچتے ہی سبیلہ سے کہا: ”آج آپ اپنے کمرے میں بیٹھیے، آج آپ کی اماں سے مجھے وہ باتیں پوچھنا ہیں جو آپ کے سامنے نہیں پوچھ سکتا۔“

سبیلہ سمجھ گئیں کہ میں وہی باتیں پوچھوں گا جو شمیلہ خانم نے انہیں نہیں بتائی ہیں۔ شمیلہ خانم کمرے میں آ چکی تھیں۔ ہم تینوں نے چائے پی۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد سبیلہ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ اُن کے جاتے ہی شمیلہ خانم بولیں:

”کل سبیلہ درگاہ گئی تھیں، میں نہیں جاسکی۔“ پھر بولیں: ”وہاں سے بہت خوش خوش لوٹیں۔ لگ رہا تھا جیسے جو مانگا ہو مل گیا ہو۔“

”آپ کی صحت اور سلامتی کی دعا کی ہوگی۔“ میں نے کہا۔

”کیا میری صحت اور کیا میری سلامتی۔ اُس دن تم سے کہا تھا چراغ سحری ہوں۔“

”ایسی باتیں مت کیجیے۔ ابھی آپ بہت دن زندہ رہیں گی۔“ میں نے کہا۔ ”ابھی تو

آپ کو اپنی بیٹی کی خوشیاں دیکھنا ہیں۔“

”خدا کرے ایسا ہو۔ لیکن..... ایک بات..... شاید سبیلہ نے تمہیں بتائی ہو۔ دل میں

ہمارے چھید ہے۔“

”بتائی تو ہے۔ لیکن یہ بھی بتایا کہ اماں نے یہ نہیں بتایا، یہ بیماری لگی کیسے۔“

”کوئی چلا گیا دل کو برما کر۔“

”کون؟“

”سبیلہ کے باپ اور کون؟“

”آخر وہ تھے کون؟ آپ نے اپنی بیٹی کو بھی نہیں بتایا۔“

”کیا بتاتی۔ سن کر اسے تکلیف ہوتی۔ بس اتنا بتا دیا تم ہماری جائز اولاد ہو۔“ شمیلا خانم

نے کہا۔ پھر کہا: ”اور یہ بتانا اس لئے ضروری تھا کہ وہ اپنے آپ سے شرمندہ نہ ہو۔“

”تو کون تھے آپ کی بیٹی کے باپ؟“

”قصہ طولانی ہے۔ اب چھیڑا ہے تو سنو:“

”ہماری ماں نے مرتے وقت اتنا چھوڑا تھا کہ دو چار برس دو وقت کی روٹی ہم آرام سے کھا لیتے۔ لیکن اُن کی آنکھ بند ہوتے ہی جس مکان میں ہم رہتے تھے اس کے مالک نے ہم کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ دراصل نیت اس کی ٹھیک نہیں تھی۔ جو کچھ وہ چاہتا تھا، جب ہم نے اسے ماننے سے انکار کر دیا تو اس نے کہا یا تو مکان خالی کرو یا کرایہ دُگنا کرو۔ ناچار ہم نے دُگنے کرائے پر رہنا منظور کر لیا۔ لیکن دل میں اس کے، اس کی بات پوری نہ ہونے کی وجہ سے فساد پیدا ہو چکا تھا اس لیے اس نے ہمارے یہاں چوری کرادی۔ زیور نقدی سب جاتا رہا۔ پھر وہ خاتون جنہیں تم نے پہلی بار ہمارے چوک والے مکان میں دیکھا تھا، انہیں ہماری اماں نے ہماری دیکھ بھال کے لیے رکھا تھا، ہم سے کچھ ہی بڑی تھیں، نام ان کا گل بانو تھا اور یہ نام اماں ہی نے رکھا تھا۔ اماں کے مرنے کے بعد انہوں نے ہمیں چھوڑا نہیں۔ تو انہوں نے ہم سے کہا پہاڑی زندگی کیسے کاٹو گی۔ جو کچھ تمہاری ماں نے سکھایا ہے اسی سے اپنا کام چلاؤ۔ مجبوراً ہم نے مجرے شروع کر دیے۔ آواز اچھی تھی۔ راگ راگنیوں سے واقف تھی۔ پاؤں طبلے کی تھاپ پر صحیح پڑتے تھے۔ بہت جلد بڑے مجرے ملنے لگے۔ اسی میں ایک مرد خوش صفات جو میرے ہر مجرے میں سب سے آگے بیٹھتے تھے دوسرے مجروں میں بلانے کے بہانے میرے یہاں آنے جانے لگے۔ وضع قطع کے اچھے تھے، اطوار سب شریفوں جیسے، گفتگو سلجھی ہوئی۔ اب تم میرے بیٹے کی طرح ہو تم سے کیا کہوں غرضیکہ اُن کا آنا مجھے اچھا لگنے لگا۔ ایک دن

باتوں باتوں میں بی گل بانو سے بولے: ”بندہ عطا حسین خاں، جن کے سپرد امجد علی شاہ کے زمانے میں دیوان خانہ تھا، اُن کے خاندان سے ہے۔ شہر میں بہت سی زمینیں اور جائیدادیں ہیں مگر جو واقعی پاس ہونا چاہئے، نہیں ہے۔ بی گل بانو بولیں کیا؟ بولے گھر کا سکھ چین۔ ابا جان نے ہمارے سولہویں برس میں ہمارا عقد پڑھوا دیا جو صاحبہ بیوی بن کر ہمارے گھر آئیں وہ ہمارے ابا جان سے ایک درجہ اوپر کے منصب دار کی بیٹی تھیں۔ آتے ہی ناطقہ ہمارا بند کر دیا۔ دو چار برس لستم پشتم کسی طرح گزرے آخر یہ قرار ٹھہرا کہ وہ اپنے گھر ہم اپنے گھر۔ تو میں چاہتا ہوں شملہ خانم بندے کے نکاح میں آجائیں۔ پھر بی گل بانو سے بولے آپ یہ تجویز ان کے سامنے رکھیے اگر انہیں قبول ہو تو کل پرسوں میں نکاح کی رسم پوری کر لی جائے۔ اسی کے ساتھ انہوں نے ایک شرط بھی لگا دی کہا ابھی میں انہیں اپنے گھر نہیں لے جاسکتا اس کے لیے حالات کا موافق ہونا ضروری ہے۔ پھر یقین دلایا مہینے دو مہینے بعد راہ ان کے وہاں رہنے کی ہموار ہو جائے گی۔ یہاں کے بجائے یہ وہیں رہیں گی۔ بی گل بانو نے جب یہ بات مجھ سے کہی تو مجھے ان کی ناچاقی والی زندگی پر ترس آیا کہ ایک نیک اعمال بندہ ایک بے لحاظ عورت کی وجہ سے ایسی آزار بھری زندگی گزار رہا ہے۔ تو میں نے یہ سوچ کر تجویز اُن کی مان لی کہ مہینے دو مہینے کی بات ہے، اس کے بعد زندگی راہ پر آجائے گی۔ سو تیسرے دن میں ان کے نکاح میں آگئی۔ اب وہ دن بھر ہمارے یہاں رہتے، رات ہونے سے پہلے اپنے گھر چلے جاتے۔ شروع شروع میں انہوں نے رئیسوں والے ٹھاٹھ دکھائے۔ میری ہر بات کا خیال رکھا ہر ہر ضرورت کو پورا کیا۔ کچھ دن گزر جانے کے بعد خاندانی جھگڑوں میں جائیدادوں کے نکل جانے کا ذکر کرنے لگے۔ جب کچھ اور دن گزرے تو خالی ہاتھ آنے لگے اور مجھ سے یہ کہہ کر پیسے لے جانے لگے کہ مقدموں میں بہت خرچ ہو رہا ہے، جیسے ہی زمین جائیداد واپس ملے گی، آپ کا سارا پیسہ لوٹا دوں گا۔ میں نے کہا یہ بھی آپ ہی کا پیسہ ہے لوٹانے کی ضرورت نہیں۔ میرے یہ کہنے سے اُن کا حوصلہ بڑھا اب وہ نقدی سے بچے کچھ گہنوں اور دوسری قیمتی چیزوں پر آگئے۔ ہر بازیہی کہتے جیسے ہی مقدمے فیصل ہوں گے گھر آپ کا زر و جواہر سے بھر دوں گا۔ میری تو آنکھ پر جیسے پٹی بندھی تھی جو کچھ وہ کہتے گئے میں کرتی گئی۔ پھر ایک دن جب انہیں معلوم ہوا سبیلہ ہمارے پیٹ میں ہے تو جو کچھ بچ رہا تھا اسے بھی یہ کہہ کر لے گئے بس یہ آخری

پیشی ہے انشاء اللہ فیصلہ ہمارے حق میں ہوگا۔ اور اس کے بعد سے انہوں نے اپنی صورت نہیں دکھائی۔ اگر بی گل بانو نہ ہوتیں تو سبیلہ پیدا ہوتے ہی مرجاتیں۔ وہ دن بڑی تکلیفوں کے تھے۔ بی گل بانو خدا معلوم کہاں سے پیسے لے آتیں اور ہم دو وقت کی روٹی کھا لیتے۔ اگر اس وقت وہ روٹی پیٹ میں نہ جاتی تو سبیلہ کو دودھ پلانا بھی مشکل ہو جاتا۔ میں نے جیسے تیسے سبیلہ کو بڑا کیا اور اسے بی گل بانو کے حوالے کر کے پھر سے مجرے کرنے لگی۔ آواز میں ابھی دم تھا اور چہرے کی رونق گئی نہیں تھی اس لیے مجرے ملنے میں پریشانی نہیں ہوئی۔ پیسہ جوڑنے کی فکر میں میں زیادہ سے زیادہ مجرے کرنے لگی اور شہر سے باہر بھی جانے لگی۔ کچھ ہی دنوں میں تکلیف کے دن ختم ہونے لگے۔ میں نے اور بی گل بانو نے نئے سرے سے گریہ جوتی شروع کی۔ بہت ساز یور خریدا۔ جس مکان میں کرائے پر رہتی تھی اسے خرید لیا۔ سونے چاندی کی صورت میں جو تحفے مجروں میں ملے تھے انہیں امانت داروں کے پاس رکھوا دیا اور بہت سا پیسہ سبیلہ کے نام بنک میں جمع کرادیا۔ تم جس وقت چوک والے مکان میں آئے تھے اس وقت سبیلہ اتنی ہی بڑی تھی جتنے بڑے اُس وقت تم تھے۔“

پورا قصہ سنا کر شمیمہ خانم نے ایک لمبی سانس لی۔ پھر کہا:

”تو یہ ہے ہمارے دل میں چھید ہونے کی کہانی۔“

میں کچھ دیر چپ رہا۔ پھر پوچھا:

”اُن مرد خوش صفات کا نام کیا تھا؟“

”حیدر حسین خاں۔“

”آپ نے انہیں ڈھونڈا نہیں۔“

”جس جگہ اپنی حویلی بتائی تھی وہاں گئی تو ایک سوکھا تالاب نکلا۔“

”کسی سے ان حیدر حسین خاں کے بزرگوں کے بارے میں نہیں پوچھا؟“

”پوچھا۔ جاننے والوں نے بتایا اعتبار الدولہ عطا حسین خاں کی نسل میں کوئی شخص اس

نام کا نہیں ہے۔“

”تو نکاح نامے پر نام بھی صحیح نہیں ہے۔“

”میں اتنا جانتی ہوں، اُس پر جو نام ہے سبیلہ اسی نام والے شخص کی بیٹی ہے۔“

یہ کہہ کر شمیلہ خانم دم روک کر یوں بیٹھ گئیں جیسے اس سے آگے کچھ نہ کہنا چاہتی ہوں۔
”پانی پیئیں گی۔“ میں نے ان سے پوچھا۔

”پیوں گی۔ سبیلہ کو آواز دے کر منگا لو۔“ انہوں نے ساری کے آنچل سے ماتھے پر
آئے ہوئے پسینے کو پونچھتے ہوئے کہا۔

میں نے سبیلہ سے پانی لانے کے لیے کہا۔ وہ پانی لے کر آئیں تو انہوں نے مجھے اسی
طرح دیکھا جیسے دودن پہلے دیکھا تھا۔ مطلب یہ کہ آج بھی آپ نے اماں کو تھکا دیا۔

”آپ باتیں کرتی ہیں تو کرتی چلی جاتی ہیں۔“ سبیلہ نے اپنی ماں کو پانی کا گلاس دیتے
ہوئے کہا۔

”کیا کروں ان کے پوچھنے پر سب یاد آنے لگتا ہے، میں بتاتی چلی جاتی ہوں، اچھا ہے
بھولی ہوئی باتیں دہرانے میں کچھ نئی باتیں بھی یاد آ جاتی ہیں۔“

”اچھا اب آرام کیجیے۔ کچھ دیر بعد ہم کھانا کھائیں گے۔“ جب شمیلہ خانم اپنے کمرے
میں چلی گئیں تو سبیلہ مجھ سے بولیں: ”کم کم پوچھا کیجیے۔ باتیں وہ سب بتائیں گی۔ سب کچھ
ان کے حافظے میں اس طرح ہے جیسے کل ہی ہوا ہو۔“ پھر بولیں: ”یادوں کے اسی خزانے میں
وہ خوش ہیں۔ اماں کہتی تھیں، اماں بتاتی تھیں، اماں جب چوٹیوں میں آ کر رہیں، جب انہوں
نے یہ مکان کرائے پر لیا، جب شیش محل والا مجرا کیا..... مجھے لگتا ہے.....“ یہ کہہ کر وہ رکیں۔
”کیا لگتا ہے؟“

”جیسے نانی نے اپنی کہانی مرزا رسوا کو سنائی تھی ویسے ہی اماں آپ کو اپنی پوری کہانی
سنائیں گی۔ اور آپ.....“
”اور میں؟“

”مرزا صاحب کی طرح اس کہانی کو لکھیں گے اور وہ..... اس وقت چھپے گی جب اماں
اس دنیا میں نہیں ہوں گی۔“

”میں نے لکھنا شروع کر دیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”نانی کا قصہ تو گھٹ بڑھ کر وہی ہوگا جو
مرزا صاحب کے دوسرے مسودے میں ہے۔ لیکن اُس میں یہ ضرور لکھوں گا کہ یہ ہاتھ کیسے
لگا۔“ یہ کہہ کر انہیں بتایا: ”اور اس کے بعد آپ کی ماں کا قصہ لکھوں گا جو آپ پر آ کر ختم ہوگا۔“

”اس کا مطلب ہم قصوں میں زندہ رہیں گے۔“
”جی۔ اور آپ لوگوں کی وجہ سے یہ قصے بھی زندہ رہیں گے۔“

یہ سن کر سبیلہ کچھ دیر چپ رہیں پھر پوچھا:
”آپ نے ہینگا اور کتو کے بارے میں پتہ لگایا۔“
”ابھی نہیں۔“

”پتہ لگائیے۔ محرم قریب آ رہا ہے۔“ سبیلہ نے کہا۔ ”میں تصویریں بنانے اور انہیں فروخت کرنے کا کام شروع کروں۔ پیسے ہمارے ہاتھ میں نہیں آئے تو امام باڑہ ہمارا سونا رہے گا۔“ پھر بولیں: ”یا آپ خود معلوم کیجیے کن دکانوں پر یہ تصویریں لی جاتی ہیں۔ میں نے سنا ہے کچھ دکاندار خود بتاتے ہیں ایسی بنائیے، ایسی زیادہ بکیں گی۔ کچھ اندازہ مل جائے تو ویسی ہی بناؤں۔“ یہ کہہ کر بولیں:

”ہینگا اور کتو سے تو مجھے یوں بھی ملنا ہے، بہت سی باتیں کرنا ہیں۔“
”کل نکلوں گا۔ ان لوگوں کے کچھ عزیز نادان محل والی سڑک پر رہتے ہیں۔ وہاں جا کر معلوم کروں گا۔“ میں نے کہا۔ ”میں اُدھر نکلتا ہوں ان لوگوں کو ڈھونڈنے آپ میرے کام پر نکلے۔ جن مکانوں میں آپ نے بتایا تھا، کرائے کے لیے جگہیں خالی ہیں ان کے مالکوں سے مل لیجیے۔“

”کل نکلوں گی۔ اب یہ بتائیے اماں سے کیا باتیں ہوئیں۔“ سبیلہ نے پوچھا۔

”وہی جو ابھی تک آپ کو بھی نہیں معلوم۔“

”آپ نے ان سے پوچھنا شروع کیا؟“

”نہیں... بات کچھ اس طرح شروع ہوئی کہ مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی وہ خود

ہی بتاتی چلی گئیں۔“

”کیسے؟“

”کل آپ درگاہ گئی تھیں، اسی کے بارے میں بتا کر بولیں:“ سبیلہ وہاں سے بہت خوش خوش لوٹیں۔ ایسا لگ رہا تھا جو مانگا ہو مل گیا ہو۔ میں نے کہا آپ کی صحت اور آپ کی سلامتی کی دعا مانگی ہوگی۔ بس اسی کے بعد انہوں نے اپنے دل میں چھید ہونے کا پورا قصہ

بتاؤ والا۔“ یہ کہہ کر میں نے حیدر حسین خاں کے فریب اور ان کی بے وفائی کی پوری کہانی سبیلہ کو بتائی۔ ساری باتیں سن کر وہ سر جھکائے بہت دیر تک خاموش بیٹھی رہیں۔ پھر آہستہ آہستہ نظریں اٹھا کر میری طرف یوں دیکھا جیسے اپنے آپ کو گناہگار سمجھ رہی ہوں۔

”ایسا تو بہت سوں کے ساتھ ہوا ہے۔ بہت سی عورتیں ہیں جو نکاح نامے لیے اپنے بچوں کے باپ ڈھونڈتی پھر رہی ہیں۔“ میں نے کہا۔ پھر سبیلہ کو بتایا: ”اپنی ماں کو میں نے کسی سے کہتے سنا تھا.....“

”کیا کہتے سنا تھا؟“

”یہی کہ بہت سے کم اصولوں کا یہی پیشہ تھا۔“

”کیا؟“

”مالدار عورتوں کو ڈھونڈنا اور.....“

”اور؟“

”انہیں اپنے نکاح میں لا کر ان کا مال لے کر چسپت ہو جانا۔ اس کے لیے وہ طرح طرح کی حکمتیں کرتے تھے۔“ میں نے سبیلہ کو بتایا۔ ”جعلی شجرہ بنا کر خود کو نواب زادہ بتاتے، شریفوں کا لباس پہن کر رئیس زادیوں کے گھر پہنچتے، انہیں اچھی اچھی باتوں سے شیشے میں اتارتے، نکاح پڑھواتے پھر بہانے بنا کر انہیں کے گھر رہ پڑتے اور دھیرے دھیرے ان کا سارا مال ہڑپ لیتے۔“ یہ بتا کر میں نے سبیلہ سے کہا۔ ”جن شریف زادیوں کو ان جعلی سازوں نے اپنے جال میں پھنسایا ان میں ایک آپ کی ماں بھی تھیں۔“

میرے یہ کہنے پر سبیلہ نے تیوریاں بدل کر مجھے دیکھا گویا کہنا چاہ رہی ہوں مذاق اڑا رہے ہیں ہمارا۔

”شریف زادی ہی تو ہیں آپ کی ماں۔ نانی آپ کی نسب کی پکی تھیں۔ کئی نسلوں تک کوئی ملاوٹ نہیں تھی۔“ میں نے کہا: ”اصل میں شہر میں ہمارے۔ کیا سب.....“

میں کہتے کہتے رکا۔

”آگے کہیے۔“

”کیا سب سفلوں نے، بدنام ہوئے نسب والے۔“

بتا ڈالا۔“ یہ کہہ کر میں نے حیدر حسین خاں کے فریب اور ان کی بے وفائی کی پوری کہانی سبیلہ کو بتائی۔ ساری باتیں سن کر وہ سر جھکائے بہت دیر تک خاموش بیٹھی رہیں۔ پھر آہستہ آہستہ نظریں اٹھا کر میری طرف یوں دیکھا جیسے اپنے آپ کو گناہگار سمجھ رہی ہوں۔

”ایسا تو بہت سوں کے ساتھ ہوا ہے۔ بہت سی عورتیں ہیں جو نکاح نامے لیے اپنے بچوں کے باپ ڈھونڈتی پھر رہی ہیں۔“ میں نے کہا۔ پھر سبیلہ کو بتایا: ”اپنی ماں کو میں نے کسی سے کہتے سنا تھا.....“

”کیا کہتے سنا تھا؟“

”یہی کہ بہت سے کم اصلوں کا یہی پیشہ تھا۔“

”کیا؟“

”مالدار عورتوں کو ڈھونڈنا اور.....“

”اور؟“

”انہیں اپنے نکاح میں لا کر ان کا مال لے کر چمپت ہو جانا۔ اس کے لیے وہ طرح طرح کی حکمتیں کرتے تھے۔“ میں نے سبیلہ کو بتایا۔ ”جعلی شجرہ بنا کر خود کو نواب زادہ بتاتے، شریفوں کا لباس پہن کر رئیس زادیوں کے گھر پہنچتے، انہیں اچھی باتوں سے شیشے میں اتارتے، نکاح پڑھواتے پھر بہانے بنا کر انہیں کے گھر رہ پڑتے اور دھیرے دھیرے ان کا سارا مال ہڑپ لیتے۔“ یہ بتا کر میں نے سبیلہ سے کہا۔ ”جن شریف زادیوں کو ان جعلی سازوں نے اپنے جال میں پھنسایا ان میں ایک آپ کی ماں بھی تھیں۔“

میرے یہ کہنے پر سبیلہ نے تیوریاں بدل کر مجھے دیکھا گویا کہنا چاہ رہی ہوں مذاق اڑا رہے ہیں ہمارا۔

”شریف زادی ہی تو ہیں آپ کی ماں۔ نانی آپ کی نسب کی پکی تھیں۔ کئی نسلوں تک کوئی ملاوٹ نہیں تھی۔“ میں نے کہا: ”اصل میں شہر میں ہمارے۔ کیا سب.....“

میں کہتے کہتے رکا۔

”آگے کہیے۔“

”کیا سب سفلوں نے، بدنام ہوئے نسب والے۔“

یہ سن کر سبیلہ نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا:
 ”آپ ہمارے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔“ اس جملے میں ’آپ‘ پر زیادہ زور تھا۔
 ”یہی کہ آپ آفتاب الدولہ نواب خورشید بہادر کے پوتے نواب علی نقی بہادر کی پر نواسی
 ہیں۔ رگوں میں اسی خون کی وجہ سے آپ کی طینت میں کوئی فرق نہیں آیا۔“
 یہ سن کر سبیلہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔
 ”اب دسترخوان بچھایا جائے۔“ وہ بولیں۔
 ”نہیں آج میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ یہاں سے نادان محل جاؤں گا۔ وہاں جا کر دیکھوں
 ہینگا اور کتو کے بارے میں کیا معلوم ہوتا ہے۔“
 ”کھانا پک چکا ہے، بس دسترخوان پر لگانا ہے۔“
 ”نہیں آج رہنے دیجیے، آج بھوک نہیں ہے۔“
 ”اچھا تھوڑی دیر بیٹھیے۔“ یہ کہہ کر سبیلہ اندر گئیں اور کچھ دیر بعد ایک گلاس نیبو کا شربت
 جس میں بہت سی برف پڑی ہوئی تھی، لے کر آئیں اور مجھے دیتے ہوئے بولیں:
 ”باہر دھوپ بہت تیز ہے، اسے پی کر نکلیے۔“
 میں نے وہ شربت پیا اور وہاں سے نکل آیا۔

○

نادان محل پہنچ کر جب میں نے زینہ چڑھ کر سردار جہاں کے عزیزوں والے مکان پر دستک
 دی تو ایک ادھیڑ عمر خاتون نے دروازے سے ذرا سا سر نکال کر مجھے سر سے پیر تک دیکھا پھر کہا:
 ”کہیے؟“

”میں آپ کے چڑیا بازار والے گھر میں آتا جاتا رہا ہوں۔ وہاں سردار جہاں صاحبہ کی
 دو بھانجیاں رہتی تھیں، ہینگا اور کتو.....“
 ”اُن لوگوں نے وہ مکان چھوڑ دیا ہے۔“

”جانتا ہوں۔ پوچھنے آیا ہوں اب وہ لوگ کہاں رہتے ہیں۔“
 ”کسی کو بتا کر نہیں گئے۔ اڑتے پڑتے سنا ہے امین آباد کے آگے نیا گاؤں میں رہے
 ہیں جا کر۔“ یہ کہہ کر بولیں: ”کوئی کہہ رہا تھا تالاب گنگنی شوکل میں جہاں فرخندہ محل کا امام باڑہ

ہے وہاں کسی نے رہنے کی جگہ دی ہے۔ ٹھیک سے کسی کو نہیں معلوم۔“ پھر دروازہ بند کرتے ہوئے بولیں: ”اُسی طرف جا کر معلوم کیجیے۔“

میں نے سوچا یہ گھسیاری منڈی سے ملے ہوئے علاقے ہیں۔ کل سہ پہر بعد میں وہاں جا کر معلوم کروں گا اور مغرب بعد اسی بہانے حکیم احمد رضا سے بھی مل لوں گا۔

○

دوسرے دن سہ پہر ہوتے ہی میں امین آباد ہوتا ہوا نیا گاؤں پہنچا۔ وہاں بہت سی دکانوں پر جا کر اور بہت سے مکانوں پر دستک دے کر میں نے ہینگا اور کتو کے نام اور اُن کی شبائیں بتا کر پوچھا: ”ایسی دو عورتیں آئی ہیں یہاں کہیں رہنے کو۔“ لیکن کسی سے ان کے یہاں آ کر رہنے کی اطلاع نہیں ملی۔ میں نیا گاؤں کے اندر ہی اندر ایک۔ دو گلیاں پار کر کے تالاب گنگنی شوکل کی طرف نکل آیا اور فرخندہ نخل کے امام باڑے کے آس پاس کے لوگوں سے وہی پوچھا جو نیا گاؤں کے لوگوں سے پوچھا تھا۔ لیکن اس طرف کے حصے میں اُن کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں معلوم تھا۔ بہت دیر بعد امام باڑے کی پشت پر بنے ایک حویلی نما مکان کے بہت بڑے احاطے میں رہنے والوں میں سے ایک شخص نے اُن دونوں کے بارے میں پوچھنے پر مجھ سے پوچھا:

”وہ جو گڑیاں اور تعزیے بناتی ہیں؟“

”جی۔“

”یہیں رہتی ہیں۔ وہ جہاں ٹاٹ کے پردے پڑے ہیں وہی والی کوٹھری ہے ان کی۔“ اس شخص نے احاطے میں بنی ہوئی بہت سی کوٹھریوں میں سے ایک کوٹھری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ٹاٹ کے اُن پردوں کے قریب پہنچ کر میری سمجھ میں نہیں آیا میں کس طرح پکاروں۔ میں کھڑا یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک سن رسیدہ بی بی جو جگہ جگہ سے پھٹا ہوا برقع پہنے تھیں میرے قریب آ کر بولیں:

”کسے ڈھونڈ رہے ہیں؟“

”چڑیا بازار، نخاس سے دو عورتیں آ کر رہی ہیں یہاں.....“

”ہینگا اور کتو؟“

”جی۔“

”بلائے دیتی ہوں۔ کچھ ہی دن تو ہوئے ہیں ان کو یہاں آئے ہوئے۔“
تھوڑی دیر بعد کتوسر پر چادر ڈالے باہر آئیں اور مجھے دیکھتے ہی بڑی حیرت سے بولیں:
”آپ.....!“ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں ان کے دروازے پر موجود ہوں۔ انہوں
نے وہیں کھڑے کھڑے پکارا: ”باجی: دیکھئے کون آیا ہے۔“

ان کے یہ کہتے ہی ہینگا بھی ٹاٹ کے پردے سے باہر نکل آئیں۔ وہ دونوں مجھے دیکھ
کر خوش بھی تھیں اور پریشان بھی۔ پریشان اس لیے کہ میں نے انہیں سردار جہاں کے ٹھاٹھ
باٹھ والے ٹھکانے پر دیکھا تھا، اب یہاں ایک چھوٹی سی کوٹھری میں دیکھ رہا تھا۔ ان کی
مشکل یہ بھی تھی وہ مجھے بٹھائیں کہاں پر کوٹھری کے باہر والی جگہ جو ٹاٹ کے پردوں سے
گھری تھی اس میں وہی چوکیاں اپنے اُسی سامان کے ساتھ رکھی تھیں جیسے چڑیا بازار والے
گھر میں رکھی رہتی تھیں۔ دونوں نے جلدی جلدی چوکیوں پر سے وہ سامان ہٹایا اور اُن پر
ایک میلی سی چادر بچھا کر مجھے اُسی پر بٹھا دیا۔

”آپ ہم سے ملنے آئے بہت اچھا لگا لیکن یہ بتائیے آپ یہاں پہنچے کیسے۔“ ہینگا نے پوچھا۔
”ڈھونڈتے ڈھونڈتے۔ پہلے نادان محل آپ کے عزیزوں والے مکان پر گیا۔ وہاں
سے معلوم ہوا آپ لوگ اس طرف آئے ہیں رہنے۔ یہاں پہلے نیا گاؤں میں لوگوں سے
معلوم کیا پھر اس طرف آ کر امام باڑے کے اہلو پہلورہنے والوں سے پوچھا، پھر امام باڑے
کی پشت پر آیا۔ قسمت اچھی تھی آپ تک پہنچ گیا۔“ یہ کہہ کر میں نے ہینگا سے پوچھا:
”آخر اتنی دور کیوں چلے آئے آپ لوگ؟“
”ہم اس طرف نہیں رہنا چاہتے تھے۔“
”کیوں؟“

”جنہوں نے ہمیں نکالا تھا، اُس طرف رہتے تو ان کا سامنا ضرور ہوتا۔“ ہینگا نے کہا۔
”یہاں سکون سے ہیں۔ اُس طرف کے لوگ ادھر مشکل ہی سے آتے ہیں۔“ یہ کہہ کر انہوں
نے کتوسر سے چائے بنانے کے لیے کہا۔ پھر قریب ہی رکھی ہوئی لائین اٹھا کر ایک پرانے
کپڑے سے اس کی چمنی صاف کرنے لگیں۔

”شام ہونے والی ہے روشنی کا انتظام کر لیا جائے۔“ انہوں نے کہا۔ پھر صاف کی ہوئی چنی لالین میں لگا کر اس کی بتی کو اوپر نیچے کر کے اسے ایسی جگہ پر ٹھہرایا کہ جلنے کے بعد اس کے اندر سے تیز روشنی نکل سکے۔ اتنی دیر میں کتو کو ٹھہری کے اندر سے چائے بنا کر لے آئیں۔

”بہت دن بعد مل رہے ہیں ہم لوگ۔“ انہوں نے مجھے چائے دیتے ہوئے کہا۔ پھر بولیں: ”مکان چھوڑتے وقت ہم نے جو خط آپ کے لیے لکھا تھا..... اس میں لکھا تھا شہر بہت چھوٹا ہے کہیں نہ کہیں پھر ملیں گے اور دیکھیے مل گئے۔“ پھر مجھ سے پوچھا:

”یہ بتائیے جن کی تصویر آپ نے بنوائی تھی انہیں وہ کیسی لگی؟“ یہ پوچھ کر پوچھا:

”ایسی کوئی صاحبہ تھیں یا.....“

کتو کے یہ پوچھنے پر میں خاموش رہا۔ انہوں نے پھر پوچھا:

”بتائیے، تھیں؟“

”تھیں، لیکن اب نہیں رہیں۔“

یہ سن کر دونوں نے مجھے افسوس بھری نگاہوں سے دیکھا۔ بہت دیر تک ہم تینوں ایک دوسرے سے کچھ نہیں بولے۔ پھر میں نے شہبا کے نور باڑی والے مکان میں رہنے سے لے کر ہسپتال میں بھرتی ہونے اور کر بلا دیانت الدولہ کے ایک حجرے میں اُس کے آخری سانس لینے تک کے سارے واقعات ان لوگوں کو بتائے۔ دونوں مجھے دیر تک دکھ بھری نگاہوں سے دیکھتی رہیں پھر ہینگا نے بہت آہستہ سے مجھ سے پوچھا:

”شمیلہ خانم جن کے بارے میں رتو آ پا سے پوچھ کر میں نے آپ کو بتایا تھا، ان کا کچھ پتہ چلا۔“

”چل گیا۔ یہاں آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔“ میں نے کہا۔ پھر انہیں شمیلہ خانم اور ان کی بیٹی سبیلہ کے بارے میں تفصیل سے بتایا اور یہ بھی بتایا کہ ہسپتال میں سبیلہ نے کس طرح جی لگا کر شہبا کی تیمارداری کی۔ یہ سب بتانے کے بعد ان سے کہا:

”سبیلہ آپ لوگوں سے ملنا چاہتی ہیں۔ کہیے تو میں انہیں یہاں لے آؤں۔“

”نہیں یہاں نہ لائیے۔ اس چھوٹی سی کوٹھری میں ہم انہیں کہاں بٹھائیں گے۔ ان کا مکان تو بہت بڑا ہوگا۔“

”نہیں بہت بڑا تو نہیں لیکن دو آدمیوں کے رہنے کے لیے بہت ہے۔“

”آپ پتہ بتا دیجیے۔ کسی دن ہمیں چلے جائیں گے اُس طرف۔“

”ایک بات یہ پوچھنا تھی آپ سے.....“ میں کہتے کہتے رکا۔

”کیا پوچھنا تھی؟“

”یہ تصویریں جو کتبہ بناتی ہیں، کن دکانوں پر لے جاتی ہیں۔“

”وہیں چوک میں کئی دکانیں ہیں، انہیں پر۔ لیکن اب تو.....“

”رک کیوں گئیں بتائیے۔“

”ذرا ٹھہریے اندھیرا ہونے لگا ہے۔ لائٹیں روشن کر لوں۔“ یہ کہہ کر ہینگا نے لائٹیں روشن

کی اور جب اس کے اندر سے اتنی ہی روشنی نکلی جتنی آس پاس کے لیے چاہیے تھی تو میں نے سوچا کچھ دیر پہلے انہوں نے اس کی بتی کو بالکل صحیح جگہ پر ٹھہرایا تھا۔ لائٹیں روشن کرنے کے بعد انہوں نے کہنا شروع کیا:

”اصل میں اُس مکان سے نکلے تو بہت دن تک ڈھنگ کی جگہ نہیں ملی۔ سامان، جہاں

رہتے تھے وہیں نیچے کی ایک دکان میں پیچھے کی طرف رکھوا دیا۔ کچھ دن اسی مکان کی پشت پر

چپ تعزیے والے اچھو نواب کی خالی پڑی ہوئی زمین پر چاروں طرف چادریں تان کر رہے۔

جب ان کی زمین بک گئی تو مغل صاحبہ کے امام باڑے میں وہ جو درگاہ کے سامنے وزیر باغ

والے راستے میں۔ یہ وہاں ایک جانے والی رہتی تھیں، انہوں نے اپنے حجرے میں رہنے کی

جگہ دے دی۔ تو آج یہاں کل وہاں والی زندگی میں کام کیا بناتے۔ جو پیسے پہلے۔ سے جمع تھے،

انہیں سے کام چلاتے رہے۔“ ہینگا بتاتی رہیں۔ ”جب یہاں آ کر کام شروع کیا تو لگی لگائی

دکانیں چھوٹ گئیں۔ دکاندار وہی چیزیں دوسروں سے لینے لگے۔ اب یہاں امین آباد میں

کچھ دکانوں پر نمونے دکھائے ہیں، دیکھئے کب انہیں پسند آتے ہیں۔“

یہ کہہ کر بولیں: ”شکر ہے محرم قریب ہے۔ تعزیے بنانا شروع کر دیے ہیں۔ انہیں کے

ہدیے سے کچھ کام چلے گا۔“ پھر مجھ سے پوچھا:

”لیکن یہ آپ نے پوچھا کیوں؟“

”سبیلہ نے کہا تھا آپ لوگوں سے پوچھ لوں۔“

”کیوں؟“

”آپ کی بہن کی طرح وہ بھی بہت اچھی تصویریں بناتی ہیں۔ ماں بیٹی اس وقت بہت تنگی میں ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ چاہتی ہیں ان کی تصویریں بازار میں نکل جائیں تو ان کا کچھ بھلا ہو جائے۔“

”ان سے کہیے گا جب ہم آئیں گے تو انہیں اپنے ساتھ ان دکانوں پر لے جا کر، جہاں یہ چیزیں لی جاتی ہیں، بات کرادیں گے۔“

”کہہ دوں گا، یہ بتائیے جس مکان سے آپ نکلیں وہ آپ کی رنجو آپا کے پاس ہے یا بک گیا۔“

”جب تک ہم اس کی پشت والی زمین پر تھے، اس وقت تک تو نہیں بکا تھا۔ لیکن گاہک آنا شروع ہو گئے تھے۔“ ہینگا نے کہا۔ ”جب سے اس طرف آئے، اُس طرف کیا ہوا کچھ نہیں معلوم۔“

”اُس مکان پر اپنا حق نہیں جتایا آپ نے۔“

”بتا چکے ہیں آپ سے، سردار جہاں ہماری سگی خالہ نہیں تھیں۔“

”ہو سکتا ہے کہیں سے آپ کا بھی کچھ حصہ نکلتا ہو۔“

”بکرا ایک سینک سے تو لڑ نہیں سکتا۔ کچھ اور لوگ کھڑے ہوتے ہمارے ساتھ تو ہم آگے بڑھتے۔“ ہینگا بولیں۔ ”پھر رنجو آپا رجوڑے والی، ہم کچھ بولتے بھی تو سنتا کون۔“ پھر کہا:

”یہ باتیں اور کبھی۔ یہ بتائیے خالہ، سبیلہ بہن کی ماں کیسی ہیں؟“

”اچھی ہیں لیکن.....“

”لیکن.....“

”دل میں چھید ہے، بہت دن زندہ نہیں رہیں گی۔“

”افسوس ہوا۔ سب اسی طرح گئے۔ دق، دمہ، دل کی بیماری۔“ ہینگا نے کہا۔ پھر بولیں:

”کیا خیال ہے آپ کا جو لوگ خاص طرح کے دکھ اٹھاتے ہیں ان سب کی جان اُنہیں امراض میں جاتی ہے۔“

”دیکھنے میں یہی آیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”شہبا، ان کی ماں بہا خانم، آپ کی خالہ،

جہاندار بیگم اور ان کی ماں..... سب کی موت انہیں بیماریوں میں ہوئی۔ اور اب شمیمہ خانم.....
 ”اللہ انہیں سلامت رکھے۔“ ہینگا نے کہا۔ ”شمیلہ بہن سے کہیے گا ہم اگلی اتوار کو آئیں
 گے۔ پتہ صحیح بتا دیجیے۔“

میں نے ہینگا کو شمیمہ کے گھر کا پتہ بتایا پھر اُن سے چلنے کی اجازت لی۔ اسی وقت انہوں
 نے مجھ سے کہا: ”ارے ہاں کل خالہ کے دیسے کی مجلس ہے۔“
 ”ایک سال ہو گیا انہیں مرے ہوئے؟“

”وقت بہت تیزی سے گزرتا ہے۔ جہاں ہم رہتے تھے کل وہاں، کسی نے بتایا رنجو آپا
 نے بہت بڑی مجلس کی۔ تبرک بھی شاندار تقسیم ہوا۔“

”اس کا مطلب وہ مکان ابھی نہیں بکا۔“ میں نے کہا۔ پھر پوچھا:

”آپ لوگ گئے تھے مجلس میں؟“

”نہیں ہمیں نہیں بلایا۔ اور شاید شمیمہ خانم کو بھی نہیں بلایا سوز پڑھنے۔“

”نہیں بلایا۔“ میں نے کہا۔ ”بلاتیں بھی تو وہ پڑھ کہاں پاتیں۔ سینے میں دم نہیں ہے۔“

زیادہ بات کرتی ہیں تو سانس پھولنے لگتی ہے۔“ پھر پوچھا:

”تو کہاں ہے آپ والی مجلس۔“

”ممتاز الدولہ کی مسجد میں۔ یہاں سے تھوڑی دور پر بائیں ہاتھ کو ایک گلی جاتی ہے وہ

اُسی مسجد پر ختم ہوتی ہے۔“

”سمجھ گیا۔ ایک آدھ بار گیا ہوں وہاں۔“

”ہم تو لوگوں سے کہہ نہیں سکتے تھے۔ نئے نئے آئے ہیں یہاں۔ مسجد کے سامنے ایک

گھر ہے۔ بہت اچھے لوگ رہتے ہیں اس میں۔“ ہینگا نے کہا۔ ”ہم نے اُن سے کہا تو انہوں

نے سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔“

”کون لوگ ہیں؟“

”رضوی لکھتے ہیں اپنے نام کے آگے۔ وہ تو تبرک کے پیسے بھی نہیں لے رہے تھے۔“ ہینگا

نے کہا۔ ”ہم نے کہا کسی اور کے تبرک سے مجلس قبول نہیں ہوگی تب مانے۔ تو آئیے گا ضرور۔“

”ضرور آؤں گا۔“

اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ کتو نے لالٹین اٹھائی اور اس کی روشنی میں دونوں بہنیں مجھے احاطے کے دروازے تک چھوڑنے آئیں۔ دروازے سے نکلتے وقت میں نے ان لوگوں سے کہا: ”اگلی اتوار کو میں بھی رہوں گا وہاں۔“ یہ کہہ کر جب میں نے ان دونوں کی طرف دیکھا تو لالٹین کی روشنی میں ان کے چہروں کی چمک صاف نظر آ رہی تھی۔

○

مجھے اس احاطے سے جہاں ہنگار بنے آئی تھیں، نکلتے نکلتے رات ہو چکی تھی۔ میں نے سوچا اب حکیم صاحب کے مطب پر مریض بہت کم رہ گئے ہوں گے۔ تھوڑی دیر میں انہیں فرصت مل جائے گی اور میں ان کے پاس بیٹھ کر انہیں اتنے دن کی بہت سی باتیں بتاؤں گا۔ میں فرخندہ محل کے امام باڑے سے نئے گاؤں کی طرف آیا اور جب حکیم احمد رضا کے مطب پہنچا تو وہاں واقعی بہت کم مریض نظر آئے۔ مریضوں کے نام پکارنے والے شخص نے مجھے دیکھتے ہی کہا: ”اب کے بہت دن بعد آئے۔“

”فرصت نہیں ملی۔“

”حکیم صاحب نے کئی بار ہم لوگوں سے کہا۔ پتہ نہیں کہاں ہیں، بہت دن ہو گئے انہیں آئے ہوئے۔“ یہ بتا کر اس نے پوچھا:

”ان بی بی کا پتہ چلا جو حویلی چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔“

میں چپ رہا۔

”حکیم صاحب ان کے لیے بہت پریشان تھے۔ کہتے تھے وہ بی بی..... ان کی زندگی اب خدا کے ہاتھ میں ہے۔“ اس نے کہا۔ پھر پوچھا: ”بی بی ٹھیک ہوئیں۔“

میں نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔

”حکیم صاحب یہ بھی کہتے تھے خدا نخواستہ ان کو کچھ ہو گیا تو یہ صاحبزادے.....“

”یہ صاحبزادے..... آگے کہیے۔ آگے کیا کہا تھا۔“

”سنجھل نہیں پائیں گے۔“ یہ کہہ کر اس نے مجھ سے کہا:

”دیکھیے آخری مریض اندر جا چکا ہے۔ میں حکیم صاحب کو بتا دوں آپ آئے ہیں۔“

آخری مریض کے باہر نکلتے ہی حکیم صاحب نے مجھے اندر بلا لیا۔ مجھے دیکھتے ہی بولے:

”آئیے۔ بہت دن لگا دیے اب کی آنے میں۔“

”الجنہیں زیادہ رہیں۔“

”اچھا بتائیے۔ شہابی بی.....“

”نہیں رہیں۔ وہیں سوئی ہوئی ہیں جہاں ان کی ماں سوتی ہیں۔“ میں نے کہا۔

”انا للہ۔ کیسے ہوا یہ سب؟“

”حویلی سے نکلتے ہی طبیعت بگڑنے لگی۔ جب حالت زیادہ خراب ہوئی ہسپتال میں جا کر بھرتی ہو گئیں۔ علاج اور تیمارداری میں کوئی کمی نہیں تھی۔ لیکن ایک دن نہ جانے کیا جی میں آئی ہسپتال سے چھٹی لے کر چلی گئیں پھر اطلاع آئی کہ بلا دیانت الدولہ کے ایک حجرے میں دم توڑ دیا۔“ یہ بتا کر میں نے حکیم صاحب کو سب کچھ تفصیل سے بتایا۔ سب کچھ سننے کے بعد انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے یہ مصرعہ پڑھا:

ع کسی کو کیا ہودلوں کی شکستگی کی خبر

پھر بولے: ”صبر کیجئے۔ ہم ایسے واقعات پر صبر ہی کرتے آئے ہیں۔“ یہ کہہ کر حکیم صاحب بہت دیر تک چپ رہے پھر میرے لیے ایک گلاس پانی منگوایا۔ میں پانی پی چکا تو بولے:

”صہبا خانم کی نسل ختم ہو گئی۔“

”شمیلہ خانم بتاتی تھیں.....“ میں نے کہا۔ ”نواب قیصر شکوہ جن سے شمیلا خانم کی ماں کی منگنی ہوئی تھی، صہبا خانم انہیں کی نانیہال سے تھیں۔“

”ضرور ہوں گی۔ وقت کی ہوا میں ہمارے آپ کے ورق اڑے تو عبارتیں بدل گئیں۔“

میں نے ان کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا تو بولے:

”سیدھی سی بات ہے۔ پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ جنہیں جہاں ہونا چاہیے تھا، وقت نے انہیں وہاں نہیں رہنے دیا۔“ یہ کہہ کر حکیم صاحب نے کہا:

”اب اُن ماں بیٹی کا حال بتائیے۔“

”ٹھیک ہیں، لیکن.....“

”لیکن؟“

”شمیلہ خانم بہت دن زندہ نہیں رہیں گی۔“

”کیوں؟“

”دل میں چھید ہے اور دل میں چھید ہونے کی پوری ایک کہانی ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے حکیم صاحب کو وہ سب کچھ بتایا جو شملہ خانم نے اپنے شوہر حیدر حسین خاں کے بارے میں بتایا تھا۔

”میاں یہ لکھنؤ ہے۔ رجب علی بیگ سرور نے کہیں لکھا ہے، کہاں لکھا ہے یاد نہیں آ رہا ہے.....“

”کیا لکھا ہے۔“

”لکھنؤ میں تلیسیوں کی ایک پوری جماعت تھی۔“

”جی؟“

”یہ جو کوٹھوں پر ناچنے والیوں کی سالار تھیں جنہیں اس کا رو بار والے ناکہ کہتے ہیں..... انہوں نے.....“

حکیم صاحب رکے پھر بولے: ”کچھ مرد پال رکھے تھے جو شریف زادیوں کو شیشے میں اتارنے کا کام کرتے تھے۔“

”شریف زادیاں شیشے میں اتر کیوں جاتی تھیں۔“ میں نے حکیم صاحب کی بات پوری ہونے سے پہلے کہا۔

”میاں آپ اُن وقتوں میں نہیں تھے۔ بتانے والے بتاتے ہیں کچھ تو بیوائیں تھیں اور کچھ وہ جن کے گھر مردوں سے خالی تھے۔“ حکیم صاحب نے بتایا۔ ”زمینیں اور جاگیریں اُن کے پاس بہت تھیں۔ کوٹھے پر بیٹھی اُن بد بختوں کے پالے ہوئے مرد ایسی عورتوں کی ٹوہ میں رہتے اور جب یقین ہو جاتا کہ ہم پر شک کرنے والا ان کے یہاں کوئی نہیں ہے تو امیر زادے بن کر خریدی ہوئی مغلا نیوں سے پہلے اپنے جعلی شجرے ان تک پہنچواتے، پھر اُن کی حویلیوں میں داخل ہوتے اور انہیں اپنے دام میں پھنسا لیتے۔ اُن بھولی بھالی عورتوں کی مجبوری یہ تھی کہ انہیں ایک محافظ بھی چاہئے تھا اور ایک شوہر بھی۔ یہ ناہنجار اسی کا فائدہ اٹھاتے۔“ یہ بتا کر حکیم صاحب بولے:

”اور میاں لطف یہ کہ یہ بنے ہوئے شریف زادے اُن پتریوں کے پیٹ سے تھے جو گاؤں اور قصبوں سے آ کر یہاں بیگم اور خانم بن گئی تھیں۔“ یہ بتا کر بولے: ”تو یہ

حیدر حسین خاں بھی انہیں پُتر یوں کی نسل سے ہوں گے۔ سیدھی سادھی شمیلا خانم اُن کی باتوں میں آگئیں۔“

”میری ماں بھی ایسے بہت سے قصے سناتی تھیں۔ یہی قصے میں نے سبیلہ کو سنائے۔“

”تو انہیں یقین آیا؟“

”آگیا، لیکن.....“

”لیکن؟“

”دل میں کانٹا تو ہے ماں کے ساتھ دھوکہ ہوا۔“

”اچھا یہ بتائیے سبیلہ بی بی اب کیا کر رہی ہیں۔“

”ماں بٹی اس وقت بڑی پریشانی میں ہیں۔ جو پس انداز کیا تھا، ختم ہو رہا ہے۔“

میں نے کہا۔

”بی بی تو، آپ نے بتایا تھا، بہت پڑھی لکھی ہیں۔“

”جی۔ لیکن ان کی ماں نوکری نہیں کرنے دیتیں۔ اب انہوں نے ایک راستہ نکالا ہے۔“

”کون سا راستہ؟“

”تصویریں بنا کر بیچنے کا۔ اسی لیے میں اس طرف آیا تھا۔“

”تو مجھ سے ملنے نہیں آئے تھے۔“

”آپ سے بھی ملنے آیا تھا اور اُس کام کے لیے بھی آیا تھا۔“

”کون سا کام؟“

”اب کیا کیا قصے آپ کو سناؤں۔ سردار جہاں کی دو بھانجیاں تھیں۔“

”جی تھیں۔ نام بھی بتائے تھے آپ نے۔“

”ہنگا اور کتو۔“

”انہیں تو گھر چھوڑنا پڑا تھا۔“

”جی۔ ادھر ادھر ٹھوکریں کھا کر اب وہ دونوں اس طرف آ کر رہی ہیں۔ فرخندہ محل کے

اما مہارے کی پشت پر۔“ میں نے کہا۔ ”میں ان سے بھی ملنے آیا تھا اور آپ سے بھی۔ اب یہ

بھی بتادوں اُن سے ملنے کیوں آیا تھا۔“

”کیوں آئے تھے؟“

”ہنگا کی چھوٹی بہن کتو تصویریں اور طفرے بناتی ہیں۔ بازار میں اس کے انہیں اچھے پیسے مل جاتے ہیں۔“ میں نے بتایا۔ ”سبیلہ چاہتی ہیں کتو کی مدد سے ان کی تصویریں بھی نکل جائیں۔“ حکیم صاحب یہ سن کر رنجیدہ ہو گئے۔ کچھ دیر سر جھکائے بیٹھے رہے پھر بولے:

”آپ شمیلہ خانم سے کہیے بیٹی کو نوکری کرنے دیں۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے وقت کیسے کئے گا۔“

”سبیلہ نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا آپ اماں کو راضی کیجیے۔ لیکن میں ناں گیا۔“

”تو آپ بھی چاہتے ہیں وہ گھر میں بیٹھیں۔“

”نہیں ایسا نہیں ہے۔ آپ تو حکیم ہیں ہر چیز کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”اصل میں جب سے دل کی تکلیف بڑھی ہے شمیلہ خانم چاہتی ہیں بیٹی ہر وقت ان کی نگاہوں کے سامنے رہے۔“

”ہوں..... بات تو سمجھ میں آنے والی ہے۔“ حکیم صاحب بولے۔ پھر پوچھا:

”ناچ گانا تو انہیں آتا ہوگا؟“

”خوب۔ روز ریاض کرتی ہیں۔ سازندے تو نہیں آتے۔ طبلے پر ان کی ماں بیٹھ جاتی ہیں۔“

”تو ایک نوکری انہیں آسانی سے مل سکتی ہے۔“

”کون سی؟“

”ناچ گانا سکھانے کی۔ اب تو بہت سی جگہوں پر ایسے اسکول کھل گئے ہیں۔“

”نہیں۔ نہ وہ ناچ کر پیسہ کمائیں گی نہ ناچ سکھا کر۔“

”کیوں؟“

”کہتی ہیں جو چھوڑا سو چھوڑا۔ ایک اور بات کہتی ہیں۔“

”وہ کیا؟“

”نانی اور اماں کو ناچنے سے ملا کیا۔“

یہ سن کر حکیم صاحب چپ ہو گئے۔ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولے:

”اچھا تو ایک کام کیجیے۔ جب تک سبیلہ بی بی کا تصویروں والا کام شروع نہیں ہو جاتا.....“ حکیم صاحب یہ کہہ کر یوں رکے جیسے آگے کا جملہ کہنے میں انہیں تاثر ہو۔ پھر

بولے: ”آپ، جب بھی وہ لوگ مصیبت میں ہوں، کچھ پیسے مجھ سے لے جا کر بطور قرض انہیں دے دیجیے۔“

”نہیں وہ قرض بھی نہیں لیں گے، میں اُن ماں بیٹی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے حکیم صاحب کو بتایا:

”آپ سے پہلے میں نے بھی سبیلہ سے یہ بات کہی تھی۔“

”کیا جواب ملا؟“

”کہا کچھ نہیں، لیکن یہ بات انہیں اچھی نہیں لگی۔“

”ایک بات کہوں۔“ حکیم صاحب بولے۔

”کہیے۔“

”میں نے اپنے مریضوں سے بہت سے قصے سنے۔ نبض دیکھنے سے نسخہ لکھنے تک بہت سی باتیں ہو جاتی ہیں اُن سے۔ الگ الگ مریض الگ الگ طرح کے قصے سناتے ہیں لیکن.....“

”لیکن؟“

”جتنے قصے آپ سے سنے اتنے کسی اور سے نہیں سنے۔ اور یہ بھی دیکھیے کہ آپ ہمارے مریض نہیں ہیں اور خدا کرے کبھی ہوں بھی نہ۔“

”ایک قصہ اور ہے۔“

”وہ کون سا؟“

”تقیہ بیگم کا۔“

”کون تقیہ بیگم؟“

”کربلا ملکہ جہاں میں صبح سے شام تک قرآن پڑھتی ہیں۔ وہ جو پہلے والا روضہ ہے، اسی کی برجی میں۔“

”سمجھ گیا سمجھ گیا۔ کیا روشن چہرہ ہے اس بڑھاپے میں بھی اور آنکھ اتنی تیز کہ زمین پر سوئی پڑی ہو تو دیکھ لیں۔“

”جی۔ بغیر عینک کے پڑھتی ہیں قرآن۔“

”تو آپ کو وہیں کربلا میں ملیں یا کہیں اور۔“

”کر بلا میں۔“ میں نے کہا۔ ”گیا تھا شہبا کی قبر پر۔ جب بہت دیر تک میں اس قبر پر سے نہیں اٹھا تو وہ اُس برجی سے جہاں سے شہبا کی قبر نظر آتی تھی، اُٹھ کر میرے پاس چائے کا گلاس لے کر آئیں اور پوچھا جو اس قبر کے اندر ہے وہ تمہارا کون ہے اور جب انہیں معلوم ہوا قبر کے اندر سوئی ہوئی خاتون نواب سلطان بہادر کی بیٹی ہیں تو افسوس کیا۔ پھر بتایا ہم بھی اسی خاندان سے ہیں۔“

”جی۔ لیکن ماں کی طرف سے بھی سلسلہ شاہی تک پہنچتا ہے اسی لیے چہرے پر شاہانہ تمکنت اب بھی ہے۔ والدہ اُن کی مخدرہ عظمیٰ نواب عالم آرا بیگم کے خاندان سے تھیں۔ اب پوچھیے عالم آرا بیگم کون۔“

”بتائیے۔“

”واجد علی شاہ کی بیہتا بیوی۔ نواب علی خاں کی دختر نیک اختر۔ اب یہ پوچھیے نواب علی خاں کون؟“

”کون؟“

”سید احمد علی خاں کے بیٹے اور مدار الدولہ اول سید یوسف علی خاں کے پوتے۔ دریا پار آدھی سے زیادہ جاگیریں انہیں کی تھیں۔“

”لیکن رہتی تو وہ رستم نگر میں ہیں۔“

”یہ علاقہ ان کی دادیہال کا ہے اور علاقہ کیا اب تو بس.....“

”بہت بڑی زمین پر چھپر ڈال کر رہ رہی ہیں۔“

”کچھ دن میں وہ بھی نکل جائے گی۔“ یہ کہہ کر بتایا: ”وہ تو نہیں ان کی اولادوں میں سے ایک آدھ کبھی کبھی ادھر آنکلتی ہے جب طبیعت زیادہ خراب ہوتی ہے۔“

”دوا لینے؟“

”دوا لینے بھی اور.....“

”پیسے کوڑی کے لیے بھی۔“ میں نے کہا۔

”اب جو سمجھ لیجیے۔ کر بلا تو میں جانہیں پاتا، درگاہ جاتا ہوں تو کچھ نہ کچھ انہیں دے آتا ہوں یہ کہہ کر کہ فلاں فلاں کے نام پر اتنے پارے پڑھ دیجیے گا۔“ یہ کہہ کر بولے: ”اچھا اب

جائیے۔ ملازم مطب بند ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔“ پھر بولے:

”آجایا کیجیے کبھی کبھی۔ کیا خبر دوسروں کو زندگی دینے والا کل اس دنیا میں نہ رہے۔“ یہ بتا کر بولے: ”ایسا نہ ہو آپ بہت دن بعد آئیں اور بہت سی باتیں بتانے والے کو یہاں نہ پائیں۔“

”یہ مت کہیے۔ جنہیں آپ نے شفا دی ہے ان کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اور ابھی تو بہت کچھ بتانا ہے آپ کو۔“ میں نے کہا۔ پھر پوچھا:

”یہ بتائیے اتنا سب کچھ آپ کو معلوم کیسے ہے؟ جس کا نام لو اس کے بارے میں سب کچھ آپ یوں بتاتے ہیں جیسے بہت زمانے سے جانتے ہوں اُسے۔“

”یہ بات اس سے پہلے بھی پوچھ چکے ہیں آپ اور میں۔ نے بتایا تھا پیشہ ہمارا ایسا ہے کہ سب طرح کے اور سب طرف کے لوگ ہمارے پاس آتے ہیں۔“ یہ بتا کر بولے:

”اور حکیموں کا ایک شوق آپ کو نہیں معلوم۔“

”کتب بنی۔“

”جی۔ اور اس کتب بنی میں ہم اس کے بارے میں زیادہ پڑھتے ہیں جو گزر چکا ہے۔ اسی لیے بہت کچھ ہمارے علم میں رہتا ہے۔“ حکیم صاحب نے کہا۔ ”اب جائیے خدا سبیلہ بی بی کی ماں کو سلامت رکھے۔“

یہ کہہ کر اپنی کرسی سے اٹھ کر ملازم کو آواز دی اور جب تک وہ آئے مجھ سے کہا:

”ایک دکھ رہے گا۔“

”وہ کیا؟“

”بہت سے مریض ٹھیک کیے۔ ایسے جو کسی طرح نہیں بچ سکتے تھے۔ لیکن شملہ خانم کو شفا نہیں دے سکتا۔“

”کیوں؟“

”ان کا مرض جراحی سے ٹھیک ہوگا اور ہم جراحی کر نہیں سکتے۔“ حکیم صاحب نے کہا۔

پھر بولے: ”اور اب تو جراحی سے بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔“

”کیوں؟“

”خطرہ ہے۔ جہاں چھید ہے وہاں نشتر لگا تو سانس رک سکتی ہے۔“

”اچھا یہ بتائیے۔ دیر ہو رہی ہے آپ کو لیکن بات نکل آئی ہے تو پوچھ لوں۔“
”پوچھیے۔“

”ہینگا کہہ رہی تھیں جو لوگ خاص طرح کے دکھ اٹھاتے ہیں وہ.....“
”آگے کہیے۔“

”دق میں مرتے ہیں یاد دے میں یا پھر دل کے مرض میں۔ ایسا کیوں؟“
”نہیں سب کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا لیکن..... جو صدمے زیادہ اٹھاتے ہیں انہیں یہی
مرض آگھیرتے ہیں۔“

”وہی تو جاننا چاہتا ہوں ایسا کیوں؟“
”میں طب کی زبان میں نہیں، اس کا جواب شاعری کی زبان میں دوں گا۔“
حکیم صاحب نے کہا۔

پھر بولے: ”آتش نے کہا ہے نا..... دل سوا شیشے سے نازک..... تو جب اسے
چوٹ پہنچتی ہے تو ٹوٹنا اس کا ضروری ہے۔“ پھر کہا: ”اور یہ جو پھپھڑے ہیں تو ساری
ٹھنڈی سانسیں اسی طرف سے ہو کر آتی ہیں۔ اسی میں وہ کمزور ہو جاتے ہیں۔ سمجھے
آپ۔ اب جاییے دیر ہو رہی ہے۔“

آج اتوار کا دن تھا اور آج ہی ممتاز الدولہ کی مسجد میں سردار جہاں کے دیے کی مجلس
تھی۔ میں گھر سے نکل کر سیدھا تالاب گنگنی شوکل پہنچا اور وہاں سے ممتاز الدولہ کی مسجد۔
زینے چڑھ کر میں اوپر مسجد میں پہنچا تو دیکھا ذاکر منبر پر بیٹھ رہے تھے۔ مسجد میں محلے کے
سارے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ذاکر بڑی احتیاط سے مجلس پڑھ رہے تھے۔ سردار جہاں کی
خوبیوں کی طرف آنے میں انہیں تاثر تھا۔ ہر دو چار جملوں کے بعد وہ ایک ہی بات کہہ
رہے تھے: ”مرنے والی مولا کی چاہنے والی تھیں خدا انہیں جو ار رحمت میں جگہ دے۔“ میں
منبر کے بالکل سامنے بیٹھا سوچ رہا تھا:

”سردار جہاں اور شمیلہ خانم کی نیکیوں پر ان کے پیشے نے سیاہ پردے ڈال رکھے ہیں۔
یہ جو مجلس پڑھ رہے ہیں ان کی آنکھ اُسی پردے تک جا کر لوٹ آتی ہے، اس کے دوسری طرف

کیا ہے یہ نہیں دیکھتی۔“ ذاکر نے پوری مجلس میں سردار جہاں کی صرف ایک۔ مولا سے محبت والی خوبی کو بیان کر کے مجلس کو ختم کر دیا۔ مجلس کے بعد جب میں مسجد کے زینوں سے اترنے لگا تو تبرک تقسیم کرنے والے شخص نے مجھ سے پوچھا:

”آپ شاید اس طرف سے آئے ہیں، پرانے لکھنؤ سے۔“

”جی۔ اور آپ کی تعریف۔“

”میں سامنے والے مکان میں رہتا ہوں۔ رضوی منزل میں، فراست نام ہے میرا۔“ یہ

کہہ کر اس نے پوچھا: ”مرحومہ سے کیا تعلق تھا آپ کا۔“

”تعلق کوئی نہیں تھا۔ کچھ باتیں پوچھنے ان کے یہاں گیا تھا، اسی میں آنا جانا شروع ہو گیا۔“

”آپ انہیں بھی جانتے ہیں جنہوں نے ان کی مجلس کی ہے۔“

”اچھی طرح۔ بڑی نیک بی بیاں ہیں۔“

”دو چار دن سے لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔“

”ان بی بیوں کے بارے میں؟“

”جی۔“

”کیا بتا رہے ہیں۔“

”بتا رہے ہیں ناچ گانے سے تعلق تھا ان لوگوں کا۔“

”ان کا نہیں، جن کی مجلس ہوئی ہے ان کا تھا۔“ میں نے کہا۔ پھر کہا: ”دوسروں کی باتوں

پر مت جائے اس وقت تبرک تقسیم کیجیے۔ کبھی آؤں گا تو بتاؤں گا یہ کیا تھے، کیا ہو گئے۔“ پھر ان

سے تبرک لے کر انہیں بتایا: ”اس وقت اتنا بتا دینا کافی ہے کسی زمانے میں سب کے سب بہت

شرف والے تھے۔“

یہ کہہ کر میں مسجد کے دروازے سے باہر نکل آیا۔ اس مجلس کے بعد عورتوں کی مجلس بھی

ہونا تھی اس لئے ہینکا اور کتو سے ملے بغیر میں اپنے ٹھکانے پر لوٹ آیا۔



نجم النساء عرف امراؤ جان کے نئے اور پرانے قصے میں بہت سی بدل جانے والی باتوں

کے بارے میں اب تک مجھے بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا لیکن ابھی بہت کچھ ایسا تھا جو مجھے معلوم

کرنا تھا۔ اصل قصے کی تلاش کے دوران جو کچھ مجھے معلوم ہوتا رہا تھا اسے میں اپنی بیاضوں میں لکھتا رہا تھا۔ ایسا میں اس لیے کر رہا تھا کہ نئے اور پرانے قصے کو سامنے رکھ کر ایک نیا مسودہ تیار کر سکوں اور جو کچھ شمیلہ خانم اور دوسروں سے معلوم ہوا ہے اسے اس میں شامل کر کے اسے نجم النساء کی نو اسی پر لا کر ختم کروں۔ اس لیے دو چار دن میں نے گھر پر رہنے کا ارادہ کیا تا کہ جو کچھ بیاضوں میں اب تک لکھا ہے اسے ایک تازہ بیاض میں سلسلے سے لکھ ڈالوں۔ اس طرح اس کتاب میں سارے واقعات اسی طرح آجائیں گے جیسے وہ حقیقت میں ہوئے ہیں۔ سو میں نے انہیں گھر پر رہ کر ترتیب سے لکھنا شروع کر دیا۔ پانچ دن تک میں اسی کام میں لگا رہا، چھٹے دن میں نے سوچا کل اتوار ہے، کل شمیلہ خانم کے یہاں ہنگا اور کتو کے آنے کا دن ہے، اس لیے آج وہاں چل کر جو کچھ شمیلہ خانم سے پوچھنے کو رہ گیا ہے پوچھ لوں۔ اس پورے قصے میں ایک بہت اہم واقعہ رہ گیا تھا جسے میں نے ابھی تک شمیلہ خانم کے سامنے نہیں چھیڑا تھا اور وہ واقعہ تھا نواب سلطان کا۔ جہاندار بیگم نے مجھ سے کہا تھا یہ جو نواب سلطان ہیں، یہ خود عمو جان ہیں۔ اس لیے آج میں گھر سے یہ طے کر کے نکلا کہ آج شمیلہ خانم سے نواب سلطان کے قصے کی اصل پوچھوں گا۔ اور یہ طے کر کے اپنے ٹھکانے سے شمیلہ خانم کے گھر کی طرف چل دیا۔

شمیلہ خانم کے یہاں پہنچتے ہی سبیلہ نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے اتنے دن غائب رہنے کا سبب پوچھ رہی ہوں۔ کچھ دیر اسی طرح دیکھنے کے بعد انہوں نے پوچھا:

”کہاں رہے۔ بتا دیا کیجیے اتنے دن نہیں آئیں گے۔ ہر وقت دروازے پر دستک ہونے کا انتظار کرتی رہتی۔“

”بتاتا ہوں۔ بیٹھنے دیجیے۔“ میں بیٹھا تو وہ جلدی سے میرے لیے پانی لے آئیں۔

”پہلے پانی پیجئے۔“

پانی پینے کے بعد میں نے شمیلہ خانم کی خیریت پوچھی۔ پھر سبیلہ کو ہنگا اور کتو کا ٹھکانہ ڈھونڈنے، ان کی خالہ کی مجلس میں شریک ہونے اور حکیم صاحب سے ملنے کا پورا قصہ سنایا۔ پھر بتایا: ”جو کچھ آپ کی نانی کے بارے میں معلوم ہوتا جا رہا ہے لکھتا جا رہا ہوں۔ اسی لکھے ہوئے کو سلسلے سے لکھنے میں تین چار دن لگ گئے۔“

”تو کل وہ لوگ آ رہے ہیں۔ سبیلہ نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔“

”جی۔ دونوں۔ پتہ میں نے اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔“

اتنی دیر میں شمیلہ خانم بھی آ گئیں۔ ہنگامہ اور کتو کے آنے کی خبر سن کر اُن کا چہرہ بھی کھل اٹھا۔ کمرے میں شمیلہ خانم کے بیٹھ جانے کے بعد میں نے سبیلہ کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کہنا چاہ رہا ہوں کہ آج بھی آپ اپنے کمرے میں چلی جائیں تو میں شمیلہ خانم سے اکیلے میں کچھ باتیں کر لوں۔ سبیلہ میرے دیکھنے کا مطلب سمجھ گئیں اور پانی کا گلاس لے کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ اُن کے باہر جاتے ہی میں نے شمیلہ خانم سے کہا:

”آپ کی ماں کے بارے میں پوچھ پوچھ کر میں نے آپ کو بہت پریشان کیا۔ زیادہ پوچھتا ہوں تو سبیلہ ناراض ہونے لگتی ہے۔“

”نہیں تم پوچھو۔ میں بھی چاہتی ہوں جو کچھ مجھے معلوم ہے بتا دوں۔ قبر میں جاؤں تو جو بوجھ سینے پر ہے، ہٹا کر جاؤں۔ اور سبیلہ! وہ بھلا تم سے ناراض کیوں ہوگی۔ اٹھتے بیٹھتے تمہاری ہی باتیں کرتی ہے۔ ایک میں ہی تو ہوں اُس کی اس دنیا میں۔ میرے خیال رکھنے کو اس کی ناراضی نہ سمجھو۔“ یہ بتا کر بولیں: ”ایک بات کئی دن سے تم سے کہنا چاہ رہی ہوں۔“

”کون سی بات۔“

”تم مانو نہ مانو لیکن ہم تمہیں اپنا سمجھتے ہیں اور اسی لیے تم سے یہ بات کہہ رہے ہیں۔“

”کون سی بات؟“ میں نے دوبارہ پوچھا۔

”میرے بعد سبیلہ کو اکیلا مت چھوڑنا۔ مطلب یہ کہ اسی طرح آتے رہنا۔“ شمیلہ خانم نے کہا۔ پھر کہا: ”میرے ساتھ گل بانو نہ ہوتیں تو آج میرے ہاتھ میں کاسہ ہوتا اور میں کسی درگاہ کے سامنے بیٹھی ہوتی۔“

”ایسا نہ کہیے۔“

”نہیں میں سمجھتی ہوں اکیلے رہنا کتنا مشکل ہے۔ اس لیے وعدہ کرو کہ آتے رہو گے اسی طرح۔“ یہ کہہ کر ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں: ”نہیں معلوم کل یہ ٹھکانہ میرے پاس رہے نہ رہے کل سبیلہ جہاں بھی رہے تم وہاں جاتے رہنا۔“

”آپ ان کے لیے اتنا پریشان مت ہوں۔“

”ماں ہوں، پریشان کیوں نہ ہوں۔ تم سے یہ سب اس لیے کہہ رہی ہوں کہ میرے بعد

اگر وہ کسی سے گھلی تو وہ تم ہی ہو۔“ یہ کہہ کر بولیں: ”اُس کے دل میں بھی گھاؤ بہت ہیں۔ اپنی پوری پڑھائی میں بہت کچھ سننا پڑا اسے۔ لوگ، تم جانتے ہو سب کچھ معلوم کر لیتے ہیں۔ اس نے سب کچھ چپ چاپ سہہ لیا۔“ پھر بولیں: ”اور یہ جو میرے دل میں چھید ہے اس نے اُسے اور گھائل کر دیا ہے۔ تو وعدہ کرو.....“

”جو آپ نے کہا ہے، میں وہی کروں گا۔“

”اب پوچھو جو پوچھنا ہے۔“

”وہ نواب سلطان.....“

”یہی بات رہ گئی تھی۔ تم نہ بھی پوچھتے تو میں تمہیں بتاتی۔“

”آپ کہیں تو جہاندار بیگم نے جو بات مجھ سے کہی تھی وہ آپ سے کہوں۔“

”انہوں نے کہا تھا وہ جو عمو جان کی کتاب میں نواب سلطان ہیں وہ دراصل عمو جان ہی ہیں۔“

”صحیح کہا تھا۔ اماں کی پوری کہانی میں یہی حصہ سب سے زیادہ دکھ دینے والا ہے۔ مرزا رسوا عالم فاضل موسیقی کے ماہر، گن رسیے غضب کے۔ امیر خسرو کی طرح اپنے کچھ راگ بھی ایجاد کیے تھے۔ شاعر بھی کمال کے، صورت بہت بھلی۔ اوڑھنے پہننے کا سلیقہ تھا۔ باتیں ایسی کہ دل میں اتر جائیں۔ ہر جملے میں رعایت، روزمرہ، محاورے برجستہ، پھبتیاں ایسی کہتے کہ دھوئے دھوئے نہ چھوٹتیں۔ جوان ہوتے ہی کوٹھوں پر جانے لگے اور ناچنے والیوں کو شوقیہ سب کچھ بتانے لگے۔ خانم صاحب اس میں خوش کہ جو کام استاد سے پیسہ دے کر لیتے وہ مرزا صاحب مفت میں کر رہے ہیں۔ اماں کو دیکھتے ہی انہوں نے سمجھ لیا تھا یہ جنم سے ناچنے والی نہیں ہیں۔ چہرے کے بھولپن اور باتوں کی سادگی میں ان کو شرافت کی بونظر آ گئی تھی۔ اس لیے اُن کے پاس ان کا اٹھنا بیٹھنا زیادہ تھا۔ اب جو بات اماں نے مجھ سے نہیں چھپائی وہ میں تم سے کیوں چھپاؤں غرضیکہ جیسے مجھے حیدر حسین خاں کا آنا جانا اچھا لگنے لگا تھا ایسے ہی اماں کو بھی مرزا رسوا کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اچھا لگنے لگا۔ دھیرے دھیرے دونوں ایک دوسرے کی طرف کھنچنے لگے۔ اماں کچھ زیادہ ہی مائل ہو گئیں۔ جس دن مرزا صاحب نہ آتے اماں ٹہل ٹہل کر ان کا انتظار کرتیں۔ حرفوں کی بنی خانم قیامت کی نظر رکھتی تھیں۔ معاملے کو تاڑ لینے میں

انہیں دیر نہیں لگی۔ اشاروں اشاروں میں اماں کو سمجھایا کہ شرفاء سے دل لگانا ٹھیک نہیں اور یہ بھی کہا کہ ان بیچارے کے پلے ہنسی کیا۔ عشق کرنا ہے تو کسی نواب زادے سے کرو جو تمہاری جھولی جواہر سے بھر دے۔ لیکن وہاں تو قول و قرار ہو چکے تھے، ساتھ رہنے کی قسمیں کھائی جا چکی تھیں اور اماں نے تو مرزا صاحب سے یہاں تک کہہ دیا تھا اب میں آپ کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتی۔ لیکن.....“

”لیکن.....؟“

”جب بات کو ٹھا چھوڑ کر نکاح میں آنے کی آئی تو مرزا صاحب اماں کو چاہنے کے باوجود ڈھل مل ہو گئے۔ معاملہ آج کل پر ٹلنے لگا اور جب اماں نے کوٹھا چھوڑنے کی زیادہ ضد کی تو مرزا صاحب کئی کاٹنے لگے پھر کوٹھے پر آنا چھوڑ دیا۔ اماں نے ادھر ادھر سے ان تک پیغام پہنچوائے، کوٹھے پر نہ آنے کا سبب جاننا چاہا مگر ان کی طرف سے خاموشی رہی۔ مرزا صاحب کی بزدلی اور بے رخی سے اماں ہماری ٹوٹ گئیں اور یہی وہ زمانہ تھا جب ہمارے ابا فیض علی نے کوٹھے پر آنا جانا شروع کیا اور جب انہوں نے سچے دل سے اماں کے ساتھ رہنے کا عہد کیا تو اماں کو جو پوری طرح ٹوٹ چکی تھیں انہیں ایک سہارا نظر آیا اور وہ ابا کے ساتھ کوٹھے سے نکل آئیں۔“ یہ بتا کر شمیمہ خانم نے آگے کہنا شروع کیا:

”ادھر مرزا صاحب کو اماں سے کیا ہوا عہد پورا نہ کر پانے کی پشیمانی بہت تھی۔ اس لیے جب وہ کتاب لکھنے بیٹھے تو اپنی پشیمانی کو مٹانے کے لیے قصے میں یہ حصہ بڑھا کر اپنی جگہ نواب سلطان کو رکھ دیا۔ خود کو رکھتے تو خاندانی شرافت پر حرف آتا۔ نواب سلطان میں ساری صفیتیں وہی ہیں جو مرزا صاحب میں تھیں۔ شاعری کا شوق، شعر کا سمجھنا، بات بات میں فارسی کے فقرے استعمال کرنا۔ پھر یہ کہ مرزا صاحب ناچ گانے اور شعر و شاعری کے ساتھ ساتھ سپہ گری میں بھی کم نہ تھے۔ علی مد، بانک اور بنوٹ کے ماہر تھے۔ قصے میں انہوں نے خانصاحب کا جو حشر دکھایا سو دکھایا اماں کہتی تھیں اصلی دنیا میں بھی کوئی ان کے منہ کو آتا تو منہ کی کھاتا۔ مرزا صاحب نے چھپے ہوئے قصے میں اماں اور نواب سلطان میں جو لاگ لگاؤ والی باتیں دکھائی ہیں وہ بالکل ویسی ہی ہیں جیسی اماں نے ڈھکے چھپے مجھے بتائی تھیں۔ ویسے ایک نواب سلطان حقیقت میں تھے جو خوشی کے خاص خاص موقعوں پر اپنے یہاں مجرے کراتے تھے لیکن کوٹھے کا

منہ انہوں نے کبھی نہیں دیکھا۔ سرائے معالیٰ خاں کے آگے ان کی بہت بڑی حویلی تھی۔ انہیں نواب سلطان کے بیٹے نواب خورشید بہادر کے یہاں ایک مجرا میں نے بھی کیا۔ ”کب؟“

”شعبان کا مہینہ تھا سنہ یاد نہیں۔ ساون لگ چکا تھا۔ نواب سلطان کی پوتی کی سالگرہ کا جشن تھا۔ گلابی جاڑے شروع ہو چکے تھے۔ رات ہوتے ہی خنکی بدن کو اطف دینے لگی تھی۔ ایک روز نواب کے منشی سر شام آئے بولے ایک ہفتے بعد نواب خورشید بہادر کی بیٹی کی پہلی سالگرہ ہے۔ مجرا آپ ہی کے نام پر طے پایا ہے، گئے رات تک رہے گا۔ جو رقم فرمائیں نواب حضور کو بتادی جائے۔ کچھ پیشگی درکار ہو تو حاضر کی جائے۔ آپ ہاں کہیں تو اسی روز اول شام موٹر بھیج دی جائے۔ نواب نے فرمایا ہے خاصہ وہیں نوش فرمائیں۔ میں نے رقم بتا کر ہاں کہہ دی اور کہہ دیا جو رقم طے ہوئی ہے اکٹھا وہیں دی جائے، پیشگی کی ضرورت نہیں۔ منشی نے جو تاریخ بتائی تھی اُس دن سر شام موٹر آگئی اور میں اس میں بیٹھ کر نواب کی حویلی پہنچ گئی۔ نواب کی حویلی کیا ایک عالی شان محل تھا۔“ شمیلہ خانم بتاتے بتاتے اسی فضا میں کھو گئیں۔

”محل کے باہر نوبت خانہ تھا اور اس کے بہت بڑے پھاٹک کے دونوں طرف دو پہرہ دار کمر میں کٹار باندھے اور ہاتھوں میں نیزے لیے کھڑے تھے۔ محل کے اندر بہت بڑے احاطے میں بائیں طرف اصطلیل تھا جہاں کوئی سائیکس گھوڑوں کو دانہ دے رہا تھا کوئی ان کی پیٹھ مل رہا تھا۔ بائیں طرف کے ایک حصے میں موٹر خانہ تھا دوسرے حصے میں شاگرد پیشہ اور ملازمین کے حجرے۔ احاطے کے بعد محل کی پہلی ڈیوڑھی تھی اور اس کے دروازے پر بھی دربان موجود تھے۔ ڈیوڑھی کے بعد بہت بڑا صحن تھا جس میں ایک طرف دیوان خانہ تھا دوسری طرف بارہ دری۔ بیچ میں ایک نہر اور نہر میں فوارہ۔ فوارے سے ابلتی ہوئی دھاریں جب نہر کے ٹھہرے ہوئے پانی میں ارتعاش پیدا کرتیں تو اسے دیکھ کر دل کو بڑی فرحت ملتی۔ صحن میں چاروں طرف چمن بندی تھی۔ خوش رنگ پھولوں کی روشیں آنکھوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ میں نے وہاں دیر تک ٹھہر کر یہ منظر دیکھا۔

دیوان خانے میں پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ جھاڑ فانوس چھتوں سے لٹکے ہوئے تھے جن میں کافوری شمعیں روشن تھیں۔ دیواروں میں ڈالیں اور اُن میں رنگ رنگ کے کنول کی

جوڑیاں اور یہی منظر بارہ دری کا۔ مجرے کا اہتمام کھلے ہوئے صحن میں نہر سے ذرا ہٹ کر کیا گیا تھا۔ اس حصے میں طرح طرح کے نقش و نگار والے قالینوں پر مسندیں لگی ہوئی تھیں اور ان پر قرینے سے گاؤتیکے رکھے ہوئے تھے۔ مجھے دیوان خانے میں لے جا کر ٹھہرایا گیا۔ خاصے کا انتظام بھی وہیں تھا۔ مجرے کے وقت میں صحن میں پہنچی تو نواب خورشید بہادر، جہاں سے فرش شروع ہوتا تھا وہاں گاؤتیکے سے لگے بیٹھے تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر آداب بجا لائے۔ نواب کے چہرے پر ریسنا نہ شان تھی۔ سر پر پٹے، بڑی بڑی مونچھیں، آنکھیں بہت روشن۔ جسم پر جنگل باڑی کا کرتہ اور اس پر انگرکھا اور انگرکھے پر ایک ریشمی دوشالہ۔ کرتے کی آستینیں چنی ہوئی تھیں اور قیمتی چھالٹین کا پانچوں دار پانچامہ ایڑیوں تک آیا ہوا تھا اور نواب کے بھرے بھرے بازوؤں پر موم جامہ کیے ہوئے تعویذ بندھے تھے۔

بیچ کی جگہ چھوڑ کر جہاں مجرا ہونا تھا نواب کے چاروں طرف ان کے دوست اور عزیز بیٹھے تھے جن کے تن پر موقع کی مناسبت سے بہت عمدہ پوشاکیں تھیں۔ فرش کے ہر طرف بہت عمدہ لباسوں میں ملبوس ملازمین ہاتھوں میں طرح طرح کے پھلوں اور میوؤں سے بھری بڑی بڑی نقرئی کشتیاں لیے بڑے ادب سے مہمانوں کے سامنے آتے اور جب وہ ان میں سے اپنی پسند کی چیزیں اٹھا لیتے تو کشتیاں ان کے سامنے سے ہٹا لیتے۔

نواب کے بالکل سامنے کئی مرد نگلیں تھیں جن پر انگوڑی خوبصورت بلیں بنی ہوئی تھیں اور موٹی موٹی شمعیں ان میں روشن تھیں جن کی لہراتی ہوئی لویں ایسی کہ آنکھ ان پر جائے تو واپس نہ آئے۔ پورے صحن میں روشنی ایسی تھی کہ دن کا گمان ہوتا تھا۔

صحن میں جہاں نواب بیٹھے تھے اس کے پیچھے قناتیں لگادی گئی تھیں اور وہاں بھی اُسی طرح کافرش بچھا دیا گیا تھا جیسا قناتوں کے اس طرف۔ ان قناتوں کے پیچھے زنان خانے کی عورتیں حسب مراتب آکر بیٹھ گئی تھیں۔ ان میں بیگمات، خواصیں، آتو، مغلانیاں، پیش خدمتیں اور لونڈیاں وغیرہ تھیں۔ ان سب کو مجھے ناچتے ہوئے دیکھنے کا اشتیاق مردوں سے زیادہ تھا۔ وہاں بھی خاطر تواضع کا ویسا ہی انتظام تھا جیسا اس طرف۔

صحن میں سازندے پہلے سے موجود تھے۔ میرا اشارہ پاتے ہی طبلہ نواز نے اپنے طبلے ملانا شروع کیے۔ جب طبلے مل گئے تو میں نے اس سے کہا:

”استاد جی! میں پاپچویں تالے سے گاتی ہوں، دایاں ملوا لیجئے۔“ طلبہ نواز نے دایاں ملایا۔ سارنگی نواز نے سارنگی ملائی۔ تان پورے پہلے سے ملے ہوئے تھے۔ میں نے ناچ شروع کرنے سے پہلے تان پورہ یہ دیکھنے کے لیے اٹھایا کہ جوڑی کا ’سا‘ کھرج اور پنچم سر میں ہے کہ نہیں۔ جوڑی کا ’سا‘ تھوڑا چڑھا ہوا بول رہا تھا، میں نے اسے ٹھیک کیا۔ دوسرا تان پورہ سر میں تھا۔ تان پوروں کو صحیح پانے کے بعد میں نے طلبہ نواز سے کہا: دایاں دیکھ لو اور بایاں ذرا گھلا کے بجانا اور ٹھیکا گائیکی کے حساب سے لگانا۔ یہ ہدایتیں ضروری ہوتی ہیں۔ سارے ساز صحیح ہو جانے کے بعد میں نے تین تال سولہ ماترا میں اپنی ماں اور اپنے استاد سے سیکھے ہوئے کچھ گتوں، توڑوں اور ٹکڑوں پر لے کاری دکھائی۔ محفل میں موجود لوگوں نے جو سب کے سب موسیقی سے اچھی طرح واقف تھے، تہائیوں کے سم پر گردن ماری اور واہ واہ کہہ کر جھوم اٹھے۔ سننے والوں نے اماں کے زمانے کے کچھ پرانوں کی فرمائش کی۔ میں نے میگھ کی ایک ’پرن سنائی۔ پھر میرے گھنگھروؤں اور طلبہ نواز کے درمیان سوال جواب ہوئے جسے محفل میں بیٹھے نوجوان لوگوں نے بہت پسند کیا۔ نواب جو ان سب چیزوں کا بہت لطف لے رہے تھے، انہوں نے اچانک آڑا چوتال کی فرمائش کر دی۔ میں نے آدھے گھنٹے سے بھی زیادہ لے کاری کی نئی نئی وضعیں پیش کیں۔ محفل میں نیا جوش پیدا ہو گیا تبھی میں نے اپنی طرف سے تال اشٹ منگل میں کچھ چیزیں کر کے بتلائیں۔ دیکھنے والوں نے انہیں بہت پسند کیا اور نواب نے یہ کہہ کر خوب داد دی کہ لڑکی نے اپنی ماں اور اپنے استاد سے جو تعلیم لی ہے وہ اس کے ناچ میں صاف دکھائی دے رہی ہے۔ پھر جھومتے ہوئے بولے:

”ایک بار ان کی ماں نے ہمارے ہی یہاں کی ایک محفل میں تال اشٹ منگل پیش کیا تھا۔ اُن کے بعد آج ان کی بیٹی نے انہیں کی طرح کر کے اسے بتلایا۔ یہ انہیں کا گھر والا کر سکتا ہے۔“

”آپ کو اس مجرے کی ایک بات یاد ہے۔“ میں نے کہا:

”ہاں۔ اور تمہیں یہ سب یاد کر کے اس لیے بتا رہی ہوں کہ تم اس محلے کے ہو جہاں ناچ گانا سکھانے والے بڑے بڑے لوگ موجود ہیں۔“ شمیلہ خانم نے کہا: ”تم ان چیزوں کو سمجھ سکتے ہو۔“ پھر بولیں:

”وہ یادگار مجرا تھا۔ سننے والے سب کے سب فن کے جاننے والے تھے۔“ شمیلا خانم بولیں۔ ”صحیح موقع پر صحیح داد دے رہے تھے۔“

”اچھا آگے بتائیے۔“

”تال اسٹ منگل کے بعد سننے والے ٹھمریاں سننے کے لیے بے چین نظر آنے لگے۔ میں دیر تک ناچتے ناچتے تھک چکی تھی۔ جب بڑی عمر کے لوگوں نے ٹھمریوں پر بھاؤ دکھانے کو کہا تو میاں استاد بشارت خاں نے جن کا شمار مشہور گویوں میں ہوتا تھا، کھمناج کا الاپ کیا اور اسی وقت محفل کا رنگ بدل گیا۔ سننے والے واہ واہ کرنے لگے۔ ایسا لگنے لگا جیسے پوری محفل ٹھمریوں ہی کے لئے سجائی گئی ہو۔ استاد خاں صاحب نے جیسے ہی ٹھمری کی آمد۔۔۔ ”نازک بیہیاں کیوں مروڑیں شیاں“۔۔۔ اٹھائی تو میں ان کی گانگی پر نئے نئے ڈھنگ سے بھاؤ دکھانے لگی۔ جتنی بار استاد اس بول کو نئے طریقے سے ادا کرتے، اتنی بار میں ان کی گانگی پر نئے بھاؤ دکھا دیتی۔ استاد تین سے چار سروں کا ترنم بنا کر ٹھمری کے بولوں کو ادا کر رہے تھے اور میں ان کے اس ترنم پر الگ الگ طرح سے بھاؤ دکھا رہی تھی۔ یہ بھاؤ دیکھ کر محفل میں موجود لوگوں کے دلوں میں ٹیس پیدا ہونے لگی۔ اس ٹھمری کے بولوں کو بہت طرح سے بہت دیر تک ادا کرنے کے بعد میاں خاں صاحب نے واجد علی شاہ کی بنائی ہوئی اودھ کی ایک بہت پرانی ٹھمری شروع کی:

”کون گلی گیو شیاں بتادے سکھی

گوکل ڈھونڈا برنداں بن ڈھونڈا ڈھونڈے برج کے بام
بتادے سکھی کون گلی گیو شیاں“

”واہ۔ واجد علی شاہ نے تو بہت سی ٹھمریاں بنائی ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ اس ٹھمری کے بعد اختر پیا کی ایک اور مدھیہ لے کی ٹھمری کی فرمائش ہوئی تو میاں خانصاحب نے مشر کھمناج میں ٹھمری شروع کر دی:

”اموا کی چھیاں یہ ٹھٹھول نہ کرو

کر پکرت مورے سوچ بچار کے اختر سنگ یہ کلول نہ کرو۔“

”تو کیا ٹھمریاں ہی چلتی رہیں؟“

”نہیں۔ اس کے بعد استاد بشارت نے ایک جھولا پیش کیا“:

”جھولا دھیرے سے جھلاؤ بنواری ارے سانوریا
 اگل بگل سب سکھیاں جھولت ہیں بچو امیں جھولے رادھا پیاری ارے سانوریا“
 رات ڈھلتی جا رہی تھی۔ آسمان پر ستاروں کی روشنی کم ہونے لگی تھی۔ یہ دیکھ خاں صاحب
 نے راگ کھمناج کا دادر اگانا شروع کر دیا:
 ”نیکي نہ لاگے تو نہو بتیاں بلم بن.....“

دن ناہی چلین رات ناہی سندیا بھائے نہ موہے کچھ اور بلم بن“
 جھولا ختم ہوتے ہوتے اندھیرا بھی ختم ہونے لگا۔ تب خاں صاحب یہ بھیرویں گانے لگے:
 ”آ جاسنوریا تو ہے گردا گالوں رس کے بھرے تورے نین“
 اور اسی کی آمد پر مجرا ختم ہو گیا۔

میں نے جانا کہ نواب کی محفل برخاست ہو گئی لیکن محل داروں میں سے کسی نے بتایا اب
 داستان گوئی شروع ہوگی اور منشی الطاف حسین جو داستان گوئی میں پید طولی رکھتے ہیں اپنا کمال
 دکھائیں گے۔ میراجی چاہا کہ میں رک جاؤں اور منشی الطاف حسین کی داستان سن کر جاؤں۔
 نواب خورشید بہادر بھی اندر اندر یہی چاہتے تھے لیکن لکھنؤ میں اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا کہ مجرا
 ختم ہونے کے بعد بھی ناچنے والیاں بیٹھ کر شائقین کی دلجوئی کریں۔ سو میں اٹھ کر وہاں سے
 چل دی۔ نواب نے مجرے کی جو رقم طے ہوئی تھی اس سے زیادہ مجھے دی اور بہت سے تحفے
 تحائف بھی ساتھ کیے۔ لیکن راستے بھر منشی الطاف حسین کی داستان نہ سننے کا قلق رہا۔“
 ”کیوں؟“

”اماں بتاتی تھیں کمال کے داستان گو تھے۔ ایک قصہ اُن کی داستان گوئی کا جو انہوں
 نے خانم صاحب سے سن رکھا تھا، اس طرح سناتی تھیں:“

”میر سردار حسین قصہ گو ایک نواب کے یہاں قصہ گوئی پر ملازم تھے۔ ایک دن نواب کے
 حضور انہوں نے عرض کی بندہ کر بلائے معلیٰ کی زیارت کو جایا چاہتا ہے آنے جانے میں کوئی
 چودہ مہینے لگیں گے سو آگے سے میرے شاگرد خاص اور جانشین منشی الطاف حسین داستان
 سنائیں گے۔ میر سردار حسین کی سنائی ہوئی داستان اتفاق سے ایسی منزل پر تھی کہ دونوں فوجیں
 آمنے سامنے کھڑی ہیں۔ ادھر مسلمانوں کی فوج ادھر جادو گروں کی۔ میدان آراستہ ہے۔ صبح

کا وقت ہے۔ بڑے بڑے نشان، جھنڈے فوجوں میں لہرا رہے ہیں۔ مسلمانوں کی فوج منتظر ہے کہ مہتر قرآن محل سے برآمد ہو کے نقارہ رزمی نوازش فرمائیں، جنگ چھڑ جائے۔

مہتر قرآن محل سے برآمد ہو رہے ہیں۔ سات ڈیوڑھیوں میں چھ ڈیوڑھیاں طے کر چکے ہیں۔ بیگمات، شہزادیاں رخصت کرنے کے لیے ساتھ ہیں۔ کنیریں غلام جلو میں آ رہے ہیں۔ نگہ روبرو خبردار ہوشیار کی آوازیں بلند ہیں۔ باہر عمائد حکومت و سرداران فوج اسلام علی حسب مراتب مجرے کو استادہ ہیں۔ مہتر قرآن ساتویں ڈیوڑھی تک تشریف لے چکے ہیں۔ اب کنیروں اور غلاموں کی آوازیں باہر آ رہی ہیں۔ پردہ اٹھنے کو ہے۔ خدا حافظ واللہ نگہبان کی آوازیں آ رہی ہیں۔

میر سردار حسین نے یہاں تک داستان بیان کی تھی۔ زیارت پر جانے لگے تو اپنے شاگرد میر الطاف حسین کو سمجھا گئے کہ میرے جانے کے بعد پردہ اٹھا دیجئے گا۔ مہتر قرآن برآمد ہو کر حکم جنگ فرمائیں گے۔ زبردست جنگ دکھائیے گا اس کے بعد حسب دستور جنگ کو آگے بڑھائیے گا۔ جاتے جاتے کچھ خاص استاد کی چیزیں انہیں تعلیم کیں۔ ادھر میر صاحب کربلا روانہ ہوئے ادھر منشی الطاف حسین روزانہ داستان سنانے لگے۔ جب میر صاحب چودہ مہینے بعد زیارت سے مشرف ہو کے آئے تو پہلا کام یہ کیا دوڑے دوڑے منشی الطاف حسین سے ملنے گئے۔ انہیں دیکھتے ہی گلے سے لگایا اور پوچھا: ”بتاؤ اب داستان کہاں پر ہے میراجی اُسی میں لگا ہوا تھا۔“ منشی الطاف حسین بولے: ”استاد چودہ مہینے داستان کہتا رہا، نواب صاحب کاجی بہلاتا رہا اور پردہ اس خیال سے نہیں اٹھایا کہ جب استاد نے پردہ نہیں اٹھنے دیا تو میں یہ بے ادبی کیوں کروں۔ سو داستان وہیں پر روکے ہوئے ہوں۔ فوج اُسی طرح کھڑی ہے۔ عمائد حکومت اور سرداران فوج اُسی طرح برآمد ہونے کے منتظر ہیں۔ اب آپ کل تشریف لے جائیے گا، پردہ اٹھا کے داستان آگے بڑھا دیجیے گا۔“

داستان ہی کے انداز میں پورا قصہ سنا کر شملہ خانم بولیں:

”تو ایسے تھے منشی الطاف حسین داستان گو۔“

”لیکن آپ نے بھی کمال کر دیا۔“ میں نے کہا۔ ”پورا قصہ یوں سنایا کہ داستان کا مزہ

آ گیا۔“ یہ کہہ کر میں کہیں کھو گیا۔

دن کا دوسرا پہر گزر چکا تھا، سبیلہ کمرے میں آ چکی تھیں۔ میرے گم صُوم ہو جانے پر سبیلہ خانم نے پوچھا: ”کہاں کھو گئے۔“

”کچھ نہیں۔ ماں یاد آ گئیں۔ اسی طرح وہ بھی سنا تی تھیں داستانیں۔“

میرے یہ کہنے پر سبیلہ نے مجھے افسردہ نگاہوں سے دیکھا۔

”داستان کی بات نکلی تو اب تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ نواب خورشید بہادر بھی داستان بن گئے۔ جہاں اُن کا محل تھا کچھ ہی برسوں میں وہاں اُلُو بولنے لگے۔ سب کچھ ناچ گانے اور دوسرے شوقیوں میں اڑا دیا۔ سنا ہے تو بے کی عمر کے ہیں۔ چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔ جہاں اُن کا محل تھا وہیں سے کچھ دور ایک شکستہ مکان میں اپنی پوتی کی دال روٹی پر زندہ ہیں۔“

”کھانے کا وقت ہو چکا ہے۔“ سبیلہ نے کہا۔ پھر بولیں: ”میرے خیال میں اماں نے آج بہت کچھ بتا دیا آپ کو۔“

”بہت کچھ..... یہ بتانے میں انہیں جو تکلیف ہوئی اس کے لیے آپ سے معافی۔“ کچھ دیر بعد ہم تینوں نے کھانا کھایا پھر میں اُن ماں بیٹی سے یہ کہہ کر چلا آیا کہ لکھنے کے جس کام میں لگا ہوا ہوں، یہاں سے جا کر اُسی میں لگنا ہے۔



دوسرے دن میں سبیلہ کے یہاں پہنچا تو وہ اپنے چھوٹے سے آنگن میں ٹہل ٹہل کر ہنگا اور کتو کا انتظار کر رہی تھیں۔ میری آہٹ سنی تو تیزی سے دروازے کی طرف لپکیں اور مجھے دیکھتے ہی پوچھا:

”کس وقت کہا تھا ان لوگوں نے آنے کو۔“

”اسی وقت۔ آتے ہی ہوں گے۔“ اور جیسے ہی میں نے یہ بات کہی دروازے پر دستک ہوئی۔ سبیلہ نے لپک کر دروازہ کھولا تو سامنے وہ دونوں پسینے میں ڈوبی کھڑی تھیں۔ سبیلہ بڑی گرمجوشی سے اُن دونوں سے گلے ملیں پھر انہیں باہر والے کمرے میں بٹھا کر پانی لینے چلی گئیں۔ واپس آئیں تو میں نے ہنگا اور کتو سے کہا:

”یہ بڑی بے چینی سے آپ دونوں کا انتظار کر رہی تھیں۔“

”ہم لوگ بھی صبح ہوتے ہی نکل پڑے تھے۔ یہاں آ کر آپ کے مکان تک

پہنچنے میں دیر لگی۔“

”سڑک سے یہاں تک فاصلہ بہت ہے، بہت چلنا پڑا۔“ سبیلہ نے کہا۔ پھر ایک پنکھا لا کر ان دونوں کے منہ پر جھلنے لگیں۔

”جب سے آپ لوگوں کے بارے میں سنا تھا.....“ سبیلہ نے کہا۔ ”بہت جی چاہتا تھا آپ لوگوں سے ملنے کا۔ آج وہ موقع آ گیا۔“

”خالہ آپ کی نانی اور آپ کی ماں کا بہت ذکر کرتی تھیں۔ سب کچھ ایسے بتاتی تھیں جیسے آپ لوگ ان کے سکے ہوں۔“ ہینگا نے کہا۔ ”اور جب جب آپ لوگوں کا ذکر ہوتا، ہم آپ سے ملنے کو بے چین ہو جاتے۔“

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ شمیمہ خانم بھی کمرے میں آ گئیں اور ہینگا اور کمو سے گلے مل کر انہیں بہت سی دعائیں دیں۔ پھر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں:

”تم لوگوں کے بارے میں انہوں نے بہت کچھ بتایا۔ بہت دکھ ہوا سن کر۔ سردار جہاں..... خیر چھوڑو اب ان سے اُسی دنیا میں ملیں گے۔ ہم بھی چند روز کے مہمان ہیں۔“

”اماں آپ نے پھر وہی باتیں.....“

سبیلہ کے یہ کہنے پر شمیمہ خانم نے بات بدل کر ان دونوں سے کہا:

”تو اب تم لوگ.....“

”تالاب گنگنی شوکل میں فرخندہ محل کے امام باڑے کے پیچھے رہتے ہیں۔“ ہینگا نے شمیمہ خانم کی بات پوری ہونے سے پہلے اپنے رہنے کا ٹھکانہ بتا دیا۔

”رہو بہن کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تم لوگوں سے گھر چھڑوا کر انہوں نے اچھا نہیں کیا۔“ شمیمہ خانم نے کہا۔ ”آخر کس چیز کی کمی تھی ان کے پاس۔“

”قناعت کی۔“ ہینگا نے کہا۔

”تم لوگ تو اپنی ماں کے مرنے کے بعد ہی سے رہنے لگے تھے وہاں؟“

”جی۔“

”بیٹیوں کی طرح پالا تم دونوں کو سردار جہاں نے اور رہو نے یہ سلوک کیا۔“ شمیمہ خانم نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔ ”سردار جہاں وہاں بڑی تکلیف میں ہوں گی اور تمہاری ماں کو

بھی بہت دکھ ہوا ہوگا۔“

”ہمیں تو برسی کی مجلس میں بھی نہیں بلایا۔ سنا تو ہم تڑپ گئے۔ دوسرے دن ہم نے الگ، جہاں ہم رہتے ہیں، وہاں خالہ کی مجلس کی۔“ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”یہ تو گئے تھے اُس میں۔“

ان باتوں کے بعد امراؤ بیگم، سردار جہاں، صہبا خانم، ربو اور شمیلہ خانم کی ماں کے بارے میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ بہت سے قصے نکلے۔ جو باتیں ایک دوسرے کو نہیں معلوم تھیں وہ معلوم ہوئیں۔ ہینگا اور کمو نے اپنے بارے میں بہت کچھ بتایا اور بہت کچھ سبیلہ کے بارے میں پوچھا۔ میں ان سب کی باتیں سن رہا تھا اور مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت زمانے بعد ایک خاندان کے پچھڑے ہوئے لوگ ایک دوسرے سے آ ملے ہوں۔ آج شمیلہ خانم کے باروچی خانے میں بڑی چہل پہل تھی۔ ایک سی عمر کی تین لڑکیاں اپنی اپنی پسند کی چیزیں پکانے میں لگی ہوئی تھیں۔ دوپہر کے بعد جب دسترخوان لگایا گیا تو اس پر اتنی چیزیں تھیں کہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کھائیں کیا چھوڑیں۔ شمیلہ خانم کا چہرہ آج بہت زیادہ چمک رہا تھا۔ ہینگا، کمو اور سبیلہ بات بات پر اس طرح قہقہے لگا رہے تھے جیسے یہ قہقہے انہوں نے اسی موقع کے لیے چھپا رکھے ہوں۔

کھانا کھانے کے دوران کمو نے انہیں دو تصویروں کے بارے میں جنہیں میں نے بہت پسند کیا تھا، سبیلہ سے پوچھا:

”یہ تصویریں کس کی ہیں۔ بہت خوبصورت ہیں۔“

”میرے نانا اور نانی کی۔“

”اور بنائی انہوں نے ہیں۔“ میں نے سبیلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”کمال کی ہیں۔“ کمو نے پھر تعریف کی۔

سبیلہ نے کمو کو ان تصویروں کے بارے میں وہی سب کچھ بتایا جو مجھے بتایا تھا۔

پھر کمو سے کہا:

”اب ہم چاہتے ہیں جہاں آپ کی تصویریں فروخت ہوتی ہیں وہیں ہماری بھی

نکل جائیں۔“

بھی بہت دکھ ہوا ہوگا۔“

”ہمیں تو برسی کی مجلس میں بھی نہیں بلایا۔ سنا تو ہم تڑپ گئے۔ دوسرے دن ہم نے الگ، جہاں ہم رہتے ہیں، وہاں خالہ کی مجلس کی۔“ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”یہ تو گئے تھے اُس میں۔“

ان باتوں کے بعد امراؤ بیگم، سردار جہاں، صہبا خانم، رجو اور شمیلہ خانم کی ماں کے بارے میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ بہت سے قصے نکلے۔ جو باتیں ایک دوسرے کو نہیں معلوم تھیں وہ معلوم ہوئیں۔ ہینگا اور کتو نے اپنے بارے میں بہت کچھ بتایا اور بہت کچھ سبیلہ کے بارے میں پوچھا۔ میں ان سب کی باتیں سن رہا تھا اور مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت زمانے بعد ایک خاندان کے پچھڑے ہوئے لوگ ایک دوسرے سے آ ملے ہوں۔ آج شمیلہ خانم کے باروچی خانے میں بڑی چہل پہل تھی۔ ایک سی عمر کی تین لڑکیاں اپنی اپنی پسند کی چیزیں پکانے میں لگی ہوئی تھیں۔ دوپہر کے بعد جب دسترخوان لگایا گیا تو اس پر اتنی چیزیں تھیں کہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کھائیں کیا چھوڑیں۔ شمیلہ خانم کا چہرہ آج بہت زیادہ چمک رہا تھا۔ ہینگا، کتو اور سبیلہ بات بات پر اس طرح قہقہے لگا رہے تھے جیسے یہ قہقہے انہوں نے اسی موقع کے لیے چھپا رکھے ہوں۔

کھانا کھانے کے دوران کتو نے انہیں دو تصویروں کے بارے میں جنہیں میں نے بہت پسند کیا تھا، سبیلہ سے پوچھا:

”یہ تصویریں کس کی ہیں۔ بہت خوبصورت ہیں۔“

”میرے نانا اور نانی کی۔“

”اور بنائی انہوں نے ہیں۔“ میں نے سبیلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”کمال کی ہیں۔“ کتو نے پھر تعریف کی۔

سبیلہ نے کتو کو ان تصویروں کے بارے میں وہی سب کچھ بتایا جو مجھے بتایا تھا۔

پھر کتو سے کہا:

”اب ہم چاہتے ہیں جہاں آپ کی تصویریں فروخت ہوتی ہیں وہیں ہماری بھی

نکل جائیں۔“

”ہم نے تو ابھی یہ کام بند کر رکھا ہے۔ لیکن ہم آپ کو ان دکانوں پر لے چلیں گے جہاں ایسی تصویروں کے نکلنے کی امید ہے۔“ کتو نے کہا۔ پھر کہا: ”آج ہی چلیں گے۔ کچھ تصویریں بنی رکھی ہوں تو لیتی چلیے گا۔“

کھانا کھانے کے بعد سبیلہ مجھے، ہینگا اور کتو کو اپنے کمرے میں لے گئیں اور کمرے کی ایک ایک چیز ہینگا اور کتو کو اس طرح دکھائی جیسے اپنی سگی بہنوں کو دکھا رہی ہوں۔ چیزیں دکھاتے دکھاتے جب انہوں نے اپنے کپڑوں کی الماری کھولی اور جب ہینگا اور کتو نے اس میں بہت سلیقے سے رکھی ہوئی اچکن اور شیروانی دیکھی تو دونوں نے ایک ساتھ پوچھا: ”یہ کس کی ہیں۔“ ”ان کی۔“ سبیلہ نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ان سے کہہ کر اپنی الماری میں احتیاط سے رکھ لی ہیں۔“ پھر ان دونوں کو بتایا کس طرح جہاندار بیگم نے ضد کر کے یہ دونوں چیزیں میرے لیے سلوائیں، کس طرح شہبا انہیں جہاندار بیگم کی حویلی سے اپنے ٹھکانے پر لے گئی اور کس طرح یہ سبیلہ کے پاس آئیں۔ شہبا کا ذکر آنے پر ان دونوں نے پھر مجھے افسوس بھری نگاہوں سے دیکھا۔ کچھ دیر بعد سبیلہ نے ایک بڑے سے بکسے سے رنگوں اور پنسل سے بنی ہوئی تصویریں نکالیں اور ایک ایک کر کے ان دونوں کو دکھائیں۔ بہت خوبصورت بنی ہوئی یہ تصویریں میں نے بھی ابھی تک نہیں دیکھی تھیں۔ کتو نے یہ تصویریں دیکھتے ہی کہا:

”یہ تو ہاتھوں ہاتھ نکل جائیں گی۔“

”میں انہیں نکالنا نہیں چاہتی، لیکن.....“ سبیلہ کہتے کہتے رکیں۔

”لیکن؟“ کتو نے پوچھا۔

”پیسہ ہاتھ نہیں آیا تو اب کی عزاداری نہیں ہو سکے گی۔ اور.....“

”اور؟“

”مکان کا کرایہ بھی چڑھتا جائے گا۔ کچھ کچھ دے کر بڑی مشکل سے مکان مالک کو راضی کرتے ہیں ورنہ وہ تو کل ہی مکان خالی کرا لے۔“

”ہم یہ تصویریں لے کر آج ہی چلیں گے۔“ کتو نے کہا۔ پھر بولی:

”اب آپ سے کچھ سنیں گے۔ میں ٹھیکالگاتی ہوں۔ باجی تان پورہ چھیڑیں گی۔ بتائیے

کیا گائیں گی۔“

”آج نہیں پھر کسی دن۔“

”نہیں آج ہی گائے۔“ کتو اڑ گئیں۔

”اچھا اودھ کی ایک بہت پرانی بول بناؤ ٹھمری جو راگ کھمّاج میں ہے، گائے دیتی ہوں۔“ یہ کہہ کر سبیلہ نے یہ ٹھمری گانا شروع کی:

”بالی عمر لڑکیاں ناچھٹروسیاں

تیج چڑھٹ موری پائل باجے

جاگت سانس جٹھنیا

ناچھٹروسیاں“

ٹھمری ختم ہوئی تو ہنگا بولیں: ”ایک بھیرویں بھی۔“

”اچھا وہ بھی گائے دیتی ہوں:

تو سے لاگی پریت دل کا میرے درد نہ جائے

نہند کہے اور نہ پہچانے

ہم ہار گئے وہ جیت

تو سے لاگی پریت“

جب بہت اچھی آواز میں سبیلہ یہ چیزیں گا چکیں تو میں نے ہنگا اور کتو سے کہا:

”یہ گانے بجانے کا ہنر تو آپ لوگوں نے چھپائے رکھا۔“

”خالہ نے سکھا دیا تھا۔ کبھی کبھی وہ شوقیہ ریاض کرتیں تو ہمیں بھی اپنے ساتھ لگاتیں۔

اسی مشق میں ہم نے یہ سب سیکھ لیا۔“

بھیرویں گانے کے بعد سبیلہ نے ہنگا اور کتو کو یہ بھی بتایا کہ وہ بازار میں بیٹھنے والی عورتوں

کے بارے میں معلومات جمع کر رہی ہیں، وہ دونوں اس میں ان کی مدد کریں۔ ہنگا اور کتو کے

آجانے سے شمیمہ خانم کے گھر میں دن بھر جشن کا ماحول رہا۔ اچھے اچھے کھانے پکے، بار بار

چائے بنی، شربت پئے گئے، سہ پہر کے بعد پھلکیاں تلی گئیں۔ اُن سب نے آج اپنے خراب

دنوں اور ناگوار یادوں کو بھلا دیا تھا۔ شمیمہ خانم بھی اُن کی خوشیوں میں شریک رہیں۔ طلبے کی

تھاپ اور تان پورے کی تان سن کر وہ سبیلہ کے کمرے میں آ گئی تھیں اور ایک منجھے ہوئے موسیقار کی طرح اپنی بیٹی کی ٹھہری سن رہی تھیں۔ شام سے کچھ پہلے ہینگا اور کتو نے سبیلہ سے کہا: ”اب اپنی تصویریں لیجیے اور ہمارے ساتھ امین آباد چلیے۔ وہاں کچھ بڑی دکانیں ہیں۔ ہم اپنے کچھ نمونے انہیں دے آئے تھے، وہیں چل کر بات کرتے ہیں۔“

سبیلہ نے ایک بہت بڑے تھیلے میں تصویریں رکھیں۔ ہینگا اور کتو نے شمیمہ خانم سے رخصت لی اور انہیں کے ساتھ میں بھی باہر نکل آیا۔ دروازے پر شمیمہ خانم نے اُن دونوں سے کہا: ”آتی رہا کرو۔ سردار جہاں، صہبا خانم، ہمارے سامنے کی پکی شہبا..... سب اس دنیا سے اٹھ گئے۔“ یہ کہہ کر یہ مصرعہ پڑھا: ع آج وہ کل ہماری باری ہے۔

پھر دونوں کو گلے لگا کر اندر چلی گئیں۔



دوسرے دن سبیلہ نے مجھے بتایا: ”جن دکانوں پر ہم گئے وہاں تصویریں بہت پسند کی گئیں، بہت سی خرید بھی لی گئیں اور دو ایک دکانداروں نے جیسی تصویریں آج کل بک رہی ہیں ویسی بنانے کے لیے کہا ہے۔“ یہ کہہ کر بولیں: ”میں نے اُن دکانوں پر بتا دیا ہے اب میں نہیں میرے گھر سے کوئی اور آئے گا تصویریں لے کر۔ اسی کو پیسے بھی دے دیجیے گا۔“ یہ کہہ کر مجھ سے بولیں: ”اب آپ چلے جایا کیجیے گا۔ اتنا حق تو ہے ہی میرا آپ پر۔“

”ضرور چلا جاؤں گا۔“

”ہینگا اور کتو یہاں آ کر بہت خوش تھیں۔“ سبیلہ نے کہا۔ ”کہہ رہی تھیں جس دن اپنا امام باڑہ سجائیں ہمیں ضرور بلائیں۔“

کچھ دن بعد جیسی تصویریں سبیلہ سے بنانے کے لیے کہا گیا تھا ویسی ہی تصویریں لے کر جب میں سبیلہ کی بتائی ہوئی دکان پر گیا تو دکاندار نے ان تصویروں کے پیسے دے کر مجھ سے کہا: ”تصویریں بہت اچھی ہیں لیکن جو صاحبہ ان نئی تصویر بنانے والی کو لے کر آئی تھیں وہ اپنی تصویریں واپس لے گئیں۔ ہم نے انہیں بھی پسند کر لیا تھا۔“

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”یہی تو میری بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ تصویریں واپس لیتے وقت کہنے لگیں جنہیں میں آپ

کے پاس لاؤں گی وہ مجھ سے کہیں اچھی تصویریں بناتی ہیں۔ آپ ان سے جتنی زیادہ تصویریں خرید سکتے ہیں خرید لیجیے گا۔“

میں تصویروں کے پیسے لے کر سبیلہ کے گھر گیا تو انہیں یہ بات نہیں بتائی۔

اب سبیلہ دن دن بھر تصویریں بنانے میں لگی رہتیں۔ چوتھے پانچویں میں یہ تصویریں لے جا کر دکانوں پر دے آتا اور جو پیسے ملتے سبیلہ کو لا کر دے دیتا۔ تصویروں کا کام چل جانے کی وجہ سے سبیلہ خوش رہنے لگی تھیں۔ ایک دن جب میں نے انہیں تصویروں کے پیسے دیے تو بولیں:

”اب ہماری عزاداری اچھی طرح ہو جائے گی اور مکان کا کرایہ بھی نکل آئے گا۔“ یہ بتا کر بولیں: ”آپ انتیس کوہنگا اور کتو کو لے آئیے گا۔ ہم لوگ امام باڑہ مل کر سجاؤں گے۔“

میں چاند رات والے دن ہنگا اور کتو کے یہاں گیا تو دیکھا وہ ایک بڑے سے تعزیے کو آخری شکل دے رہی ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی ان دونوں نے کہا:

”آئیے آئیے۔ یہ تعزیہ ہم نے سبیلہ بہن کے امام باڑے کے لیے بنایا ہے۔ اچھا ہوا آپ آگئے۔ بس اس میں دو چار چیزیں لگانے کو رہ گئی ہیں۔ پھر اسے لے کر چلتے ہیں اُن کی طرف۔“

”میں آپ لوگوں کو بلانے ہی آیا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”سبیلہ نے کہا ہے آپ لوگ آج آجائیں تو سب مل کر امام باڑہ سجاؤں گے۔“

ہنگا اور کتو نے جب تعزیے کی آرائش مکمل کر لی تو مجھے چائے پلائی۔ پھر ایک سواری بلا کر وہ دونوں اس تعزیے کو لے کر اُس پر اس طرح بیٹھیں کہ تعزیے کی بے حرمتی نہ ہونے پائے۔ سواری پر بیٹھ کر ہنگا بولیں: ”فاصلہ بہت لمبا ہے۔ ہمیں پہنچنے میں دیر لگے گی۔ آپ جا کر سبیلہ سے بتا دیجیے ہم آ رہے ہیں۔“

سبیلہ کے گھر پہنچ کر میں نے انہیں ہنگا اور کتو کے آنے کی خبر دی اور یہ بھی بتایا کہ وہ لوگ اپنے ساتھ ایک بڑا تعزیہ لے کر آ رہے ہیں جو انہوں نے خاص آپ کے امام باڑے کے لیے بنایا ہے۔ یہ سن کر ماں بیٹی دونوں بہت خوش ہوئے اور اسی کے ساتھ اُن کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔ سبیلہ نے اپنی چھوٹی سی صحیحی کو پاک کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ بالٹیاں بھر بھر کر لا رہی تھیں اور پچی کے فرش اور دیواروں کو دھو رہی تھیں۔ پچی کے باہر داہنی طرف ایک بڑا سا بکسا رکھا تھا۔ میں نے پوچھا اس میں کیا ہے۔

”عزاداری کا سامان۔ علم پٹکے وغیرہ۔“ سبیلہ نے کہا۔ ”اب تو بہت کم سامان رہ گیا ہے۔ نانی کے پاس، اماں بتاتی ہیں بڑے بڑے سونے چاندی کے علم تھے اور کارچوبی اور زردوزی کے کام والے بھاری بھاری پٹکے جن کے کناروں پر بہت مہنگے لچکے لگے ہوئے تھے۔ گنگا جمنی جھاڑیں، شیشہ آلات ایسے جو دور دور تک دیکھنے کو نہ ملیں۔ چاندی کے شمع دان اور گلاب پاش۔ ایک چاندی کی اور ایک صندل کی لکڑی کی بہت عمدہ کام والی ضرتح تھی۔ وہ اپنے امام باڑے کی بڑی والی ضرتح خاص طرح کے کاربگروں سے بنواتی تھیں۔ اُن کا سجا ہوا امام باڑہ دیکھ کر لوگ کہتے یا تو شاہی امام باڑوں میں ایسا سامان ہوتا ہے یا امراؤ جان کے یہاں۔“

”لیکن وہ اپنا امام باڑہ سجاتی کہاں تھیں۔“ میں نے پوچھا۔ ”خانم تو اپنے مکان پر اپنی تعز یہ داری کرتی تھیں۔“ میں یہ پوچھ ہی رہا تھا کہ شمیلہ خانم آگئیں۔ آتے ہی بولیں: ”کیا پوچھ رہے ہو۔“

”پوچھ رہے ہیں نانی اپنا امام باڑہ کہاں سجاتی تھیں۔“ سبیلہ نے انہیں بتایا۔ ”انہیں ہر سال محرم بھر کے لیے ایک مکان حسین آباد میں نواب ملکہ کشور کے متعلقین کی طرف سے دے دیا جاتا۔“ شمیلہ خانم نے بتایا۔ ”اماں وہیں اپنا امام باڑہ سجاتیں اور شب کو خانم صاحب کے امام باڑے میں ماتم کرنے کے بعد اپنے امام باڑے میں چلی آتیں اور وہیں محلے کے لوگوں کو جمع کر کے سوز خوانی کرتیں اور نوحے پڑھتیں۔“ یہ کہہ کر بولیں: ”پورے محرم یہی سلسلہ رہتا۔ عزاداری کا بہت قیمتی سامان تھا اُن کے پاس۔ جب ابا کے ساتھ کوٹھے سے نکلیں تو سب خانم صاحب کے پاس رہ گیا۔“ پھر بتایا: ”اپنے اچھے دنوں میں میں نے بھی اماں ہی کا جیسا سامان جمع کیا تھا لیکن وہ جو ہمارے مکان میں چوری ہوئی اس میں وہ بھی چلا گیا۔ اب یہ جو تم دیکھ رہے ہو، یہ قسمت سے بچ گیا۔“

ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو ہینگا اور کتو تعز یہ سنبھالے ہوئے سواری پر سے بہت سنبھل کر اتر رہی تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر تعز یے کو سنبھالنے میں مدد کی۔ تعز یے کو اندر لا کر ایک چوکی پر رکھ دیا گیا۔ سبیلہ اور اُن کی ماں اس تعز یے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ کچھ رکی باتوں کے بعد وہ چاروں امام باڑہ سجانے میں لگ گئے۔ پہلے پچی میں فرش بچھایا گیا پھر تین طرف کی دیواروں میں اوٹیر لگائی گئیں۔ پھر

ان کی کھونٹیوں میں علم لگا کر پٹکے باندھے گئے، مناسب جگہوں پر شیشے کا سامان سجایا گیا۔ صحنی کے دونوں طرف چھتریں لگے ہوئے دو چھوٹے چھوٹے منبر رکھے گئے اور ان میں علم لگائے گئے۔ سب سے آگے ایک بڑی سی کشتی میں شمع دان رکھا گیا اور اس کے پہلو میں گلاب پاش۔ ایک ایک چیز کو بہت قرینے اور سلیقے سے لگایا جا رہا تھا۔ وہ سب اس کام میں شام تک لگے رہے۔ آج کھانے کے بجائے بیچ بیچ میں ادھر ادھر کی چیزیں کھالی گئیں۔ مغرب سے پہلے پہلے امام باڑہ سج کر تیار ہو گیا اور جو تعزیہ ہینگا اور کتو بنا کر لائی تھیں، اسے صحنی کے بالکل بیچ میں رکھ دیا گیا اور اذان کے وقت جیسے ہی شمعوں اور قہقہوں کو روشن کیا گیا، یہ چھوٹا سا امام باڑہ نور سے بھرا ہوا نظر آنے لگا۔ مغرب کی نماز کے بعد ان سب نے اپنی چوڑیاں توڑیں، سیاہ کپڑے پہنے اور بہت پرسوز آواز میں یہ نوحہ پڑھنا شروع کیا:

ع چاند نکلا ہے ماہِ عزا کا

نوحہ ختم ہونے کے بعد شمیلہ خانم بولیں: ”آج کی تاریخ والا ایک سوز بھی پڑھ لو۔“ یہ کہہ کر انہوں نے امام باڑے کے سامنے تکیہ رکھ کر اس پر اپنی بیاض رکھی اور دوزانو بیٹھ گئیں۔ سبیلہ، ہینگا اور کتو ان کے اہلو پہلو اسی طرح بیٹھ گئے۔ شمیلہ خانم نے سوز پڑھنا شروع کیا:

اے اہل عزا ماہِ محرم کے دن آئے
اے مجلسیوں پھر الم و غم کے دن آئے
اے ماتمیو روؤ کہ ماتم کے دن آئے
پھر گریہ خاتونِ دو عالم کے دن آئے

پھر ہند میں آتی ہے سواری شہِ دیں کی

برپا کرو پھر تعزیہ داری شہِ دیں کی

جب سوز ختم ہوا اور جب سب کے آنسو تھم گئے تو سبیلہ نے کہا:

”یہ سوز تو راگ پوریا میں تھا۔“

”ہاں۔ پوریا اور پیلو میں لوگ کم پڑھتے ہیں۔“ شمیلہ خانم بولیں۔

ہینگا اور کتو نے چلنے کی تیاری شروع کر دی۔

”کھانا کھا کر جائیے۔“ سبیلہ نے کہا۔

”نہیں، بہت دیر ہو جائے گی۔ یہاں سے جا کر اپنے یہاں نوحہ پڑھیں گے۔“ ہنگا بولیں: ”ہم جہاں رہتے ہیں وہاں زیادہ جگہ نہیں ہے۔ ایک چھوٹا سا لکڑی کا امام باڑہ ایک جگہ پر رکھ لیا ہے، اسی کے سامنے کھڑے ہو کر ماتم کر لیں گے۔“

جب وہ دونوں چلنے کے لیے کھڑی ہوئیں تو شمیلہ خانم مٹھی میں کچھ دبائے ہنگا کے قریب آ کر بولیں:

”تعزیر کا ہدیہ؟“

”خالہ یہ ہم نے خاص آپ کے امام باڑے کے لیے بنایا ہے۔ ہدیہ ہمیں دوسرے تعزیوں کا مل جاتا ہے۔ اپنے امام باڑے کو ہمارا ہی امام باڑہ سمجھیے۔“ ہنگا نے کہا۔ ”ایسا ہی تعزیر ہم اپنی خالہ کے امام باڑے کے لیے بناتے تھے۔ وہ اس دنیا میں نہیں رہیں، اُن کے بعد ہم اُن کے گھر میں نہیں رہے۔ تعزیر آپ کے امام باڑے میں رکھ کر ہم نے خالہ کو خوش کیا ہے اور اپنے آپ کو بھی۔“ یہ کہہ کر بولیں: ”آپ بس ان کے نام کی ایک مجلس کر دیجیے گا، سمجھ لیجیے یہی ہمارا ہدیہ ہے۔“

آج پہلی محرم تھی۔ میں شمیلہ خانم کے یہاں جانے کے لیے نکلا تو عزادار ہر طرف سیاہ کپڑے پہنے گھوم رہے تھے۔ لکھنؤ کی ساری بڑی مجلسیں اُسی سڑک پر ہوتی ہیں جہاں میں رہتا تھا۔ شاہی امام باڑے تو یہاں سے ذرا دوری پر تھے، لکھنؤ کے دوسرے مشہور امام باڑے کچھ کچھ فاصلے پر اسی علاقے میں تھے۔ صبح ہوتے ہی پہلی مجلس آصف الدولہ کے امام باڑے میں ہوتی تھی پھر محمد علی شاہ کے عزادخانے میں پھر غازی الدین حیدر کے حسینے میں جو عرف عام میں شاہ نجف کے نام سے مشہور ہے۔ صبح کے نو بجتے بجتے اس طرف کی بڑی مجلسیں شروع ہو جاتیں اور ان میں عزاداروں کا ہجوم نظر آنے لگتا اور دوپہر ہوتے ہوتے کھوے سے کھوا چھلنے لگتا۔ جگہ جگہ سیاہ پوشوں والی ٹھنڈے پانی کی سبیلیں لگی ہوتیں جن میں اوپر کی طرف سیاہ پیوں پر سفید حروف میں وہ شعر لکھے ہوتے جو کر بلا کے پیاسوں کی یاد دلاتے تھے:

کرم ساقی کوثر کو دکھا دو بھائی
جتنا پانی ہے وہ پیاسوں کو پلا دو بھائی
بھائیو! آؤ جو پانی کی طلبگاری ہے
چشمہ فیض حسین ابن علی جاری ہے

ان سبیلوں پر مانتی لباسوں میں ملبوس نوجوان عزا داروں کو ٹھنڈا پانی پلاتے رہتے۔ کسی سبیل پر زعفران کے شربت کا بھی اہتمام ہوتا۔

✓ سوگواروں کے اس ہجوم سے گزرتا ہوا میں سعادت گنج کی طرف آیا اور وہاں سے ایک سواری پر بیٹھ کر عنبر گنج شملہ خانم کے مکان پہنچ گیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی سبیلہ نے مجھ سے کہا: ”چھٹی محرم سے میں آپ کی طرف کی مجلسیں کروں گی۔ اماں ہمارے ساتھ نہیں چل سکتیں۔“ یہ بتا کر بولیں: ”آپ پہلی والی مجلس میں مجھے مل جائیے گا۔ وہاں سے بڑی مجلسوں میں میرے ساتھ ساتھ رہیے گا۔“ پھر کہا: ”اور ہاں آٹھ محرم کو غائب نہ ہو جائیے گا۔ اس دن میں آپ کو اپنے عزا خانے میں بہشتی بنا کر حضرت عباس کے علم میں گروں کروں گی۔ جیسے اس روز درگاہ میں کیا تھا۔“

✓ شملہ خانم سبیلہ کی یہ باتیں سن رہی تھیں اور میں ان کی آنکھوں میں وہ چمک دیکھ رہا تھا جو اپنی کسی عزیز شے کی سلامتی کا یقین ہو جانے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ آج مجھے شملہ خانم کے یہاں کوئی کام نہیں تھا۔ ساری پوچھی جانے والی باتیں میں ان سے پوچھ چکا تھا جو ایک دورہ گئی تھیں، محرم آ جانے کی وجہ سے ان کا پوچھنا مناسب نہیں تھا۔ یوں بھی ان دس دنوں میں سوائے مجلس ماتم کے اور کوئی بات نہیں کی جاتی اور وہ بات تو بالکل بھی نہیں کی جاتی جس کا تعلق ناچ گانے وغیرہ سے ہو۔ لیکن کوئی کام نہ ہونے کے باوجود میں ان کی طرف آ نکلا۔ جس دن سے سبیلہ نے میرے ٹھکانے پر میرے پیروں کی سنکائی کی تھی، اُس دن سے صبح اٹھتے ہی میرے پاؤں اپنے آپ عنبر گنج کی طرف اٹھ جاتے اور میں شملہ خانم کے ٹھکانے پر پہنچ جاتا اور یہاں آنے کے بعد یہاں سے نکلنے کو میرا جی نہ چاہتا۔ آج بھی مجلسوں میں شریک ہونے کے بجائے میں ان کی طرف آ نکلا۔ لیکن آتے ہی میں نے سوچا سوگ کے ان دنوں میں بہت دیر بیٹھنا ٹھیک نہیں۔ ان دنوں ہر گھر میں دن بھر امام باڑہ کھلا رہتا ہے اور رک رک کر اس کے سامنے ماتم ہوتا رہتا ہے۔ کڑھائی چولہے پر نہیں چڑھائی جاتی، گھروں میں سادہ کھانا پکتا ہے اور ہنسی مذاق والی باتوں سے گریز کیا جاتا ہے۔ سو میں کچھ دیر وہاں بیٹھ کر وہاں سے یہ کہہ کر اٹھنے لگا کہ مجھے دوسری مجلسوں میں شریک ہونا ہے۔ یہ کہہ کر میں دروازے کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ سبیلہ نے کہا:

”شام کو میں ضريح کی زیارت کے لیے بڑے امام باڑے جاؤں گی، آپ وہاں آجائیے گا۔“ پھر پوچھا: ”کہاں پر ملیں گے۔ مجمع بہت ہوگا۔ کیسے ڈھونڈوں گی آپ کو۔“

”رومی دروازے کے داہنی طرف والے زینے کے پاس، وہاں لوگ زیادہ نہیں ہوتے۔“

میں نے کہا۔ ”وہیں آجائیے گا، وہاں سے چلیں گے امام باڑے کے صحن کی طرف۔“



سہ پہر ہوتے ہی سبیلہ وہاں آگئی تھیں جہاں میں نے کہا تھا۔ آصفی امام باڑے سے حسین آباد کی طرف جانے والی سڑک پر آدمی ہی آدمی نظر آ رہے تھے۔ ہم رومی دروازے کے بائیں طرف والے زینے کے پاس کچھ ہی دیر کے لیے کھڑے ہوئے تھے کہ دلوں میں جوش پیدا کرنے والی آوازوں کے ساتھ تاشے اور نقارے بجنا شروع ہوئے۔ ضريح کا جلوس امام باڑے کے پہلے والے صحن میں چیزوں کی آگے پیچھے والی ترتیب سے تیار ہو چکا تھا۔ سب چیزوں کو ہر طرح سے ٹھیک کرنے کے لیے جلوس نے صحن کے تین چکر لگائے اور جب اس کی ہر چیز اپنی ترتیب میں ہر طرح سے ٹھیک ہوگئی تو وہ امام باڑے سے برآمد ہونا شروع ہوا۔ پہلے نوبت خانے کے سامنے والے دروازے سے نشان باہر آیا۔ شاہی خاندان کے لوگ اور امام باڑے کے منتظمین ایک ہاتھ میں اپنی ٹوپی لیے اور دوسرا ہاتھ سینے پر دھرے سوگواروں کی صورت بنائے اس نشان کے آگے آگے چل رہے تھے۔ نشانوں کے پیچھے روشن چوکی تھی جس پر بیٹھے ہوئے لوگ نفیری اور نقارے بجا رہے تھے اور شہنائی پر ماتمی دھنیں۔ روشن چوکی کے آگے جھانجھ اور بگل بج رہے تھے اور اس کے دونوں طرف اچھی پوشاکیں پہنے عصا بردار چل رہے تھے۔ عصا برداروں کے پیچھے ایک رواں سبیل تھی جس پر سے جلوس میں شریک لوگوں کو دودھ کا شربت پلایا جا رہا تھا۔ سبیل کے پیچھے ہاتھیوں پر سیاہ پوش سوار ماہی مراتب لیے بیٹھے تھے جن میں ہم نے شمار کیا تو پانچ چیزیں تھیں۔۔۔ تاج، تلوار، مچھلی، سورج اور مور پٹکھی۔ ماہی مراتب والے ہاتھیوں کے پیچھے کئی اور ہاتھی تھے جن کی پشت پر ہودے کسے ہوئے تھے۔ ان ہودوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کے ہاتھوں میں زرتار علم تھے جن کے پرچم ہوا میں لہرا رہے تھے۔ ہاتھیوں کی گردنوں میں فقری گھنٹے اور ہیکلیں لٹکی ہوئی تھیں۔ ان ہاتھیوں کے پیچھے اونٹوں کی ایک قطار تھی اور ان کی عماریوں میں بیٹھے لوگوں کے ہاتھوں میں بھی علم تھے جن کے جواہر نگار

پتکوں سے روشنی پھوٹی پڑتی تھی۔ اونٹوں کی قطار کے پیچھے کچھ پیادے تھے جو ہاتھوں میں نیزے کی شکل کی جھنڈیاں لیے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے وردی پوشوں کا ایک پورا دستہ جنگی باجوں پر ماتمی دھن بجا رہا تھا۔ اس دستے سے متصل پھر جھنڈی برداروں کی صفیں تھیں اور ان صفوں کے بعد خوش لحن سوز خوانوں کی ایک جماعت تھی جو مختلف راگوں میں سوز پڑھ رہی تھی اور سننے والوں کو رلا رہی تھی! اس جماعت کے بعد سونے چاندی کے زیوروں سے آراستہ ذوالجناح تھا جس پر چاندی کی ایک منقش کارچوبلی چھتری سایہ کیے ہوئے تھی۔ اس کے جسم پر ایک چادر پڑی تھی جس میں تیر پیوست تھے اور اس پر یہاں وہاں لال رنگ کے چھینٹے ڈال دیے گئے تھے۔ ذوالجناح کی زین پر ایک عمامہ، ایک کمان اور تیروں سے بھرا ایک ترکش بندھا تھا۔ اس کے آگے ایک شخص ایک بڑی سی کشتی میں انگیٹھی، لوبان دان اور گلاب پاش رکھے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ ذوالجناح کے دونوں طرف زرق برق لباس پہنے کچھ لوگ گس رانی کے لیے ہاتھوں میں چنور لیے ہوئے چل رہے تھے۔ ذوالجناح کے پیچھے پیادوں اور سواروں کے دستے تھے اور ان دستوں کے پیچھے ایک شخص کے ہاتھوں میں سیاہ علم تھا۔ علم کے پنجے میں الٹی کمان میں دو ننگی تلواریں لٹک رہی تھیں۔ علم کو چومنے کے لیے اس کے ساتھ سوگواروں کا ہجوم تھا اور ہجوم کے پیچھے ایک تخت پر رکھی ہوئی کئی فٹ اونچی شاہی ضریح کو کئی کبار مل کر اٹھائے ہوئے تھے۔ ضریح کے پیچھے لاڈوساقن کا تعزیہ تھا۔

سبیلہ نے بڑی ضریح کے پیچھے اس چھوٹے سے تعزیے کو دیکھ کر کہا: ”یہ جو چھوٹا تعزیہ ہے، جانتے ہیں کس کا ہے؟“
 ”لاڈوساقن کا۔“

”ہاں یہ وہی لاڈوساقن ہے۔“ سبیلہ نے بتانا شروع کیا۔ ”جو آصف الدولہ کا امام باڑہ بننے سے پہلے یہاں کی زمین کے ایک بہت چھوٹے سے حصے میں رہ رہی تھی۔“ سبیلہ بتاتی رہیں۔ ”یہ امام باڑہ بننے وقت جب اسے زمین کی بڑی قیمت دی جانے لگی تو اس نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔“ وہ رکیں تو میں نے پوچھا: ”کیوں؟“
 ”اس نے شرط رکھی جس طرح یہاں میں اپنا تعزیہ رکھتی ہوں، امام باڑہ بننے کے بعد وہ تعزیہ اسی جگہ پر اسی طرح رکھا جائے۔“

ساقی از باب حقوق

PDF BOOK COMPANY

مدد، مشاورت، تجاویز اور شکایات:

Muhammad Husnain Siyalvi

0305-6406067

Sidrah Tahir

0334-0120123

Muhammad Saqib Riyaz

0344-7227224



”تو؟“

”آصف الدولہ نے اس کی یہ شرط مان لی اور امام باڑہ بننے کے بعد وہ تعزیہ اُسی جگہ پر اُسی طرح رکھا جانے لگا۔“ یہ بتا کر بولیں: ”پہلی محرم کو شاہی ضرتح کے ساتھ اس تعزیہ کو بھی اٹھایا جاتا ہے۔“

اس تعزیہ کی تاریخ مجھے بھی معلوم تھی لیکن میں نے سبیلہ پر یہی ظاہر کیا جیسے مجھے کچھ نہیں معلوم۔ ہم نے وہیں کھڑے کھڑے جلوس کی زیارت کی۔ سبیلہ نے بڑھ بڑھ کر علم چوے دیر تک سوز سنا، دُلڈل کو بوسہ دیا اور جب جلوس کا آخر حصہ رومی دروازے سے باہر نکل گیا تو مجھ سے بولیں:

”اب چلیے امام باڑے کے اندر۔“

ہم نوبت خانے کے سامنے والے تین بڑے پھاٹکوں میں سے بیچ والے پھاٹک سے جس سے ابھی ابھی جلوس کا آخری حصہ باہر نکلا تھا، اندر داخل ہوئے۔ اندر دائرے کی شکل کے وسیع میدان کے کنارے کنارے بہت خوبصورت پھولوں کے گملے رکھے ہوئے تھے۔ اس دائرے کے اندر ایک اور دائرے میں کیاریاں بنا کر اُن میں رنگ رنگ کے پھولوں کے درخت لگائے گئے تھے۔ ہم گملوں میں کھلے ہوئے پھولوں کو دیکھتے ہوئے بائیں طرف والے کنارے سے گزر کر اُن سیڑھیوں تک پہنچے جن کے بعد پھر تین پھاٹک ہیں۔ یہاں صرف بیچ والا پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ اس پھاٹک سے داخل ہو کر ہم دوسرے والے میدان میں پہنچے جو پہلے والے میدان سے زیادہ بڑا ہے۔ اس بہت کشادہ میدان کے داہنی طرف ایک اونچی کرسی پر آصفی مسجد ہے۔ سبیلہ نے میدان میں کھڑے ہو کر دائیں طرف کی مسجد اور سامنے بنی ہوئی امام باڑے کی عمارت کو دیکھ کر کہا:

”کیسا حیران کرنے والا تناسب ہے۔“

”بنانے والے کا کمال ہے۔“ میں نے کہا۔ کفایت اللہ جنہوں نے اس عمارت کا نقشہ بنایا تھا، انجینئر نہیں تھے لیکن کسی شاہکار عمارت بنادی۔“

”ایسی عمارتوں میں ہم آتے رہتے ہیں، لیکن انہیں خاص نظر سے نہیں دیکھتے۔“ سبیلہ میدان کے چاروں طرف نظر دوڑا کر بولیں۔

”میں نے کہیں پڑھا ہے۔“

”کیا پڑھا ہے؟“

”ایرانی سیاح عبداللطیف شوستری کا بیان۔۔۔ اس عمارت کے بارے میں۔“

”کیا لکھا ہے اُس نے؟“

”امام باڑہ اور مسجد دنیا کے تعمیری عجائب میں سے ہیں۔ اس نے یہاں کی آرائش کے بارے میں بھی لکھا ہے۔“

”کیا لکھا ہے؟“

”محرم میں جب اس کی سجاوٹ ہوتی ہے تو چار پانچ سو جھاڑ اور دو ہزار فرشی فانوس روشن ہوتے ہیں۔ بلوری گلاسوں میں کافی شمعیں جلتی ہیں۔“ یہ بتا کر میں نے بتایا: ”لیکن یہ پرانی بات ہے۔ غدر کے بعد یہاں خاک اڑنے لگی۔“

”ہاں۔“ اماں بتاتی ہیں انگریزوں نے اسے اپنا قلعہ بنا لیا تھا۔ امام باڑے کے پھانک بار بار کھلتے اور بند ہوتے تھے۔ امام باڑے کی چھت اور مسجد کے میناروں سے گولیوں کی بوچھاڑ ہوتی تھی۔“ سبیلہ نے بتایا۔

”سارے امام باڑے میں بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ ہر دھماکے کے ساتھ جھاڑ فانوس ٹوٹ رہے تھے۔“ میں نے کہا۔ ”یہاں کے دھماکوں سے دور کے امام باڑوں کے جھاڑ فانوس لرز جاتے تھے۔“

اُس وسیع میدان میں کچھ دیر کھڑے رہ کر ہم چوڑی سیڑھیاں چڑھ کر اس بہت چوڑے چبوترے پر آئے جس کے بعد امام باڑے کی اصل عمارت میں داخل ہوا جاتا ہے۔ اس عمارت میں داخل ہو کر سبیلہ نے سب سے پہلے اس چھت کو دیکھا جو دنیا کی سب سے بڑی بے ستون چھتوں میں سے ایک ہے۔ پھر انہوں نے اس طلائی مرصع کار سامان کو دیکھا جو زینت کے لیے جابجا نصب ہے۔ پھر اُن قد آدم آئینوں کو دیکھا جو کچھ کچھ فاصلے پر کھڑے کیے گئے ہیں۔ ہم امام باڑے کے وسیع دالانوں میں دیر تک گردش کرتے رہے اور ایک ایک چیز کو غور سے دیکھتے رہے۔ ان چیزوں کو دیکھتے دیکھتے میں نے سبیلہ سے کہا:

”آپ نے ٹھیک کہا تھا۔ ہم یہاں بار بار آئے ہیں لیکن خاص نظر سے اسے آج

ہی دیکھ رہے ہیں۔“
 ”لیکن اب یہاں پہلے والی بات نہیں ہے۔“ سبیلہ نے کہا۔ ”اماں نانی کی بتائی ہوئی باتوں کو یاد کر کر کے کہتی تھیں.....“
 ”کیا کہتی تھیں؟“

”کسی زمانے میں یہاں کے جھاڑ فانوس اور شیشہ آلات شمار میں نہیں آتے تھے۔“
 ”صحیح کہتی تھیں۔“ میں نے کہا۔ ”بزرگ بتاتے ہیں اتنے بڑے دالان ہیں پھر بھی ان کے فرشوں پر رکھے اور چھتوں سے لٹکے سامان کی وہ کثرت تھی کہ ملازموں کو اُن کا سنبھالنا دشوار ہو جاتا تھا۔“

”اماں یہ بھی بتاتی تھیں اور انہیں ان کی ماں نے بتایا تھا یہاں نوابوں کے پرچم بھی تھے۔“ سبیلہ نے بتایا۔ پھر بتایا: ”ایسی ڈھالیں تھیں جن پر خدا کے پاک نام لکھے تھے، خراسانی فولاد کی تلواریں اور نیزے تھے.....“

”اور بہت سے مشہور سپہ سالاروں کی بہت سی دستاریں اور منبر۔“ میں نے کہا۔ ”ہر جمعرات کو یہاں مجلس ہوتی تھی جس میں مشہور روضہ خواں ملا محمد روضہ خوانی کرتے تھے۔“
 پھر سبیلہ کو بتایا: ”یہ بھی دستور تھا لوگ اپنے بیٹے بیٹیوں کی شادی پر سب سے پہلے یہاں آ کر نذر چڑھاتے تھے۔“

دونوں دالانوں کا آرائشی سامان دیکھنے کے بعد سبیلہ اُن درجوں کی طرف گئیں جو تعداد میں چودہ ہیں اور جن میں سے ہر ایک میں ایک ضرت رکھی ہے۔ کسی زمانے میں یہ سب ضرتیں خالص چاندی کی ہوا کرتی تھیں۔ ان ضربیوں کو دیکھنے اور چومنے کے بعد وہ اس امام باڑے کے بانی آصف الدولہ اور ان کی بیگم شمس النساء کی قبروں کی طرف آئیں اور ان کے آگے شیشے کے صندوق میں رکھے ہوئے بادشاہ کے تاج اور تلوار کو دیکھ کر بولیں:

”امام باڑہ نہ بناتا تو کتنے لوگ بھوکوں مر جاتے۔“
 ”صحیح کہہ رہی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”جب قحط کی وجہ سے شرفاروٹیوں کو محتاج تھے تو رات کے پردے میں انہوں نے یہاں مزدوری کی اور اُن کی روزی روٹی کا بندوبست ہوا۔“
 ”نواب نے اس کی تعمیر اور اس کی سجاوٹ میں دو کروڑ صرف کیے۔“

”اور اس کے بننے میں دس سال لگے۔“ میں نے کہا۔

”اس کی تعمیر پوری کب ہوئی۔“ سبیلہ نے پوچھا۔

”غدر سے کوئی ساٹھ برس پہلے۔“

صندوق کے سامنے سے ہٹ کر ہم پہلے والے دالان میں آئے۔ باہر نکلنے سے پہلے سبیلہ نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”وہ جو سامنے درجہ ہے، اُسے دیکھ رہے ہیں۔ وہاں رکھا جاتا ہے لاڈوساقن کا تعزیہ۔“

کچھ دیر بعد ہم دالان سے نکل کر امام باڑے کے بڑے والے پھانک پر آ گئے اور یہاں سے بائیں گھوم کر اس فلک بوس پھانک کی طرف آئے جسے رومی دروازہ کہا جاتا ہے۔ پھانک کے نیچے سے گزرتے ہی سبیلہ نے کہا:

”اس طرف آئے ہیں تو چھوٹے امام باڑے بھی ہو لیں۔“



رومی دروازے سے نکلتے ہی اس امام باڑے کا سفید بیرونی پھانک صاف نظر آنے لگتا ہے اور اس کا گول گنبد بھی۔

”دیکھیے۔“ سبیلہ نے اس گنبد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سنہری برج جو کبھی سونے کا ہوا کرتا تھا کیسا سورج کی طرح چمک رہا ہے۔“

”سرور نے کیا نقشہ کھینچا ہے۔“ میں نے کہا۔

”رجب علی بیگ سرور؟“

”ہاں۔ لکھا ہے شیشے یہاں کے ایسے کہ حلب والے حیرت سے منہ تکیں۔“

”اور کیا لکھا ہے؟“

”جھاڑوں کی یہ کثرت کہ فرنگ والے ہاتھ جھاڑ بیٹھے۔“ یہ کہہ کر میں نے سبیلہ کو بتایا:

”پہلے یہ علاقہ جمنیا باغ کہلاتا تھا، امام باڑہ بننے کے بعد اس کا نام حسین آباد پڑ گیا۔“ پھر بتایا:

”امام باڑے کے بانی محمد علی شاہ نے اس امام باڑے کی خاطر چھتر منزل سے ایک سڑک بنوائی

جو سیدھی اس امام باڑے تک آئی۔ اس سڑک پر بازار بھی لگتا تھا۔“

امام باڑے کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے ہم اس کے اصل پھانک پر آئے اور

اس سے آگے بڑھ کر نوبت خانے کے سامنے والے دروازے سے جب امام باڑے کے اندر داخل ہوئے تو سب سے پہلے ہماری نگاہ اُن دو پتلیوں پر گئی جو دروازے سے کچھ ہی فاصلے پر داہنے بائیں نصب تھیں۔ ان دونوں پتلیوں کے ہاتھوں میں زنجیریں تھیں جن کا دوسرا سرا دروازے کے بالائی حصے پر جا کر ختم ہوتا تھا۔

”یہ زنجیریں؟“ سبیلہ نے پتلیوں کو دیکھ کر پوچھا۔

”فریاد کے لیے نہیں ہیں۔“ میں نے کہا۔

”پھر؟“

”یہ اس لیے ہیں.....“ میں نے بتایا..... ”کہ بجلی گرے تو عمارت کو نقصان پہنچائے بغیر زمین میں اتر جائے۔“ ان پتلیوں کے بعد امام باڑے کے بہت بڑے صحن کے بیچوں بیچ وہ خوبصورت نہر تھی جو امام باڑے کی اصل عمارت کے چوڑے چبوترے تک چلی گئی ہے۔ اُس کے بیچ میں لوہے کا ایک چھوٹا سا پل تھا اور اسی کے آگے نہر کے آخر میں ایک تیرتی ہوئی کشتی پر پورے قد کے دلدل کی شبیہ تھی اور اس شبیہ کو دھوپ سے محفوظ رکھنے کے لیے اس پر ایک چھت بنادی گئی تھی۔ ہم نہر کے کنارے کنارے سبز درختوں اور رنگ رنگ کے پھولوں والے خوش فضا صحن سے گزرتے ہوئے چبوترے پر آ کر اصل عمارت میں داخل ہو گئے اور بہت قیمتی فرشی فانوسوں، قندیلوں اور جھاڑوں سے بھرے ہوئے دونوں دالانوں میں گھوم گھوم کر اس کی آرائش کو دیکھتے رہے۔ سبیلہ نے دوسرے دالان کے درجوں میں رکھی ہوئی ضربیوں اور تعزیوں کی زیارت کی اور پہلے دالان میں رکھے ہوئے چاندی کے منبر کو چوم کر باہر نکل آئیں۔ باہر نکل کر انہوں نے اس عمارت کے تینوں طرف کے اوپری حصوں پر خطاطی کے بہت عمدہ نمونوں کو دیکھ کر کہا:

”اب ایسے لکھنے والے کہاں ہیں۔ نانی کے پاس خطاطی کے بہت عمدہ نمونے تھے۔

لیکن یہاں وہاں رہنے کی وجہ سے سب ادھر ادھر ہو گئے۔“

”خطاطی سے دلچسپی تھی انہیں؟“

”بہت۔ خود سیکھی۔ اماں کو سکھائی، اماں نے مجھے مشق کرائی۔“

”اتنی عمدہ تصویریں بنانے کا یہی راز ہے۔ بچپن سے ہاتھ سدھا ہوا ہے۔“

”کتمو ریشم کے تاروں سے طغرے بناتی ہیں، میں نے نرکل والے قلم سے بہت سے
خطوں میں طغرے لکھے ہیں۔“
”دکھائے نہیں۔“

”عشرہ نکل جانے دیجیے، دکھاؤں گی۔“

ہم یہ باتیں کرتے ہوئے امام باڑے سے باہر نکل آئے۔ باہر نکلتے ہی سبیلہ نے کہا:
”دیر بہت ہو گئی ہے۔ آپ مجھے گھر پہنچا دیجیے۔ کھانا بھی وہیں کھا لیجیے گا۔“
میں نے سبیلہ کو گھر پہنچایا۔ اُن کے ساتھ بہت سادہ سا کھانا کھایا۔ کچھ دیر سبیلہ خانم سے
باتیں کیں پھر چلتے وقت سبیلہ سے کہا: ”چھ محرم کو آٹھ بجے صبح تحسین کی مسجد کی پشت پر تقی صاحب
کے امام باڑے والی مجلس کے لیے آ جائیے گا۔“ پھر انہیں بتایا:
”پہلی مجلس وہیں ہوتی ہے۔ وہاں کے بعد دوسری مجلسوں میں چلیے گا۔ میں آپ کو مسجد
کے دروازے پر مل جاؤں گا۔“

تقی صاحب کے امام باڑے کا نام سن کر سبیلہ خانم تڑپ گئیں۔ بولیں:
”اماں ہماری سیاہ چادر اڑھا کر ہماری انگلی پکڑے پکڑے ہمیں وہاں لے جاتی تھیں۔
کیسی رقت کی مجلسیں ہوتی تھیں۔ ہم جہاں رہتے تھے وہاں سے دو ہی قدم کا فاصلہ تھا۔“ یہ
بتا کر بولیں: ”اماں کہتی تھیں جب وہ خانم صاحب کے مکان میں آئی تھیں اُس وقت وہاں
ممتاز العلماء جنہوں نے یہ امام باڑہ بنوایا تھا، ان کا بہت بڑا باغ تھا جس میں لیمو، جامن،
شریفہ اور دوسرے بہت سے پھلوں کے درخت تھے۔“ پھر بولیں: ”لیکن ہم جب اماں کے
ساتھ وہاں گئے تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔“

”اور ہم بھی تو آپ کے ساتھ وہاں گئے ہیں۔“ سبیلہ بیچ میں بولیں۔ ”کچھ کچھ ہمیں یاد ہے۔“
”جب تک ہم چوک والے مکان میں رہے، جاتے رہے۔“ سبیلہ خانم نے کہا۔
”اب بہت کچھ بدل گیا ہے۔ چاروں طرف آبادی ہے، گھنی آبادی۔“ میں نے کہا۔
”تو چھ کو لے جاؤ انہیں۔“ سبیلہ خانم بولیں۔ ”یہ بھی دیکھ لیں پہلے کیا تھا، اب کیا ہے۔“
”تو چھ محرم کو تحسین کی مسجد کے دروازے پر۔“ میں نے سبیلہ کی طرف دیکھ کر کہا اور ان
کے گھر سے نکل آیا۔

پانچ محرم تک میں صبح سے گئے رات تک چھوٹی بڑی مجلسوں میں شریک ہوتا رہا۔
چھٹی محرم کو صبح آٹھ بجے میں تحسین علی خاں کی مسجد کے دروازے پر پہنچ گیا۔ کچھ ہی
دیر بعد سبیلہ وہاں آ گئیں۔

”چلیے۔ انہوں نے آتے ہی کہا۔“
ہم جیسے ہی وہاں سے امام باڑے کی طرف چلے سبیلہ نے ایک طرف اشارہ
کرتے ہوئے کہا:

”یہیں کہیں پر تھا خانم صاحب کا مکان جہاں نانی لائی گئی تھیں۔“ وہ بہت دیر
تک اس جگہ کو اور اس کے آس پاس کی عمارتوں کو دیکھتی رہیں۔ پھر اکبری دروازے
کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں:

”اسی طرف سے نانی نانا کے ساتھ نکلی تھیں، کانپور کے لیے.....“

”چلیے۔ مجلس شروع ہونے والی ہے۔“ میں نے کہا۔

”اور یہ جو چھتہ ہے، اسی سے نکلتے ہی ہمارا گھر تھا، پتہ نہیں اب وہاں کون رہتا ہے۔“

”دوسری مجلس میں ہم اُسی طرف سے ہو کر جائیں گے، دیکھ لیجیے گا۔ اب چلیے۔“

چند قدم طے کرنے کے بعد ہم تقی صاحب کے امام باڑے پہنچ گئے۔ ذاکر منبر پر بیٹھ
چکے تھے۔ سبیلہ اس طرف جہاں عورتیں بیٹھی تھیں، چلی گئیں اور میں امام باڑے کے اندر
والے دالان میں۔ محرم کی مجلسوں میں فضائل کم مصائب زیادہ پڑھ جاتے ہیں۔ اس لیے
بہت کم فضائل پڑھ کر ذاکر مصائب کی طرف آ گئے اور رقت شروع ہو گئی۔ اور اسی کے بعد مجلس
ختم ہو گئی۔ جب مجمع چھٹ گیا تو سبیلہ اپنے آنسو پونچھتی ہوئی جہاں میں کھڑا تھا وہاں
آ گئیں۔ تقی صاحب کے امام باڑے سے نکل کر ہم اُسی گلی میں آ گئے جہاں شمیمہ خانم کا مکان
تھا اور جہاں سبیلہ کا بچپن گزرا تھا۔ وہ عطر کے کارخانے والے مکان کے سامنے آ کر رک گئیں
اور کچھ دیر پہلے کی بھگی ہوئی آنکھوں کو ایک بار پھر بھگو کر مجھ سے کہا:

”یہیں رہتے تھے ہم، یہیں سے اپنے اسکول جاتے تھے اور.....“ کہتے کہتے رک گئیں۔
”اور.....؟“ میں نے پوچھا۔

”اور یہیں اماں نے آپ سے نہاری کلچے منگوائے تھے۔“ یہ کہہ کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنا سر میرے کاندھے پر رکھ دیا۔ سبیلہ کے آنسو اُن کے رخساروں سے ہوتے ہوئے میرے شانوں تک آ گئے۔ اُس گلی سے گزرنے والے اکاؤنٹکارا بکپروں نے ہمیں دیکھنا شروع کر دیا۔ میری قمیص بھگنے لگی تھی۔ میں نے آہستہ سے اپنے شانے سے سبیلہ کا سر ہٹایا اور دھیرے سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا: ”دوسری مجلس شروع ہو چکی ہوگی۔“

○

ہم دن بھر ایک مجلس کے بعد دوسری مجلس کرتے رہے۔ لکھنؤ میں شاہی امام باڑوں کے بعد غفرانمآب کا امام باڑہ سب سے زیادہ مشہور ہے۔ محرم کی سب سے بڑی مجلس یہیں ہوتی ہے اور دوپہر ہوتے ہوئے ختم ہو جاتی ہے۔ جب ہم اس امام باڑے کی طرف بڑھ رہے تھے تو پرانے لکھنؤ کی یہ چوڑی سڑک عزاداروں سے چھلک رہی تھی۔ ہم اُن کے درمیان سے ہوتے ہوئے غفرانمآب کے امام باڑے کی طرف بڑھے لیکن وہاں جانے سے پہلے سبیلہ آغا باقر کے امام باڑے میں داخل ہو گئیں جو اسی امام باڑے کے راستے میں اس سے چند قدم پہلے ہے۔ سبیلہ کچھ دیر اس امام باڑے کے صحن میں کھڑے ہو کر ایک طرف اشارہ کر کے بولیں: ”وہاں مرزا سودا کی قبر ہے چلیے فاتحہ پڑھ لیں۔“ سودا کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد میں نے سبیلہ سے کہا: ”آپ کو معلوم ہے لکھنؤ کا پہلا امام باڑہ کون سا ہے؟“

”نہیں۔“

”آرائش محفل پڑھی ہے؟“

”میر شیر علی افسوس والی؟“

”جی۔“

”وہ سعادت علی خاں کے زمانے میں تھے۔“ میں نے سبیلہ کو بتایا۔ ”انہوں نے لکھا ہے مرزا ابوطالب خاں کا امام باڑہ لکھنؤ کا پہلا امام باڑہ ہے۔ ریاست اس وقت صفدر جنگ کی تھی۔ اور افسوس نے یہ بھی بتایا ہے یہ امام باڑہ کیسے بنا۔“

”کیسے بنا؟“

”ایک بزرگ مرزا علی نے ایک دوسرے بزرگ کلپ علی خاں سے.....“ میں نے بتانا

شروع کیا.....”جنہوں نے ایک مکان اپنے عزیزوں کے مدفن کے لیے بنوایا تھا اس میں سے تھوڑی سی زمین مانگی۔ اس بزرگ نے وہ زمین دے دی۔“ یہ بتا کر میں نے آگے بتایا: ”مرزا علی نے اس پر امام باڑہ بنوایا لیکن وہ مشہور ہوا ان کے بیٹے مرزا ابوطالب کے نام سے۔“

”کیوں؟“

”مرزا ابوطالب اپنے کارناموں کی وجہ سے باپ سے زیادہ مشہور تھے۔“
”اب اس امام باڑے کے بارے میں بتائیے، جہاں ہم کھڑے ہیں۔“
”یہ امام باڑہ ابوطالب کے امام باڑے کے بعد بنا۔ انہیں شیر علی افسوس نے لکھا ہے.....“

”کیا لکھا ہے؟“

”بعد اس کے شجاع الدولہ کے عہد میں جوہری محلے کے متصل..... سڑک کے اُس طرف یہی محلہ ہے.....“

”جانتی ہوں۔ بڑے عالموں کا محلہ ہے۔“

”..... تو وہاں باقر خاں نے جو مغل رسالدار تھے اور کئی سوسواران کے رسالے میں تھے ایک امام باڑہ بنایا۔ آگے افسوس نے بڑے افسوس کے ساتھ لکھا ہے۔“
”کیا لکھا ہے؟“

”ابوطالب خاں کے امام باڑے کی طرح یہ دوسرا سب سے بڑا امام باڑہ.....“

”سب سے بڑا امام باڑہ.....“

”جس نے بنوایا تھا، اس کے بجائے دوسرے کے نام سے مشہور ہوا۔“

”کس کے نام سے؟“

”آغا باقر کے نام سے۔ آغا باقر تو اس کی تعمیر کے نگران تھے۔“

”تو پھر اسے بنوایا کس نے؟“

”آغا اسماعیل نے۔ وہ آغا باقر خاں کے بھتیجے تھے۔ انہوں نے چچا کے ذریعے یہاں

چوڑی والیوں سے زمین مول لی اور امام باڑہ بنوایا۔“ یہ کہہ کر میں نے کہا: ”اور یہاں عزاداری ایرانیوں کے دستور سے ہوتی تھی۔“

آغا باقر کے امام باڑے سے نکل کر ہم غفرانمآب کی طرف آ گئے۔ اس کے بہت بڑے صحن میں شامیانے تنے ہوئے تھے۔ اور ہر طرف سر ہی سر نظر آرہے تھے۔ گرمی بہت زیادہ تھی اس لئے بہت سے عزادار ہاتھ والے پنکھے اپنے ساتھ لے کر آئے تھے اور جن کے پاس یہ پنکھے نہیں تھے انہیں امام باڑے کی طرف سے تقسیم کیے جا رہے تھے۔ سبیلہ نے پنکھے بانٹنے والے سے ایک پنکھا لے کر مجھ پر جھلنا شروع کر دیا۔ ذاکر نے منبر پر بیٹھ کر جیسے ہی سرنامے کی آیت پڑھنا شروع کی تو ہزاروں کا مجمع جس کی آوازیں صحن میں بہت زیادہ گونج رہی تھیں، یکدم خاموش ہو گیا۔ فضائل کے دوران بار بار صلواتیں پڑھی جاتی رہیں اور جیسے ہی ذاکر مصائب کی طرف آئے لوگوں نے چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیا۔ مجلس ختم ہونے کے بعد بھی دیر تک یہ گریہ جاری رہا۔ مجلس کے بعد جب صحن میں عزادار بہت کم رہ گئے تو ہم امام باڑے کے ایک کونے میں نیم کے درخت کے نیچے آ کر بیٹھ گئے۔ سبیلہ ایک چھوٹے سے ڈبے میں کچھ روٹیاں اور آلو کا بھرتا جو انہوں نے سویرے سویرے پکا لیا تھا، لے آئی تھیں۔ انہوں نے اپنے تھیلے سے چھوٹی سی چادر نکال کر زمین پر بچھائی اور ڈبے کے ڈھکن پر روٹیاں رکھ کر مجھ سے کہا: ”کھائیے۔ پانی سبیل پر چل کر پیئیں گے۔“

”ہم نے اس نیم کے درخت کے نیچے بیٹھ کر روٹیاں اور آلو کا بھرتا کھایا۔ سبیل پر جا کر پانی پیا، پھر اسی درخت کے نیچے آ کر بیٹھ گئے۔ دوپہر کے بعد والی بڑی مجلس کے شروع ہونے میں ابھی دیر تھی اس لیے ہم اس درخت کے نیچے دیر تک بیٹھے۔ اسی بیٹھنے میں سبیلہ نے مجھ سے کہا: ”میں نے آپ سے بتایا نہیں۔ اماں کی تکلیف بڑھتی جا رہی ہے۔“ پھر بولیں: ”عشرے کے بعد انہیں ہسپتال لے جاؤں گی۔ رات میں اگر ایک بار اٹھ گئیں تو سینے پر ہاتھ رکھے رکھے صبح تک جاگتی رہتی ہیں۔“ پھر بڑی مایوسی کے لہجے میں کہا: ”پتہ نہیں یہ محرم کربھی پائیں گی یا نہیں۔“ یہ بتا کر بولیں:

”کل میں نے شہبا کو خواب میں دیکھا۔“

”کیا دیکھا؟“

”پوچھ رہی تھی۔“

”کیا پوچھ رہی تھی؟“

”وہ کیسے ہیں۔ اُنہیں اچکن یا شیردانی پہنائی۔ پہنائی تو کیسے لگے۔“
 ”آپ نے کیا کہا؟“

”کہا ابھی نہیں۔ ابھی ایسا کوئی موقع نہیں آیا۔ دونوں چیزیں میں نے اپنے کپڑوں کی الماری میں رکھ لی ہیں، بڑی احتیاط سے۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئی۔ پھر پوچھا تمہارے یہاں آتے ہیں میں نے کہا روز اس پر وہ اور خوش ہوئی۔ پھر میں نے اُسے اپنا امام باڑہ سجانے اور اس میں ہنگا اور کتوں نے جو تعز یہ لا کر رکھا تھا، اس کے بارے میں بتایا یہ سن کر پہلے تو بہت خوش ہوئی پھر افسوس کرتے ہوئے کہا ہم وہاں ہوتے تو ہم بھی امام باڑہ سجانے میں تم لوگوں کے ساتھ لگتے اور اپنی عزاداری بھی وہیں کرتے، تمہارے یہاں۔ پھر کہنے لگی تمہارا جو خون ہمیں چڑھایا گیا تھا اس سے ہمیں دو چار دن کی زندگی اور مل گئی اور ہم نے اُنہیں دو چار دن اور دیکھ لیا۔ لیکن میں اُس خون کا شکریہ ادا نہیں کروں گی۔ پھر کچھ دیر چپ رہ کر بولی: ہمارا اور تمہارا خون ایک ہی تو ہے۔ پھر کہنے لگی: جب سے ہم اور وہ ایک دوسرے سے ملے جو ہم نے کھایا وہ اُنہیں کھلایا تم بھی جو خود کھانا وہ اُنہیں کھلانا۔“ یہ بتا کر سبیلہ بولیں:

”اس وقت وہ بہت خوش ہو رہی ہوگی۔“
 ”ہاں۔ بہت عمدہ آلو کا بھرتا پکاتی تھی۔“

○

مغرب سے قبل کی آخری مجلس کے بعد سبیلہ اپنے گھر کے لیے چل پڑیں۔ چلتے چلتے مجھ سے بولیں:

”اور ہاں میں بھول گئی تھی۔ کل بھی آنا ہے آپ کو۔ کل آپ کو مولا کا فقیر بناؤں گی۔ سمجھ گئے۔ سات کو فقیر آٹھ کو ہشتی۔“ یہ کہہ کر وہ سواری پر بیٹھ کر غنبر گنج کی طرف نکل گئیں۔
 سات محرم کو ہم نے دن بھر اُسی طرح مجلسیں کیں اور ایک دو وہ مجلسیں بھی کیں جو دورے کی مجلسیں کہی جاتی ہیں اور ہر دوسرے تیسرے گھر میں ہوتی ہیں۔ جو لوگ ان مجلسوں کو پڑھتے ہیں انہیں ذاکر کے بجائے قاری کہا جاتا ہے۔ یہ قاری اپنی مجلس کبھی لُحْن میں پڑھتے ہیں کبھی بغیر لُحْن کے پڑھنے لگتے ہیں۔ جب لُحْن میں پڑھتے ہیں تو انکے گلے کی رگیں پھول جاتی ہیں۔ ہم جس مجلس میں کچھ دیر کے لیے رکے وہاں قاری لُحْن پڑھ رہے تھے جنہیں سننے والے ایک

زمانے سے سنتے آرہے تھے۔ دوپہر کے بعد والی مجلس کے بعد سبیلہ نے مجھ سے کہا:
”ایک اور مجلس میں جانا ہے، اماں نے کہا ہے اسے ضرور سننا۔“
”کون سی؟“

”قصر حسینی کی۔ نوریا گنج کے آگے بلوچ پورہ میں۔ سات محرم کو وہاں زعفر جن کے حال کا مرثیہ پڑھا جاتا ہے۔“ سبیلہ نے کہا۔ ”سنا ہے ایک صاحب.....“
”نجم الحسن نثار۔“ میں نے نام بتایا۔ ”بہت عمدہ پڑھتے ہیں۔ مرثیے کے سیکڑوں ہزاروں بند یاد ہیں۔ پڑھنے پر آتے ہیں تو پڑھتے چلے جاتے ہیں۔“ پھر بتایا: ”پڑھتے وقت سماں کھینچ دیتے ہیں۔ آدھی سے زیادہ مجلس مرثیے کے بندوں میں ہوتی ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے کہا:
”جس مجلس میں ہم چل رہے ہیں۔ ناظمیہ مدرسہ سے والی.....“

”وہاں محسن نواب پڑھتے ہیں۔“ سبیلہ میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے بولیں:
”ہاں اُس مجلس کے بعد چلیں گے قصر حسینی۔“

ہم یہ باتیں کرتے ہوئے مدرسہ سے والی مجلس میں آ گئے۔ مدرسہ کے بہت بڑے ہال میں لوگ آنا شروع ہو گئے تھے۔ سبیلہ اوپر چلی گئیں جہاں عورتوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ اوپر جانے سے پہلے انہوں نے مجھ سے کہا:
”منبر کے بالکل سامنے بیٹھیے گا۔“

اور خود اوپر جا کر ایسی جگہ بیٹھیں جہاں سے منبر کے سامنے بیٹھے ہوئے لوگ اچھی طرح نظر آ سکیں۔ میں منبر کے بالکل سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ مجلس شروع ہونے سے پہلے میں نے اوپر جہاں عورتیں بیٹھی تھیں، نگاہ ڈالی تو سبیلہ مجھے بالکل سامنے بیٹھی نظر آ گئیں۔ اُن کا چہرہ آدھے سے زیادہ کھلا تھا۔ اُن کا بہت صاف رنگ، بڑی بڑی روشن آنکھیں اور بہت خوبصورت دہانہ نیچے سے بالکل صاف نظر آ رہا تھا اور میرے آس پاس بیٹھے نوجوان جو بار بار اوپر کی طرف دیکھ رہے تھے، ان کی نگاہیں سبیلہ کے چہرے پر جا کر ٹھہر جاتی تھیں۔
مولانا نے مجلس بہت دیر تک پڑھی اور مجلس میں شریک لوگوں کو بہت دیر تک رلایا۔ مجلس کے بعد میں مدرسہ کی سیڑھیوں پر آ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے سامنے سے گزرنے والی عورتوں میں سبیلہ کو تلاش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے ہلکے سے میرے شانے پر تھپکی دی۔

”اُدھر نہیں میں اُدھر ہوں۔“

میں مڑا تو سبیلہ سامنے کھڑی تھیں۔ گلی سے سڑک پر آتے ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا:
”مجلس بہت اچھی پڑھی، بہت رقت ہوئی۔“ پھر بولیں: ”کیا اچھی صورت ہے اور

لباس کتنا اجلا تھا اور اسے کتنی اچھی طرح پہنے تھے۔“

”ہاں منبر پر انہیں دیکھ کر لگتا ہے جیسے اسی کے اندر سے اُگے ہوں۔“ میں نے کہا۔

”کیسے ترشے ترشائے جملے تھے۔“ سبیلہ بولیں۔ ”اماں کہتی ہیں یہاں ہر ذاکر کا لہجہ

الگ ہے اور زبان بھی۔ اور یہ بھی کہتی ہیں یہاں ایک اردو نہیں بہت سی اردوئیں ہیں۔“

”صحیح کہتی ہیں۔ اس سے پہلے والی جو مجلس ہم نے سنی تھی مولانا کلب حسین کی۔ اس میں

زبان کتنی سادہ تھی اور کتنی روانی سے پڑھ رہے تھے۔“ میں نے کہا۔ ”چوتھی پانچویں جماعت کا

بچہ بھی آسانی سے سمجھ لے۔“

”ایک بات کہوں۔“ سبیلہ بولیں: ”موقع تو نہیں کہنے کا لیکن کہے بغیر رہا بھی نہیں جاتا۔“

”کہیے۔“

”نانی والی کتاب میں مرزا رسوانے بڑی گاڑھی زبان استعمال کی ہے۔ لغت کے بغیر

اسے پڑھنا مشکل ہے۔“

”صحیح کہہ رہی ہیں۔ اصل میں وہ پڑھنے والوں کو بتانا چاہتے تھے۔.....“

”کیا بتانا چاہتے تھے۔“

”لکھنؤ کی زبان ہم سے ہے۔“

”لیکن آپ ایسی زبان نہ لکھیے گا۔ جو کچھ ہم لوگوں کا حال احوال ہے سیدھے سادھے

انداز میں بیان کر دیجیے گا۔“ سبیلہ نے کہا۔ پھر بولیں: ”میں بھی سوگ کے دنوں میں کیسی

باتیں کر رہی ہوں۔“ پھر کہا:

”تو چلیں زعفر جن کا حال سنئے۔“

”بالکل چلیں۔ ہمارے پہنچتے پہنچتے مجلس شروع ہو جائے گی۔“

کچھ دور چل کر ہم قصر حسینی آ گئے۔ سبیلہ عورتوں والی صحنہ میں چلی گئیں اور میں دالان

میں جا کر بیٹھ گیا۔ پیش خوانی شروع ہو چکی تھی۔ نجم الحسن منبر کے پہلو میں بیٹھے شاعروں کا کلام

من رہے تھے اور انہیں داد دے رہے تھے۔ پیش خوانی ختم ہوئی تو وہ اپنی جگہ سے اٹھے، شیردانی کو ٹھیک کیا اور منبر کے زینوں کو چوم کر پورے مجلسی وقار کے ساتھ اُس پر بیٹھے۔ سر پر ٹوپی کو درست کیا۔ آغازِ کلام والی آیت پڑھی اور زعفر جن کا جو قصہ آج انہیں پڑھنا تھا اس کے بارے میں سننے والوں کو یوں بتانا شروع کیا:

”عزادارو!

آج محرم کی سات تاریخ ہے۔ آج میں آپ کے سامنے زعفر جن کے حال کا مرثیہ پڑھوں گا۔ قصہ میر عشق نے اس مرثیے میں یوں بیان کیا ہے کہ ایک عالم دین کو خراسان کے ایک کتب خانے میں ایک کتاب ملی جس میں ایک شخص نے اپنے دریائی سفر کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس دریا میں جس سے میرا سفینہ گزر رہا تھا، ناگہاں ایک زور کا طوفان آیا، ایسا طوفان جس میں پانی کی موجیں گزروں اچھلنے لگیں۔ اُن موجوں کے تھپڑے اتنے تیز تھے کہ ان کی چوٹوں سے کشتی ہماری ٹوٹ گئی اور اس پر سوار سب کے سب لوگ دریا میں ڈوب گئے۔ میں ایک تختہ کشتی پر جو کسی طرح ٹوٹنے سے بچ گیا تھا آنکھ بند کیے طوفان کے تھمنے کی دعا مانگتا رہا۔ جب طوفان کا زور ختم ہوا اور کشتی کا وہ تختہ ہچکولے کھاتا ہوا بہت دیر بعد کنارے سے آکر لگا تو میں نے دیکھا یہ ایک ویران جزیرہ ہے جہاں نہ درخت ہیں نہ جانور نہ کوئی آدم زاد۔ میں نے نگاہ کو دور تک دوڑایا تو دیکھا ایک جگہ ایک شخص خاک پر تنہا بیٹھا ہے اور اس کے بال زمین پر پھیلے ہوئے ہیں۔ میں اس کی پشت پر گیا تو کیا دیکھتا ہوں وہ خاک پر اپنی انگلی سے حسین کا نام لکھ کر زار و قطار رو رہا ہے۔ میں اس کی پشت سے اس کے منہ کی طرف آیا اور پوچھا اے شخص اس ویران جزیرے میں تیری زاری کا سبب؟ وہ بولا اے مسافر میں حیران ہوں کہ تو اس خوفناک جزیرے میں جہاں دھوپ اداس رہتی ہے اور چاندنی رندھی ہوئی نکلتی ہے کیونکر آن پہنچا۔ یہ سن کر میں نے اسے اپنا سارا حال بتایا تب وہ روشن چہرے اور دراز گیسو والا شخص بولا اے مسافر تجھے خبر نہیں کہ بلا کے میدان میں علی کا لال مارا گیا اور جن اور ملائک اور بشر سب اُس کی موت کے غم میں ڈوبے ہیں۔ یہ سن کر میں نے سینے پر ہاتھ مارا اور کہا یہ کیا غضب ہوا اے شخص میں انہیں کا غلام، انہیں کا چاہنے والا ہوں لیکن تو

بتا تو کون ہے اور امام کے شہید ہونے پر اس طرح کیوں رو رہا ہے:
 یہ سن کے یاس سے مجھ پر نگاہ کی اس نے کہا کہ زعفر جن اور آہ کی اس نے
 اس کے یہ کہنے پر جگر میں نے اپنا تھام لیا، آنکھوں سے میری لہو ٹپکنے لگا۔ میں نے
 مضطرب ہو کر اس سے کہا:

بہت حسین کی باتوں کا ہے مزہ مجھ کو سناؤ قصہ میدانِ کربلا مجھ کو
 وہ شخص اسی عالمِ زاری میں گویا ہوا:
 سناؤں مختصر اچھا نہیں ہے زیادہ طول وہ میرے جشن کا دن تھا موافقِ معمول
 امورِ سلطنتِ انبساط میں مشغول کہ ناگہاں کئی جن آئے بے قرار و ملول

حواس اڑے ہوئے تھے جان سے بھی عاری تھے
 بندھی تھیں ہچکیاں آنکھوں سے اشک جاری تھے
 سروں کو پیٹ کے چلائے یوں سرد دربار یہ تخت و تاج تصدق ہے جس کا اے سردار
 وہ بادشاہ ہیں اس وقت جان سے بزار چلی حسین علیہ السلام سے تلوار

اٹھائے صبح سے لاشے نہ کی فغاں اب تک
 لڑے حسین بہتر لڑائیاں اب تک
 کیا وہاں سے جہاں تک مری نگاہ نے کام نظر کچھ اور نہ آیا سوائے لشکرِ شام
 ٹھہر کے میں نے جو پوچھا کہاں ہیں میرے امام خبر جو لائے تھے جن، یوں کیا انہوں نے کلام

بڑا ہجوم ہے زخموں سے چور ہیں شبیر
 نظر یہاں سے نہ آئیں گے دور ہیں شبیر
 یہ بند پڑھنے کے بعد نجم الحسن نے مرثیے کے وہ بند پڑھے جن میں زعفر کے کربلا
 پہنچنے، دشمنوں سے جنگ کی اجازت طلب کرنے، امام کے اجازت نہ دینے اور ان کے
 شہید ہو جانے کا ذکر تھا۔

حیرت اور طلسم سے بھرے ہوئے اس قصے کو پڑھنے میں کبھی نجم الحسن کا لہجہ دھیمہ ہوتا
 کبھی تیز۔ جب ان کا بیان نثر میں ہوتا تو لہجے میں ٹھہراؤ آ جاتا اور جب وہ نظم کی طرف آتے
 تو آواز دھیرے دھیرے اونچی ہونے لگتی۔ آواز کی تیزی اور لہجے کی بلندی ہر بند کے بعد

بڑھتی جاتی۔ سننے والوں کو منظر پوری طرح دکھانے کے لیے وہ اعضا کی حرکتوں سے بھی کام لے رہے تھے۔ مجمع ان کے ایک ایک انداز پر فدا تھا۔ پورے ہال اور باہر صحن میں واہ واہ کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ نٹاری کے ماہر نجم الحسن نے اپنے پڑھنے کے انداز سے وہ سب کچھ دکھا دیا جو مرثیے میں بیان کیا گیا تھا۔

جب وہ مجلس پڑھ کر منبر سے اترے تو پسینے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ لوگ بڑھ بڑھ کر ان کے ہاتھ چوم رہے تھے اور ان کے پڑھنے کی داد دے رہے تھے۔ عزا خانے سے باہر نکلتے ہی سبیلہ نے مجھ سے کہا:

”کیا غضب کی مجلس پڑھی۔ سماں باندھ دیا۔ ایسے پڑھ رہے تھے جیسے سب کچھ نگاہوں کے سامنے ہو رہا ہو۔“

”ہاں۔ اب ان کے بعد ایسی مجلس پڑھنے والا کوئی ہے نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”یہ انداز انہیں پر ختم ہے۔“

ٹوریا گنج سے جب ہم نخاس کی طرف آئے تو دو خانہ معدن الادویہ سے مہندی کے جلوس کے اٹھنے کی تیاری ہو رہی تھی۔ امام حسین کے بیٹے جناب قاسم کی یاد میں اٹھنے والا یہ جلوس، میری ماں بتاتی تھیں، شاہی کے زمانے میں بڑے تزک و احتشام سے اٹھتا تھا۔ لیکن اب جلوس میں پہلے جیسا اہتمام نہیں تھا۔ پھر بھی کم کم ہی سہی اس جلوس میں ہاتھی بھی تھے اونٹ گھوڑے بھی اور جھنڈیاں لیے ہوئے وردی پوش بھی۔

اور انہیں کے ساتھ قرنا اور نفیری بجانے والوں کی ایک دو چوکیاں بھی تھیں اور ان چوکیوں کے پیچھے کچھ خوانوں میں مٹھائیاں، خشک میوے اور پھولوں کے ہار تھے اور سب سے پیچھے جناب قاسم کا تابوت۔ جلوس سڑک سے گزرنا شروع ہوا تو ہم نے ایک طرف کھڑے ہو کر اس کی زیارت کی اور جب وہ ہمارے سامنے سے نکل گیا تو سبیلہ نے مجھ سے کہا:

”ابھی شاہ گنج سے بھانڈوں والی مہندی بھی آئے گی۔“ ۱۷۱ حسن کی مہندی
 ”ہاں، بہادر حسین بھانڈ سب انہیں جہاز کہتے ہیں وہ اس مہندی میں میاں احسان کا لوحہ پڑھتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”اماں کہتی ہیں بڑا اثر ہے ان لوگوں کی آواز میں۔“

”دوسری مہندیاں اس کے سامنے پھیکی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”جہاز ہر مصرعے کے بعد ہائے اور ہے ہے کہتے ہیں اور جس درد بھرے انداز میں کہتے ہیں اس کی نقل دوسرے بھانڈوں سے نہیں ہو سکتی۔“

ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ ہمارے کان میں درد بھری آواز آنا شروع ہوئی:

رن میں بیوہ حسن کی پکاری میرے قاسم کی آتی ہے مہندی
میں پیمبر کے پیالے بھروں گی (ہے ہے) بی بی زہرا کی صحنک کروں گی
(ہائے) شمع مشکل کشا کی دھروں گی میرے قاسم کی آتی ہے مہندی
میں نے نظر اٹھائی تو شاہ گنج کی طرف سے بھانڈوں والی مہندی یہ نوحہ پڑھتی ہوئی
آ رہی تھی۔ سبیلہ نے اس مہندی کے قریب جا کر پورا نوحہ سنا پھر مجھ سے پوچھا:

”بتا سکتے ہیں کس راگ میں پڑھ رہے ہیں یہ لوگ۔“

”نہیں مجھے اتنی سمجھ نہیں ہے۔“ میں نے راگ سمجھ لینے کے باوجود کہا۔

”اچھا اب گھر چلیے۔ اماں امام باڑہ کھولے انتظار کر رہی ہوں گی۔“



ہم سبیلہ کے گھر پہنچے تو شمیمہ خانم واقعی امام باڑے کے سامنے بیٹھی تھیں۔ سبیلہ نے انہیں پہلی مجلس سے لے کر مہندی کے اٹھنے تک کا حال بتایا۔ پھر مہندی کا جو سامان خریدا تھا اسے امام باڑے میں رکھا اور اس کے چاروں طرف شمعیں روشن کیں۔ پھر وہ اپنے کمرے میں گئیں اور وہاں سے ایک سبز کرتہ اور سبز ٹوپی لا کر مجھ سے کہا:

”اسے پہنیے۔“

میں نے وہ کرتہ اور ٹوپی پہن لی تو انہوں نے ایک چھوٹے سے ہرے کپڑے کے چاروں کونوں کو ناڑے سے باندھ کر اس کی ایک جھولی بنائی اور اسے میرے گلے میں ڈال دیا۔ پھر میری پانچوں انگلیوں میں چھلے پہنائے اور مجھے امام باڑے کے بالکل سامنے کھڑا کر کے ماں بیٹی نے یہ نوحہ پڑھنا شروع کیا:

ع حسین نام ہے جس کا نبی کا پیارا ہے
نوحہ ختم ہوتے ہی سبیلہ نے میرا بازو پکڑ کر امام باڑے میں رکھی ہوئی ضریح کی

طرف دیکھ کر کہا:

”ہم آپ کو مولا کے نام پر گروی کرتے ہیں۔“

اس کے بعد امام باڑے میں رکھے ہوئے مہندی کے سامان میں سے مجھے تھوڑی تھوڑی چیزیں چکھائیں۔ جب یہ ساری رسمیں پوری ہو گئیں تو میں اسی طرح فقیر بنا بنانا کے گھر سے نکل آیا۔

○

دوسرے دن..... دن بھر کی مجلسیں کرنے کے بعد جب ہم سبیلہ کے گھر پہنچے تو شملہ خانم وہ ساری چیزیں تیار کر چکی تھیں جن پر آج نذر دی جانا تھی۔ سبیلہ نے گھر پہنچتے ہی امام باڑے کے سامنے دسترخوان بچھایا اور اس پر طشتریوں میں گلاوٹ کے کباب، پراٹھے اور حلوہ رکھا اور ایک طشتری میں کٹی ہوئی مولی، پودینہ، ادراک اور پیاز کے لچھے اور دو تین گلاسوں میں دودھ کا شربت۔ پھر شمع دان میں شمعیں روشن کیں اور کل ہی کی طرح مجھے امام باڑے کے سامنے کھڑا کر کے میرے سر پر ہر اصفہ باندھا پھر کمر کے گرد باندھنے کے لیے ایک لال لنگی دی۔ پھر میرے کاندھے پر ایک سوکھی ہوئی مشک باندھی اور میرے ہاتھ میں دودھ کی کٹوری دے کر نوحہ پڑھنا شروع کیا:

ع مارا گیا ہے ہے مرا غمخوار علمدار

نوحہ ختم کر کے سبیلہ مجھے امام باڑے کے سامنے لائیں اور مجھ سے کہلوا یا: ”میں جناب سکیںہ کا صدقہ ہوں۔“

میرے یہ کہنے کے بعد انہوں نے دودھ کی کٹوری میں مشک ڈبو کر وہ دودھ پہلے مجھے پلایا پھر خود پیا پھر اپنی ماں کو دیا۔ جب یہ سب ہو گیا تو ہم نے دسترخوان پر بیٹھ کر نذر کا سامان نوش کیا۔ دسترخوان پر بیٹھے بیٹھے میں کسی اور دنیا میں چلا گیا۔ مجھے گم صم دیکھ کر سبیلہ نے پوچھا: ”کہاں کھو گئے۔“

”اپنا امام باڑہ یاد آ گیا۔ اماں دونوں دن اسی طرح گروی کرتی تھیں اور نذر کے سامان میں بھی یہی سب رکھتی تھیں۔“

میرے یہ کہنے پر ماں بیٹی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کچھ دیر تک دونوں کچھ

نہیں بولے۔ خاموشی کا یہ وقفہ گزر جانے کے بعد سبیلہ بولیں:

”اب چلتے ہیں علم کی زیارت کے لیے۔“

اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا شمیمہ خانم بولیں:

”محرم کے معاملے میں یہ اپنی نانی سے کئی قدم آگے ہے۔ عاشورے کی آخری مجلس تک

تمہیں اس کے ساتھ رہنا پڑے گا۔“

شمیلہ خانم کا جملہ ختم ہوتے ہی سبیلہ چلنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ باہر نکل کر انہوں

نے مجھ سے کہا:

”یہ پہلا موقع ہے کہ میں صبح سے شام تک مجلسیں کر رہی ہوں۔ جانتے ہیں کیوں؟“

”کیوں؟“

”آپ کا زیادہ سے زیادہ ساتھ رہے گا اور جتنا میں آپ کے ساتھ رہوں گی، شہباز اتنا

خوش رہے گی۔ دوسرے یہ.....“

”دوسرے کیا؟“

”آپ جلوسوں اور مجلسوں کے بارے میں بہت جانتے ہیں۔ آپ کے ساتھ رہوں گی

تو سب معلوم ہوتا رہے گا۔ اور ایک بات اور.....“

”وہ کیا؟“

”عزاداری میں آپ کی ماں بہت آگے آگے رہتی تھیں۔ انہیں کی طرح میں بھی یہ سب

کروں گی تو وہ آپ کو یاد آتی رہیں گی۔“ سبیلہ بولیں۔ پھر کہا: ”ایک بات کہوں۔“

”کہیے۔“

”جب آپ اپنی ماں کو یاد کرتے ہیں، مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ

میرے پاس آ کر بیٹھ گئی ہوں۔“

یہی باتیں کرتے ہوئے ہم دریا کنارے بنی ہوئی اس مسجد کی طرف چل دیے جہاں

سے آج کی رات حضرت عباس کا علم اٹھتا ہے۔ ہم وہاں پہنچے تو مجمع بہت ہو جانے کی وجہ سے

مسجد کے آس پاس ہمیں بیٹھنے کی جگہ نہیں ملی۔ سبیلہ ہجوم میں راستہ بناتی ہوئی مسجد کے اس رخ

پر آئیں جہاں دریا بہہ رہا تھا۔ انہوں نے مسجد اور دریا کے درمیان چاندنی میں چمکتی ہوئی

ریت پر چادر بچھائی اور ہم دونوں اس پر بیٹھ گئے۔ اس مجلس میں اور مجلس کے بعد علم کے جلوس میں روشنی کا اہتمام نہیں ہوتا۔ کچھ مشعلیں جلادی جاتی ہیں انہیں کی روشنی میں علم نکلتا ہے اور پرانے لکھنؤ کے اسی امام باڑے میں جس کے درخت کے نیچے بیٹھ کر پچھلے دو تین دن سے ہم کھانا کھا رہے تھے، جا کر بڑھا دیا جاتا ہے۔ مجلس شروع ہونے سے پہلے سبیلہ نے مجھ سے پوچھا:

”یہ مجلس یہاں کیوں کی جاتی ہے؟“

”فرات کا منظر تازہ کرنے کے لیے۔“ میں نے کہا۔ ”اور روشنی اس لیے نہیں کی جاتی کہ عصر کے بعد کربلا کے میدان پر جو اندھیرا چھا گیا تھا، نگاہ کے سامنے رہے۔“

مجلس شروع ہوئی تو پورے مجمعے کی طرح ہم بھی خاموش ہو گئے۔ مجلس کے بعد جب مسجد سے علم برآمد ہوا تو لوگ اسے چومنے کے لیے ایک دوسرے پر گرنے لگے۔ میں علم چومنے کے لیے اس کی طرف بڑھا تو سبیلہ میرا بازو پکڑ کر بولیں:

”اس اندھیرے میں میں آپ کو کہاں ڈھونڈوں گی۔“ پھر بولیں:

”ایسا کیجیے ہم علم کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں، جب مجمع کم ہو جائے گا تو ہم دونوں ایک ساتھ چل کر اسے چومیں گے۔“

اور جب ایک جگہ مجمع کم ہوا تو سبیلہ تیزی سے میرا ہاتھ پکڑ کر علم کی طرف بڑھیں۔ اسی وقت سوگواروں کا ایک ریلہ آیا اور ان کی گرفت میرے ہاتھ پر ڈھیلی پڑنے لگی۔ سبیلہ نے پوری قوت سے لوگوں کو ہٹا کر پھر میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ لوگوں کو چیرتے ہوئے ہم کسی طرح علم تک پہنچے۔ سبیلہ نے میرا ہاتھ پکڑے پکڑے علم کی چھڑ سے اپنی پیشانی کو مس کیا پھر اس کے پھر ہرے کو تھام کر مجھ سے کہا:

”اماں کے ٹھیک ہو جانے کی دعا کیجیے۔“

میں نے جیسے ہی علم کو بوسہ دیا، سبیلہ مجھے کھینچتی ہوئی ہجوم سے باہر نکال لائیں۔ باہر آتے ہی انہوں نے مجھ سے پوچھا:

”آپ نے اماں کے لیے دعا کی؟“

”کی۔ انشاء اللہ وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔“

”میں نے بھی آپ کے لیے بہت سی دعائیں کیں۔ دل کہتا ہے سب قبول ہوں گی۔“

رات زیادہ ہو چکی تھی۔ سواری اس وقت سڑک پر کوئی نہیں تھی۔ ہم پیدل ہی سبیلہ کے گھر کی طرف چل دیے۔ وہاں پہنچتے پہنچتے رات اور زیادہ ہو گئی اس لیے شمیلا خانم نے مجھے وہیں روک لیا۔ شہبا کی موت کے بعد یہ دوسری رات تھی جو میں نے اس گھر میں گزاری تھی۔



صبح سبیلہ نے اٹھ کر چائے بنائی، اسی کے ساتھ بہت سادہ سا کھانا پکایا۔ چائے پینے اور کھانا پکانے کے بعد وہ اپنی ماں سے بولیں:

”رات کو ہم شب عاشور والے علم کے بعد لوٹے تو لوٹے نہیں تو اسی طرف رہیں گے۔ رات بھر روضوں اور امام باڑوں کی زیارت کریں گے اور شہبا کی قبر پر بھی جائیں گے۔“ یہ کہہ کر انہیں بتایا: ”پچھلے پہر واپس آئیں گے اور صبح کو تالکٹورے والی کربلا کے لیے نکل جائیں گے۔“ شمیلا خانم کچھ نہ بولیں۔ بس اتنا کہا: ”شہبا کی قبر پر ضرور جانا اور ایک شمع میری طرف سے بھی روشن کر دینا۔“ پھر بولیں:

”اور یہ جو تالکٹورے والی کربلا ہے، اب اسی نام سے جانی جاتی ہے، یہ میرا خدا بخش کی کربلا ہے۔ اب کچھ ہی لوگ میرا خدا بخش کا نام جانتے ہیں۔“

”تو اسے تالکٹورے کی کربلا کیوں کہتے ہیں؟“ سبیلہ نے پوچھا۔

”کہا جاتا ہے جب کربلا بنی تھی، وہ علاقہ گڑھی کٹورہ کہلاتا تھا۔ کربلا بننے میں جب مٹی کی ضرورت پڑی تو وہاں ایک بڑا گڑھا کھودا گیا جو مثل تالاب کے ہو گیا۔“ شمیلا خانم نے بتایا۔ ”اسی مناسبت سے اسے تالکٹورہ کہا جانے لگا۔“

”کربلا اسی جگہ پر کیوں بنی۔“

”وہ جگہ شہر سے بہت دور تھی اور وہاں صحرائیت زیادہ تھی۔“ یہ کہہ کر انہوں نے آگے بتایا: ”تمہاری نانی، جیسے تم نے مجھ سے پوچھا ہے ایسے ہی میں نے ان سے پوچھا تھا، بتاتی تھیں ایک روز سعادت علی خاں کی سواری آموں کے باغ سے گزر رہی تھی۔ بہو بیگم کے بھائی نواب قاسم علی خاں ان کے ساتھ تھے۔“ شمیلا خانم بتاتی رہیں۔ ”جب سواری اُس مقام پر پہنچی جہاں کربلا ہے تو سعادت علی خاں نے اُن سے کہا: ”شہر والے پے کے بجائے یہاں تعزیرے دفن کریں، یہاں صحرائیت زیادہ ہے۔“ اسی کے بعد یہاں میرا خدا بخش کی کربلا بن گئی

اور تالکھورے والی کر بلا کے نام سے مشہور ہو گئی۔“

شمیلہ خانم نے کر بلا کے نام اور اس جگہ اس کے بننے کے بارے میں اپنی بات ختم کی تو سبیلہ بولیں:

”تو کل ہم میرا خدا بخش کی کر بلا جائیں گے۔“ یہ کہہ کر انہوں نے ایک تھیلے میں ایک چھوٹی سی چادر رکھی اور ایک ڈبے میں پکائے ہوئے کھانے میں سے تھوڑا سا کھانا اور چلنے کے لیے تیار ہو گئیں۔



آج کے دن عورتیں بال کھلے رکھتی ہیں اور سوگوار برہنہ پا گھر سے باہر نکلتے ہیں۔ سبیلہ کے لمبے سیاہ بال اُن کے شانوں پر پڑے تھے۔ ان کے چادر اوڑھنے سے پہلے میں نے انہیں دیکھا تو کھلے ہوئے بالوں میں ان کا چہرہ اور زیادہ چمک رہا تھا۔ انہوں نے ایک سیاہ چادر سر پر ڈالی اور ہم گھر سے باہر نکل آئے۔ پرانے لکھنؤ کی طرف آتے ہی سڑکیں سوگواروں سے بھری ہوئی نظر آنے لگیں۔ بچے، بوڑھے، نوجوان سب سیاہ لباس پہنے چھوٹے چھوٹے جتھوں کی شکل میں امام باڑوں کی طرف جا رہے تھے۔ دن بھر ہم آدمیوں کے اسی سمندر سے گزرتے رہے اور ایک کے بعد ایک مجلس کرتے رہے۔ غفرانمآب کے امام باڑے میں مجمع آج اُٹھ آیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا سارے کے سارے لوگ اپنے گھروں سے نکل آئے ہیں۔ آج مولانا نے مجلس بہت دیر تک پڑھی، بہت دیر تک گریہ ہوا اور جب کر بلا کے شہیدوں کی شبیہیں نکلتا شروع ہوئیں تو ان میں پیوست تیروں اور ان کی چادروں پر پڑے ہوئے خون کے چھینٹوں کو دیکھ کر لوگوں کا گریہ اور بلند ہوا۔ شبیہیں اٹھتے اٹھتے تیسرا پہر آگیا تھا۔ امام باڑے سے مجمع کے نکلنے میں آج بہت دیر لگی۔ لوگ جیسے ہی اس درخت کے نیچے سے جہاں بیٹھ کر ہم روز کھانا کھاتے تھے، ہٹے تو سبیلہ نے چادر بچھا کر کھانے والا ڈبہ نکالا اور ہم نے جلدی جلدی کھانا کھایا۔

مغرب سے پہلے والی مجلس کے بعد سبیلہ اچانک اپنے گھر جانے کے لیے بے چین ہو گئیں۔ کہنے لگیں:

”میرا دل اماں میں لگا ہوا ہے۔ میں ذرا گھر ہواؤں۔ دیکھ آؤں انہوں نے کھانا ٹھیک سے کھایا اور دوا اپنی لی۔“ یہ کہہ کر بولیں:

”علم والی مجلس شروع ہونے سے پہلے میں آپ کو غفرانمآب کے دروازے پر مل جاؤں گی۔ وہاں سے ہم ناظم صاحب کے امام باڑے چلیں گے مجلس سننے اور علم کی زیارت کرنے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں امام باڑے کے دروازے پر آپ کو مل جاؤں گا۔“

○

سبیلہ مجلس کے وقت سے بہت پہلے آ گئیں۔ میں غفرانمآب کے دروازے پر پہنچا تو وہ تیزی سے میری طرف بڑھ کر بولیں: ”چلیے ناظم صاحب کے امام باڑے۔“

”اماں آپ کی ٹھیک ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”ٹھیک ہیں۔ کھانا بھی کھایا اور دوا بھی لی۔ کہا ہے آدھی رات کے بعد آ جانا۔ امام باڑے کے سامنے بیٹھ کر انہیں راگوں میں سوز پڑھیں گے جن راگوں میں اماں پڑھا کرتی تھیں۔“ یہ کہہ کر بولیں:

”اور یہ بھی کہا ہے.....“

”کیا کہا ہے۔“

”اُن سے الگ نہ ہونا۔ بھیڑ بہت ہوگی اور اندھیرا بھی رہے گا۔“

غفرانمآب سے ناظم صاحب کا امام باڑہ چند قدم کے فاصلے پر ہے لیکن سڑک پر ہجوم ہونے کی وجہ سے یہ فاصلہ طے کرنے میں ہمیں دیر لگی۔ امام باڑہ بہت پہلے بھر چکا تھا اور باہر سڑک پر بھی دور تک آدمی ہی آدمی تھے۔ ہمیں عزا خانے سے کچھ دور ایک چھوٹے سے چبوترے پر بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔ ہم نے وہیں بیٹھ کر مجلس سنی اور جب امام باڑے سے علم برآمد ہوا تو بہت زیادہ ہجوم کی وجہ سے اس تک پہنچنا ہمارے لیے ممکن نہ ہوا۔ ہم نے دور ہی سے علم کی زیارت کی اور جب علم بہت آگے نکل گیا اور مجمع سڑک پر بہت کم ہو گیا تو ہم روضوں اور امام باڑوں کی طرف چل پڑے۔

آج ساری رات کربلائیں اور امام باڑے کھلے رہتے ہیں اور وہاں ماتم کی صدائیں بلند ہوتی رہتی ہیں۔ یہ رات عبادت اور نوحہ خوانی میں گزاری جاتی ہے اور لوگ اپنے عزیزوں کی قبروں پر جا کر فاتحہ پڑھتے اور چراغ روشن کرتے ہیں۔ میں نے اور سبیلہ نے طے کیا کہ پہلے ہم دوسری کربلاؤں اور امام باڑوں میں جائیں گے اور پھر وہاں جہاں شہباز دفن ہے۔ آدھی

رات سے پہلے پہلے ہم بہت سی کربلاؤں اور امام باڑوں میں ہو آئے۔ سبیلہ نے ان سب کربلاؤں اور امام باڑوں میں روضوں کی جالیوں سے لگ کر دعائیں مانگیں اور جب آدھی رات ہونے کو آئی تو ہم کربلا ملکہ جہاں کی طرف چل دیے۔ کربلا میں داخل ہو کر ہم نے دیکھا بہت سی قبروں پر چراغ روشن ہیں اور بہت سی قبروں پر چراغ جلانے والے آرہے ہیں۔ ہم شہبا کی قبر کی طرف بڑھے تو سبیلہ نے میرا بازو پکڑ کر مجھ سے کہا:

”مجھے سنبھالے رہیے۔“

قبر پر پہنچ کر سبیلہ خود کو سنبھال نہیں سکیں اور جب تک میں انہیں سنبھالوں سنبھالوں انہوں نے خود کو قبر پر گرادیا۔ بہت دیر تک وہ اسی حالت میں قبر سے لپٹی ہوئی زیر لب کچھ کہتی رہیں۔ میں ان سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہو گیا تھا لیکن ان کے بولے ہوئے لفظ مجھے صاف سنائی دے رہے تھے۔ وہ کہہ رہی تھیں:

”میں انہیں کے ساتھ یہاں آئی ہوں۔ وہ میری پشت پر کھڑے ہیں۔ یہ محرم کے دن ہیں اور میں انہیں کے ساتھ مجلسوں میں جا رہی ہوں۔ یہ آخری رات ہے۔ کل ہم تالکھورے والی کربلا جائیں گے۔ سہ پہر تک وہیں رہیں گے پھر شام غریباں کی مجلس کریں گے۔ میں نے، جیسا تم نے کہا تھا، انہیں اکیلا نہیں چھوڑا۔ ان کی اچکن اور شیردانی بھی میری الماری ہی میں ہیں۔ محرم ختم ہوتے ہی انہیں پہناؤں گی اور تمہیں آ کر بتاؤں گی کیسے لگ رہے تھے۔“

اس کے بعد وہ چپ ہو گئیں اور ایسا لگ رہا تھا جو کچھ انہوں نے کہا ہے اس کا جواب سن رہی ہوں۔ جب سبیلہ بہت دیر تک قبر سے نہیں اٹھیں تو میں نے ان کے قریب جا کر کہا:

”اٹھیے۔ چراغ روشن کیجیے۔“ یہ سن کر انہوں نے قبر پر تین چراغ روشن کیے۔ ایک میری طرف سے، ایک اپنی ماں کی طرف سے اور ایک اپنی طرف سے۔ تینوں چراغ جلا کر وہ بہت دیر تک خاموش بیٹھی رہیں۔ پھر بولیں: ”اپنا ہاتھ دیجیے۔“ اور جب وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھیں تو میں نے ان سے پوچھا:

”آپ شہبا سے کچھ کہہ رہی تھیں۔“

”آپ سن رہے تھے؟“

”کچھ کچھ۔“

”میں نے اُس کے پوچھنے سے پہلے سب کچھ اسے بتا دیا۔ بہت خوش ہوئی۔ پھر مجھ سے ایک وعدہ لیا۔“

”کون سا وعدہ؟“

”ابھی نہیں بتاؤں گی۔ اس سے بھی میں نے یہی کہا ہے۔“

”کیا کہا ہے؟“

”زندہ رہی تو وعدہ ضرور پورا کروں گی۔“

اس سے آگے میں نے سبیلہ سے کچھ نہیں پوچھا۔ قبر سے ہٹنے کے بعد میں نے اُن سے کہا:

”ان کی ماں کی قبر، جب یہ زندہ تھیں، بتایا تھا یہاں سے کچھ دور پر ہے۔ لیکن اُدھر کی

ساری قبروں کے نشان مٹ چکے ہیں۔“

”اور آپ کی ماں کی قبر بھی.....“

”یہیں ہے۔ دوسرے والے روضے کی دیوار کے قریب۔“ میں نے سبیلہ کو بتایا۔

”تو چلیے اُدھر چلتے ہیں۔“

دوسرے والے روضے کے قریب پہنچ کر میں نے سبیلہ کو اپنی ماں کی قبر دکھائی۔ قبر دیکھ کر

انہوں نے میری طرف دیکھا پھر مجھ سے پوچھا:

”کتنے سال ہوئے انہیں.....“

”کتبے پر سب لکھا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”چراغ روشن کریں گی تو سب نظر آ جائے گا۔“

سبیلہ نے چراغ روشن کیا اور اس کی روشنی میں بول بول کر کتبے کی عبارت پڑھنا شروع کی:

جو عدم سے آگیا دنیا میں، بولی ہنس کے موت

اور اک دو چار دن کے میہماں پیدا ہوئے

.....

”یہاں ذاکیہ بیگم حدیث خوان دفن ہیں۔ مرحومہ نے بہت دکھ بھری زندگی

بڑی قناعت کے ساتھ گزاری۔ عمر بھر کتابیں پڑھیں، خدا کو یاد کیا، ذاکری کی اور

علم بانٹا۔ پچاس سے کچھ اوپر کی عمر میں ایک جان لیوا مرض میں مبتلا ہو کر اس دنیا

سے کوچ کر گئیں۔ پسماندگان میں ایک بیٹا ہے۔ اس دنیا میں اُن کے آنے اور

یہاں سے چلے جانے کی تاریخیں یہ ہیں.....“

سبیلہ نے عبارت پڑھ کر چھلکتی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا پھر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولیں:

”جب میں اس دنیا سے اٹھوں تو ایسی ہی عبارت میرے کتبے پر بھی لکھواد دیجیے گا۔“

میں نے اپنے ہاتھ میں دیا ہوا سبیلہ کا ہاتھ زور سے دباتے ہوئے کہا:

”کوئی نہیں جانتا پہلے کون اٹھے گا۔“ پھر کہا:

”یہاں سے سیدھی سڑک منشی فضل حسین خاں کی کربلا کی طرف جاتی ہے، جہاں آپ کی نانی دفن ہیں۔ یہاں سے وہیں چلتے ہیں۔“

کربلا ملکہ جہاں سے نکل کر ہم سیدھی سڑک پر چلتے ہوئے حیدر گنج چوراہے پہنچ گئے اور وہاں سے بائیں طرف مڑ کر منشی فضل حسین خاں کی کربلا آ گئے۔ کربلا میں داخل ہو کر سبیلہ اس قبر پر جا کر ٹھہر گئیں جس کا پتھر مٹ چکا تھا لیکن جس کے بارے میں انہیں معلوم تھا یہ ان کی نانی کی قبر ہے۔ وہ کچھ دیر قبر سے لگی بیٹھی رہیں پھر اس پر شمع روشن کر کے مجھ سے بولیں:

”قبر پر نانی کا اصل نام نہیں لکھوایا گیا۔“

”کیوں؟“

”اماں نے بتایا اصل نام لکھواتے تو لوگ قبر دیکھ کر آگے بڑھ جاتے۔ امراؤ جان کا نام دیکھ کر لوگ یہاں ٹھہرتے بھی ہیں اور فاتحہ بھی پڑھتے ہیں۔“ یہ بتا کر سبیلہ بولیں: ”ایک اچھا سا پتھر نانی کے نام کا لکھواد دیجیے۔ اسی محرم میں آ کر لگوادیں گے۔“

”لکھ جائے گا۔ امام کے تیجے کے بعد۔“

دوسری کربلاؤں کی طرح یہاں بھی لوگ قبروں پر شمعیں روشن کر رہے تھے۔ سبیلہ اپنی نانی کی قبر سے اٹھ کر اندر روضے میں گئیں اور کچھ دیر وہاں رہ کر باہر نکل آئیں۔ باہر نکل کر مجھ سے بولیں:

”چلیے اب چل کر اپنے امام باڑے کے سامنے بیٹھیں گے۔ اماں سوز پڑھیں گی اور ہم

اور آپ ان کے بازو بنیں گے۔“

ہم حیدر گنج کی پشت سے کاظمین اور کاظمین سے سعادت گنج ہوتے ہوئے عنبر گنج کی طرف آ گئے۔ شمیلا خانم نے گھر کا دروازہ کھلا رکھا تھا اور خود امام باڑے کے سامنے بیٹھی راگ

ملتان میں کوئی سوز پڑھ رہی تھیں۔ گھر میں داخل ہو کر میں اور سبیلہ ان کے دائیں اور بائیں جا کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے ترچھی نظروں سے ہمیں دیکھا لیکن راگ ٹوٹنے نہیں دیا۔ سبیلہ اپنی ماں کے پڑھے ہوئے ہر مصرعے کو اسی راگ میں اٹھا رہی تھیں، میں صرف سنگت کر رہا تھا۔ راگ ملتان والا سوز ختم ہوا تو سبیلہ بولیں:

”اماں کچھ درگا اور درباری میں بھی پڑھیے۔“

”درگا بہت مشکل ہے۔ اس راگ میں بڑے بڑے گویے نہیں پڑھ پاتے۔“ سبیلہ خانم نے کہا۔ ”گلا ساتھ نہیں دے گا۔“

”آپ شروع کیجیے۔ میں سنبھال لوں گی۔“

شمیلہ خانم نے گنگنا کر پڑھنا شروع کیا:

”کارواں سالار بن وہ کاروانِ کربلا

خاک سر پر ڈالتا جب دشتِ ویراں سے چلا

راہ میں ان بے کسوں سے تھا جو کوئی پوچھتا

کس کے تم ناموس ہو اور کس کے ہو صاحبِ عزا

کالے کپڑے وہ دکھا کر کہتے تھے با اشک و آہ

اس حسینی قافلے کا مر گیا ہے بادشاہ“

سبیلہ نے ماں کے ساتھ بندش کو بہت اچھی طرح سنبھالا۔ بند جیسے ہی ختم ہوا،

شمیلہ خانم بولیں: ”تمہاری نانی راگ درباری میں یہ بند بار بار پڑھتی تھیں اور زار و قطار روتی تھیں:

قید ہو شام کو جب عابد بیمار چلے

طوق و زنجیر و سلاسل میں گرفتار چلے

گرد کھینچے ہوئے تلواریں ستمگار چلے

اور آپس میں یہ کرتے ہوئے تکرار چلے

چین رستے میں اس آزاری کو کم لینے دو

دم بھی تھک کے کہیں لیویں تو نہ دم لینے دو“

بند ختم ہوتے ہی شمیلا خانم بولیں:

”رات کا آخری پہر آ پہنچا ہے۔ بہاگ میں یہ بند اور پڑھے دیتی ہوں:

یہ کہتی تھیں صغرا علی اکبر نہیں آئے

بہنا موئی جاتی ہے برادر نہیں آئے

جس روز سے گھر سے گئے وہ، گھر نہیں آئے

کیا کیا میں دعا مانگتی ہوں پر نہیں آئے

حسرت یہی دل میں لیے جاؤں گی جہاں سے

بھیتا میں تمہیں ڈھونڈ کے لاؤں گی کہاں سے

دونوں ماں بیٹیوں نے یاد کر کر کے انہیں راگوں میں سوز پڑھے جن راگوں میں
آج کی رات نجم النساء عرف امراؤ جان اپنے امام باڑے کے سامنے بیٹھ کر پڑھتی تھیں۔
جیسے ہی رات کا آخری پہر ختم ہوا شمیلا خانم نے اپنی بیاض بند کی اور کھڑے ہو کر درد بھری
آواز میں یہ نوحہ پڑھنا شروع کیا:

صبح کا تارا جھلملاتا ہے

دیکھیے کیا خدا دکھاتا ہے

صبح عاشور، صبح محشر ہے

دیکھ کر ہم کو رونا آتا ہے

نوحہ ختم ہونے کے بعد ان دونوں نے اور میں نے بھی دیر تک سینہ زنی کی پھر شمیلا خانم امام
باڑے والی پچی پر سر رکھ کر روتی رہیں اور اسی رونے میں انہوں نے اپنی ماں کو بھی کئی بار یاد کیا۔

○

پو پھٹ چکی تھی۔ ستارے پوری طرح ڈوب چکے تھے۔ سورج نے آسمان سے جھانکنا
شروع کر دیا تھا۔ جب دھوپ دیواروں پر اتر آئی تو سبیلہ نے اپنی ماں سے کہا:

”اب ہم نکلتے ہیں کر بلا میر خدا بخش کے لیے۔ راستہ بہت لمبا ہے۔ پہنچتے پہنچتے
بہت وقت لگ جائے گا۔“

”جلدی نکلو۔“ شمیلا خانم نے کہا۔ ”دوپہر ہوتے ہوتے وہاں سب ختم ہونے لگتا ہے۔“

میں اور سبیلہ پا برہنہ شملہ خانم کے گھر سے نکل کر تالکٹورے والی کربلا کی طرف چل دیے۔ راستے میں ہر طرف علم اور تعزیوں کے جلوس نکل رہے تھے۔ جب ہم پرانے لکھنؤ کی طرف آئے تو یہاں جلوسوں کا زور کچھ زیادہ تھا۔ سبیلہ جب کوئی علم یا تعزیہ دیکھتیں، لپک کر اسے چومتیں اور پھر میرے ساتھ چلنے لگتیں۔ ماتم کی صدائیں اور نوحوں کی آوازیں سنتے ہوئے ہم کربلا پہنچ گئے۔ دھوپ میں شدت زیادہ آگئی تھی اور زمین تپنے لگی تھی۔ تپتی ہوئی زمین پر چلتے چلتے جب سبیلہ کے پاؤں زیادہ جلنے لگتے تو وہ میرا ہاتھ زور سے پکڑ لیتیں۔ کربلا کے اندر اور اس کے تین دروازوں میں سے جنوبی دروازے پر جو اس کا اصل دروازہ ہے، ایک کے پیچھے ایک ماتمی دستے نوحہ خوانی کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان میں نامی نوحہ خواں اور سوز خواں نوحے اور سوز پڑھ رہے تھے۔ ایک آدھ ماتمی دستہ جن میں زیادہ تر کشمیری تھے، فارسی میں بھی نوحہ خوانی کر رہا تھا۔ کربلا کے باہر بائیں طرف قلندروں، مدار یوں اور خانہ بدوشوں کی انجمنیں جن کے تعزیے عام تعزیوں سے مختلف تھے، آگے پیچھے موجود تھیں۔ ان میں کیا پڑھا جا رہا تھا، اس کا سمجھنا مشکل تھا لیکن ان کی سینہ زنی میں بڑا جوش تھا۔ اسی جوش کو دیکھنے کے لیے ہر ایک وہاں ٹھہر جاتا۔ سبیلہ نے مجھے بتایا:

”پچھلی بار جب ہم اماں کے ساتھ آئے تھے تو میں نے ان سے پوچھا تھا یہ کیا پڑھ رہے ہیں۔“

”انہوں نے کیا بتایا؟“

”دے۔ یہ اُن کی اپنی زبان میں ہوتے ہیں۔“ یہ کہہ کر سبیلہ ان انجمنوں کے قریب جا کر اُن دھوں کو سننے لگیں۔ جب بہت دیر تک وہ وہاں سے نہیں ہٹیں تو میں نے ان کے قریب جا کر پہلی بار ان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ جب وہ پلٹیں تو میں نے کہا:

”مجھے شیدیوں کا نوحہ سننا ہے۔ شیدی سمجھتی ہیں۔“

”سمجھتی ہوں۔ حبشی۔ اماں بتاتی ہیں یہ لوگ بہت خوش آواز ہوتے ہیں۔“

”ہاں۔ کسی نے ابھی بتایا ان کی انجمن کربلا کے اندر پڑھ رہی ہے۔“

”چلیے چلیے۔ انہیں سننا بہت ضروری ہے۔ اماں یہ بھی کہتی ہیں یہ لوگ بہت تیز دھن

میں نوحہ پڑھتے ہیں۔“ سبیلہ نے کہا۔ ”اور جوش میں آ کر مصرعے کے مصرعے تحت اللفظ

میں پڑھ جاتے ہیں۔“

”اچھا سنئے۔“ میں نے کہا۔ ”بھیڑ بہت زیادہ ہے۔ اگر ہم لوگ ادھر ادھر ہو جائیں تو آپ خیمہ گاہ کی طرف آجائے گا جہاں تعزیرے دفن ہوتے ہیں۔ اس طرف لوگ زیادہ نہیں آتے۔ میں آپ کو وہیں مل جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے اب چلیے۔ دیکھیے وہ لوگ کہاں پڑھ رہے ہیں۔“
ہم کربلا میں داخل ہوئے تو چار چھ انجمنوں کے بعد ہمیں یہ نوحہ سنائی دیا:

بعد قتل شاہ اعدا کا بڑھا یہ حوصلہ

گھر جلا کر خاک کر ڈالا رسول اللہ کا

ہم انجمن کے قریب پہنچے تو دیکھا اصل نوحہ خواں ایک اونچی سی کرسی پر کھڑے ایک خالی کوزہ ہاتھ میں لیے اشاروں سے عصر کے بعد کا منظر بتاتا کر یہ نوحہ پڑھ رہے ہیں اور سننے والوں کو خوب رلا رہے ہیں۔ ہم نے وہاں کھڑے ہو کر شیدیوں کی انجمن کا یہ پورا نوحہ سنا۔ دوسروں کی طرح سبیلہ بھی نوحہ سننے کے دوران خوب روئیں۔ جب وہ انجمن آگے بڑھ گئی تو سبیلہ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے مجھ سے کہا:

”ایک بات کہوں برا تو نہیں مانیں گے۔“

”کہیے۔“

”آپ کو انیس کے سلام کا وہ مطلع یاد ہے؟“

”کون سا؟“

”ضبطِ گریہ ماتم سرور میں ہو سکتا نہیں

سر جھکا کر بیٹھ مجلس میں جو رو سکتا نہیں“

”یاد ہے۔ میں سمجھ گیا آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔ لیکن ایک بات آپ بھی سمجھ لیجیے۔“

”وہ کیا؟“

”کسی کے نہ رونے سے یہ نہ سمجھیے اسے غم نہیں ہے۔ آنکھوں سے زیادہ دل کا

رونا ضروری ہے۔“

یہ سن کر سبیلہ چپ ہو گئیں۔ انہوں نے روضے کے باہر چبوتروں پر بیٹھے ہوئے حاضری

فروشوں سے حاضریاں، شمعیں اور اگر بتیاں خریدیں پھر مجھے لے کر روضے کے زنجیری دروازے پر آئیں۔ بہت زیادہ ہجوم ہونے کی وجہ سے لوگ اس دروازے سے پھنس پھنس کر نکل رہے تھے اور ہر شخص دروازے میں داخل ہوتے اور اس سے نکلتے وقت زنجیر کو ہلائے اور اسے چومے بغیر آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ سبیلہ نے بھی دروازے میں داخل ہونے سے پہلے میرا داہنا ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ میں مضبوطی سے تھاما۔ پھر اپنے داہنے ہاتھ سے زنجیر ہلائی، اسے جلدی سے چوما پھر میرا جو ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھا اسے اٹھا کر زنجیر سے مس کرایا اور دھکے کھاتی ہوئی اندر داخل ہو گئیں۔ روضے کے احاطے میں پہنچتے ہی بولیں:

”جو کام آپ کو کرنا چاہیے تھا، وہ مجھے کرنا پڑا۔“

اور اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا وہ مجھے ایک گھنے پیڑ کے نیچے لے جا کر بولیں:

”میں روضے پر حاضریاں چڑھا کر اور شمعیں اور اگر بتیاں جلا کر آتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ روضے کے اندر چلی گئیں۔ بہت دیر بعد وہاں سے پسینے میں ڈوبی ہوئی نکلیں اور میرے پاس آ کر بولیں:

”بڑی مشکل سے روضے کی جالی تک پہنچے۔“

پھر جو حاضریاں روضے کے اندر سے لے کر آئی تھیں انہیں تھیلے میں رکھا اور پیڑ کے نیچے چادر بچھا کر مجھ سے کہا: ”بیٹھیے کوئی اچھی انجمن آئے گی تو اس کا نوحہ سنیں گے۔“ ہم بہت دیر تک اس پیڑ کے نیچے بیٹھے رہے۔ بیچ بیچ میں جب اچھا نوحہ پڑھنے والی کوئی انجمن آتی تو ہم اٹھ کر اس کا نوحہ سننے لگتے۔ روضے کے احاطے میں نوحے سنتے سنتے جب تیسرا پہر قریب آنے لگا تو ہم اس دروازے سے جو زینبیہ دروازہ کہلاتا ہے، پچھتم کی طرف بنی ہوئی خیمہ گاہ کی طرف آئے۔ یہاں پہنچ کر سبیلہ ہشت پہل درجے پر بنے ہوئے اس گنبد کی طرف گئیں جس کے نیچے ایک تعزیہ اور ایک چوبی ضربت رکھی رہتی ہے۔ انہوں نے اس غار میں اتر کر طاق میں شمعیں روشن کیں، تعزیے اور ضربت کو چوما اور دعا مانگ کر باہر آ گئیں۔

”چلیے اب چلتے ہیں۔ گھر پہنچتے پہنچتے فاقہ شکنی کا وقت ہو جائے گا۔“ باہر آ کر سبیلہ نے مجھ سے کہا۔

خیمہ گاہ سے نیچے آتے وقت سبیلہ نے آموں کے ان باغوں کی طرف جو کربلا کی چہار

دیواری میں اب بھی موجود تھے، اشارہ کرتے ہوئے کہا:

”انہیں باغوں سے ہو کر سعادت علی خاں کی سواری گزری تھی۔“

کربلا کے باہری دروازے کی طرف آتے وقت ہمیں زنجیری ماتم کرنے والی کئی انجنیں نظر آئیں جن میں بڑوں کے ساتھ بہت چھوٹی عمر کے بچے بہت جوش کے ساتھ چھریوں کا ماتم کر رہے تھے اور سروں پر قمع لگا رہے تھے۔ سبیلہ خون میں نہائے ہوئے ان کے آدھے کھلے ہوئے جسموں کی طرف نظر اٹھانے سے خود کو بچا رہی تھیں۔ ان سے یہ منظر دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ اور جب ایک بہت چھوٹے بچے کو گود میں لے کر قمع لگائی جانے لگی تو انہوں نے میرے دونوں شانے زور سے پکڑ کر مجھے اپنے آگے کر لیا اور میری پشت پر وہ اس وقت تک کھڑی رہیں جب تک وہ انجمن آگے نہیں نکل گئی۔ پھر ہم کربلا سے باہر آ گئے۔

○

تالکٹورے سے عنبر گنج کا فاصلہ بہت لمبا تھا۔ یہ طویل فاصلہ ہم نے رک رک کر طے کیا۔ سبیلہ کا حلق سوکھنے لگا تھا۔ راستے میں سڑک پر لگے ہوئے نلوں پر جا کر کئی بار انہوں نے کلیاں کیں اور اپنے منہ پر چھینٹے مارے۔ تھکے ہوئے قدموں سے جب ہم سبیلہ کے گھر پہنچے تو شملہ خانم فاقہ شکنی کا سارا سامان نیا کر چکی تھیں۔ سبیلہ نے کچھ دیر بیٹھنے کے بعد امام باڑے کے سامنے دسترخوان بچھایا پھر طشتریوں میں چاول اور کٹوروں میں کھڑی مسور کی دال نکال کر انہیں دسترخوان پر رکھا۔ اور اسی کے ساتھ چار پانچ گلاسوں میں دودھ کا شربت اور ایک بڑی سی طشتری میں کٹی ہوئی مولی رکھ کر انہیں بھی دسترخوان پر رکھ دیا۔ فاقہ شکنی کا وقت آتے ہی شملہ خانم نے اُن سب چیزوں پر نذر دی اور دعا مانگنے کے بعد ہم نے دال چاول کھا کر اور دودھ کا شربت پی کر اپنا فاقہ توڑا۔ جب سبیلہ اپنا فاقہ توڑ چکیں تو انہوں نے اپنی ماں سے پوچھا:

”یہ چاول کے ساتھ کھڑی مسور ہی کی دال کیوں رکھی جاتی ہے؟“

”اشک آور ہوتی ہے۔“ شملہ خانم نے کہا۔ ”رونے کا اصل وقت یہی ہے۔ اسی وقت

امام شہید ہوئے تھے۔“

میں اور سبیلہ رات بھر کے جاگے اور دن بھر کے تھکے ہوئے تھے اس لیے ہم دونوں الگ الگ جگہوں پر جا کر لیٹ گئے۔ بہت گہری نیند سے ہماری آنکھ اس وقت کھلی جب شملہ خانم

نے یہ کہہ کر ہمیں جگایا کہ شامِ غریباں کی مجلس کا وقت قریب آ رہا ہے۔ ہم دونوں نے اٹھ کر اپنے اپنے منہ پر پانی کا ایک چلو ڈالا اور محرم کے دس دنوں کی آخری مجلس کے لیے امام باڑہ غفرانمآب کی طرف چل دیے۔ آج کی اس مجلس میں کربلا کی اداس اور ہولناک شام کا منظر پیش کرنے کے لیے نہ شامیانے لگائے جاتے ہیں، نہ فرش بچھایا جاتا ہے نہ روشنی کی جاتی ہے۔ لوگ پا برہنہ اور کھلے سر زمین پر بیٹھتے ہیں اور مجلس میں شہادت کے بعد کا حال بیان کیا جاتا ہے۔ امام باڑے میں ہمارے پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد مجلس شروع ہو گئی۔ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے لوگوں کے بیچ سے گزرتے ہوئے ہم کسی طرح امام باڑے کے آخری حصے میں پہنچے جہاں بڑی مشکل سے ہمیں ایک چھوٹی سی جگہ ملی جس پر ہم دونوں ایک دوسرے سے لگ کر بیٹھ گئے۔ سوگ میں ڈوبا ہوا مجمع بالکل خاموش تھا۔ اس کی آواز اسی وقت بلند ہوتی جب ذکرِ صلوٰۃ پڑھواتا۔ اندھیرے اور خاموشی نے پوری فضا میں عجیب سی اداسی پیدا کر دی تھی۔ اس مجلس کے ذکرِ رنج و اندوہ میں ڈوبی ہوئی آواز کے ساتھ بڑی آسان زبان میں امام کی شہادت کے بعد خیموں کے جلنے، جلتے ہوئے خیموں سے بی بیوں کے باہر نکلنے، اُن کے سروں سے چادروں کے چھینے جانے، خیموں کے لٹنے اور سروں پر بیبیوں کے خاک ڈالنے کا منظر بیان کر رہے تھے۔ مجمع اس پورے منظر کو سن کر زاری کر رہا تھا۔ سبیلہ رورہی تھیں۔ روتے روتے انہوں نے میرے کاندھے پر سر رکھ دیا۔ یہ سرائیوں نے مجلس کے بعد میرے کاندھے سے اس وقت ہٹایا جب امام باڑے کے حجرے سے شہادت کے بعد کا منظر پیش کرنے کے لیے شبیہیں نکالنا شروع ہوئیں۔ جلتی ہوئی مشعلوں کے ساتھ ان شبیہوں میں کچھ اونٹوں پر روٹیوں سے بھرے خوان اور پانی سے بھرے مشکیزے تھے۔

”شبیہیں کیوں نکالی جاتی ہیں؟“ میرے برابر بیٹھے ہوئے ایک بچے نے اپنی ماں سے پوچھا۔
 ”اُن بچوں اور بی بیوں کی یاد میں.....“ اس کی ماں نے اسے بتایا۔ ”جو تین دن سے بھوکے پیاسے تھے۔ ابھی مجلس میں سنا نہیں۔ یہ جو مشعلیں اندھیرے میں جل رہی تھیں، انہیں کی روشنی میں اُن کے لیے کھانا پانی لایا گیا تھا۔“

سبیلہ ان شبیہوں کے قریب جانا چاہتی تھیں لیکن مجمع ان شبیہوں تک پہنچنے کے لیے ٹوٹا پڑ رہا تھا اس لیے وہ دور ہی سے یہ منظر دیکھتی اور اپنی آنکھیں نم کرتی رہیں۔ جب شبیہوں کا

جلوس امام باڑے کے دو تین چکر لگا کر حجرے میں واپس آ گیا تو ہم مجمعے کے بیچ سے جگہ بناتے ہوئے امام باڑے سے باہر نکل آئے۔ سڑک پر آ کر میں نے سبیلہ سے کہا:

”ابھی رات زیادہ نہیں ہوئی ہے۔ آپ کو سواری آسانی سے مل جائے گی۔“ پھر کہا:

”کل آپ آرام کیجیے۔ پرسوں اماں کو دکھانے لے جائیے۔ میں اسی دن شام کو آؤں گا اُن کا حال پوچھنے۔“

سبیلہ اپنی جگہ کھڑی رہیں جب بہت دیر تک وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلیں تو میں نے ان سے پوچھا:

”کیا بات ہے۔ کچھ طبیعت.....“

”نہیں ایسا نہیں ہے۔“

”پھر؟“

”آپ کے ساتھ گھر جانے کی عادت ہو گئی ہے۔“

”میں آپ کے ساتھ چلتا لیکن وہاں سے لوٹنے میں بہت دیر ہو جائے گی۔“

”تو وہیں رہ جائیے گا۔“

”نہیں یہ ٹھیک نہیں ہے۔ میں پرسوں آؤں گا۔“

”اپنا خیال رکھیے گا۔“ سبیلہ نے کہا اور میری طرف دیکھے بغیر ایک سواری پر بیٹھ کر اپنے گھر کی طرف چلی گئیں۔



تیسرے دن شام کو میں سبیلہ کے یہاں پہنچا تو وہ شمیلہ خانم کے سرہانے بیٹھی اُن کا سر سہلا رہی تھیں۔ میں نے شمیلہ خانم کو سلام کر کے سبیلہ سے پوچھا:

”کیا بات ہے طبیعت کچھ.....“

”آج دکھانے لے گئی تھی۔ بہت سی جانچیں ہوئی ہیں، بہت سی دوائیں بھی دی گئی ہیں۔“ سبیلہ نے بتایا۔ ”ڈاکٹر صاحب نے مکمل آرام بتایا ہے، یہ بھی کہا ہے طبیعت زیادہ بگڑے تو لے آئے گا بھرتی کر لیں گے۔“

”اب بھرتی ہونے کا وقت نہیں ہے۔ موت سے ہم بہت دن سے مہلت مانگ رہے ہیں۔ اب اور نہیں ملنے والی۔“ شمیلہ خانم نے کہا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولیں:

”خداے سخن میرا نیس نے کیا خوب کہا ہے:
 تھا کون سا نخل جس نے دیکھی نہ خزاں
 وہ کون سے گل کھلے جو مرجھا نہ گئے“
 ”آرام کیجیے، دوا کھائیے۔ ٹھیک ہو جائیں گی۔ بس تھوڑی سی کمزوری ہے۔“ میں نے
 کہا اور کہہ کر سبیلہ کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں میں نمی تھی۔
 شمیمہ خانم نے میری تسلی بھری باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا بس چھلکتی ہوئی آنکھوں سے
 یہ دوسرے پڑھ دیے:

”شبِ نم سے جو وجہ گریہ پوچھی تو کہا
 رونا فقط اپنی بے ثباتی کا ہے“
 سبیلہ کے سر سہلانے کی وجہ سے شمیمہ خانم کو نیند آنے لگی تھی۔ جب وہ پوری طرح
 سو گئیں تو سبیلہ نے مجھے باہر والے کمرے میں لا کر بتایا:
 ”اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کھل کر کچھ نہیں بتایا، یہی کہتے رہے
 لگ کر تیمارداری کیجیے۔“ پھر بولیں: ”اماں کی طبیعت ٹھیک رہتی تو.....“
 ”تو.....؟“

”میں اپنا چھوٹا ہوا کام شروع کرتی، بہت دن سے ادھورا پڑا ہے۔“
 ”وہ بازار والی عورتوں کا۔“
 ”ہاں۔ بہت کچھ کر لیا ہے۔ کچھ اور ہو جائے تو کتاب پوری ہو جائے۔“ یہ کہہ کر بولیں:
 ”اور تصویریں بنانے والا کام بھی رکا ہوا ہے۔“
 ”پریشان نہ ہوں۔ دوا دیتی رہیے۔ دو چار دن میں طبیعت سنبھل جائے گی۔“
 ”خدا کرے ایسا ہی ہو۔ چائے بناتی ہوں آپ کے لیے۔“
 ”نہیں چائے نہ بنائیں۔ ایسا کیجیے۔ آج تو نہیں کل پرسوں میں جب میں آؤں تو جتنا
 کام آپ نے کر لیا ہے مجھے دے دیجیے۔ میں اپنے کام کے ساتھ ساتھ اسے بھی کرتا رہوں گا۔“
 ”آپ کا کون سا کام۔“

”جو مسودہ ملا ہے اس میں آپ کا اور آپ کی ماں کا حال لکھنے کا۔ یہ مسودے کے

دوسرے حصے میں ہوگا۔“ یہ بتا کر میں نے سبیلہ سے کہا: ”آپ کی ماں ٹھیک ہو جائیں اور اللہ نے چاہا ٹھیک ہو جائیں گی تو ایک دو باتیں میں اُن سے اور پوچھ لوں، کتاب مکمل ہو جائے۔“

”مرزا رسوا آپ کی نانی کے انتقال کے بہت دن بعد تک زندہ رہے، کیا وہ کبھی آپ کی ماں سے آ کر ملے؟“

”نہیں کبھی نہیں۔ آتے بھی تو اماں اُن سے نہ ملتیں۔“

”کیوں؟“

”سب تو آپ کو معلوم ہے، پھر بھی پوچھ رہے ہیں۔ اُنہیں کی وجہ سے تو اماں کا اس شہر سے نکلنا ہوا۔“ یہ کہہ کر سبیلہ غصے سے بولیں:

”اور وہ نانی سے ملنے آتے تو وہ بھی ان سے نہ ملتیں۔ نانی کانپور سے لکھنؤ آئیں تو مرزا صاحب اسی شہر میں تھے اور اسی علاقے میں تھے جہاں نانی کرائے پر رہی تھیں۔“

”کیوں نہ ملتیں۔“

”نانا سے نکاح کے بعد انہوں نے کسی مرد کا منہ نہیں دیکھا۔“ سبیلہ نے کہا۔ ”نانا کا انتظار کرتی رہیں اور اسی انتظار میں اس دنیا سے چل بسیں۔“

”ابھی تو آپ اپنی ماں میں لگی ہیں۔ تھوڑی فرصت ملے تو ایک اور کام کیجیے۔“

”وہ کیا؟“

”اپنی ماں کی شاعری والی بیاضیں ایک جگہ کر لیجیے، مجھے دیکھنا ہیں۔“

”لیکن اس کے لیے اماں کی اجازت لینا ہوگی۔ ان میں ایسی باتیں بھی ہیں جو وہ کسی کو نہیں بتانا چاہتیں، مجھے بھی نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں ان سے پوچھ لوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”اب میں چلتا ہوں۔ آپ اپنی ماں کو دیکھیے۔ ایک دو دن بعد پھر آتا ہوں۔“

جب میں چلنے لگا تو سبیلہ نے کہا:

”آپ کی وجہ سے ہم نے اس بار بہت اچھی طرح محرم کر لیا اور.....“

”اور.....؟“

”جیسا چاہتی تھی.....“

”کیسا چاہتی تھیں؟“

”زیادہ سے زیادہ آپ کے ساتھ رہوں۔ اس کا موقع مل گیا۔ اب انشاء اللہ اگلے سال

پھر اسی طرح ساری مجالس کریں گے۔“

”انشاء اللہ۔“ میں نے کہا۔ اور وہاں سے چلا آیا۔



دو تین دن میں اپنے ٹھکانے ہی پر رہا اور اس کتاب کی جو میں نے نئے اور پرانے مسودے کی مدد سے تیار کی تھی، ورق گرانی کرتا رہا۔ اس میں واقعات کی ترتیب کو دوبارہ دیکھا اور ادھر کے دنوں میں جو کچھ معلوم ہوا تھا اُسے ایک الگ بیاض میں لکھا۔ پھر شروع سے لکھے ہوئے کو رک رک کر یہ دیکھنے کے لیے پڑھنا شروع کیا کہ قصے کی ترتیب کہیں برہم نہ ہوگئی ہو۔ دو تین دن یہ کام کرنے کے بعد جب میں سبیلہ کے یہاں پہنچا تو دیکھا سبیلہ خانم کی طبیعت کافی سنبھل گئی تھی۔ وہ اٹھ کر چلنے پھرنے لگی تھیں اور چھوٹے موٹے کاموں میں سبیلہ کا ہاتھ بھی بٹانے لگی تھیں۔

”آپ تو ٹھیک ہو گئیں، میں نے کہا تھا ٹھیک ہو جائیں گی۔“ میں نے انہیں دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”آپ نے دو تین دن کیا کیا۔“ سبیلہ نے پوچھا۔

”چھوٹا ہوا کام۔ کتاب کا ایک حصہ تیار ہو گیا ہے، دوسرا، جس میں آپ لوگوں کا ذکر ہے اُسی میں لگا ہوا تھا۔“

”ابھی تو اس میں بہت کچھ لکھنا پڑے گا۔“ سبیلہ نے کہا۔ پھر بولیں: ”ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔“

”کیا؟“

”ہم نے اتنے دن مجالس کیں، کر بلا گئے، لیکن ہنگامہ اور کم تو کہیں نظر نہیں آئیں۔“

”اتنی بھیڑ میں کیا نظر آتیں۔“

”نہیں، جان پہچان والوں پر نگاہ پڑ ہی جاتی ہے۔“

”ہو سکتا ہے نگلی ہی نہ ہوں۔“

”نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ان دنوں کوئی اپنے گھر میں نہیں بیٹھتا۔“
 ”ایک دودن میں جاؤں گا ان کی طرف، خیریت لینے۔“ میں نے کہا۔
 ”اُس دن تم آئے تو میں بے حال پڑی تھی۔“ ہماری بات ختم ہوئی تو شمیلہ خانم بولیں:
 ”تم سے کوئی بات ہی نہ ہو پائی۔ سبیلہ نے مجھے سب بتایا تم لوگ کہاں کہاں گئے، کس کس کی
 مجلس سنی۔“ پھر بولیں: ”میری ماں کی قبر پر بھی گئے۔ یہ بہت اچھا کیا۔ طبیعت ذرا اور سنبھلے تو
 اسے ٹھیک کراؤں۔“ پھر کہا: ”آج جلدی نہ چلے جانا مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے۔“
 ”کیا بات کرنا ہے؟“ سبیلہ نے پوچھا۔
 ”تمہیں نہیں بتا سکتی۔“

”اچھا تو میں ہٹ جاتی ہوں۔ آپ کر لیجیے ان سے بات۔“ یہ کہہ کر سبیلہ اپنے کمرے
 میں چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد شمیلہ خانم مجھے اپنے سامنے بٹھا کر بولیں:
 ”اس سے پہلے کہ میری آنکھ بند ہو میں نے سوچا دو تین باتیں تمہیں بتا دوں اور ایک دو
 باتیں تم سے پوچھ لوں۔“ پھر کہا: ”کچھ دن پہلے میں نے تم سے کچھ کہا تھا، یاد ہے۔“
 ”یاد ہے۔ اپنی بیٹی کے بارے میں۔“
 ”ہاں اسے اکیلا نہ چھوڑنا۔ میں اب زیادہ نہیں جیوں گی۔“
 ”ایسا نہ کہیے۔“

”نہیں۔ جب بیٹیا مجھے دکھانے لے گئیں تو ڈاکٹر کی آنکھوں میں..... اپنی موت کا اشارہ
 میں نے پڑھ لیا تھا۔“ شمیلہ خانم نے کہا۔ ”ہم جہاں دیدہ لوگ ہیں۔ آنکھیں جو کہتی ہیں، فوراً
 سمجھ لیتے ہیں۔ انہوں نے بیٹیا کو تسلی دی ہے لیکن وہ سمجھ چکے ہیں دوا سے اب یہ مرض ٹھیک
 نہیں ہوگا۔ اور ایک بات اور..... دل اسے کہتے ہوئے ڈرتا ہے۔“
 ”وہ کیا؟“

”یہ مرض جو مجھے ہے بیٹیا کو نہ لگ گیا ہو۔ ابھی تک تو اس کے آثار نظر نہیں
 آئے لیکن.....“
 ”نہیں ایسا نہیں ہوگا۔“

”تم مجھے بہلا رہے ہو۔ جو مرض جہاندار بیگم کی ماں کو تھا وہی انہیں بھی آ لگا۔ ان

کے پاس پیسہ تھا اس لیے دواؤں، غذاؤں نے انہیں بہت دن زندہ رکھا۔“ یہ کہہ کر شمیمہ خانم رکیں پھر بولیں:

”لیکن شہبا..... وہ بہت دن زندہ نہیں رہی اور اس کی ماں جتنا اسے جینا چاہیے تھا، نہیں جی سکی۔“ پھر کہا:

”تو خدا نخواستہ سبیلہ کو یہ دل والا مرض آگے تو اس کی تیمارداری میں پیچھے نہ رہنا۔ کبھی کبھی ڈاکٹر سے زیادہ تیمار دار مریض کو ٹھیک کر لیتے ہیں۔“ یہ بتا کر بولیں: ”بیٹا لگ کر میری دیکھ بھال نہ کرتی تو میں اتنے دن نہ جیتی۔ اور ہاں وہ جو کتاب تیار کر رہے ہو، میری آنکھ بند ہونے سے پہلے مجھے دکھا لو۔ میں تمہیں، جو کچھ تم لکھ رہے ہو اسے لکھنے سے روکوں گی نہیں لیکن ایک نظر اسے دیکھ لوں۔“

”دکھا دوں گا۔ بس کچھ دن رک جائیے۔“

”نہیں، کل پرسوں میں لے آؤ۔ اب زیادہ وقت نہیں ہے میرے پاس۔ جو کچھ ہو چکا ہے، کتاب پڑھوں گی تو اسے ایک بار پھر اپنے سامنے ہوتا ہوا دیکھ لوں گی۔“

”اچھا بتائیے پوچھنا کیا ہے آپ کو۔“

”تمہارے بارے میں۔ کس خاندان کے ہو۔ باپ دادا کا تعلق کہاں سے تھا اور

ماں تمہاری.....“

”بتائے دیتا ہوں۔ دادا میر شوکت علی نیوتنی، جو لکھنؤ سے کچھ ہی فاصلے پر ہے، وہاں کے جاگیر دار تھے۔ پہلے شاید آپ کو بتا چکا ہوں۔ چاندی کی بگھی میں نکلتے تھے۔ باپ میر اشفاق علی کی لکھنؤ میں بہت بڑی جائیداد تھی۔ لیکن بیٹھے بیٹھے کھانے کی وجہ سے سب نکل گئی۔ ماں صرف نام کو ان کے نکاح میں تھیں۔ شادی کے بعد اپنا ایک مکان رہنے کو دیا لیکن پیسے کی ضرورت پڑی تو اسے بھی گروی رکھ دیا۔ میں پیدا ہوا تو کچھ پیسے ماں کو دے کر چلے گئے پھر لوٹ کر نہیں آئے۔ ماں نے کرتے سی کر اور بچوں کو پڑھا کر مجھے بڑا کیا۔ پڑھایا لکھایا۔ پھر اسی مرض میں جوان کی ماں کو تھا، مبتلا ہو کر اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔“ میں نے رُکے بغیر سب بتا دیا۔

”یہ تو بتایا سبیلہ نے۔“ شمیمہ خانم بولیں۔ پھر بولیں: ”اس کا مطلب ہمارا تمہارا میل نہیں ہو سکتا۔“

”یہ کیوں کہہ رہی ہیں؟“

”تم اشرف سے ہو۔“

”آپ بھی..... ہیں تو شریف زادی۔“

”فرق ہے۔“

”کیا؟“

”ہم تھے اب نہیں ہیں۔ تم ہو اور رہو گے۔“ یہ کہہ کر سبیلہ خانم بولیں:

”ایک ڈرستار ہا ہے۔ کہوں تو برانہ ماننا۔“

”کہیے۔“

”جب کتاب تمہاری تیار ہو جائے اور سب حال ہمارا اس میں لکھ جائے تو کہیں تم.....“

”رک کیوں گئیں۔ آگے کہیے.....“

”سبیلہ کے پاس آنا بند نہ کر دو۔“

”کیوں؟“

”تم جاگیردار کے پوتے۔ وہ ناچنے والی کی نواسی۔“

”ایسی باتیں مت کیجیے۔ میں تو بس ایک بات جانتا ہوں۔“

”کیا؟“

”سبیلہ اور شہبا۔۔ اور ہینگا اور کمو۔۔ ایسی اچھے دل والی لڑکیاں جہاں بھی ہوں دنیا اچھی لگنے لگے۔“ یہ سن کر سبیلہ خانم کے چہرے پر چمک آئی۔

”میں بہت دیر آپ سے بات کروں گا تو شاید آپ کی بیٹی کو اچھا نہ لگے۔ اس لیے آرام کیجیے۔“ میں نے کہا۔ ”طبیعت آپ کی ٹھیک رہی اور انشاء اللہ ٹھیک رہے گی تو ایک۔ دو باتیں آپ سے اور پوچھ لوں گا۔“

”اب کیا پوچھنا ہے۔ سب کچھ تو بتا چکی۔“

”کل بتاؤں گا۔ ابھی آپ آرام کیجیے۔“

سبیلہ اپنے کمرے سے یہ دیکھنے کے لیے نکل آئی تھیں کہ ہماری بات ختم ہوئی یا نہیں اور جب انہوں نے دیکھا کہ ہماری بات ختم ہو چکی تو بولیں:

”آج تو آپ اماں ہی سے باتیں کرتے رہے۔“
 ”کل آپ سے باتیں کروں گا۔ اور ہینگا اور کتو کے بارے میں بھی بتاؤں گا، دونوں
 کس حال میں ہیں۔“
 ”ان کی طرف ضرور جائیے، مجھے فکر لگی ہے۔“
 ”اب تو آپ کی اماں ٹھیک ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اپنا چھوٹا ہوا کام شروع کیجیے۔“
 ”اسے بعد میں کروں گی۔ پہلے تصویریں بناؤں۔ اماں کی دوائیں بہت مہنگی ہیں۔“
 سبیلہ نے کہا۔ ”اگلے ہفتے انہیں دے آئیے گا دکان پر۔“
 ”دے آؤں گا۔“



دوسرے دن فرخندہ محل کے امام باڑے کے پشت والے احاطے میں ہینگا کی کوٹھری کے
 قریب جا کر میں نے بہت آہستہ سے انہیں پکارا۔ وہ باہر نکلیں تو بہت پریشان لگ رہی تھیں۔
 میں اندر پہنچا تو دیکھا کتو بستر پر لیٹی کراہ رہی ہیں۔
 ”خیریت.....“ میں نے پوچھا۔
 ”کئی دن سے طبیعت خراب ہے۔ یہیں قریب میں جو حکیم صاحب ہیں، ان سے
 دوا لارہے ہیں۔“

”حکیم احمد رضا؟“

”جی۔ اچھے حکیم ہیں۔ انہیں کی دوا سے طبیعت کچھ سنبھلی ہے۔“
 مجھے دیکھ کر کتو نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی تو میں نے انہیں منع کر دیا۔
 ”کیا ہوا انہیں۔“

”ہوا کچھ نہیں۔ گھر چھٹنے کا بہت دکھ ہے۔ خود یہاں ہیں، دل وہاں۔“ ہینگا نے کہا۔
 ”ابھی تک وہاں کے صحن اور چیمبوں سے نکلی نہیں ہیں۔ خالہ یوں تخت پر بیٹھتی تھیں، یوں ہم
 تعزیے بناتے تھے، یوں مصلیٰ بچھاتے تھے۔“ پھر میرے قریب آ کر بہت چپکے سے بولیں:
 ”اب وہاں صحن ہے نہ صحنیاں نہ کمرے نہ کوٹھریاں۔“
 ”کیوں؟“

”اقبال بیگم نے اسے تڑوا کر سب کچھ نئی طرح سے بنوالیا۔ یہ بات میں نے کتو کو نہیں بتائی۔ سن کر اسے اور دکھ ہوتا۔“

”شہبا بھی جب اپنے گھر سے نکلی، گھر چھوڑنے کا اسے بہت دکھ ہوا۔“ میں نے کہا۔
”جہاندار بیگم کے یہاں جب تک رہی چھوٹے ہوئے گھر کو یاد کرتی رہی۔“ پھر انہیں بتایا:
”آپ ہی کی طرح میں نے بھی اسے نہیں بتایا، جہاں وہ رہتی تھی وہ گھر تڑوا دیا گیا۔“ پھر ہینگا سے پوچھا: ”ایسا کیوں ہوتا ہے۔“
”کیسا کیوں ہوتا ہے؟“

”جو بھلا دینا چاہئے، اسے ہم بھلا کیوں نہیں پاتے۔“
”بھلا دیں تو رہے گا کیا ہمارے پاس۔ یہی یاد رکھا ہوا ہمیں مارتا بھی ہے جلاتا بھی ہے۔“
”اچھا یہ بتائیے۔ سبیلہ کہہ رہی تھیں، آپ لوگ محرم میں نظر نہیں آئے۔“
”اُن دنوں کتو کی طبیعت بہت خراب تھی۔ بہت مشکل سے نو کی مجلس کی ہم نے ہینگا نے کہا۔“ شب میں تھوڑی دیر کو غفرانمآب ہو آئے۔ دس کو ان کی طبیعت اور خراب ہو گئی، کربلا بھی نہیں جاسکے۔ آپ لوگ گئے تھے؟“

”گئے تھے۔ سبیلہ میرے ساتھ چھ محرم سے مجلسیں کر رہی تھیں۔“ یہ کہہ کر میں نے ہینگا کو چھ محرم سے لے کر شامِ غریباں کی مجلس میں جانے تک کی ساری باتیں بتائیں اور یہ بھی بتایا کہ سبیلہ نے مجھے اپنے امام باڑے میں فقیر بھی بنایا اور بہشتی بھی۔ ہینگا سب کچھ سنتی رہیں لیکن انہیں یہ سننا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد انہوں نے پوچھا:
”کیسی ہیں خالہ، سبیلہ کی ماں۔“

”طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ جانچیں ہوئی ہیں۔ دوائیں بھی ڈاکٹر نے بہت سی دی ہیں۔ لیکن.....“
”لیکن؟“

”سبیلہ کو یقین نہیں کہ اب وہ ٹھیک ہوں گی۔ خود سبیلہ خانم بھی سمجھ گئی ہیں..... علاج سے مرض ٹھیک نہیں ہوگا۔“

”جہاندار بیگم، خالہ، شہبا..... ایک کے بعد ایک سب..... اور اب آپ اُن کے

بارے میں بتا رہے ہیں۔“

”اور ایک بات اور.....“

”وہ کیا؟“

”شمیلہ خانم کو ڈر ہے ان کا مرض ان کی بیٹی کو نہ لگ گیا ہو۔“

”ایسا نہ کہیے۔“ ہینگا نے کہا۔ پھر پوچھا: ”وہ کر کیا رہی ہیں۔ تصویر بنانے والا کام دس

دنوں میں تو کیا نہیں ہوگا۔“

”اب شروع کرنے والی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ماں کی دوائیں بہت مہنگی ہیں۔ جو

تصویریں اپنے لیے بنا کے رکھی ہیں، ضرورت پڑی تو شاید انہیں بھی نکال دیں۔“

”ہمیں بھی اپنے کام میں زیادہ نہیں ملتا ورنہ ہم بھی کچھ مدد کرتے۔“

”جن حکیم صاحب سے آپ کتو کی دوالائی ہیں وہ سبیلہ اور ان کی ماں کو اچھی طرح

جانتے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا.....“

”کیا کہا تھا؟“

”جن اسکولوں میں ناچ گانا سکھایا جاتا ہے، سبیلہ وہاں ناچ گانا سکھانے کی نوکری کر لیں۔“

”تو؟“

”نہیں کریں گی۔ میں نے حکیم صاحب کو بتا دیا۔“

”کتو کی طبیعت کچھ سنبھلے تو ہم دونوں ان کے یہاں جائیں۔ بتا دیجیے گا انشاء اللہ

جلد آئیں گے۔“

”سبیلہ کو بھی آپ دونوں کی بڑی فکر ہے۔ ماں کی طبیعت ٹھیک ہوتی تو وہ بھی آتیں۔“

میں اٹھنے لگا تو ہینگا بولیں: ”بیچ بیچ میں ہماری خبر لے لیا کیجیے۔ خالہ کے بعد اب

ہمارا کوئی ہے نہیں۔“

”دو چار دن بعد پھر آؤں گا۔“

”یہ بتائیے وہ جو سبیلہ کی نانی والی کتاب تھی جس کے لیے آپ لوگوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر

اُن سے مل رہے تھے، وہ کہاں تک پہنچی۔“ ہینگا نے پوچھا۔

”تیار ہے۔ کچھ باتیں شمیمہ خانم سے رہ گئی ہیں پوچھنے کو۔“ میں نے کہا۔ ”بیچ میں محرم

آ گیا، پھر ان کی طبیعت بگڑ گئی۔ کل اگر ان کی طبیعت ٹھیک رہی تو وہ بھی پوچھ لوں گا۔“ پھر بتایا:

”وہ چاہتی ہیں ایک بار وہ بھی دیکھ لیں اس کتاب کو۔“

”آپ نے اس میں سب کچھ ٹھیک ٹھیک لکھا ہے، اس لیے؟“

”شاید اسی لیے۔ وہ چاہتی ہیں اور شاید ان کی بیٹی بھی، جو کچھ جس طرح ہے، اسی طرح لکھا جائے اس میں کوئی رد و بدل نہ ہو۔“

”جیسا مرزا رسوا نے کیا۔“

”جی۔“

”اس سے فرصت ملے تو کچھ ہمارا قصہ بھی لکھ ڈالے۔“ ہینگا نے کہا۔ ”بہت کچھ اس میں بھی ہے لکھنے کو۔ اچھن بی سے شروع کیجیے اور ہم پر ختم کیجیے۔“ پھر بولیں: ”میں لکھتا تو نہیں جانتی لیکن بتا سکتی ہوں قصہ ختم کیسے ہوگا۔“

”کیسے ہوگا؟“

”..... اور وہ دولڑکیاں جو سردار جہاں کی سگی بھانجیاں نہیں تھیں اور جو تعزے اور گڑیاں بنا کر اپنا گزارا کرتی تھیں، جب سردار جہاں کے گھر سے نکالی گئیں تو فرخندہ محل کے امام باڑے کی پشت پر ایک سیلن بھری کوٹھری میں رہنے لگیں اور وہیں انہیں بہت سی بیماریاں آ لگیں اور ایک مہینے کے اندر آگے پیچھے دونوں کی موت ہو گئی اور جنازے میں شریک ہونے کے لیے لوگوں کو کہہ کر لانا پڑا۔“

ہینگا نے ایک سانس میں اپنے قصہ کا خاتمہ بتا ڈالا۔ بستر پر لیٹی ہوئی بیمار کتو ڈوپٹے سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگیں اور میں بہت دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر میں نے بہت آہستہ سے ہینگا سے کہا:

”ایک بات کہوں۔“

”کہیے۔“

”یہ سب تو خیر اپنے طور پر آپ نے سوچ لیا لیکن اچھا ہوگا اپنا قصہ آپ خود لکھیں۔“ میں نے کہا۔ ”چھپے گا تو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔“

”وہ کیوں؟“

”آپ بہت اچھی طرح لکھیں گی۔“

”آپ نہیں لکھیں گے تو مجھی کو لکھنا پڑے گا۔“

میں کچھ نہیں بولا۔ جب چلنے لگا تو بستر پر پڑی ہوئی کتو نے بہت کمزور آواز میں کہا:

”سبیلہ کو پوچھ دیجیے گا اور خالہ کو بھی۔ ہم ان کے اچھے ہونے کی دعا کریں گے۔“



اگلے دن میں نے سبیلہ کو ہنگا اور کتو کا سارا حال بتایا۔ سب کچھ سن کر انہیں دکھ ہوا۔ کچھ دیر بعد وہ بولیں: ”میں نے پہلے کی بنائی ہوئی بہت سی تصویریں نکال لی ہیں، آپ انہیں امین آباد والی دکان پر لے کر چلے جائیے، اگر ان کے اچھے پیسے مل جائیں تو فروخت کر دیجیے۔“

”مجھے اُن کی قیمت کا اندازہ نہیں۔“ میں نے کہا۔ بنانے والا اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔

آپ بھی چلیے گا میرے ساتھ۔“

”ٹھیک ہے چلوں گی اور وہیں سے ہنگا اور کتو کے یہاں چلوں گی۔“ یہ بتا کر بولیں:

”کچھ وہ تصویریں بھی، جیسی دکاندار نے کہی تھیں، بنالی ہیں۔ انہیں آپ ہی دے آئیے گا۔“

ہماری باتیں سن کر شمیلہ خانم اپنے کمرے سے نکل آئی تھیں۔ میں نے انہیں دیکھتے ہی کہا:

”آج تو آپ پہلے سے بہتر ہیں۔ چہرے سے نقاہت غائب ہے۔“

شمیلہ خانم یہ سن کر مسکرائیں۔ پھر یہ مصرعہ پڑھا:

ع سینے میں یہ دم شمع سحر گاہی ہے

”انیس کو آپ نے بہت پڑھا ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں نے کیا سب نے پڑھا ہے۔ اماں کو پورے کے پورے مرثیے یاد تھے اور

انہیں کی طرح مجھے بھی۔“ انہوں نے کہا۔ ”اب حافظہ ساتھ نہیں دیتا اس لیے ذہن پر زور

دینا پڑتا ہے۔“ یہ کہہ کر بولیں:

”اچھا بتاؤ کیا پوچھنا ہے۔“

ہمیں باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر سبیلہ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ انہوں نے سمجھ لیا

میں پوچھنے اور شمیلہ خانم بتانے کے لیے بے چین ہیں۔

”تو پوچھو کیا پوچھنا ہے۔“

”آپ کی ماں کے لکھنؤ آنے کے بعد..... مرزا رسوا کبھی اُن سے ملنے آئے۔“

”نہیں۔ میرے ہوش سنبھالتے سنبھالتے تو نہیں آئے۔“ شمیلہ خانم نے کہا۔ ”اور پہلے بھی آئے ہوتے تو اماں، جیسے انہوں نے سب باتیں بتائی تھیں، یہ بات بھی بتائیں۔“ یہ کہہ کر بولیں: ”وہ آتے بھی تو اماں انہیں دروازے سے واپس کر دیتیں۔“

”اور جب آپ بڑی ہوئیں تو آپ سے آئے ملنے۔“

”نہیں مجھ سے بھی نہیں۔“ میں بھی، اگر وہ آتے، اماں کی طرح دروازہ نہ کھولتی۔“
شمیلہ خانم بولیں۔ ”انہوں نے اماں کا قصہ چھاپ کر اور غلط طرح سے چھاپ کر اچھا نہیں کیا۔“ پھر بولیں: ”یہ جو میں تمہاری کتاب پڑھنا چاہتی ہوں اس کی وجہ یہی ہے کہ بھولے سے اس میں کوئی ایسی بات نہ چلی جائے جس سے سبیلہ کو تکلیف پہنچے، اُسی طرح جیسے اماں کے قصے سے مجھے پہنچی ہے۔“

”میں نے، جو کچھ آپ لوگوں نے پہلے کی باتیں بتائی ہیں وہ اسی طرح لکھی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اور جو کچھ میرے سامنے ہوا ہے، اس میں بھی اپنی طرف سے کچھ نہیں بڑھایا۔“

”اچھا اور پوچھو۔“

”آپ نے اپنے ایک مجرے کا تو حال بتایا لیکن اپنی ماں کے کسی مجرے کا ذکر نہیں کیا۔“

”انہوں نے مجھ سے کہیں زیادہ مجرے کیے اور ایک سے ایک اونچی جگہوں پر اور ایک

سے ایک ماہر سازندوں کے ساتھ۔“

”اُن میں سے کسی کے بارے میں انہوں نے آپ کو کبھی کچھ بتایا۔“

”ایک مجرے کا بہت ذکر کرتی تھیں۔“

”کون سا؟“

”شیش محل کا۔ اور کیوں ذکر کرتی تھیں یہ بعد میں بتاؤں گی۔ یہ کہہ کر انہوں نے اس مجرے

کا حال بتانا شروع کیا: ”وہ بھی شعبان کا مہینہ تھا۔ امیر الدولہ میر مہدی کے خاندان کے ایک رئیس

اقبال الدولہ بہادر تھے۔ آصف الدولہ کی مجلس کے ایک بڑے حصے میں پورے شاہانہ ٹھاٹھاٹ

کے ساتھ ان کی سکونت تھی۔ موقع ان کے بیٹے اکمال الدولہ کی شادی کا تھا۔ یوں تو شہر میں بہت

ناچنے والیاں تھیں لیکن اماں کا نام اُن میں سب سے اوپر تھا۔ شادی میں ہر چیز کی خوبی کا خیال رکھا

گیا تھا اس لیے ناچنے والی بھی وہ بلائی جس کے آگے شہر میں کوئی دوسری نہ ٹھہرے۔ اماں بتاتی تھیں نواب نے شادی اتنے دھوم دھام سے کی کہ مہینوں شہر میں اس کا چرچا رہا۔“

مانجھے کے دن سے پورے محل اور اس کے آس پاس روشنی کا سامان تھا۔ لوگ باگ اس چراغاں کے مزے لے رہے تھے۔ ہر شے روشنی میں نہائی ہوئی تھی۔ ساچق کے دن بھی یہی چکا چونڈ تھی۔ شام سے تا صبح چاندی سونے کے گنگا جمنی چوگھڑے اور آرائش کے تخت اٹھے اور مہندی کا بھی یہی رنگ تھا۔ ایسی زرنکار کشتیاں اور قیمتی ساز و سامان کے ایسے بھاری بھاری خوان کہ مزدوروں سے اٹھائے نہ اٹھتے اور جب برات کی رات آئی تو آتش بازی ایسی چھڑائی گئی کہ شب برات اس کے سامنے ہیچ۔ محل کے اندر اور باہر ہر طرف شامیانے تے ہوئے اور ان میں ہر جگہ خور و نوش کے سامان سجے ہوئے۔ دن چڑھے تک چراغ روشن رہے۔ اماں بتاتی تھیں کہ محل اور اس کے آس پاس ایسا نور تھا گویا سارا علاقہ کوہ طور ہو۔ اور جب بجی سجائی برات نکلی تو ایک خلقت اسے دیکھنے کو اٹھ آئی۔ آگے آگے تو زک پھر نقیب اور چو بدار پھر ہاتھیوں پر نوبت نشان ماہی مراتب اور ان کے پیچھے رنگ رنگ کے پھولوں سے سجی بشکل جہاز ایک بگھی اور اس میں دولہا کے ساتھ سرخ و سبز جامے زیب تن کیے اچھی صورتوں والی بی بیایاں جن کے رخ سے پردہ اٹھے تو پریاں معلوم ہوں۔ بگھی کے پیچھے ہاتھیوں کے دل، ہودج، عماریاں اور ان میں زنانی سواریاں، جلوس کے ساتھ چلنے والے مرد سب کے سب طرح دار جن کی ٹوپیاں غضب اور کرتیاں قیامت۔ جیغہ، کلنگی، سر پیچ کے ساتھ زربفت کے پاجامے پہنے اشرفیاں لٹاتے اور روپیوں کا مینہ برساتے چل رہے تھے۔ برات کی رونق دیکھنے کو راستوں میں کوٹھوں پر جمگھٹ تھے، لوگ ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔

اماں بتاتی تھیں اور انہیں دیکھنے والوں نے بتایا تھا کہ لپ دریا کوسوں تک آتش بازی تھی جسے دیکھنے کشتیوں پر خلق خدا کھڑی تھی۔ مجرے کا اہتمام اسی محل سے کچھ دور مہتاب باغ میں ہوا تھا۔ پورا باغ بقیعہ نور تھا۔ درختوں کی شاخوں میں قدیلیں روشن تھیں اور پھولوں کی روشوں کے دونوں طرف ہانڈیوں میں شمعیں جل رہی تھیں جن کی جھلملاتی ہوئی لویں بہت خوبصورت معلوم ہو رہی تھیں۔ اماں کہتی تھیں سارے باغ میں ایسا چراغاں تھا گویا بہت سے مہتاب ایک ساتھ نکل آئے ہوں۔ باغ کے فرش پر دور تک قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے اور ان پر قرینے سے

گاؤ تکے لگے ہوئے۔ فرش پر تھوڑی تھوڑی دور پر میووں اور پھلوں سے بھرے ہوئے خوان خوش
 نہا چکیوں پر رکھے ہوئے اور خادم بالباس مہمانوں کے آگے چاندی کے حقے لیے کھڑے
 ہوئے۔ یہ روشنی اور یہ آرائش باغ کے آس پاس ہی نہیں تھی، یہ ٹھاٹ تاگوگھاٹ تھا۔
 مجرا، اماں بتاتی تھیں رات کے پہلے پہر شروع ہوا اور پچھلے پہر تک ہوتا رہا۔ چنے ہوئے
 سازندوں کے ساتھ اماں نے بہت سے راگوں میں گایا۔
 ”کیا کیا گایا۔ آپ کی ماں نے یہ بھی بتایا ہوگا۔“

”ہاں یہ بھی بتایا اور جس طرح انہوں نے بتایا اسی طرح مجھے یاد ہے۔“ شملہ خانم
 نے کہا۔ ”اماں نے بتایا سب سے پہلے انہوں نے اپنے استاد سے سیکھی ہوئی پُر یا کلیان کی
 بندش و لمبت میں گائی:

”آج سو بنانی آ یورے ماں

اُس بن رے کو بھی رس سو ہے

متین مانگ بھری“

”اماں نے بتایا کہ ان کے استاد نے پُر یا کے رکھ لگانے کی ایسی تعلیم دی تھی کہ رکھ
 لگتے ہی سننے والوں کو راگ پُر یا کا درشن ہو جاتا تھا۔“
 ”اس کے بعد کیا گایا؟“

”اس کے بعد انہوں نے راگ پُر یا کلیان ہی میں چھوٹا خیال سنایا:

بہت دن بیتے اچھونا ہیں آئے

جب آون کی پیاملن کی پیامورے گھر آئے من دل را

اور اسی کے بعد انہوں نے راگ بہاگ میں بندش گائی:

لٹ ابھی سلجھا جا بالم

مورے ہاتھن مہندی لگی ہے

موری مانگ سجا جا بالم

لٹ ابھی سلجھا جا بالم“

شملہ خانم بتاتی رہیں: ”اماں بتاتی تھیں اس محفل میں سننے والے راگ راگنیوں اور ان

کی باریکیوں سے بہت اچھی طرح واقف تھے اور دل کھول کر داد دے رہے تھے اس لیے میرا
دل لگ گیا اور میں گاتی چلی گئی۔ بہاگ کے بعد میں نے مشردیس کا دادرا گانا شروع کر دیا:

آئے بلم کرم مورے جاگے
تمھرے درس کی آگ لگی ہے
تن من دھن تو پے واروں
آئے بلم کرم مورے جاگے
اور صبح ہوتے جب مجرا ختم پر آیا تو انہوں نے کھماج کی یہ ٹھمری گائی:
چھبی دکھلا جا بانکے سنوریا
دھیان لگے موہے تورا
نیناں ریلے چال چلت متواری
آس لگی سکھی نامانے جیارامورا
چھبی دکھلا جا بانکے سنوریا
دھیان لگے موہے تورا

اسی ٹھمری پر مجرا ختم ہو گیا۔ نواب اور ان کے احباب اور ان کے مصاحبین رات بھر
روپیوں اور اشرافیوں کی بارش کرتے رہے۔ اس مجرے میں اماں کو اتنا ملا کہ رکھے سے نہ رکھا
گیا۔ جب نور کا تڑکا ہوا تو سازندوں نے ہاتھ اپنے روک لیے اور مجرا موقوف ہوا۔ نواب نے
اماں کے لیے سواری بلوائی، تحفے ساتھ کیے اور جب سواری مہتاب باغ سے کچھ آگے بڑھی تو
اماں کی نگاہ گنوگھاٹ پر گئی پس اسی وقت انہوں نے رونا شروع کر دیا۔ سواری سے اتریں،
گھاٹ پر گئیں اور بہتے ہوئے پانی کو چلو میں لے کر بولیں:

”یہیں سے کچھ آگے ابا جان بحرے پر بیٹھتے تھے اور دلکش جا کر دریا کے اس طرف رمنے
میں شکار کھیلے تھے۔“

ساتھ والے کچھ نہ سمجھے۔ بہت دیر اماں دریا کو دیکھ دیکھ کر روتی رہیں۔ کوٹھے پر واپس
آئیں تو سارا پیسہ خانم کے حوالے کیا اور تحفے بھی سب انہیں کو دے دیے اور خانم صاحب سے
کہہ دیا اب کئی دن تک میں کوئی مجرا نہیں کروں گی۔“

اپنی ماں کے مجرے کا پورا قصہ سنانے کے بعد غم آنکھوں کے ساتھ شملہ خانم بولیں:
 ”اب سمجھے وہ اس مجرے کا ذکر کیوں کرتی تھیں۔“
 ”سمجھ گیا۔“

”نہیں تم کچھ نہیں سمجھے۔ میں تمہیں بتاتی ہوں کیوں ذکر کرتی تھیں۔ انہیں بہت حسرت تھی دلہن بننے کی اور یہ حسرت مجھے بھی تھی۔ لیکن ماں بیٹی دونوں کی دلہن بنے بغیر شادی ہو گئی۔ نہ مانجھا، نہ ساچق، نہ مہندی نہ بری کے جوڑے، نہ ہم نشینیں، نہ ساتھ والیاں۔ دو مولوی دو گواہ اور بس۔ اماں نے جب اس برات کا حال سنا اور مجرے کے روز کی رونق دیکھی تو انہیں خیال آیا اگر ابا کے گھر سے انہیں غائب نہ کیا جاتا تو ایسی ہی برات ان کے دروازے پر بھی آتی۔ اور یہی سوچ کر وہ رنجیدہ ہوئیں۔ دوسرے یہ کہ گٹھاٹ دیکھ کر انہیں ابا کا بچا یاد آ گیا۔ مجرے تو انہوں نے بہت بڑے بڑے کیے لیکن یہ مجرا انہیں دو وجہوں سے وہ کبھی نہیں بھلا سکیں۔“
 ”آپ نے سب کچھ اسی طرح بتایا جیسے آپ کی ماں نے آپ کو بتایا تھا۔“
 ”اماں کچھ دنوں بعد اس مجرے کا ذکر کرتیں اور ایسے کرتیں جیسے سب کچھ ان کے سامنے ہو رہا ہو اسی لیے سب کچھ مجھے اُسی طرح یاد رہا۔“

”اب میں آپ سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔“
 ”تم پوچھو نہ پوچھو لیکن جو مجھے یاد آتا جائے گا، تمہیں بتاتی جاؤں گی۔“ یہ کہہ کر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں:

ع ”اس عمر میں انقلاب کیا کیا دیکھے“
 ”بس ایک بات اور، یہ بات پوچھنے والی تو نہیں لیکن پوچھے لیتا ہوں اور آپ بتا بھی دیں گی۔“
 ”کیا؟“

”عمر میں آپ کی اب کون سا برس لگا ہے؟“
 ”ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتی۔ جس آشوب میں ہم پیدا ہوئے اماں کے لیے کچھ یاد رکھنا مشکل تھا۔ بس اتنا یاد ہے، رجب کا مہینہ تھا۔“ شملہ خانم نے بتایا۔ پھر کہا: ”جب تم سے کلچے نہاری منگوائے تھے اس وقت باون پچپن کے آس پاس تھی یا اس سے کچھ اوپر۔ اب کچھتر سے

آگے نکل چکی ہوں اور اس سے آگے نکلنا مشکل ہے۔“
”ایک بات میں نے آپ کی بیٹی سے کہی تھی، آپ سے بھی کہہ رہا ہوں۔“
”کون سی۔“

”اپنی بیاضوں میں آپ نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اپنا کلام بھی اور کچھ وہ بھی جو آپ کسی کو نہیں دکھانا چاہتیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں ان میں جو چھپنے والا ہو وہ مجھے دے دیجیے۔“
”تم انہیں دیکھ لو۔ میں تم سے کچھ نہیں چھپانا چاہتی۔“ شمیلہ خانم نے کہا۔ ”جو ہوتا تھا، روز کے روز لکھ لیا کرتی تھی اور اس کا جواثر مجھ پر ہوتا تھا اسے بھی لکھ لیا کرتی تھی۔ سب پڑھ کر اب تم طے کرنا کیا چھپنا ہے، کیا نہیں۔“

”اچھا اب آپ آرام کیجئے۔“
”اب آرام ہی کرنا ہے۔ اب سوؤں گی تو کوئی جگانے والا نہیں ہوگا۔“
”ہم ہوویں گے اور قبر کا کونا ہوگا۔“ شمیلہ خانم نے ایک سرد آہ کھینچتے ہوئے کہا۔
پھر بولیں:

”بیٹا کی آہٹ سے آنکھ کھلی بھی تو نہ وہ مجھے دیکھ سکے گی نہ میں اسے۔“ یہ کہہ کر شمیلہ خانم اپنے کمرے میں چلی گئیں اور سبیلہ اپنے کمرے سے باہر نکل آئیں۔
”جو تصویریں امین آباد لے کر چلنا ہے، نکال لیں آپ نے۔“ میں نے ان سے پوچھا:
”نکال تو لیں۔ لیکن.....“
”لیکن؟“

”جب ان کے بیچنے کی بات آتی ہے تو دل لرز نے لگتا ہے۔ یہ تصویریں میں نے اپنے لیے بنائی تھیں۔“ سبیلہ بولیں: ”سوچا تھا کسی قابل ہوئی تو ایک بڑا گھر بناؤں گی اور اس میں اپنا ایک الگ تصویر خانہ۔“
”تو رہنے دیجیے۔“

”اماں کا علاج، گھر کا کرایہ، روز کا خرچ، یہ سب کیسے ہوگا۔“
”میں نے پہلے بھی کہا تھا پھر کہہ رہا ہوں، اس کے لیے پریشان نہ ہوں۔“
”آپ اٹھائیں گے یہ خرچ؟“ سبیلہ غصے سے بولیں۔ ”یہ مجھے گوارا نہیں۔ پہلے بھی کہہ

چکی ہوں۔“ پھر بولیں: ”اب میں سوچتی ہوں صرف تصویروں کی فروخت سے کام نہیں چلے گا، کچھ اور کرنا پڑے گا۔“ یہ کہہ کر تصویروں سے بھرا تھیلا اٹھاتے ہوئے بولیں:

”چلیے امین آباد۔“

○

امین آباد میں جب ہم اس دکان پر پہنچے جہاں سے میں سبیلہ کی بنائی ہوئی تصویریں دے کر اُن کے پیسے لے آیا کرتا تھا تو دکاندار میرے ساتھ سبیلہ کو دیکھ کر بولا:

”پہلی بار یہی آئی تھیں تصویریں لے کر۔“

”ہاں۔“

”اس کے بعد تو آپ آنے لگے تھے، انہیں کیوں آنا پڑا۔“

”کچھ نئی تصویریں ہیں۔ بہت پہلے کی بنائی ہوئی۔ اُن کی قیمت جو انہیں لینا ہے، یہی بتائیں گی۔“

”دکھائیے تصویریں۔“

میں نے تھیلے سے نکال کر تصویریں اسے دکھائیں۔ وہ کافی دیر تک انہیں دیکھتا رہا پھر اس نے سبیلہ سے پوچھا: ”آپ ہی نے بنائی ہیں؟“

”جی۔“

”کیوں بیچ رہی ہیں؟“

”ضرورت آ پڑی ہے۔“

”کتنا دیا جائے سب کا؟“

”جو ایک تصویر کی قیمت ہے، وہی سب کی۔ اسی کے حساب سے جوڑ لیجیے۔“

سبیلہ نے کچھ سوچ کر اسے پیسے بتائے۔ اس نے سب تصویروں کے پیسے جوڑے اور فوراً سبیلہ کو دے دیے۔ پیسے اچھے خاصے تھے۔ سبیلہ انہیں لے کر خوش بھی ہوئیں اور رنجیدہ بھی۔

”کچھ دن کا خرچ نکل آیا۔“ انہوں نے کہا۔ ”اور مکان کا کرایہ بھی۔ اماں کی طبیعت ٹھیک ہو تو جیسی یہ لوگ چاہتے ہیں ویسی تصویریں بناؤں گی۔“

”ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“ میں نے کہا۔

”کیا؟“

”آپ نے جتنے پیسے بتائے، اس نے فوراً دے دیے۔ کوئی مول تول نہیں کیا۔“

”اب یہ سب مت سوچیے۔ چلیے ہنگا اور کتو کی طرف۔“

دکان سے کچھ آگے بڑھنے کے بعد سبیلہ نے مجھ سے کہا:

”چل رہے ہیں تو کچھ ان لوگوں کے لیے لیتے چلیں، خالی ہاتھ جانا اچھا نہیں لگتا۔“

پھر سوچنے لگیں کیا لیا جائے۔ بہت سوچنے کے بعد مجھ سے بولیں:

”ایک مہینے بعد جاڑا شروع ہو جائے گا۔“

یہ کہہ کر امین آباد کے بالکل بیچ میں بنے ہوئے بازار میں جو طرح طرح کے کپڑوں کی فروخت کے لیے مشہور ہے، داخل ہو گئیں اور ایک ایسی دکان پر جا کر رکیں جہاں شنیل کی رضائیاں لگی ہوئی تھیں۔ سبیلہ نے ان رضائیوں کو دیکھنا شروع کیا پھر مجھ سے پوچھا:

”ان لوگوں کو کون سے رنگ کی پسند آئے گی؟“

”زرد یا اودے رنگ کی۔ کتو کی تصویروں میں یہی دو رنگ بہت استعمال ہوئے ہیں۔“

”زرد تو مجھے پسند نہیں اودے رنگ کی لیے لیتے ہیں۔ اس رنگ کی شنیل زیادہ اچھی لگے گی۔“

سبیلہ نے اس رضائی کے دام پوچھے، کچھ مول تول کیا پھر اسے خرید کر اپنے تھیلے میں رکھ

لیا۔ بازار کے باہری حصے میں ریوڑی، گجک اور دال موٹ کی بہت سی دکانیں تھیں۔ سبیلہ نے

ان دکانوں سے یہ تینوں چیزیں خریدیں اور انہیں بھی تھیلے میں رکھ کر بولیں: ”اب چلیے۔“

ہم امین آباد سے متصل لاٹوش روڈ کی طرف نکلنے والی بہت سی ڈھلانوں میں سے ایک

ڈھلان اتر کر ماڈل ہاؤس جانے والی گلی کی طرف آئے اور وہاں سے فرخندہ محل کے امام

باڑے کی پشت والے احاطے میں۔ احاطے میں داخل ہو کر ہم ہنگا اور کتو والی کوٹھری کے

سامنے جا کر رک گئے۔ سبیلہ نے آہستہ سے ہنگا کو آواز دی۔ وہ باہر نکل کر آئیں اور سبیلہ کو

دیکھتے ہی ان سے لپٹ گئیں۔ پھر مجھے اور سبیلہ کو لے کر اندر کوٹھری میں گئیں۔ کتو بستر ہی پر

تھیں لیکن ان کی طبیعت پہلے سے بہتر معلوم ہو رہی تھی۔

سبیلہ نے کتو کی خیریت پوچھنے اور کچھ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد پہلے تھیلے سے

رضائی نکالی اور اسے کتو کو دیتے ہوئے بولیں: ”آپ کے لیے۔ پسند آئی۔“

”اس کی کیا ضرورت تھی۔“

”پسند آئی یا نہیں۔“

پسند تو بہت آئی، بہت اچھا رنگ ہے، بہت پیارے نیل بوئے ہیں لیکن۔۔۔۔۔
”لیکن ویکن کچھ نہیں۔ اگلے مہینے سے گلابی جاڑے شروع ہو جائیں گے۔ اسے پانچویں
جگ کے پیکٹ نکالے اور انہیں ہینگا کی طرف بڑھا کر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں:
”یہ ان کی طرف سے۔“

ہینگا نے وہ پیکٹ شکر یہ کہہ کر لے لیے لیکن ان کے چہرے سے لگا کہ سبیلہ کے ہاتھوں
ان چیزوں کا دیا جانا انہیں اچھا نہیں لگا۔

ہینگا اور کتو نے شمیلہ خانم کی خیریت معلوم کی۔ سبیلہ نے انہیں میرے ساتھ محرم کی
مجلسوں میں جانے، عاشور کے دن کر بلا میں دوپہر تک رہنے اور شام غریباں کی مجلس سننے کا
حال تفصیل سے بتایا۔ پھر بتایا: ”اور ہم نوکی شب شہبا کی قبر پر بھی گئے۔“

سب کچھ سننے کے بعد ہینگا بولیں: ”کتو کی طبیعت کی وجہ سے ہم مجلسوں میں نہیں جاسکے،
اس کا ہمیں افسوس ہے اور ایک مجلس میں نہ جانے کا بہت افسوس ہے۔“
”کون سی؟“ میں نے پوچھا۔

”قصر حسینی والی۔ سات محرم کو ہم وہاں ضرور جاتے تھے۔ زعفر جن کا حال سننے۔
وہیں سن سن کر ہمیں پورا مرثیہ یاد ہو گیا۔“ ہینگا نے کہا۔ ”پھر ہم اپنے گھر کی مجلس میں یہی
مرثیہ پڑھنے لگے۔“ پھر بولیں:

”اس بار ہم وہاں جاتے نہیں سکے لیکن وہی کام ہم نے گھر پر کر لیا۔ کتو کو اپنے سامنے بکے
لگا کر بٹھایا اور یہ پورا مرثیہ اسی انداز میں جیسے نجم الحسن پڑھتے ہیں، انہیں سنایا۔“

”اگلے برس سات کو ہمارے یہاں پڑھیے گا۔ اماں بہت خوش ہوں گی۔“ سبیلہ نے کہا۔
ہینگا اور کتو کے یہاں بہت دیر بیٹھنے اور بہت سی باتیں کرنے کے بعد ہم نے چلنے کی
اجازت چاہی تو کتو بولیں: ”دن کا کھانا یہیں کھا کر جائیے۔ آج میں نے آپا سے قبولی کی
فرمائش کی ہے۔ پکنے میں بہت دیر نہیں لگے گی۔“

”قبولی تو ہمیں بہت پسند ہے۔ ہم ضرور کھاتے لیکن اماں کو بہت دیر اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔“ سبیلہ نے کہا۔

”ہم پھر آئیں گے اور قبولی کھائے بغیر نہیں جائیں گے۔“ یہ کہہ کر سبیلہ چلنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

○

احاطے سے باہر نکل کر سبیلہ بولیں: ”بہت چھوٹی سی جگہ میں رہتے ہیں یہ لوگ ان سے کہیے ہمارے یہاں آ جائیں۔“

”نہیں آئیں گے۔“

”کیوں؟“

”میں نے پیسوں سے آپ کی مدد کرنا چاہی، آپ نے قبول کی؟“

”نہیں۔“

”تو بس۔ یہی غیرت انہیں بھی روکتی ہے آپ کے یہاں آنے سے۔“

سبیلہ کچھ نہ بولیں۔ ماڈل ہاؤس سے نکل کر جب ہم امین آباد آئے تو سبیلہ بولیں:

”ہم چوک کی طرف سے چلیں گے۔“

”کیوں؟“

”یہ وہیں چل کر بتائیں گے۔“

ہم ایک سواری پر بیٹھ کر چوک آئے تو سبیلہ نے مجھ سے کہا۔

”آپ گول دروازے پر میرا انتظار کیجیے، میں وہیں آتی ہوں۔“ کچھ دیر بعد وہ اپنے ہاتھوں میں ایک تھیلا لیے ہوئے آئیں اور مجھ سے بولیں: ”چلیے۔“

”میں اپنے گھر جاؤں گا۔ بہت کام ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”دو دن بعد آؤں گا۔ آپ اپنی ماں کی بیاضیں اور وہ جو آپ کا رجسٹر ہے اسے الگ رکھ دیجیے گا۔“ پھر انہیں بتایا: ”بیاضیں دیکھنے کی اجازت آپ کی ماں نے مجھے دے دی ہے اور یہ بھی کہا ہے جو نہ چھپنے والا ہوا سے نہ چھپوانا۔“

”تو آپ نہیں چلیں گے ہمارے ساتھ؟“

”بتایا تو آپ کو، بہت کام ہیں۔“

”آپ جب وہاں نہیں ہوتے ہیں تو.....“

”تو.....“

”نہ اماں کو اچھا لگتا ہے نہ مجھے۔“

”دو دن بعد آ رہا ہوں۔ وہ کام بھی ضروری ہیں جو ان دو دنوں میں مجھے کرنا ہیں۔“

”اس دن آپ آئیں گے تو میں ایک بات آپ کو بتاؤں گی۔“

”کون سی بات۔“

”اُسی دن بتاؤں گی۔ سڑک پر کھڑے کھڑے زیادہ دیر باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا۔“

”تو ٹھیک ہے دو دن بعد۔“



ان دو دنوں میں میں نے لکھی ہوئی چیزوں کو پھر سے دیکھنا شروع کیا۔ لکھے ہوئے کو بار بار پڑھ کر میں اطمینان کر لینا چاہتا تھا کہ نانی سے لے کر نواسی تک کوئی چیز لکھنے سے رہ تو نہیں گئی۔ کام کرنے کا یہ طریقہ میں نے، جس ریاست میں منشی والی نوکری کی تھی، وہاں سیکھا تھا۔ اس ریاست کے راجہ جہازی سائز کے ایک رجسٹر میں بائیں صفحے پر روز کی روداد لکھتے اور داہنا صفحہ رد و بدل کے لیے خالی رکھتے۔ دونوں صفحوں کو اور اسی کے ساتھ پہلے کے لکھے ہوئے کو وہ بار بار دیکھتے اور تب انہیں کاتبوں کے حوالے کرتے اور کاتبوں کے لکھے ہوئے میں بھی ضرورت سمجھتے تو بدل دیتے۔ ایک دن میں نے ایک سن رسیدہ کاتب سے پوچھا:

”راجہ صاحب ایسا کیوں کرتے ہیں۔“

”احتیاط۔ احتیاط بہت ضروری ہے۔ بے احتیاطی میں کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔“

اُن کا جملہ یاد آتے ہی مجھے شہباز یاد آئی۔ اس نے، جو مسودہ ہمیں ملا تھا اسے بہت ٹھہر ٹھہر کر پڑھا تھا اور چھپی ہوئی کتاب سے ملان کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا تھا۔ اُس کی اُسی محنت نے میرا کام آسان کر دیا تھا۔

یہ دو دن میں نے اسی لیے رکھے تھے کہ اب تک لکھے ہوئے کو آخری بار حرفاً حرفاً پڑھ لوں اور اچھی طرح دیکھ لوں کہ اس میں کوئی تکرار یا الجھاؤ تو نہیں ہے۔ سب کچھ اچھی طرح پڑھ لینے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اب میرے پوچھنے اور شمیلہ خانم کے بتانے

والی کوئی بات بچی نہیں ہے۔ بس شمیلا خانم کی بیاضیں دیکھنا رہ گئی ہیں۔ اگر ان میں کچھ ایسا ہوا جسے لکھے ہوئے میں شامل کرنا ضروری ہوا تو اسے وہیں جہاں وہ مناسب معلوم ہوں گی، چسپاں کر دوں گا۔

دو دن بعد میں سبیلہ کے یہاں پہنچا تو وہ اپنی ماں کے ساتھ بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے پوچھا: ”سب ضروری کام ہو گئے؟“

”ہو گئے۔ دو دن لگ کر اب تک جو کچھ لکھا تھا اسے ایک سے زیادہ بار پڑھ لیا۔“

میں نے کہا۔

”اب وہ سب آپ کی ماں کو لا کر دے دوں گا۔ وہ اُس لکھے ہوئے کو پڑھنا چاہتی ہیں۔“ یہ کہہ کر میں نے سبیلہ سے کہا: ”ذرا اپنے کمرے میں چلیے۔“

جب وہ میرے ساتھ اپنے کمرے میں آ گئیں تو میں نے ان سے پوچھا:

”آپ کون سی بات بتانا چاہتی تھیں؟“

”کوئی خاص بات نہیں۔ اُس دن جب اماں نانی کے حجرے کا حال آپ کو بتا رہی تھیں تو گنو گھاٹ کا ذکر آیا تھا۔“

”آیا تھا۔“

”اس سے پہلے مہدی گھاٹ تھا۔ وہیں سے اماں کے نانا بجرے پر بیٹھ کر دلکشا کی طرف جاتے تھے، رمنے میں شکار کھیلنے۔“

”جی۔“

”اماں کی طبیعت ابھی سنبھلی ہوئی ہے۔ میں چاہتی ہوں ایک دن صبح صبح آپ کے ساتھ نکلوں اور مہدی گھاٹ جا کر وہاں سے گوشتی کے کنارے کنارے دلکشا تک جاؤں۔“

سبیلہ نے کہا۔ پھر بولیں: ”سیر بھی ہو جائے گی۔ باتیں بھی ہوں گی اور وہ سب بھی دیکھ لوں گی جو نانی سے سن کر اماں نے بتایا ہے۔“

”کل ہی چلیے۔ میں سورج نکلنے سے پہلے آ جاؤں گا۔“

”میں پچھلے پہر اٹھ کر ناشتہ کھانا سب پکالوں گی۔ ناشتہ ہم وہاں کریں گے جہاں نانی کے ابا کا بجر الگ تھا اور دن کا کھانا دلکشا میں کھائیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ اب ایسا کیجیے نانی کی ساری بیاضیں اور اپنا رجسٹر مجھے دے دیجیے۔ میں نے اپنا کام کر لیا ہے، اب آپ کے کام پر لگوں گا۔“ میں نے کہا۔

”جن عورتوں کی روداد آپ لکھنا چاہتی ہیں، اُن میں سے بہت سی میرے محلے کے سامنے بسی ہیں، بہت سی وہاں سے آگے اکبری دروازے سے شاہ گنج کی طرف جانے والے راستے میں۔“

”میں نے ان میں سے زیادہ تر کا حال لکھ لیا ہے۔“ سبیلہ نے کہا۔ پھر بتایا: ”پہلے اُن کا حال لکھا ہے جو کوٹھے چھوڑ کر چلی گئیں اور کوئی نہیں جانتا کہاں گئیں۔ پھر اُن کے بارے میں لکھا ہے جو کوٹھوں پر ہیں لیکن بہت بوڑھی ہو چکی ہیں۔ اور پھر ان کا ذکر کیا ہے جو بازار میں بیٹھی ہیں۔“

”آپ نے تو کہا تھا صرف بازار والی عورتیں.....“

”اس منظر میں دو تصویریں ہیں۔ ایک دیکھنے میں بہت بری نہیں معلوم ہوتی دوسری صرف بری معلوم ہوتی ہے۔“ سبیلہ بولیں۔ ”مجھے دونوں دکھانا ہیں۔ اب آپ اماں کی بیاضیں اور میرا رجسٹر لے جائیے اور دونوں کام کر ڈالیے۔“ یہ کہہ کر انہوں نے اپنا رجسٹر اور اپنی ماں کی بیاضیں میرے سامنے لا کر رکھ دیں۔ میں انہیں لے کر سبیلہ کے کمرے سے باہر آ گیا اور خاموش بیٹھی ہوئی شمیلہ خانم سے کہا:

”کتاب تیار ہے۔ بس آپ کی بیاضوں کو دیکھ لوں پھر آپ کو پڑھنے کے لیے دے دوں۔“

”دکھانے میں دیر نہ کرنا ایسا نہ ہو کہ میں اسے دیکھے بغیر.....“

بس دو چار دن کی بات ہے۔ یہ کہہ کر میں نے رجسٹر اور بیاضیں اٹھائیں اور انہیں سبیلہ کے دیے ہوئے تھیلے میں رکھ کر ان سے کہا:

”تو کل فجر کے وقت.....“

”فجر کے وقت؟“ شمیلہ خانم سن کر چونکیں۔

”کل سورج نکلنے سے پہلے ہم لوگ مہدی گھاٹ جائیں گے۔“ سبیلہ نے اپنی ماں کو

بتایا۔ ”وہاں سے گومتی کے کنارے کنارے دلکشا تک۔“

”کیوں؟“

”جو کچھ اپنے نانا کے بارے میں آپ نے بتایا ہے اسے انہیں کے زمانے میں جا کر دیکھیں گے۔“ یہ سن کر شمیلہ خانم کو ہنسی آ گئی۔ ”ان کے زمانے میں کیسے جاؤ گی۔“

”اسے اپنی آنکھوں میں واپس لا کر۔“

”ٹھیک ہے جاؤ ضرور جاؤ۔ نانا کے زمانے میں بہت خوبصورت تھا وہ علاقہ۔“

شمیلہ خانم بولیں:

”اماں بتاتی تھیں اور انہیں اُن کی مغلانیاں بتاتی تھیں کیسے ہرے بھرے جنگل تھے گومتی کے اُس طرف اور کیسے ان میں ہاتھی چنگھاڑتے تھے اور شیر دھاڑتے تھے اور ہرن چوکڑیاں بھرتے تھے اور کیسے درختوں کی شاخوں پر پرندے چہچہاتے تھے۔“

”اماں آپ تو اسی زمانے میں چلی گئیں۔“

”رمنے کے یہی منظر بتا کر مغلانی کم بخت اماں کو اُس بہلی تک لے آئی تھی جس میں بیٹھ کر.....“

”آگے۔ آگے بتائیے۔“

”اماں خانم صاحب کے یہاں پہنچ گئیں۔“ یہ کہتے وقت شمیلہ خانم کی آواز بیٹھنے لگی۔

”شام ہونے سے پہلے ہم لوگ واپس آ جائیں گے۔“ سبیلہ نے بات بدلی۔ پھر

مجھ سے بولیں:

”کل پو پھٹنے سے پہلے میں آپ کو تیار ملوں گی۔“



دوسرے دن تاروں کی چھاؤں میں میں نے سبیلہ کے دروازے پر دستک دی۔ وہ بالکل تیار تھیں۔ انہوں نے چادر سر پر ڈالی۔ ایک بڑا سا تھیلا جس میں ناشتہ اور کھانا تھا، اپنے ہاتھوں میں لیا۔ شمیلہ خانم کو جگا کر بتایا ہم جارہے ہیں اور دروازے کے باہر نکل آئیں۔ عنبر گنج سے نکلتے ہی ہمیں ایک تانگہ مل گیا۔ اس پر بیٹھ کر ہم شیش محل آئے اور شیش محل کے اندر سے مہتاب باغ کی طرف۔ یہاں پہنچ کر سبیلہ نے باغ کے کنارے کھڑے ہو کر کہا:

”یہیں نانی نے وہ مجرا کیا تھا جسے وہ عمر بھر نہیں بھلا سکیں۔“

پھر اس اجڑے ہوئے باغ کے آخری حصے میں جا کر بولیں:

”یہیں وہ رات بھر ناچی ہوں گی۔“ پھر میرا ہاتھ پکڑ کر کہا: ”تیز تیز چلیے۔ سورج نکلنے سے پہلے مہدی گھاٹ پہنچنا ہے۔“ ہم بہت تیز چلتے ہوئے سورج کی پہلی کرن پھوٹنے سے پہلے مہدی گھاٹ پہنچ گئے۔ وہاں بیچ دریا میں کشتیاں موجوں پر رواں تھیں اور گھاٹ پر صبح کا نہان کرنے والوں کا مجمع تھا۔ سورج نکلتے ہی میں نے دریا کی موجوں کو دیکھا تو کرمیں اُن پر طرح طرح کے نقش بنا رہی تھیں۔ سبیلہ کنارے سے لگی ہوئی ایک کشتی پر سوار ہو کر بولیں:

”ہمارے پرانا نا کا بچرا یہیں لگتا تھا۔ یہاں تک وہ اپنی بگھی پر آتے تھے اور اسی راستے سے آتے تھے جس راستے سے ہم آئے ہیں۔“

کچھ دیر اس کشتی پر بیٹھ کر وہ اتر آئیں پھر دریا سے کچھ دور ریت پر ایک بڑی سی چادر بچھائی اور اس پر ناشتے کا سامان رکھ کر بولیں: ”لیجیے کبجے ناشتہ“ پھر بولیں: ”اُس طرف کبھی جنگل تھا، اب میدان ہے، کچھ دن میں وہاں پکی عمارتیں بن جائیں گی جیسے پکے پل اور کوٹھی فرح بخش کے دوسری طرف بن رہی ہیں۔“

ہم ناشتہ کر رہے تھے اور صبح دم دریا میں بہتی ہوئی ان کشتیوں کو دیکھ رہے تھے جن کے ملاحوں نے مچھلیاں پکڑنے کے لیے دریا میں اپنے جال ڈال دیے تھے۔ کچھ نو عمر لڑکے بیچ دریا میں تیراکی کے ہنر دکھا رہے تھے اور کچھ اِس کنارے سے اُس کنارے سب سے پہلے پہنچنے کا مقابلہ کر رہے تھے۔ آسمان میں اڑتے ہوئے بہت سے پرندوں میں سے دو چار تیزی سے نیچے کی طرف آتے اور دریا کے پانی کو اپنے پنجوں سے چھو کر اوپر کی طرف اڑ جاتے۔

ناشتے کے بعد ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور گٹو گھاٹ کی طرف چل دیے۔ وہاں سے گلاں کوٹھی ہوتے ہوئے کڑیا گھاٹ آ کر سبیلہ نے رومی دروازے کی طرف دیکھا اور آصفی مسجد کے ان میناروں کو جو بہت دور سے نظر آ جاتے ہیں۔ پھر ہم مسجد شاہ پیر محمد کے پیچھے سے بول کے درختوں سے گھرے زنا نہ گھاٹ کی طرف آئے۔ یہاں آ کر سبیلہ مجھ سے بولیں:

”آپ اندر نہیں جاسکتے۔ یہیں ٹھہریے۔ میں کچھ دیر گھاٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر آتی ہوں۔“

کچھ دیر بعد وہ باہر آئیں تو میں نے اُن سے پوچھا:

”سیڑھیوں پر جا کر کیوں بیٹھیں۔“

”وہاں سے بجز جس پر علی نقی بہادر بیٹھ کر جاتے تھے، بہت صاف دکھائی دے رہا تھا۔“
 اور اس سے پہلے کہ میں ان کی بات کا مطلب سمجھوں وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دریا کے
 کنارے کنارے چلنے لگیں۔ چلتے چلتے بولیں: ”اب راج گھاٹ آئے گا۔“ اماں بتاتی ہیں،
 اُن کے نانا وہاں اپنا بجز رکواتے تھے۔ اب یہ پوچھیے کیوں رکواتے تھے۔“
 ”کیوں رکواتے تھے؟“

”بجز پر سواران کے ساتھ کے لوگ یہاں نہاتے تھے۔ اماں کہتی ہیں کہ یہ راج
 گھاٹ ہے لیکن یہاں نہانے والے سب کے سب مسلمان ہوتے تھے۔“ یہ کہہ کر بولیں:
 ”کچھ دیر میں وہاں بھی رکوں گی۔“

راج گھاٹ آیا تو سبیلہ اس کی سیڑھیوں پر بھی اُسی طرح بیٹھیں جیسے پہلے والے گھاٹ
 پر بیٹھی تھیں۔ میں بھی ان کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ بہت دیر تک دریا کی روانی کو دیکھتے رہنے کے
 بعد وہ مجھ سے بولیں:

”اماں اٹھتے بیٹھتے دنیا سے اٹھ جانے کی بات کرتی ہیں۔ کل رات میں اٹھ اٹھ کر سب
 موت والے شعر پڑھ رہی تھیں:

موردِ مرگ ناگہانی ہے
 جائے عبرت سرائے فانی ہے
 ہوش و حواس و تاب و تواں داغِ جاچکے
 اب ہم بھی جانے والے ہیں سامانِ تو گیا
 اماں کی آنکھ، خدا نہ کرے بند ہوئی تو.....“

”پریشان نہ ہوں۔ اس عمر میں ہر بیمار اپنی بیماری کو موت کی آمد سمجھنے لگتا ہے۔ اُن کے
 ساتھ بھی یہی ہے۔“

”سوچتی ہوں نوکری کر لوں۔ ڈھونڈیے کہیں۔“ سبیلہ نے کہا۔ ”آگے کی زندگی کیسے
 کٹے گی۔ کہیں لڑکیوں کے اسکول میں مل جائے، پڑھانے کی۔“ یہ کہہ کر وہ بولیں:
 ”پچلیے آگے چلتے ہیں۔“

راج گھاٹ سے ہم پکے پل اور اس کے بعد لوہے والے پل کے نیچے سے ہوتے

ہوئے اس حصے میں آئے جو کبھی سبھٹی کہلاتا تھا اور جس کے اندر بھیم کا اکھاڑہ تھا۔ سبیلہ نے اس طرف جہاں کبھی اکھاڑہ ہوا کرتا تھا، اشارہ کرتے ہوئے کہا:

”وہیں کہیں میر تقی میر رہا کرتے تھے۔“ پھر بولیں: ”جب وہاں رہتے ہوں گے تو ٹہلتے اچھے شعر کہتے ہوں گے۔“

ریت پر چلنے میں ہمیں بہت پریشانی ہو رہی تھی اس لیے کچھ کچھ دیر بعد ہم کسی پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ جاتے۔ چلتے چلتے ہم بیگم کوٹھی کے سامنے آ گئے۔ سبیلہ نے کوٹھی کی طرف جے اب بلی گارد کہا جاتا تھا، دیکھتے ہوئے کہا:

”یہیں محمدی خانم نے انگریزوں کو گھیر لیا تھا۔“

”حضرت محل؟“

”جی۔ افتخار النساء خانم، راج ماتا بھی کہتے تھے انہیں۔“ سبیلہ نے کہا۔ ”حضرت محل تو سلطان عالم کا دیا ہوا نام تھا۔“

”جی۔ لکھنؤ سے واجد علی شاہ کے نکلنے کے بعد بہت سی بیگموں نے محل چھوڑ دیا، بہت سوں نے نہیں چھوڑا۔ انہیں میں یہ حضرت محل بھی تھیں۔“ میں نے کہا۔ پھر سبیلہ کو بتایا: ”کیا جی دار عورت تھی۔ انگریزوں کے قبضے کے بعد بھی اپنی حکومت چلاتی رہی۔“

”اماں بتاتی ہیں چھوٹے سے لڑکے برجیس قدر کو تخت پر بٹھا دیا۔ نام بیٹے کا تھا کام وہ کرتی تھیں۔“

”ہاں۔ بیٹے کی طرف سے حکومت واپس لینے کا اعلان کر دیا، ایک بڑی فوج بنا کر دشمن سے مورچہ لیا۔“ میں نے کہا۔ ”اور گیارہ دن کے اندر انگریزوں کو اودھ سے نکال باہر کیا۔ لیکن.....“

”لیکن؟“

”دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور.....“ میں رکا پھر کہا۔ ”..... وہ پوری فوجی طاقت کے ساتھ یہاں آ گئے۔“

”اس سے آگے جو اماں نے بتایا ہے میں بتاتی ہوں۔“ سبیلہ بولیں:

”بتائیے۔“

”زبردست جنگ ہوئی۔ ایک خبر آئی بلی گارد پر ہندستانی فوج کا قبضہ ہو گیا۔ دوسری خبر آئی انگریزوں نے ہندستانی فوج کو شکست دے دی۔ دوسری خبر صحیح نکلی۔“ سبیلہ بتاتی رہیں۔ ”دہلی سے آئی ہوئی فوج بلی گارد میں داخل ہو گئی پھر اس نے قیصر باغ پر حملہ کر دیا۔ حضرت محل نے قیصر باغ کے سارے پھاٹک بند کرادیے لیکن انگریزی فوجیں قیصر باغ میں داخل ہو گئیں۔ بہت خون بہا بہت سی جانیں گئیں۔ انگریز جیت گئے۔“ کچھ دیر رک کر سبیلہ نے آگے بتانا شروع کیا:

”حضرت محل بہت سی عورتوں کے ساتھ گھسیاری منڈی کی طرف والے پھاٹک سے نکل کر حسین آباد آ گئیں۔ یہاں پھر انہوں نے انگریزوں سے ٹکر لی۔ لیکن.....“

”نا کام رہیں۔“ میں نے کہا۔ ”چھپ چھپا کر اپنے بیٹے کے ساتھ نیپال کے لیے نکل پڑیں اور ایک دن وہیں خاموشی سے مر گئیں۔“

”بڑی بہادر عورت تھی۔“ سبیلہ بولیں: ”شجاع الدولہ کی طرح ہار گئی لیکن ان کی طرح انگریزوں کے آگے سر نہیں جھکایا۔“

حضرت محل کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے ہم کوٹھی فرح بخش کے پیچھے سے موتی محل آ گئے۔ موتی محل سے پہلے والے پل پر ہمیں بندروں کے غول نظر آنے لگے۔ وہ پل کی کگاروں اور ستونوں پر کودتے پھر رہے تھے اور جب کوئی عقیدتمند کھانے والی چیزیں لے کر آتا تو اس کے ہاتھوں سے اُچک لے جاتے۔ ان میں سے کچھ، جب ہم پل کے نیچے سے گزر رہے تھے، پل کے نیچے اتر آئے اور سبیلہ کے تھیلے کی طرف لپجائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔

”یہ منگی برج ہے۔ یہاں سے جلدی نکلیے ورنہ یہ سب جان کو چمٹ جائیں گے۔“

میں یہ کہہ ہی رہا تھا کہ دو تین بندر سبیلہ کی طرف جھپٹے اور وہ چیخ کر مجھ سے لپٹ گئیں۔ اُن کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ بندروں کو بھگانے کے بعد اپنے آپ کو اُن سے چھڑانے میں مجھے تھوڑا وقت لگا۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑا اور انہیں کھینچتا ہوا اس پل سے بہت دور لے آیا۔ پھر سکندر باغ سے پہلے ایک گھنے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر ہم نے اپنی سانسیں درست کیں۔ جتنی دیر ہم اس پیڑ کے نیچے بیٹھے، سبیلہ نے میری طرف دیکھا نہ مجھ سے

ہاتھ کی۔ بہت دیر بعد جب ہم اس کپڑے کے نیچے سے اٹھ کر نکلا تو اس کی طرف چلے گئے۔
 انہیں جھکائے جھکائے انہوں نے مجھ سے کہا:
 ”میں بہت دیر کی تھی اس لیے۔“

”اچھے وقت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ چلیے۔ دیکھا آپ بہت دور گئے ہیں۔“ میں نے کہا۔
 ”یہج میں شاہ نجف ہے پھر ہناری باغ اس کے بعد دیکھا۔“

”ہناری باغ نہیں حضرت باغ۔“ سبیلہ نے کہا۔ ”اماں کہتی ہیں، ہناری باغ اس کا نام
 کب پڑا کوئی نہیں جانتا۔ اس کے اندر ایک گھنٹے والی بارہ دہری تھی، بہت خوبصورت۔ اب
 مکندر بن چکی ہے۔“

ہم شاہ نجف کی پشت پر آئے تو سبیلہ نے اس کے بہت بڑے دروازے پر جا کر اسے
 چوما پھر بولیں:

”علی نقی بہادر یہاں بھی اپنا بجرار کواتے ہوں گے اور روئے کے اندر ضرور جاتے ہوں
 گے۔“ یہ کہہ کر کہا: ”واپسی میں ہم روئے کے اندر جائیں گے۔“

شاہ نجف سے ہم حضرت باغ کی طرف آئے اور دوپہر ہوتے ہوتے لارڈ مارٹن کے
 اسکول کی پشت سے ہوتے ہوئے دیکھا پہنچ گئے۔ وہاں پہنچتے ہی میں نے سبیلہ سے کہا:

”کچھ دن پہلے، جہاندار بیگم کے انتقال کے بعد میں یہاں آیا تھا۔“
 ”کیوں؟“

”بستر پر لیٹے لیٹے جی ڈوب رہا تھا اچانک اٹھا اور کچھ سوچے بغیر چل پڑا اور جو کچھ دیکھتی
 ہوئی آپ آئی ہیں وہی سب دیکھتا ہوا یہاں پہنچ گیا۔“

”جی ڈوبتا ہے تو ان راستوں کی سیر بہت سکون دیتی ہے۔“ سبیلہ نے کہا۔ پھر دیکھا کی
 میٹرھیوں پر بیٹھنے سے پہلے مشرق کی جانب بنی ہوئی اس کوٹھی کی طرف دیکھا جو یہاں سے کچھ
 ہی فاصلے پر تھی۔ کوٹھی کو کچھ دیر تک دیکھتے رہنے کے بعد انہوں نے میری طرف دیکھ کر کہا:
 ”اسی کے کنارے بجر آ کر لگتا تھا۔ نانی اماں کو بتاتی تھیں اس طرف رمنہ تھا جہاں نیل گائیں،
 ہرن، چکارے اور بارہ سنگھے دوڑتے پھرتے تھے۔“ پھر بولیں: ”دن بھر نانی کے اہا اس رمنے
 میں شکار کھیلتے تھے اور سورج غروب ہونے سے پہلے اپنی حویلی کے لیے چل پڑتے تھے۔“ پھر

میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولیں: ”اگر نانی کو پھسلا کر اپنی حویلی سے باہر نہ لایا گیا ہوتا تو..... آج ہم اس حال کو نہ پہنچتے۔“ یہ سن کر میں نے کہا:

”شہبا کی موت کے بعد جب آپ ہمارے یہاں آئی تھیں، یاد ہے؟“

”یاد ہے۔“

”تو آپ ہی نے کہا تھا۔“

”کیا کہا تھا؟“

”جو کچھ ہوا اگر وہ ہمارے اختیار میں ہوتا تو نہ ہوا ہوتا۔“

یہ سن کر سبیلہ نے میرے کاندھے پر سر رکھ دیا۔ پھر بولیں:

”ایک بات کہوں۔“

”کہیے۔“

”اگر آپ نہ ملے ہوتے تو میں.....“

”تو میں.....“

”ٹوٹ چکی ہوتی۔ آپ نے ٹوٹنے نہیں دیا۔“ سبیلہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

”نانی کا دکھ، اماں کی بیماری، میری لاچاری..... مجھے زندہ نہ رہنے دیتی۔“ پھر بولیں: ”یہ جو ہم

مہدی گھاٹ سے دریا کے کنارے کنارے یہاں تک آئے ہیں، کس لیے آئے ہیں؟“

”کس لیے آئے ہیں؟“

”اپنے روشن دنوں کی یاد تازہ کرنے اور آپ ساتھ نہ ہوتے تو ہم یہاں تک نہ آ پاتے۔“

چلیے اب ہم اپنا دسترخوان بچھائیں۔“ یہ کہہ کر سبیلہ نے سیڑھیوں کے سامنے ایک سایہ دار

درخت کے نیچے وہی چادر بچھائی جو ناشتے کے لیے بچھائی تھی۔ پھر مجھ سے پوچھا:

”بتائیے میں نے کیا پکایا ہے؟“

”جو آپ کو پسند ہوگا، وہی پکایا ہوگا۔“

”نہیں جو آپ کو پسند ہے، وہی پکایا ہے۔ مسالہ بھری ہوئی شملہ مرچ۔“

”یہی ایک دن جہاندار بیگم کے یہاں شہبانے بھی پکائی تھی۔“

”اُسی نے جب وہ اسپتال میں تھی، مجھے بتایا تھا آپ کو کیا کیا پسند ہے۔“

سبیلہ نے تھیلے سے ناشتے دان باہر نکالا، اس کے ڈبوں کو چادر پر رکھا اور مجھ سے بولیں:
 ”شہبا نے آپ کو گرم گرم مرچ کھلائی تھی، یہ ٹھنڈی ہے۔ پھر بھی مزہ اس کا
 دیا ہی ہے۔“

میں نے منہ میں نوالہ رکھا تو واقعی اس میں شہبا کی پکائی ہوئی شملہ مرچ ہی کا مزہ
 تھا۔ جب میں تعریف کر کے دو تین نوالے کھا چکا تو سبیلہ نے ایک نوالہ میرے منہ
 میں رکھتے ہوئے کہا:

”یہ شہبا کی طرف سے اُس کی روح کو خوش کرنے کے لیے۔“

وہ نوالہ بہت دیر تک میرے منہ میں رہنے کے بعد میرے حلق سے نیچے اتر ا۔ کھانا
 کھانے کے بعد سبیلہ دریا پر گئیں اور کنارے پر آئی ہوئی موجوں میں کتوں تک اپنے
 پاؤں ڈبو کر بولیں:

”جی چاہتا ہے اسی پانی سے گزر کر اس پار ہو آؤں۔“ پھر میری طرف دیکھ کر کہا: ”لیکن
 اب نہ وہاں رمنہ ہے نہ رمنے کے وہ باسی جن کے لیے ہمارے پرانا یہاں آتے تھے۔“
 کچھ دیر تک پانی میں اسی طرح کھڑے رہنے کے بعد وہ باہر آ گئیں۔ مہدی گھاٹ سے
 دلکشا تک آتے آتے ہم بہت تھک گئے تھے۔ اس لیے ہم نے جہاں کھانا کھایا تھا، اُسی پیڑ
 کے نیچے بیٹھ کر کچھ دیر آرام کیا پھر پیڑ کے تنے سے لگے لگے سبیلہ نے کہا:

”کتنا سکون ہے یہاں۔ سعادت علی خاں یوں ہی نہیں یہاں آ کر ٹھہرتے تھے۔“

سہ پہر کا وقت قریب آ رہا تھا اور جیسے ہی دھوپ کی شدت میں کمی آئی ہم چلنے کے لیے
 اٹھ کھڑے ہوئے۔ کافی دیر چلنے کے بعد جب ہم شاہ نجف کی پشت پر پہنچے تو اس کے
 دروازے پر رک کر سبیلہ نے کہا: ”میں نے کہا تھا واپسی میں روضے کے اندر جائیں گے۔ یہ
 دروازہ تو بند ہے چلیے سامنے والے دروازے سے داخل ہوں گے۔“

غازی الدین حیدر کے بنوائے ہوئے اس خوبصورت امام باڑے کے گردا گرد بہت
 خوبصورت باغ ہے۔ ہم پشت کی طرف سے پورا چکر کاٹ کر اس بڑے پھانک کی طرف
 آئے جس پر بیٹھی ہوئی حالت میں دو شیر بنے ہیں۔ اس پھانک سے دوسرے پھانک تک

بہت کھلا ہوا حصہ ہے جس کے دونوں طرف سبزہ زار ہے۔ پہلے پھاٹک سے دوسرے پھاٹک تک کے پختہ راستے کے دونوں طرف سبز درختوں اور خوشنما پھولوں کو دیکھتے ہوئے ہم اس دروازے پر پہنچے جس پر مرادوں والی زنجیر لٹک رہی تھی۔ سبیلہ نے زنجیر ہلا کر دعا مانگی پھر مجھے زنجیر ہلانے اور دعا مانگنے کا اشارہ کیا۔ دوسرے پھاٹک کے بعد والے صحن میں کھڑے ہو کر ہم نے اس گنبد کو دیکھا جو بہت بڑا اور چمٹا سا ہے۔

”کیسی نفاست سے بنایا گیا ہے۔“ سبیلہ نے روضے کی اصل عمارت کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہاں کا شیشہ آلات اور علم شکے دوسرے امام باڑوں سے زیادہ قیمتی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر روضے کی اصل عمارت میں داخل ہوئے جہاں سنگ مرمر کے چوکور فرش پر سیاہ اور سفید چوکوں سے شطرنجی بنائی گئی تھی اور دیواروں کے اوپری حصوں میں بہت خوبصورت خطوں میں قرآنی آیتیں لکھی ہوئی تھیں۔ ہم غلام گردشوں سے ہوتے ہوئے روضے کے اندر پہنچے۔ اندر پہنچتے ہی سبیلہ نے اپنے چاروں طرف کے ساز و سامان کو دیکھتے ہوئے کہا:

”کیا آئینہ بندی ہے۔ آدمی دیکھتا رہ جائے۔“

پھر دیواروں پر خوبصورت فریموں میں لگی ہوئی تصویروں اور طغروں کو دیکھ کر بولیں:

”انہوں نے امام باڑے کا حسن اور بڑھادیا ہے۔“

سبیلہ نے روضے کے اندر کی ایک ایک چیز کو چوم کر دعا مانگی پھر اس بڑے سے آئینے کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئیں جس کے لیے مشہور ہے کہ اسے دیکھنے سے بیمار شفا یاب ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر تک اس کے سامنے کھڑے رہنے کے بعد مجھ سے بولیں:

”کسی طرح سے اماں کو لا کر یہ آئینہ دکھا دیں۔“

”ٹھیک رہیں تو انشاء اللہ اگلے ہفتے لے آئیں گے۔“

”روضے میں سب طرف گھومنے اور سب چیزوں کو چومنے کے بعد سبیلہ نے مجھ سے

کہا: ”جو چیز واقعی دیکھنے والی تھی وہ نہیں رہی۔“

”کیا چیز؟“

”سبز شیشے کا وہ حسین تعزیہ جو ولایت سے منگوایا گیا تھا۔“ سبیلہ نے بتایا۔ ”اماں بتاتی

ہیں جب غدر میں یہاں مورچہ بندی ہوئی تو یہاں کا بہت سا سامان تہس نہس ہو گیا۔ اُسی میں

وہ تعز یہ بھی چکنا چور ہو گیا۔“

روضے کی زیارت کے بعد ہم پشت کے دروازے کی طرف آئے اور وہاں سے کچھ دور پر لہریں مارتے ہوئے دریا کی طرف بڑھ گئے اور اسی طرح جیسے گئے تھے، دریا کے کنارے کنارے چلتے ہوئے سکندر باغ کے آگے نکل آئے۔ یہاں پہنچ کر سبیلہ بولیں:

”منکی برج آنے والا ہے۔ بندر پھر نہ میری طرف لپکیں، لپکے تو آپ ہی کو بچانا پڑے گا۔“

”اور اس کے لیے آپ کو مجھ سے.....“

”شرمندہ مت کیجیے۔ آپ ہی نے کہا تھا ایسے وقت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔“

منکی برج کے بندروں سے بچنے کا راستہ ہم نے یہ نکالا کہ پل آنے سے پہلے ہم سڑک پر آ گئے پھر چھتر منزل سے ملے ہوئے گھاٹ پر جا کر دوبارہ دریا کے کنارے کنارے چلنے لگے اور سورج ڈوبنے سے پہلے مہدی گھاٹ پہنچ گئے۔ سورج غروب ہونے کا منظر ہم نے اُسی گھاٹ پر دیکھا اور جب سورج پوری طرح ڈوب گیا تو ہم شیش محل ہوتے ہوئے عنبر گنج سبیلہ کے گھر پہنچ گئے۔ ہمارے قدموں کی آہٹ سن کر شملہ خانم نے بہت کمزور آواز میں پوچھا:

”کون؟“

”آپ کی بیٹی۔ ہم واپس آ گئے۔“ یہ بتا کر سبیلہ سیدھے شملہ خانم کے کمرے میں پہنچیں۔ وہ سر نیوڑھائے بستر پر بے دم سی پڑی تھیں۔ ہم دونوں انہیں دیکھ کر پریشان ہو گئے۔

”اماں آپ ٹھیک ہیں۔“ سبیلہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ پھر انہیں بستر پر ٹھیک سے لٹا کر اُن کا ماتھا چھوا تو وہ بہت تپ رہا تھا اور اس پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

”آپ کو بہت پسینہ آ رہا ہے اور پنڈا بھی گرم ہے۔ ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔“

”نہیں یہ موت کا پسینہ ہے۔ جو دوا ہے وہی کھلا دو۔“ پھر میری طرف دیکھ کر بولیں:

”جو کہا تھا اسے یاد رکھنا۔“

”اماں یہ سب باتیں مت کیجیے۔ ہم دوا آپ کو دے رہے ہیں اور بہت اچھی سی ادویہ کی چائے آپ کے لیے بنا رہے ہیں، اسے پیجئے گا تو بہت سا پسینہ آ کر بخار اتر جائے گا۔“

”بہلاؤ مت۔ ادویہ کی چائے سے بخار نہیں اترتا۔“

”نہ اترے۔ آرام تو ملے گا۔“

”آرام تو اب وہیں ملے گا۔“

سبیلہ نے جلدی سے انہیں دوا لا کر دی پھر چائے بنانے چلی گئیں۔ میں سبیلہ خانم کے پلنگ کے پاس کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ وہ کبھی اپنی آنکھیں کھولتیں، کبھی بند کرتیں۔ اسی حالت میں وہ اپنے آپ سے گویا ہوئیں:

”حیدر حسین خاں تم جہاں بھی ہو، میں نے تمہارا گناہ معاف کیا۔“ پھر بولیں: ”اماں جن کے پاس میں جا رہی ہوں، انہیں نہیں بتاؤں گی تم کون تھے۔“ یہ کہہ کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے دباتے ہوئے کہا: ”یاد ہے نا!“

”یاد ہے۔ آپ آرام کیجیے۔“

سبیلہ خانم کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے حکیم احمد رضا کی بات یاد آ رہی تھی:

”جہاں چھید ہے وہاں نشتر لگا تو سانس رک سکتی ہے۔“ یہ جملہ یاد آتے ہی میں نے سوچا ڈاکٹر جس نے سبیلہ کو لگ کر تیمارداری کرنے کی صلاح دی تھی، پوری طرح سمجھ گیا تھا سبیلہ خانم کو نہ دوا سے بچایا جاسکتا ہے نہ جراحی سے۔

سبیلہ چائے بنا کر لے آئی تھیں۔ انہوں نے اپنی ماں کو تکیے سے لگا کر بٹھایا پھر پیالی ان کے منہ میں لگا کر انہیں چائے پلائی اور چائے پلانے کے بعد تکیے ہٹا کر انہیں دھیرے سے بستر پر لٹا دیا۔ بستر پر لیٹتے ہی سبیلہ خانم کو نیند آ گئی۔ اُن کے سوتے ہی سبیلہ اپنے اور میرے لیے چائے لے آئیں۔

”آپ کہیں تو میں آج رات یہاں رک جاؤں۔“ میں نے کہا۔

”اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ آپ رہیں گے تو مجھے اطمینان رہے گا۔ لیکن.....“

”لیکن.....؟“

”ہو سکتا ہے آگے کی راتیں زیادہ کٹھن ہوں۔“ سبیلہ نے کہا۔ ”اس لیے آج آپ گھر جا کر آرام کیجیے۔ بہت تھکے ہوئے ہیں۔ آج میں سنبھال لوں گی۔“ پھر بولیں: ”جب یہ دوا جود دی ہے، دیتی ہوں تو انہیں بہت گہری نیند آتی ہے۔ اب صبح تک فکر کی کوئی بات نہیں۔ آپ سویرے سویرے آجائے گا۔“

دوسرے دن میں سویرے سویرے سبیلہ کے یہاں پہنچا تو دیکھا شمیلہ خانم بستر پر بیٹھی چائے پی رہی ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولیں: ”تم دونوں میری وجہ سے کل بہت پریشان رہے۔“

”پریشان تو رہے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کی طبیعت ٹھیک رہتی تو آپ کی بیٹی مہدی گھاٹ سے دلکشا تک کا حال آپ کو بتاتیں۔“ پھر کہا: ”وہاں جاتے وقت اور واپسی میں بھی بار بار آپ کا اور اپنی نانی کا نام لے لے کر بتاتی رہیں کہاں کیا تھا کہاں کیا نہیں رہا۔“ پھر انہیں بتایا: ”جہاں جہاں آپ کے نانا اپنا بجرار کواتے تھے وہاں وہاں رکیں اور اس رمنے کو جو سلطان عالم کے زمانے تک.....“

”.....گو متی کے اس پار کوٹھی فرح بخش کے سامنے والے علاقے سے لے کر کوٹھی بی بی پور تک چلا گیا تھا۔“

سبیلہ آگے کا جملہ پورا کرتے ہوئے چائے کی کشتی ہاتھوں میں لیے کمرے میں داخل ہوئیں۔

”تو پرانا کا زمانہ گھوم گیا آنکھوں میں۔“ شمیلہ خانم نے مسکراتے ہوئے

سبیلہ سے پوچھا۔

”جو کچھ آپ نے جس طرح بتایا تھا وہ سب اسی طرح آنکھوں کے سامنے آتا رہا۔“

”کتاب کب لاؤ گے؟“ شمیلہ خانم نے بات کا رخ میری طرف موڑ دیا۔ ”میری

طبیعت سنبھل سنبھل کر بگڑ رہی ہے۔“

”پرسوں“ میں نے کہا۔ ”کل آپ کی بیاضیں دیکھ کر ان میں جو شامل کرنے

والی باتیں ہیں، انہیں شامل کروں گا اور پرسوں لے آؤں گا۔“ یہ کہہ کر میں نے

سبیلہ کو باہر لا کر پوچھا:

”رات کیسی گزری؟“

”سوئی رہیں۔ لیکن بیچ بیچ میں کچھ بڑبڑاتی بھی رہیں۔ آپ کا نام بھی کئی بار زبان پر آیا۔“

”میرا نام؟ میرا نام لے کر کیا کہا۔“

”وہی جو آپ سے کہا تھا۔ آپ کو تو یاد ہوگا۔“ سبیلہ نے کہا۔ ”میں ناشتہ بنالوں آپ

اماں سے باتیں کیجیے۔“

سبیلہ ناشتہ لے کر آئیں تو میں نے جلدی جلدی ناشتہ کیا۔ پھر سبیلہ سے کہا:

”اب دو دن بعد آؤں گا۔ آپ کی اماں بار بار کتاب دیکھنے کو کہہ رہی ہیں، اب اسے پورا کر کے انہیں دکھا ہی دوں۔ خدا حافظ۔“



دوسرے دن رات کے پہلے پہر کسی نے زور زور سے میرا دروازہ بھڑ بھڑایا۔ میں، جو کتاب مجھے شملہ خانم کو دکھانا تھی اس کی آخری سطریں لکھ رہا تھا۔ دروازے کے اس طرح بھڑ بھڑائے جانے سے میں گھبرا گیا۔ میں نے اٹھ کر جلدی سے دروازہ کھولا تو ایک ادھیڑ عمر خاتون بہت گھبرائی ہوئی میرے دروازے پر کھڑی تھیں۔

”علی حیدر آپ ہی کا نام ہے۔“ انہوں نے پوچھا۔

”جی۔ بتائیں۔“

”جلدی چلیے۔ سبیلہ بی بی نے فوراً آپ کو بلایا ہے۔ اُن کی ماں کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔“

”آپ؟“

”جن کی طبیعت بگڑی ہے ان سے کبھی کی صاحب سلامت تھی۔ ان کے گھر سے کچھ ہی دور پر رہتی ہوں۔“ اُن بی بی نے کہا۔ پھر اسی گھبرائے ہوئے لہجے میں بولیں: ”دیر نہ کیجیے کہیں آپ کے پہنچتے پہنچتے.....“

میں جو کام کر رہا تھا اسے اسی طرح چھوڑ کر ان بی بی کے ساتھ عنبر گنج کی طرف چل پڑا۔ اور جب شملہ خانم کے گھر میں داخل ہوا تو دیکھا وہ بستر پر نیم جان سی پڑی ہیں۔ میں نے ان کی نبض پر ہاتھ رکھا تو وہ رک رک کر چل رہی تھی۔ سبیلہ میرے چہرے پر آئے ہوئے رنگ سے سمجھ گئیں کہ اُن کی ماں پر یہ رات بہت بھاری ہے۔ وہ کبھی اُن کا سر سہلاتیں کبھی پاؤں دباتیں کبھی ان کے منہ میں پانی پڑکاتیں اور کبھی ان کے پانکٹی بیٹھ کر رونے لگتیں۔ سبیلہ خانم کے منہ سے، جیسا مرتے وقت ہوتا ہے بے ربط باتیں نکل رہی تھیں:

”تحسین گنج میں ہماری حویلی تھی۔ گل بانو چوک والے گھر میں پاندان کھولے بیٹھی ہیں۔ ابا لالھی محال والے مکان میں آئے ہیں، میرے پالنے کے

پاس بیٹھے ہیں۔ بٹیا! سنو، اماں راگ سونی میں سوز پڑھ رہی ہیں:

ع مانگو دعا زمین پھٹے اور سماؤں میں

نانا کا سامان حویلی سے باہر نکالا جا رہا ہے۔ مہتاب باغ میں کتنی روشنی ہے۔ اماں کے چاروں طرف اشرفیوں کے ڈھیر ہیں۔ بٹیا! اماں ہماری امراؤ بیگم سے ملنے جا رہی ہیں۔ ہواد و قرآن کی۔ اور بٹیا! مجھے بھی ہواد و قرآن کی۔ میں بھی جا رہی ہوں اپنی ماں نجم النساء کے پاس۔ اور وہ کہاں ہیں؟ اُن سے میں نے کہا تھا: ”جو کچھ میں نے کہا ہے یاد رکھنا۔“

سبیلہ دوڑی دوڑی گئیں اور قرآن لا کر اپنی ماں کو اس کی ہوادینے لگیں اور اسی وقت جب وہ اپنی ماں کو قرآن کی ہوادے رہی تھیں، شمیلہ خانم کی آخری سانس نکلی اور قرآن کی ہواد میں شامل ہو گئی۔ سبیلہ نے قرآن سرہانے رکھ کر خود کو اپنی ماں کے مردہ جسم پر گرا دیا اور بہت دیر تک شمیلہ خانم کے سینے پر سر رکھ کر روتی رہیں۔ بہت دیر بعد جب میں نے انہیں اٹھایا تو انہوں نے میرے کاندھے پر سر رکھ کر بہت دیر تک نہیں ہٹایا۔ کاندھے پر سر رکھے رکھے انہوں نے مجھ سے کہا: ”میں آپ سے کہتی تھی اماں بہت دن زندہ نہیں رہیں گی۔“ پھر بولیں: ”بہت دن انہوں نے اپنے دکھ کو چھپائے رکھا۔“

میں نے سبیلہ کو اُن کی ماں کے پلنگ سے ہٹا کر ایک طرف بٹھایا پھر ان کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

”صبر کیجئے۔ یہی حال رہا آپ کا تو جو کچھ ہونا ہے وہ کیسے ہوگا۔“

”اماں کے تکیے کے نیچے ایک پرچہ ہے، اسے دیکھ لیجئے۔“ سبیلہ نے ہچکیاں لیتے ہوئے

کہا۔ میں نے تکیہ ہٹا کر پرچہ نکالا تو اس میں لکھا تھا:

”مجھے میری ماں کے پہلو میں دفن کیا جائے اور اس کام میں کسی سے کوئی

پیسہ نہ لیا جائے۔ اسی بستر کے نیچے ایک بقیہ رکھی ہے۔ میرے مرنے پر جتنا

صرف ہوگا وہ سارا پیسہ اس میں رکھا ہے بلکہ اس سے بہت زیادہ۔“

”پرچہ پڑھ کر میں نے اُن بی بی سے جو مجھے بلانے آئی تھیں، کہا: ”آپ انہیں

سنجھالیے میں صندوق لانے اور دوسرے انتظامات کرنے جا رہا ہوں۔“ اُن سے یہ کہہ کر میں

سیدھے منشی فضل حسین خاں کی کربلا پہنچا اور متولی کا پتہ معلوم کر کے اس کے گھر پر جا کر دستک دی۔ وہ باہر نکلا تو میں نے اس سے کہا:

کمرہ دار کے متولی سے کھالو

”قبر کے لیے کربلا میں زمین چاہیے ہے۔“

”مل جائے گی لیکن دام اب بہت بڑھ گئے ہیں۔ اگر کم داموں چاہیے ہے تو کربلا کے آخری حصے میں کہیں مل جائے گی۔“

”نہیں روضے کے بالکل قریب، جہاں امراؤ جان دفن ہیں۔“

”امراؤ جان کا نام سن کر وہ چونکا، بولا وہاں تو بہت مہنگی ہے۔“ پھر بولا: ”لیکن وہاں کیوں۔ وہ تو.....“

”ناچنے والی تھیں۔ یہی کہنا چاہتے ہیں۔ جنہیں دفن ہونا ہے وہ ان کی بیٹی ہیں۔“

”بیٹی!“ وہ پھر چونکا۔ ”ہمارے بزرگوں نے بتایا تھا وہ..... آپ مذاق تو نہیں کر رہے ہیں۔“

”مرنے کے معاملے میں مذاق نہیں کیا جاتا۔ زمین انہیں کے پہلو میں چاہیے ہے۔“

”یہ بھی انہیں کی طرح ناچ گانا کرتی تھیں؟“ اس نے پوچھا۔

یہ سن کر مجھے غصہ آیا لیکن میں نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے پوچھا:

”یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

”اصل میں.....“ وہ کہتے کہتے رکا۔ پھر بولا: ”ہماری کربلا میں اب ایسے لوگ.....“

”..... دفن نہیں ہوتے۔“

”جی۔“

”جنہیں دفن ہونا ہے وہ آفتاب الدولہ نواب خورشید بہادر کے خاندان کی ہیں۔ پرانا نانا

کے سلطان عالم واجد علی شاہ کے زمانے میں بندوبست کے مہتمم تھے اور ان کے نانا نواب علی نقی بہادر

کی تحسین گنج میں بہت بڑی حویلی تھی۔“ میں نے ایک ہی سانس میں اسے شمیلا خانم کا شجرہ بتا ڈالا۔

”آپ صحیح کہہ رہے ہیں؟“

”ایسے معاملوں میں کوئی جھوٹ نہیں بولتا، بولتا ہے تو مرنے والے کی روح کو اذیت

ہوتی ہے۔“ میں نے کہا۔ پھر کہا: ”اب کربلا چلیے۔ قبر تیار کرائیے اور صندوق غنبر گنج اس پتے پر

بھواد بیجیے۔“ میں نے ایک پرچے پر شمیمہ خانم کا پورا پتہ لکھ کر متولی کو دیا اور چلا آیا۔

○

شمیمہ خانم اُسی دن شام کو اپنی ماں کے پہلو میں دفن ہوئیں۔ جتنے لوگ ان کی ماں کے جنازے میں تھے، اُن کے جنازے میں اس سے بھی کم سوئم کی مجلس کے بعد میں نے دو پتھر لکھوائے۔ ایک امراؤ جان کا دوسرا شمیمہ خانم کا۔ امراؤ جان کے پتھر پر وہی عبارت رہنے دی جو پہلے سے اس پر لکھی تھی۔ صرف امراؤ جان سے پہلے ”نجم النساء عرف“ بڑھوا دیا اور شمیمہ خانم کے پتھر پر یہ عبارت کندہ کرائی:

”تھا کون سا نخل جس نے دیکھی نہ خزاں
وہ کون سے گل کھلے جو مرجھا نہ گئے

شمیمہ خانم بنت نجم النساء

مرحومہ کے اجداد شاہی کے زمانے میں اعلیٰ منصبوں پر فائز تھے۔ کئی برس ایک لاعلاج مرض میں علیل رہیں۔ جب اس مرض سے لڑنے کی طاقت نہیں رہی تو اپنے پیچھے ایک بیٹی چھوڑ کر دنیا چھوڑ دی۔ زندگی بہت مشکل میں گزری لیکن زبان پر حرف شکایت نہ آیا۔

سرگزشت ان کی اُن سب کے لیے جو ہمتیں ہار جاتے ہیں، ایک مثال ہے۔“

جس دن میں یہ دونوں پتھر لگوانے گیا اس دن متولی کربلا میں موجود تھا۔ پتھروں کی عبارتیں دیکھ کر بولا:

”یہ امراؤ جان سے پہلے آپ نے کیا بڑھا دیا اور یہ شمیمہ خانم..... ان کے باپ کے بجائے ماں کا نام.....“

”ضروری نہیں آپ کو سب کچھ بتایا جائے۔“ یہ کہہ کر میں کربلا سے باہر نکل آیا۔

○

اپنی ماں کی موت کے بعد سبیلہ بہت صدمے میں تھیں۔ کئی دن تک انہیں چپ سی لگی رہی۔ مجھ سے بھی وہ ضرور تباہ ہوتی تھیں۔ میں نے اُن بی بی کو جو شمیمہ خانم کی موت کے وقت موجود تھیں یہ کہہ کر سبیلہ کے یہاں رکنے پر راضی کر لیا کہ ان کے ساتھ کسی بزرگ کا رہنا ضروری ہے۔ میں دن دن بھر سبیلہ کو بہلانے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا لیکن وہ اپنے

سیدھے منشی فضل حسین خاں کی کربلا پہنچا اور متولی کا پتہ معلوم کر کے اس کے گھر پر جا کر دستک دی۔ وہ باہر نکلا تو میں نے اس سے کہا:

کمرہ دار کے متولی سے کہانی

”قبر کے لیے کربلا میں زمین چاہیے ہے۔“

”مل جائے گی لیکن دام اب بہت بڑھ گئے ہیں۔ اگر کم داموں چاہیے ہے تو کربلا کے آخری حصے میں کہیں مل جائے گی۔“

”نہیں روضے کے بالکل قریب، جہاں امراؤ جان دفن ہیں۔“

”امراؤ جان کا نام سن کر وہ چونکا، بولا وہاں تو بہت مہنگی ہے۔“ پھر بولا: ”لیکن وہاں کیوں۔ وہ تو.....“

”ناپنے والی تھیں۔ یہی کہنا چاہتے ہیں۔ جنہیں دفن ہونا ہے وہ ان کی بیٹی ہیں۔“

”بیٹی!“ وہ پھر چونکا۔ ”ہمارے بزرگوں نے بتایا تھا وہ..... آپ مذاق تو نہیں کر رہے ہیں۔“

”مرنے کے معاملے میں مذاق نہیں کیا جاتا۔ زمین انہیں کے پہلو میں چاہیے ہے۔“

”یہ بھی انہیں کی طرح ناچ گانا کرتی تھیں؟“ اس نے پوچھا۔

یہ سن کر مجھے غصہ آیا لیکن میں نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے پوچھا:

”یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

”اصل میں.....“ وہ کہتے کہتے رکا۔ پھر بولا: ”ہماری کربلا میں اب ایسے لوگ.....“

”..... دفن نہیں ہوتے۔“

”جی۔“

”جنہیں دفن ہونا ہے وہ آفتاب الدولہ نواب خورشید بہادر کے خاندان کی ہیں۔ پرانا ان کے سلطان عالم واجد علی شاہ کے زمانے میں بندوبست کے مہتمم تھے اور ان کے نانا نواب علی نقی بہادر کی تحسین گنج میں بہت بڑی حویلی تھی۔“ میں نے ایک ہی سانس میں اسے شمیلہ خانم کا شجرہ بتا ڈالا۔

”آپ صحیح کہہ رہے ہیں؟“

”ایسے معاملوں میں کوئی جھوٹ نہیں بولتا، بولتا ہے تو مرنے والے کی روح کو اذیت ہوتی ہے۔“ میں نے کہا۔ پھر کہا: ”اب کربلا چلیے۔ قبر تیار کر ایسے اور صندوق عنبر گنج اس پتے پر

کمرے میں منہ ڈھانپے پڑی رہتیں۔ بس اسی وقت اٹھتیں جب میں چلنے لگتا اور چلتے وقت آنکھوں آنکھوں میں کہتیں:

”ابھی نہ جائے۔“

رات میں اپنے ٹھکانے پر گزرتا اور صبح ہوتے ہی سبیلہ کے یہاں چلا جاتا۔ شمیمہ خانم کی موت کے کئی دن بعد جب میں نے اس کتاب کو جسے دکھانے کے لیے شمیمہ خانم مجھ سے بار بار کہتی تھیں، دیکھا تو مجھے بہت دکھ ہوا۔ میں اس کی آخری سطریں لکھ چکا تھا اور دوسرے دن اسے شمیمہ خانم کو دکھانے والا تھا لیکن وہ اسے دیکھے بغیر، جیسا وہ کہا کرتی تھیں، اس دنیا سے چلی گئیں۔ دیکھ لیتیں تو اچھا ہوتا اور مجھے اس میں کسی چیز کے غلط ہو جانے کا اندیشہ نہ رہتا۔ میں نے سوچا اب سبیلہ کی طبیعت سنبھل جائے تو انہیں دکھا لوں لیکن سبیلہ کو صدمہ بہت گہرا تھا اور ان کی حالت دیکھ کر مجھے رہ رہ کر شمیمہ خانم کے یہ جملے یاد آ رہے تھے:

”اُس کے دل میں بھی گھاؤ بہت ہیں اور یہ جو میرے دل میں چھید ہے اس نے اسے اور گھائل کر دیا ہے۔“

یہ جملے یاد آتے ہی میرا دل لرز نے لگتا اور اسی وقت مجھے وہ بھی یاد آنے لگتا جو شمیمہ خانم نے مجھ سے بہت ڈرتے ڈرتے کہا تھا: ”یہ مرض جو مجھے ہے بٹیا کو نہ لگ گیا ہو۔ اگر ایسا ہو تو اس کی تیمارداری میں پیچھے نہ رہنا۔“

شمیمہ خانم کی یہ بات یاد آنے پر میں اپنے آپ سے وہی کہتا جو اُن سے کہا تھا:

”نہیں ایسا نہیں ہوگا۔“

پھر میں سوچتا سبیلہ اپنی ماں کی موت کو آسانی سے نہیں بھلا سکیں گی۔ اور تب مجھے ہنگام کی کہی ہوئی بات یاد آتی: ”یہی یاد رکھا ہوا ہمیں مارتا بھی ہے جلاتا بھی ہے۔“

اسی یاد آنے میں مجھے یاد آیا سبیلہ نے کچھ تصویریں، جیسی دکاندار نے کہی تھیں، بنا کر رکھ لی تھیں۔ اور مجھ سے دکان پر دے آنے کے لیے کہا تھا۔ میں نے سوچا کل جا کر دیکھوں گا کہاں رکھی ہیں۔ مل گئیں تو انہیں دکان پر دے آؤں گا۔

دوسرے دن میں سبیلہ کے یہاں گیا تو وہ تصویریں سبیلہ کے کمرے میں ایک طرف رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے ان تصویروں کو ایک تھیلے میں رکھا تو سبیلہ نے کچھ بولے

بغیر مجھے کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھا۔ میں نے اُن بی بی کو جو سبیلہ کے ساتھ رہنے لگی تھیں، الگ لے جا کر پوچھا:
 ”طبیعت کیسی ہے۔ کچھ کھایا پیا۔“

”بہت کہنے پر ایک دونو الے۔ اتنے دن سے یہی کر رہی ہیں۔ بس چائے پی لیتی ہیں۔“
 ”رات میں سوتی ہیں؟“

”بہت کم۔ اُٹھ اُٹھ کر اماں کو یاد کرتی ہیں۔ کل رات گئے جب اپنی ماں کو یاد کر رہی تھیں مجھے بلا کر پوچھا: خالہ وہ جو روز آتے ہیں، وہ آئے تھے۔“

”میں نے کہا بی بی وہ تو آپ سے مل کر گئے ہیں تب پوچھا، کل آئیں گے؟ میں نے کہا کیوں نہیں آئیں گے تو بولیں مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ میں نے پوچھا کس بات کا بولیں کہیں وہ آنا نہ چھوڑ دیں۔ میں نے کہا نہیں آنا نہیں چھوڑیں گے تب کہنے لگیں یہ آپ کیسے کہہ رہی ہیں اُس پر میں نے کہا بیٹیا میں نے دنیا دیکھی ہے آدمی کی مجھے بڑی پہچان ہے یہ سن کر اُن کے ہونٹوں پر ہلکی سی ہنسی آئی اور بیٹا ماں کی موت کے بعد پہلی بار میں نے ان کے ہونٹوں پر ہنسی دیکھی۔“ یہ بتا کر بولیں:

”اب تم اپنے ہاتھوں سے کھلاؤ تو شاید کھالیں۔“

”چائے پی چکیں۔“

”پی چکیں۔ لیکن تم بناؤ گے تو پھر پی لیں گی۔“

میں نے چائے بنائی اور انڈے ابا لے۔ انڈے چھیل کر ان کے قتلوں پر کالی مرچ اور نمک چھڑکا اور سب چیزیں ایک کشتی میں رکھ کر سبیلہ کے کمرے میں آ گیا اور ان کے سامنے بیٹھ کر انڈے کا ایک قتلہ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ”کھائیے۔“

سبیلہ نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور منہ کھول دیا۔ میں نے اسی طرح دو تین قتلے اور ان کے منہ میں رکھے اور انہیں چائے کی پیالی دیتے ہوئے کہا:

”جب تک زندگی مجھے نہ چھوڑے، میں آنا نہیں چھوڑوں گا۔“

یہ سن کر سبیلہ کی آنکھیں اور زیادہ چمکیں۔

”میری ماں، مرتے وقت اُن کی عمر بہت نہیں تھی.....“ میں نے رک رک کر کہنا

شروع کیا..... ”جب نہیں رہیں، میں بہت دن گم صم رہا۔ گھر میں پڑا رہتا۔ باہر نکلتا تو کچھ اچھا نہ لگتا لیکن..... ایسے کب تک رہتا۔ جو نہیں بھلانا چاہتا تھا، بھلانا پڑا۔“ آگے کہتے کہتے میں رکا۔ پھر کہا: ”آپ بھی، میں جانتا ہوں زخم آپ کا بہت دن نہیں بھرے گا لیکن مرہم تو اس پر رکھنا پڑے گا، سنبھالیے اپنے آپ کو۔ ابھی بہت سے کام پڑے ہیں جنہیں پورا کرنا ہے۔“

میری باتیں سن کر سبیلہ کے چہرے کی افسردگی کم ہونے لگی تھی۔

۱ ”ماں کی موت کے بعد.....“ میں نے آگے کہنا شروع کیا..... ”جہاندار بیگم کی موت نے مجھے بہت دکھ دیا لیکن مجھے سنبھلنا پڑا۔ اور شہبا..... شہبا کا مرجانا، اگر آپ نہ ہوتیں تو مجھے سنبھلنے نہ دیتا۔ میری طرح آپ کو بھی سنبھلنا پڑے گا۔“ یہ کہہ کر میں نے سبیلہ کی آنکھوں میں دیکھا تو اُن میں پہلے کا سادکھ نہیں تھا۔

میں کچھ دیر کے لیے سبیلہ کے پاس سے ہٹا تو یہاں رہنے والی بی بی میرے پاس آ کر بولیں:

”جیسے زبردستی ناشتہ کرایا ہے ایسے ہی دن کا کھانا بھی کھلا دو۔ اتنے دن تک بہت کم کھانے سے وہ بہت ڈبلی ہو گئی ہیں۔“

جب دن کے کھانے کا وقت آیا تو جو اُن بی بی نے پکایا تھا اس کے نوالے بنا بنا کر میں نے سبیلہ کو دیے۔ انہوں نے، جب تک ان کا پیٹ بھر نہیں گیا منع کیے بغیر وہ نوالے کھائے۔ اور تب مجھے اور اُن بی بی..... دونوں کو اطمینان ہوا۔

میں سہ پہر تک وہیں رہا پھر اپنے بستر پر خاموش لیٹی ہوئی سبیلہ سے کہا:

”اب میں آپ کی تصویریں لے کر جا رہا ہوں، امین آباد۔ ادھر سے حکیم صاحب سے ملنے جاؤں گا۔ بہت دن ہو گئے اُن سے ملے۔“ پھر کہا: ”رات میں آیا تو آیا نہیں تو کل سویرے سویرے۔“

سبیلہ خاموش رہیں۔ میں نے تصویروں کا تھیلہ اٹھایا اور اُن کے گھر سے نکل کر امین آباد کی طرف چل دیا۔ جب تصویروں والی دکان پر پہنچا تو دیکھا ایک شخص دکاندار سے تصویروں ہی کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا: ”جو تصویریں

پچھلی بار لے گیا تھا، بہت اونچے داموں بکیں۔ وہ تو نمائش میں رکھنے والی تھیں۔
میں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر شوقینوں کے ہاتھ فروخت کیں۔“ یہ کہہ کر بولا: ”ویسی ہی
تصویریں اور چاہیے ہیں۔“

”اُن کی بنانے والی بہت دن سے آئی نہیں۔“ دکاندار نے کہا۔

یہ سن کر میں دکاندار کے سامنے آنے کے بجائے وہاں سے آگے بڑھ کر ایک طرف کھڑا
ہو گیا اور جب وہ شخص اس دکان سے ہٹا تو میں نے لپک کر اُس سے پوچھا:

”آپ کو ویسی ہی تصویریں چاہیے ہیں جیسی آپ دکاندار سے بتا رہے تھے۔“

اس شخص نے مجھے سر سے پیر تک دیکھا پھر بولا: ”چاہیے تو ہیں لیکن..... دکاندار کہہ رہا تھا
ان کی بنانے والی.....“

”میں ہی ان کی تصویریں لاتا ہوں اُس دکان پر۔“ یہ کہہ کر میں اسے ایک گلی میں لے گیا
اور تھیلے سے نکال کر تصویریں دکھائیں۔ تصویریں دیکھتے ہی وہ بولا:

”ایسی ہی چاہیے ہیں، بالکل ایسی۔“

”لیکن پیسے آپ کو زیادہ دینا ہوں گے۔“

”دکاندار کتنے دیتا ہے؟“

”وہ جتنے دیتا ہے اس سے تین گنا زیادہ۔“ میں نے اپنے خیال میں دام بہت بڑھا
کر بتائے۔ اس نے سب تصویریں گنیں اور فوراً تگنے پیسوں کے حساب سے سب
تصویروں کے پیسے مجھے دے دیے۔ پھر بولا: ”یہ پتہ رکھ لیجیے۔ یہیں آ جایا کیجیے تصویریں
لے کر۔“ دکاندار سے کچھ نہ کہیے گا۔“

○

حکیم صاحب کا مطب کھلنے میں ابھی دیر تھی۔ یوں بھی وہ سب مریضوں کو دیکھنے
کے بعد مجھ سے ملتے تھے۔ میں نے سوچا کیا کروں۔ اچانک میرے قدم اپنے آپ
ایک طرف اٹھنے لگے۔ میں امین آباد سے نکل کر نظیر آباد ہوتا ہوا قیصر باغ کی طرف
آیا اور دورویہ بنی ہوئی شاہی عمارتوں کو جواب رئیسوں اور راجاؤں کی ملکیت تھیں،
دیکھتا ہوا چھتر منزل کی طرف نکل آیا۔ لیکن چھتر منزل کی طرف آنے سے پہلے میں

نے رک کر اپنے بائیں جانب سفید پتھروں سے بنی ہوئی اس عمارت کو دیکھا جس کا نام واجد علی شاہ نے قصر العزا رکھا تھا۔ لیکن اب بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ خوبصورت عمارت کسی زمانے میں امام باڑہ تھا۔ اب اسے قیصر باغ کی سفید بارہ دری کہا جاتا ہے اور تعز یہ داری سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ بارہ دری سے آگے بڑھ کر میں نے اس عمارت کو دیکھا جو سعادت علی خاں کے مقبرے سے متصل تھی اور کہا جاتا ہے شاہی کے زمانے میں یہاں پری خانہ ہوا کرتا تھا اور کچھ یہ بھی کہتے ہیں یہ سلطان عالم کی محسرا تھی۔ اب اس میں ناچ گانا سکھانے کا اسکول قائم ہو گیا تھا۔ اس عمارت کے سامنے رک کر میں نے سوچا: ”امراؤ جان کا سانا چنے والا کوئی اور لکھنؤ میں پیدا ہوگا“ اور آگے بڑھ گیا چھتر منزل پہنچ کر میں اس سے ملے ہوئے گھاٹ پر گیا اور وہاں جہاں پُل کی طرف سے آتے ہوئے بندروں کو دیکھ کر سبیلہ چیخ کر مجھ سے لپٹ گئی تھیں، بیٹھ کر دریا کی موجوں پر کشتیوں کو بہتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اور جب سورج غروب ہو گیا اور اندھیرا پوری طرح پھیل گیا تو میں آہستہ آہستہ گھسیاری منڈی کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ مطب پہنچنے میں مجھے اچھا خاصا وقت لگا اور جب وہاں پہنچا تو دیکھا ایک ہی دو مریض رہ گئے ہیں۔ میں نے مریضوں کا نام پکارنے والے شخص سے جو مجھے دیکھتے ہی حکیم صاحب کو میری آمد کی اطلاع دینے کے لیے لپکتا تھا، پوچھا:

”کیا مریض کم آنے لگے ہیں۔“

”نہیں۔ حکیم صاحب نے مریضوں کو دیکھنے کا وقت گھٹا دیا ہے۔ صرف ایک گھنٹہ بیٹھتے ہیں اور گئے چنے مریضوں کو دیکھتے ہیں۔“ اس نے کہا۔ پھر بولا: ”اب خود بھی بیمار رہنے لگے ہیں۔ میں بتائے دیتا ہوں آپ آئے ہیں۔“

حکیم صاحب نے آخری مریض دیکھنے کے بعد مجھے بلا لیا۔ میں اندر پہنچا تو مجھے دیکھتے ہی بولے:

”اب آپ بہت بہت دن بعد آنے لگے ہیں۔“

”نہ آنے کے سبب سنگین ہوتے ہیں۔“

”مطلب؟“

”شمیلہ خانم نہیں رہیں۔“

”انا للہ۔“

”یہی بتانے آیا ہوں اور یہ بھی بتانے آیا ہوں کہ ان کی بیٹی سبیلہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“
حکیم صاحب بہت کمزور لگ رہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان کی سانس پھولنے لگتی
تھی۔ انہوں نے تیز تیز سانسیں لیتے ہوئے پوچھا:
”یہ کب ہوا؟“

میں نے حکیم صاحب کو شمیلہ خانم کے انتقال سے لے کر دفن ہونے تک کی پوری تفصیل
بتائی۔ سب کچھ سن کر وہ بولے:

”ایسا تیسری بار ہوا ہے۔“

”کیسا تیسری بار ہوا ہے؟“

”آپ آئے تو کسی کے مرنے کی خبر لائے۔ خدا سبیلہ خانم کو سلامت رکھے۔“ حکیم صاحب
نے کہا..... پھر بولے:

”آزردہ نہ ہوں۔ قدرت کے کارخانے میں کسی کا کیا دخل۔“ پھر پوچھا: ”کیا تکلیف
ہے سبیلہ بی بی کو۔“

”بہت صدمہ ہے ماں کے مرنے کا۔“

”وہ تو ہوگا۔ اور دل مضبوط رکھیں تو ایک بات اور کہوں۔“

”کہیں۔“

”شمیلہ خانم کے دل میں چھید تھا۔“

”جی۔“

”ایسے مرض اولاد کو بھی لگ سکتے ہیں۔“

”یہی شمیلہ خانم نے کہا تھا۔“

”جیسے آپ نے شہابی بی بی کا خیال رکھا ایسے ہی ان کا بھی خیال رکھیے۔ خدا نخواستہ

ایسا ہوا تو.....“

”تو.....؟“

”علاج سے نہیں ٹھیک ہوگا۔ ہم حکیم ہیں تمہارا دھوکہ دھوکے میں نہیں رکھتے۔“ یہ کہتے کہتے حکیم صاحب کی سانس تیزی سے پھولنے لگی۔

”اب زیادہ دیر نہیں بیٹھا جاتا، اسی لیے زیادہ مریض نہیں دیکھتا۔“ حکیم صاحب نے کہا۔ پھر بولے: ”آئندہ یہاں نہ ملوں تو تالکٹورے والی کربلا چلے آئیے گا۔ ہمارے خاندان کے لوگ وہیں دفن ہوتے ہیں۔“

”ایسا نہ کہیے۔“

”جو سچ ہے اسے کیسے نہ کہوں۔“ جاں لے کے یہاں آئے تھے تن لے کے چلے.....

اب جائے مجھ سے زیادہ نہیں بیٹھا جا رہا ہے۔“ یہ کہہ کر حکیم صاحب نے معاون کو آواز دی۔ اس نے انہیں کرسی سے اٹھایا، ہاتھ میں چھتری دی اور باہر سواری پر لا کر بٹھا دیا۔

”خدا حافظ۔“ حکیم صاحب نے سواری پر بیٹھنے کے بعد کہا۔ پھر کہا:

”یہاں نہیں تو وہاں تالکٹورے والی کربلا میں۔“



دوسرے دن تصویروں کی فروخت سے ملے ہوئے بہت سے روپے میں نے سبیلہ کے سامنے رکھے تو وہ حیران رہ گئیں۔

”اتنے روپے؟“

”ہاں۔ وہ دکاندار جہاں ہم جاتے تھے، بہت کم پیسے دیتا تھا۔ اب کی میں نے دوسری دکان پر دکھائیں تو اس نے اونچے داموں لیں۔“ میں نے سبیلہ کو یہ نہیں بتایا جس کے ہاتھ میں نے یہ تصویریں فروخت کی ہیں وہ انہیں اس سے کہیں زیادہ داموں پر نکالے گا اور یہ بھی نہیں بتایا کہ جو تصویریں فروخت ہوئی ہیں وہ نمائش میں رکھنے والی تھیں۔

”کل سے میں آپ کے کام پر لگوں گا۔“ کچھ دیر خاموش رہ کر میں نے کہا۔ ”آپ کہیں تو دو چار دن نہ آؤں۔ خالہ آپ کو سنبھالے رہیں گی۔“

یہ سن کر سبیلہ کا چہرہ بجھ گیا۔

”نہیں آئیے روز۔ اماں کی برسی ہو جائے تو..... رات میں رہنے کی بھی صورت نکل آئے۔“ سبیلہ نے کہا۔ پھر بولیں: ”جانے دیجیے آپ تو جاگیردار کے پوتے ہیں۔“

میں نے سبیلہ کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا تو وہ بولیں: ”اب مجھ سے آ کیے نہیں رہا جاتا۔ گھر کا سناٹا کاٹنے لگتا ہے۔ خالہ آج ہیں کل چلی جائیں گی۔“

میں کچھ نہیں بولا۔ کچھ دیر بعد میں نے پوچھا: ”دن میں کیا کھائے گا۔ آج میں خود پکاؤں گا۔“ یہ سن کر سبیلہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی ہنسی آئی۔

”ارہر کی کھجڑی۔“ میں نے کہا۔ ”اماں بہت عمدہ پکاتی تھیں۔ بگھری ہوئی پیاز کے ساتھ بہت اچھی لگے گی۔“

یہ کہہ کر میں نے سبیلہ کو حکیم صاحب کے یہاں جانے اور ان کی صحت کے بگڑ جانے کی بات بتائی۔ پھر کچھ دیر چپ رہ کر کہا: ”شاید زیادہ دن زندہ نہ رہیں۔ انہیں کچھ ہوا تو مجھے بہت دکھ ہوگا۔“ پھر کہا: ”انہوں نے مجھے بہت کچھ بتایا ہے۔ بہت جانتے ہیں اس شہر کے بارے میں۔ اُن کے پاس بیٹھو تو اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔“

”ایسا تو آپ کے ساتھ بھی ہے۔ کوئی آپ کے پاس بیٹھے تو اس کا اٹھنے کو جی نہ چاہے۔“ سبیلہ سے بہت دیر باتیں کرنے کے بعد دوپہر سے کچھ پہلے اٹھ کر جس طرح اماں کھجڑی پکاتی تھیں اسی طرح میں نے کھجڑی پکائی۔ اور جب وہ کھجڑی سبیلہ کو کھلائی تو وہ کھاتی چلی گئیں۔

میں سبیلہ کے یہاں روز جاتا اور ان کی دلجوئی والی باتیں کرتا رہا۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا:

”مجھے کچھ ہو جائے تو اس گھر کا سارا سامان اپنے یہاں لے جائے گا اور نانا اور نانی کی تصویریں، جہاں رہے گا اسی طرح دیوار پر لگائے گا۔“ پھر بولیں: ”ایسے لگانے سے جب جب ان تصویروں کو دیکھیے گا، میں آپ کو یاد آؤں گی۔“ اس سے آگے بھی وہ کچھ کہنے والی نہیں لیکن میں نے انہیں کچھ اور کہنے سے روک دیا۔

○

شمیلہ خانم کی برسی سے کچھ پہلے سبیلہ کی طبیعت بہت زیادہ بگڑ گئی۔ اُن کی یہ حالت دیکھ کر میں دوڑا دوڑا انہیں ڈاکٹر کے پاس گیا جو شمیلہ خانم کا علاج کر رہے تھے۔ جب

سب کچھ انہیں بتایا تو وہ بولے: ”یہ تو ان کی ماں والا مرض ہے۔ وہی دوائیں دیکھیے جو ان کی ماں کو دی جا رہی تھیں۔“

”آپ کہیں تو آپ کے پاس لے آؤں، دیکھ لیجیے۔“

”آپ کہتے ہیں تو لے آئیے۔ لیکن.....“

”آپ انہیں ٹھیک ہو جانے کا دلاسا دے دیجیے۔ بس۔ اور انہیں یہ نہ معلوم ہو کہ انہیں اپنی ماں والا مرض ہے۔“

”ڈاکٹر جانتا ہے مریض سے کیا کہنا ہے کیا نہیں۔“

دوسرے دن میں سبیلہ کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تو انہوں نے بہت اچھی طرح سبیلہ کو دیکھا پھر ان سے کہا: ”کچھ دوائیں دے رہا ہوں کھائیے اور ایک مہینے بعد پھر آئیے۔ ویسے انہیں دواؤں سے ٹھیک ہو جائیں گی۔“ یہ کہہ کر افسوس کرتے ہوئے سبیلہ سے کہا: ”آپ کی ماں کا مرض بگڑ چکا تھا اس لیے انہیں ٹھیک نہیں کر سکا۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔“

جب میں سبیلہ کے ساتھ ان کے کمرے سے نکلنے لگا تو انہوں نے بہانے سے الگ بلا کر مجھ سے کہا:

”میں نے ہلکی پھلکی دوائیں دی ہیں۔ اگر ماں والی دوائیں دیتا تو یہ سمجھ جاتیں..... سمجھ گئے نا آپ۔“

”جی سمجھ گیا۔“

○

گھر آتے ہی سبیلہ کی طبیعت اور بگڑی۔ میں نے انہیں وہی دوائیں دیں جو ڈاکٹر نے مرض نہیں، اُس کی تکلیف کم کرنے کے لیے دی تھیں۔ کئی دن تک میں انہیں یہی دوائیں دیتا رہا اور رات رات بھر اُن کی تکلیف میں اُن کے ساتھ جاگتا رہا اور ایک دن جب ان کی طبیعت زیادہ بگڑی اور بولنے میں انہیں بہت تکلیف ہونے لگی تو لفظوں کو توڑ توڑ کر انہوں نے کہا:

”گھر کا سارا سامان اب آپ کا ہے۔ اماں کی بری اچھی طرح کیجئے گا۔ اچکن اور

شمیلہ خانم کی وہ تصویر لگائی جو سبیلہ نے پنسل سے بنائی تھی۔ اس تصویر کو لگانے کے بعد میں نے اسے غور سے دیکھا۔ لیکن پہلے ہی کی طرح اس بار پھر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ شملہ خانم ہنس رہی ہیں یا رو رہی ہیں۔ تصویر کو دیکھتے دیکھتے اچانک مجھے محسوس ہوا وہ بولنے لگی ہے۔ میرے کانوں میں آواز آئی:

”بہت سے روگ لگا رکھے ہیں بٹیا نے۔“

یہ سن کر میرے منہ سے نکلا: ”لیکن یہ روگ انہیں بہت دن زندہ رکھیں گے۔“

”کہاں بہت دن زندہ رکھا۔ ادھر میں نے دنیا چھوڑی، ادھر وہ بھی وہاں سے نکل آئی۔“ آواز آتی رہی:

”کتاب جو تم نے بنائی تھی اسے دیکھنے کی بڑی حسرت تھی۔ وہ حسرت پوری نہ ہوئی۔ بٹیا بھی نہیں دیکھ سکی۔“

مجھے یاد آیا۔ سبیلہ نے کہا تھا ابھی تو اس میں بہت کچھ لکھنا پڑے گا۔ میں وہ بہت کچھ نہیں لکھ سکا۔ وہ بہت کچھ اسی وقت لکھ سکتا تھا جب سبیلہ بہت دن زندہ رہتیں۔

اچانک مجھے یاد آیا سبیلہ نے ہنگام اور کمو کے گھر سے لوٹتے وقت چوک سے کوئی چیز خریدی تھی اور مجھے یہ نہیں بتایا تھا کیا خریدا ہے۔ میں نے لائے ہوئے سامان میں اس تھیلے کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ دو چار چیزیں ادھر ادھر کرنے کے بعد وہ تھیلا مجھے مل گیا۔ میں نے تھیلا کھولا تو اس میں سنہری تاروں کے نقش و نگار والا ایک بہت خوبصورت ناگرہ تھا۔ میں نے ناگرے کی اس جوڑی کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو اس میں سے ایک پرچی نکل کر نیچے گری۔ میں نے اسے اٹھا کر دیکھا تو اس پر لکھا تھا:

”اچکن اور شیردانی کے ساتھ اسی کو پہنیے گا، کوئی دوسرا جو تا نہیں۔“

ان سب چیزوں سے فرصت پا کر میں نے وہ رجسٹر کھولا جس میں سبیلہ نے اُن عورتوں کے احوال لکھے تھے جو کوٹھوں پر ناچتی اور بازار میں بیٹھتی تھیں۔ سبیلہ نے ان کے بارے میں عجب عجب باتیں لکھی تھیں جو اس طرح تھیں:

”کوٹھے والی: منی جان:

لکھنؤ کب آئیں کچھ نہیں معلوم۔ ماں کے بارے میں بتایا، باپ کے

بارے میں ٹھیک سے نہیں بتا سکیں۔ چھوٹے موٹے مجرے کرتی ہیں اور کچھ کچھ دن کے لیے کسی رئیس کے یہاں رہ جاتی ہیں۔ اب بیمار ہیں اور اس بیماری کے بارے میں کھل کر نہیں بتاتیں۔ بہت پوچھنے پر بس یہ کہتی ہیں یہ جان لیوا مرض ہے، اسی میں ہماری موت ہوگی۔

ایک بیٹی ہے اس کے بارے میں پوچھا تو بولیں ماں اس کی میں ہوں، آگے نہ پوچھیں تو اچھا ہے۔“

.....

”بازار والی: راشدہ:

رنگ بہت گورا۔ عمر پچاس کے آس پاس۔ آنکھیں بڑی بڑی۔ بال بہت لمبے۔ کانٹھی اب بھی کسی ہوئی۔ سولہویں برس ہر دوئی سے کوئی یہ کہہ کر لکھنؤ لایا تھا وہاں گھروں میں کام بہت ہیں۔ کام کی جو تنخواہ ملے گی سو ملے گی، کپڑا لٹا کھانا پینا مفت۔ لکھنؤ میں جو کام ملا وہ مردوں کے ساتھ بیٹھک کا۔ اسی بیٹھک میں جوانی بیٹھ گئی۔ اب طرح طرح کے عارضے ہیں۔ زیادہ دن جینے والی نہیں۔ ان کی بھی ایک بیٹی ہے۔ دس برس کی۔“

میں یہ احوال پڑھتا گیا اور جب سادہ ورق شروع ہوئے تو ان کا پلٹنا بھی میں نے بند نہیں کیا۔ اور جب رجسٹر کا آخری ورق آیا تو اُس پر لکھا تھا:

”میں چاہتی ہوں میرے پاس اتنا پیسہ ہو کہ ناوقت مر جانے والی ان عورتوں کے بچوں کی دیکھ بھال میں اپنے ذمے لے سکوں۔ اس کے لیے مجھے بہت محنت کرنا ہوگی اور وہ محنت میں کروں گی۔“

میں نے رجسٹر بند کیا اور اپنے بستر پر آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔



شمیلہ خانم کی برسی کے تھوڑے ہی دن بعد محرم آ گیا۔ میں، جس دن گھروں میں امام باڑے سجائے جاتے ہیں، اپنے ٹھکانے سے نکل کر گلی کے نکل پر آیا تو بہت سی دکانوں پر ہدیے کے لئے تعزیے رکھے ہوئے تھے اور اسی کے ساتھ امام باڑہ سجانے کا سامان۔ میں کچھ دیر ان دکانوں کو دیکھتا رہا پھر گلی میں آ کر میں نے اُن دروازوں کی طرف دیکھا جو آج کے دن

امام باڑہ سجانے کے لیے کھلے چھوڑ دیے گئے تھے۔ ان دروازوں سے میری نگاہ اُن صحیحیوں کی طرف گئی جہاں مرد اور پردہ پوش بی بیایاں امام باڑے سجا رہی تھیں۔ اچانک مجھے لگا میرے سامنے ہینگا اور کتو کے ساتھ سبیلہ کھڑی ہیں اور مجھ سے وہ چیزیں جن سے امام باڑہ سجا جاتا ہے، اٹھانے کو کہہ رہی ہیں۔ یہ منظر نگاہ میں آتے ہی میں اپنے کمرے پر لوٹ آیا۔ دوسرے دن سے میں نے مجلسیں شروع کر دیں۔ چھٹی محرم آتے آتے مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اور جب میں تحسین علی خاں کی مسجد کی پشت والے امام باڑے کی مجلس میں جانے لگا تو میرے کانوں میں ایک آواز آئی:

”انشاء اللہ اگلے سال پھر اسی طرح ساری مجلسیں کریں گے۔“

شام کو میں ضرتح کا جلوس دیکھنے نہیں گیا۔ جاتا تو مجھے کون بتاتا بڑی ضرتح کے پیچھے لاڈوسا قن کا تعزیہ کیوں نکالا جاتا ہے۔ زعفر جن والی مجلس کے دن سبیلہ مجھے پھر بہت یاد آئیں۔ اس دن میں ذاکر کے بالکل سامنے جا کر بیٹھا اور سمندر سے ویران جزیرے تک پہنچنے اور ویران جزیرے سے کربلا کے میدان تک آنے کے بیان میں ایک بھی منظر ایسا نہیں تھا جس میں سبیلہ کا چہرہ مجھے بار بار نظر نہ آیا ہو۔ دس محرم کو میں صبح صبح کربلا پہنچ گیا اور زنجیری دروازے سے متصل حاضری فروشوں والے چبوترے پر جا کر بیٹھ گیا۔ دوپہر سے کچھ قبل شیدیوں والی انجمن آئی۔ میں نے اس کا نوحہ سنا اور روضے کے اندر جا کر زینبیہ دروازے سے باہر نکل کر خیمہ گاہ کی طرف چلا آیا۔ یہاں پہنچتے ہی اچانک مجھے ہینگا نظر آئیں۔ آج کے دن نہ خود سلام کیا جاتا ہے نہ کسی کے سلام کا جواب دیا جاتا ہے اور نہ ایک دوسرے کی خیریت معلوم کی جاتی ہے۔ میں نے ان کے قریب جا کر اُن سے کہا:

”آپ اکیلی؟“

”دوسری اس دنیا میں نہیں رہیں۔ آپ جب کتو کو دیکھنے آئے تھے اسی کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔“ ہینگا نے بتایا۔ ”سبیلہ کی طرف جانے کا موقع نہیں ملا اور نہ آپ کو خبر ہو جاتی۔“ یہ کہہ کر پوچھا:

”اور سبیلہ.....؟“

”کتو کی طرح وہ بھی..... نجم النساء کی نسل ختم ہو گئی۔“

”یہ کب.....؟“

”اپنی ماں کی موت کے بعد۔ ان کے مرنے کے دکھ نے انہیں بھی مار دیا۔“
ہم کڑی دھوپ سے ہٹ کر ایک پیڑ کی چھاؤں میں آ گئے۔ ہینگا بہت دیر تک اس پیڑ کے نیچے سر پکڑے بیٹھی رہیں پھر مجھ سے پوچھا: ”کہاں دفن کیا نہیں؟“
”کر بلا ملکہ جہاں..... اپنی ماں ذاکیہ بیگم کے پہلو میں۔“
”پرسوں آؤں گی وہاں۔ سہ پہر کے وقت۔ کتو بھی وہیں..... آپ ملیں گے؟“
”ملوں گا۔“

”میں چلتی ہوں۔ اعمال کرنا ہیں۔“ یہ کہہ کر ہینگا آگے بڑھ گئیں۔



تیسرے دن سہ پہر کے وقت میں کر بلا ملکہ جہاں پہنچا تو ہینگا وہاں موجود تھیں۔ ہم شہباز، کتو اور سبیلہ کی قبروں کے پہلو میں بہت دیر بیٹھے اور بہت دیر ہم نے ان تینوں کی باتیں کیں اور جب پچھلے سال سبیلہ کے ساتھ محرم کرنے کی باتیں بتاتے میری آواز بیٹھنے لگی تو ہینگا میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولیں:

”چلیے کہیں چلتے ہیں۔“

”کہاں؟“

”دریا کی طرف۔“

بہت لمبا راستہ طے کرنے کے بعد ہم کوٹھی فرح بخش پہنچے اور اس کی پشت پر ایک اونچی سی جگہ پر بیٹھ کر دریا کو دیکھنے لگے۔

”کچھ دن پہلے سبیلہ میرے ساتھ یہاں آئی تھیں۔“ میں نے کہا۔ ”ہم نے مہدی گھاٹ سے چلنا شروع کیا تھا۔ نواب علی نقی بہادر، سبیلہ کے پرانا کاجرا جب وہ شکار پر نکلتے تھے وہیں سے چل کر دلکشا پہنچتا تھا۔ بیچ بیچ میں وہ کئی جگہ اپنا کاجرا کواتے اور شاید یہاں بھی۔ پھر دلکشا پہنچ کر اس کے سامنے والے رمنے میں شکار کھیلتے۔ دریا کنارے چلتے چلتے سبیلہ بھی ان سب جگہوں پر رکی تھیں جہاں ان کے پرانا رکتے تھے۔“

سورج دھیرے دھیرے ڈوب رہا تھا۔ ہینگا نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

”سامنے اُن بہتی ہوئی موجوں کو دیکھ رہے ہیں۔“

”دیکھ رہا ہوں۔“

”جو موج آگے نکل جاتی ہے، واپس نہیں آتی۔ اٹھیے جھٹ پٹا ہو چکا ہے۔“

ہم کوٹھی فرح بخش کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے جب موتی محل سے پہلے والے پل پر پہنچے تو

میں نے ہینگا کو بتایا:

”یہیں سبیلہ کی طرف بہت سے بندر لپکے تھے اور وہ چیخ کر مجھ سے لپٹ گئی تھیں۔“ یہ

کہہ کر میں آگے والے پل کی طرف چلنے لگا۔ کچھ دیر بعد مجھے محسوس ہوا ہینگا میرے ساتھ نہیں

ہیں۔ اندھیرا پھیل چکا تھا میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو بہت دور تک ہینگا نظر نہیں آئیں۔ میں

نے زور زور سے پکارنا شروع کیا: ہینگا..... ہینگا..... میں جتنی بار پکارتا میری آواز کوٹھی فرح بخش

کی دیواروں سے ٹکرا کر لوٹ آتی۔ ناچار میں اپنے ٹھکانے پر لوٹ آیا اور اس کتاب کو جو شملہ

خانم کو نہیں دکھاسکا تھا، دیکھنا شروع کر دیا۔



نوٹ: اشیاء، مقامات، قص اور موسیقی سے متعلق بیانات میں تسامحات ممکن ہیں۔

ان سب کے بیان میں بیشتر تخلیقی آزادی کو روا رکھا گیا ہے۔

’دھیارے‘ مشاہیر کی نظر میں

میں نے ’دھیارے‘ پڑھی۔ یہ ناولٹ آپ نے بہت عمدہ زبان میں لکھا ہے۔ اس کا پلاٹ بھی خوب ہے۔ بڑے بھائی اور شامہ زندہ جاوید کردار ہیں۔ یہ ناولٹ اردو فکشن میں اپنی مخصوص جگہ بنائے گا۔

اسلم فرخی

عزیزی آصف فرخی۔

تمہاری بھیجی ہوئی کتابیں ملیں..... اور پھر ’دھیارے‘ پڑھنا شروع کی۔ ایک دفعہ پڑھی دو دفعہ پڑھی پھر تیسری دفعہ بھی پڑھ لی۔ اس (ناولٹ) کے بارے میں کچھ کہنے کا ہوتا (حوصلہ) ابھی پانہیں سکی ہوں۔ ابھی تو ہر بار پڑھ کر غالب کے اس شعر کی بازگشت نے ذہن میں اودھم مچایا ہوا ہے:

وحشت کہاں کہ بخودی انشا کرے کوئی

ہستی کو لفظ معنی عنقا کرے کوئی

یہ انیس اشفاق ہیں کون؟ اس سے پہلے ان کا کوئی افسانہ یا ناول پڑھنے میں نہیں آئی۔ جی چاہتا ہے اس کے بارے میں کچھ لکھوں۔ فی الحال تو میرے اندر اسی ایک شعر کی تکرار جاری ہے۔
تم نے یہ کتاب بھیجی تمہارے شکرے کے لیے الفاظ کہاں سے لاؤں۔

دعا گو
الطاف فاطمہ

۲۸ جنوری ۲۰۱۲ء

اس مختصر سے ناول سے ان کی نثر کے کئی دلکش پہلو نمایاں ہو رہے ہیں۔ آہستہ رو آہنگ، تھوڑی سی پراسراریت، گزشتہ اور اکثر کھوئی ہوئی باتوں کی یاد اور تلاش۔ ناول پر یہ چیزیں چھائی ہوئی ہیں: بیماری، بیماری، موت اور گھروں سے بے دخلی، گزشتہ گاہ کا انتظار۔ اور یہ سب اس خوبی سے پلاٹ میں جذب ہیں کہ احساس نہیں ہوتا کہ قصہ ہمیں کہاں لے جا رہا ہے۔ انیس اشفاق کی زبان خوبصورت اور درست ہے (اس زمانے میں یہ درستی بڑی بات ہے)۔

شمس الرحمن فاروقی

بڑے بھائی کی صورت میں انیس اشفاق نے ایک ایسا کردار وضع کیا ہے جو اردو فکشن میں منفرد حیثیت کا حامل ہے۔

”دکھیارے“ میں جو ماحول ہے اور جو کردار پیش کیے گئے ہیں وہ مانوس اور معمولی سے لگتے ہیں۔ ناول بھی، اگر اسے بے احتیاطی سے پڑھا جائے، ڈرامے سے خالی نظر آئے گا۔ جہاں ڈراما نہ ہو، بلچل نہ ہو، اس پر بے رنگ اور بے رس ہونے کا گمان ہو سکتا ہے۔ ذرا غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ بیان کا یہ پیرایہ ایک گردابی تماشا ہے جس میں کردار پھنس کر رہ گئے ہیں۔ وہ گھومتے رہتے ہیں مگر گرداب سے باہر نہیں آ سکتے۔ خود کو ناول کے آہنگ کے سپرد کرنا پڑتا ہے۔ سیدھا سادہ بیانیہ پڑھنے والے کو رکنے اور سوچنے کے مواقع کم فراہم کرتا ہے۔ آخر میں حیرانی ہوتی ہے کہ کن راستوں پر چل کر کہاں آ نکلے ہیں۔

محمد سلیم الرحمن

نثر میں عالم آشوب قرۃ العین حیدر نے لکھا اور بٹوارے کے بعد لکھنؤ کا شہر آشوب، انیس اشفاق کے قلم سے نکلا جسے انہوں نے ”دکھیارے“ کا نام دیا۔ یہ اس لکھنؤ کا قصہ ہے جس نے زوال کا زہر پی لیا اور اب اس کی نبضیں چھوٹ رہی ہیں۔

”دکھیارے“ کہنے کو ایک مختصر سا قصہ ہے لیکن کتنے ہی پیچیدہ سوال اٹھاتا ہے۔ وہ سوال جو ہماری تاریخ، تحریک آزادی اور آزادی موہوم کے معاملات سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس شہر آشوب کو لکھ کر انیس اشفاق نے ہمیں بٹوارے کے بعد ہندوستان میں آویزشوں کا ایک نیا رخ دکھایا ہے۔

زاہدہ حنا

مجھے امید ہے کہ انیس اشفاق کا یہ ناول بہت سے اچھے پڑھنے والوں کی توجہ حاصل کرے گا اور یہ اردو کے ہم ناولز میں شامل ہوگا۔

انور سن رائے

زبان و بیان کا جو سلیقہ انیس اشفاق کے یہاں ہے وہ ہمارے یہاں آہستہ آہستہ مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ ایک فکشن لکھنے والے کی سنجیدگی، فکر اور سلیقہ، اشیا کو چھوڑنے میں اور انہیں بٹور کر الگ رکھنے کا نام ہے۔ انیس اشفاق اس رمز سے بخوبی واقف ہیں۔ اُن کا ناول ”دکھیارے“ اس رمز سے بھرا ہوا ہے اور زیادہ تر مکالموں کے ذریعے کہانی کو آگے بڑھانے کی تکنیک نے اس میں یونانی المیوں کی سی شان پیدا کر دی ہے۔

ایسی عجیب و غریب اور مایوس کن صورت حال میں انیس اشفاق کا یہ ناول ایک بڑا واقعہ ہے۔ ناول کی تمام خوبیوں سے قطع نظر میرے خیال میں 'دکھیارے' ہمارے عہد کے نئے لکھنے والوں کے لیے ایک ہدایت نامہ کا فریضہ بھی انجام دیتا نظر آتا ہے کیونکہ سنجیدگی کے ساتھ اس کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہمارے بہت سے خود ساختہ ناول نگاروں کو یہ بات بھی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ آخر ناول لکھا کیسے جاتا ہے یا یہ کہ ناول کیسے لکھیں۔

خالد جاوید

'دکھیارے' جیسا ناولٹ لکھ کر انیس اشفاق نے یقیناً ایک قرض ادا کیا ہے جو وہ نہ ادا کرتے تو اس قرض کے بارے میں شاید کوئی کچھ جان بھی نہ پاتا۔

جس معاشرے، ماحول اور عہد میں انیس اشفاق نے آنکھیں کھولیں، اپنے پیروں چلنا سیکھا اور پھر ایک دنیا کو وہ کچھ بتانا اور سکھانا ضروری سمجھا جو کہ انہوں نے اپنے عہد اور ماحول سے سیکھا تھا۔ یہ کام انہوں نے بڑے سلیقے سے بلکہ اس سے زیادہ خلوص سے کیا ہے۔

'دکھیارے' کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو پڑھتے وقت ہرگز احساس نہیں ہوتا کہ کسی نے اسے قصداً لکھا ہے۔ کیونکہ ایسا لگتا ہے کہ سب کچھ خود بخود ہو رہا ہے دیکھنے والا بڑے انہماک سے دیکھ رہا ہے کیونکہ وہ جو کچھ دیکھتا ہے اس میں اسے اپنی تصویر بھی نظر آتی ہے۔

بیانیہ میں انیس اشفاق نے بڑے سبک، سلیس اور نفیس انداز سے جو کچھ بیان کر دیا ہے وہ لمحوں کی بات نہیں صدیوں کی داستان ہے لیکن داستان کہنا اس لیے شاید درست نہ ہو کہ یہ تاریخ ہے اور بالکل درست جغرافیہ بھی۔ کہانی میں حزن و ملال ہے تو محبت کی ہلکی ہلکی آنچ بھی جو جسم کو حرارت بخشتی ہے اسے پڑھ کر بہت کچھ سوچنے اور سمجھنے کا موقع ملتا ہے، مٹی ہوئی اعلیٰ اقدار کا افسوس ہوتا ہے تو گزری شرافت اور رواداری کے وہ نمونے سامنے آتے ہیں جو اب دیکھنے کو نہیں مل سکتے۔

بہت دلچسپ، مفید اور پرکشش ناولٹ کی تصنیف کے لئے انیس اشفاق یقیناً مبارکباد کے مستحق قرار پائیں گے۔

روزنامہ 'آگ'، لکھنؤ

۲۰ مارچ ۲۰۱۶ء

ساقی از باب حقوق

PDF BOOK COMPANY

مدد، مشاورت، تجاویز اور شکایات:

Muhammad Husnain Siyalvi

0305-6406067

Sidrah Tahir

0334-0120123

Muhammad Saqib Riyaz

0344-7227224



مصنف کی دوسری تصنیفات

(ناشر: اتر پردیش اردو اکادمی)	• اردو غزل میں علامت نگاری
(ناشر: اتر پردیش اردو اکادمی)	• یگانہ
(ناشر: اتر پردیش اردو اکادمی)	• قائم چاند پوری
انتخاب	• ادب کی باتیں
انتخاب	• کوئے اور کالا پانی
تنقیدی مضامین	(ترجمہ)
نزل درما، بہ اہتمام سہتیہ اکادمی	• مسعود حسن رضوی ادیب
	(مونیوگراف)
بہ اہتمام سہتیہ اکادمی، دہلی	• بحث و تنقید
تنقیدی مضامین	• غزل کا نیا علامتی نظام
(ناشر: اتر پردیش اردو اکادمی)	• روح انیس
مسعود حسن رضوی ادیب	• صحیح و ترتیب و پیش گفتار
بہ اہتمام سہتیہ اکادمی، دہلی	• خوشبوئے خاک
رپورٹاژ	• دکھیاے
ناولٹ	• در شہر دوستداراں
یادنامہ کراچی	• کتبے پڑھنے والے
افسانے	

زیر اشاعت

شاعری	• شہر عدم رفتگاں
	• جدید مغربی مصنفین

ہمارے سنے ناول اور افسانے کے ساتھ ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ دانشورانہ اظہار اسے بہت پسند آنے لگا ہے۔ ایسا شاید اُس وقت ہو جب افسانے میں تجربہ اور علامت کا عمل شروع ہوا۔ یوں تو ان رتھانوں میں دانشورانہ اظہار شروع ہی سے موجود تھا، پھر وہ زمانہ آیا جب ادبی اور دانشورانہ حلقوں میں سارتر نے ایک فیشن کی شکل اختیار کر لی۔ پہلے کھل تو ہم نے اسے ایک ناول نگار اور ڈرامہ نویس کی حیثیت سے جانا لیکن جلد ہی ہم پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ جوہریت کا فلسفہ بھی سارتر ہی سے منسوب ہے۔ اس انکشاف نے اس کی ادبی شہرت میں اور اضافہ کر دیا اور یہ ہمارے کام کا مظہر۔ بیسویں صدی کا وہ زمانہ کب کا ختم ہو چکا لیکن ہمارے گلشن نگاروں میں اُس زمانے کا اختیار کیا ہوا دانشورانہ اظہار اب بھی موجود ہے۔ ناول اور افسانہ لکھنے والے سمجھتے ہیں کہ دانشورانہ اظہار (ادب میں) متانت کی ضمانت ہے۔ لیکن وہ ناول جس پر میں گفتگو کرنے جا رہا ہوں اس نوع کے اظہار سے مکمل انحراف ہے۔ کسی طرح کی بناوٹ کے بغیر اس ناول میں چیزوں کے بیان کرنے کا جو انداز ہے، اسی نے مجھے اس کی طرف متوجہ کیا۔

لکھنؤ کے انیس اشفاق اس ناول کے مصنف ہیں۔ اشفاق جنہوں نے بہت سی (تقیدی) کتابیں لکھی ہیں، (ادبی دنیا) میں خداداد کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ ناول انہوں نے پہلی بار لکھا ہے۔ ناول شروع ہوتے ہی پڑھنے والے پر شاید یہ تاثر قائم ہو کہ واقعہ بیان کرنے والا انچائیک اپنے گزرنے والے دنوں کو یاد کرنے لگا ہے۔ اسے یہ محسوس کرتے ہیں کہ وقت گئے گا کہ واقعہ بیان کرنے والا (خود) ناول کا ایک کردار ہے۔ ظاہر ہے وہاں روایت والے خاندان کی سب سے چھوٹی فرد ہے اور جو اپنی مری ہوئی ماں کو یاد کرتے وقت اپنے اُس بڑے بھائی کو بھی یاد کرنے لگا ہے جسے مرے ہوئے بہت دن ہو چکے ہیں۔

اُس کے بھائی کی یادیں اسے اُن الم آمیز دنوں کی یاد دلاتی ہیں۔ جب وہ حیران و پریشان اپنے بھائی کی تلاش میں یہ جانے بغیر نکل پڑا تھا کہ وہ کس مسجد یا کس امام باڑے میں رہ رہا ہے۔ اُس بھائی نے اپنا آبائی مکان چھن جانے کے بعد اپنے خاندان کے ساتھ رہنا چھوڑ دیا ہے اور اسے نہیں معلوم کہ اس کا اگلا مکان کیا

ہوگا۔ مسجد کا حجرہ، گرجا گھر کا ایک کونایا کسی امام باڑے کی چٹھی۔ وہ ایک بھگی ہوئی روح کی مانند شہر میں ادھر ادھر گھومتا پھر رہا ہے۔ بالآخر وہ ایک پانے اور خورش امام باڑے میں آکر اس لیے رہنے لگتا ہے کہ یہاں وہ اس کی مرمت کے کاموں میں حصہ لے سکے۔ پریشان حال پھونکا بھائی جب شہر میں اپنے چھوٹے بھائی کی تلاش میں گھوم رہا ہوتا ہے، اُس کا سابق عجیب و غریب لوگوں سے ہوتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی جائیدادوں سے محروم ہو جانے کے بعد غربت و افلاس کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ اپنی پر آسائش زندگی ختم ہو جانے کے بعد ان لوگوں کو کسی درگاہ یا امام باڑے میں رہنا پڑ رہا ہے۔ اب یہ لوگ ان بھگی ہوئی روحوں کی طرح ہیں جو اپنی شان و شکوہ والی زندگیوں کو یاد کر کے لکھنؤ کی گمشدہ تہذیب کی یاد دلا رہی ہیں۔

یہاں اب ادبی مہدی کی چمک دمک موجود نہیں ہے اب لکھنؤ ایک جزا ہو شہر ہے لیکن اسی خراب حالی میں اُس تہذیب کے ایسے نشانات نظر آنے لگتے ہیں جو اب مٹ چکے ہیں لیکن جن میں اب بھی پہلی کی سی لکشی موجود ہے۔

انیس اشفاق نے کسی طرح کے اہتمام کے بغیر ان چیزوں کی عکاسی کی ہے۔ وہ بڑی روانی اور سہولت کے ساتھ لکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے کرداروں کو اُسی طرح پیش کیا ہے جیسے وہ ہیں۔ ناول نگار اس معاملے میں بہت حساس ہے۔ وہ اپنے کرداروں کی گفتگو اور اُن کے عمل میں کوئی مداخلت نہیں کرتا۔ ایک بیوہ اپنی بیٹی کے ساتھ ایک پرانی اور خستہ حال کربا کے ایک گوشے میں رہ رہی ہے۔ کرتوں کی کڑھائی ان دونوں کی کمائی کا ذریعہ ہے لیکن اُن کا یہ پیشہ محض پیشہ نہیں ہے۔ جو کام وہ کر رہی ہیں اس میں لکھنؤ کی تہذیبی نفاست کا عکس نظر آتا ہے۔ اگرچہ یہ لوگ بہت مذہبی نہیں ہیں لیکن مذہب کے گہرے شعور کا اظہار اُن کے اعلیٰ تہذیبی رسوم میں نظر آتا ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ دکھیا رے بہت سادگی کے ساتھ لکھا گیا ہے لیکن تہذیبی اور انسانی سطحوں پر اس میں بہت سے معانی موجود ہیں۔

انتظار حسین

مڈان کراچی

Rs. 900.00

www.sangemeel.com

ISBN-10: 969-35-3171-3

ISBN-13: 978-969-35-3171-8

